گفت و شنید 16
شہرِ خیال
قارئین
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 24
فلسفی
ڈاکٹر ساجد امجد
حکمرانوں کے لیے اس نے اسباق سیاست مرتب کیے

یادِ رفتگاں 47
سالگرہ کے دن
غلام حسین میمن
جس تاریخ کو پیدا ہوئے اسی تاریخ کو وفات پانے والی نامور شخصیات

تصویرِ عالم 54
صحرائے اعظم
طارق عزیز خان
اس صحرا کا تذکرہ جسے دنیا کا خطرناک ترین خطہ کہا گیا ہے

جہاں نما 59
کھیل
منظر امام
عجیب و غریب ان کھیلوں کا تذکرہ جو عالمی پیمانے پر کھیلے جاتے ہیں

تذکرہ خاص 67
ماہ مئی
سلیم الحق فاروقی
اس اہم ماہ کی اہم شخصیات کا ذکرِ خاص

نفسیات 75
وہم
ثنا ثاقب
اس خطرناک بیماری کا بیان جو تیزی سے پھیل رہی ہے

تحریر خاص 83
رہنمائے سیاست
شکیل صدیقی
دنیا کو سیاست کی بازی گری کے گر سکھانے والے کا تذکرہ

ننھی دنیا 109
سدابہار
انور فرہاد
وہ سدابہار چہکتی ہوئی آواز جو آج بھی کانوں کو بھلی لگتی ہے

گنجلک واقعہ 123
پراسرار قتل
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ترکی کے اس خلیفہ کی داستان جس کا قتل آج بھی معما ہے

سبق آموز 131
سامری
محمد ساجد
اس جادوگر کا قصہ جس کا ذکر قرآن پاک میں

معلومات 138
اسرار
شیراز خان
بھید بھری اس دنیا کے مخفی اسرار

زندگی نامہ 143
انقلابی
مریم کے خان
دنیا کو انقلاب کا درس دینے والے شخص کا زندگی نامہ

کھیل کھلاڑی 161
تین کھلاڑی
ثوبیا اعجاز
پاکستان کے تین مایہ ناز کھلاڑیوں کا ذکرِ خاص

معاشرت 170
سراب
کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی 216
آوازِ دوست
نازگل
وہ قوت سماعت سے محروم تھی اور اس کا محبوب؟

دوسری سچ بیانی 237
سیدھا راستہ
شیریں بی بی
اس نے جلد بازی میں اپنی قسمت خود خراب کرلی

تیسری سچ بیانی 246
حقیقت
محمد عارف محمود
عورت کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں

چوتھی سچ بیانی 251
بہروپ
انجم فیروز
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم ادھر کا رہا نہ ادھر کا رہا

پانچویں سچ بیانی 261
کیا کروں
کامران بٹ
وہ خودکشی کرنے گیا تھا کہ آفت گلے پڑ گئی

چھٹی سچ بیانی 268
کوما
امین بھایانی
اس نے پورے بتیس برس بعد آنکھیں کھولیں

ساتویں سچ بیانی 276
فیصلہ
ارشد علی ارشد
ماں ہو کر بھی اس نے بیٹی کی وجہ سے ایک عجیب فیصلہ کیا

آٹھویں سچ بیانی 279
جوکر انکل
ڈاکٹر فوزیہ
وہ موت کی دہلیز پر کھڑے بچوں کو ہنسایا کرتا تھا

نویں سچ بیانی 288
کر بھلا
شاھد
اس کی ایک نیکی نے قسمت کو اوج پر پہنچا دیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جلد 29 ٭ شمارہ 09 ٭ مئی 2015ء

ماہنامہ [illegible] کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ٹی وی اور اخبارات دیکھیں تو ایسا لگے گا جیسے عوام کا بس ایک ہی مسئلہ ہے، سیاست۔ گو کہ سیاسی مسائل کا حل بھی ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ہے ضروریات زندگی کی فراہمی میں آرہی اڑچنوں کا سدباب۔ کیوں کہ اب سفید پوشی کا بھرم رکھنا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ مہنگائی کا طوفان تیز تر ہو رہا ہے۔ عوامی ضروریات کی فراہمی کے لیے قائم کردہ سرکاری اور نجی کمپنیاں کھل کر لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں۔ بجلی کی فراہمی کا ادارہ ہو یا رسل و رسائل کا، سب نے عوام کی زندگی کو جہنم بنانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ اب تو موبائل سروس پرووائیڈر بھی اس دوڑ میں شامل ہو کر سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ نت نئے طریقوں سے عوام کو لوٹ رہے ہیں۔ خود ہی اسکیم بناتے ہیں اور بغیر پوچھے اسکیم میں شامل کر کے بیلنس کاٹ لیتے ہیں اور ان سے باز پرس کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ ایسے لاتعداد مسائل کا سامنا ہے مگر توجہ صرف اور صرف سیاست پر مرکوز کرائی جا رہی ہے۔ عوام اور ان کے بے حساب مسائل کی کسی کو پروا نہیں، بقول خلیل رامپوری

جو دل میں نقش ہے اسے کیسے ابھاریے
جو مہرباں ہیں صورتِ ابرِ سیاہ ہیں

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فرخ علی بخش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ٭ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتہ ٭ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

استادِ اردو

سرگزشت
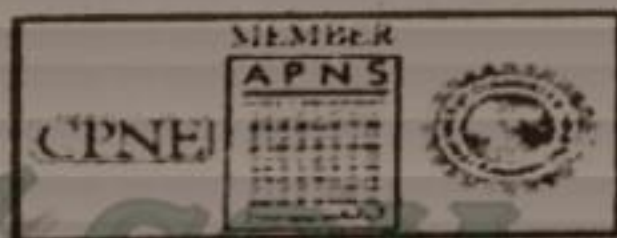
سنبھل (مراد آباد) سے اس خاندان کا تعلق تھا۔ خاصے خوش حال لوگ تھے۔ کافی اثر و رسوخ والے زمیندار تھے۔ بہت بڑی زمینوں کے مالک۔ اسی گھرانے میں اس بچے نے جنم لیا۔ ماں کا تعلق ریاست رام پور سے تھا۔ یہ گویا دونوں جانب سے پٹھانی خون تھا۔ اس لیے ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا۔ والد نے کانپور میں تجارتی لکڑیوں کا بہت بڑا کارخانہ کھول رکھا تھا۔ وہ بھی باپ کے پاس رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ابتدائی تعلیم سنبھل سے حاصل کر کے آیا تھا اور اب میڈل کے مساوی درجے میں تھا۔ عمر تقریباً تیرہ چودہ سال کی تھی کہ گھر میں اڑتی اڑتی خبر سنی کہ اس کی شادی کرائی جائے گی۔ ماموں زاد سے منگنی کافی پہلے ہو چکی تھی۔ اب جو شادی کا غلغلہ اٹھا تو یہ پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سوچ لیا کہ گھر سے فرار ہو کر جاپان چلا جائے۔ وہاں جانے سے دو فائدے ملیں گے۔ ایک تو شادی کرنے سے بچ جائے گا، دوسرے وہ کوئی ہنر سیکھ لے گا۔ اس وقت جاپان اور جرمنی کا بڑا نام تھا۔ یہ دونوں ملک صنعت و حرفت میں آفاقی شہرت کے حامل تھے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل پڑا۔ اسبابِ سفر کے نام پر ایک جوڑی کپڑے تھے وہ بھی جسم پر منڈھے ہوئے اور جیب میں بس اتنی رقم تھی کہ وہ لکھنؤ تک پہنچ سکے۔ لکھنؤ پہنچ کر اب اسے ایک نئی فکر نے گھیر لیا کہ آگے کیسے جائے۔ ابھی وہ اسی مخمصے میں پھنسا تھا کہ اس پر ایک عزیز کی نظر پڑ گئی اور وہ اسی عزیز کی نگرانی میں واپس کانپور پہنچا دیا گیا۔ والد جلاد صفت تھے مگر اس وقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اتنا پوچھا ''میاں آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟'' اس نے نظروں کو جو پہلے ہی جھکی ہوئی تھیں مزید جھکا لیا اور دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''انگریزی پڑھوں گا۔'' والد نے تحمل بھرے انداز میں کہا۔ ''اچھی بات ہے۔'' پھر اگلے ہی روز والدہ کے پاس رام پور روانہ کر دیا۔ ساتھ میں تاکید بھرا خط بھی تھا کہ انگریزی تعلیم وقت کی ضرورت ہے۔ کسی کرسچن اسکول میں داخلہ دلوا دیا جائے۔ رام پور کے ایک اسکول میں چھٹی کلاس میں داخلہ دلوایا گیا۔ وہیں سے مڈل پاس کیا اور پھر مراد آباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں آ گیا۔ یہاں زیادہ تر ایسے بچے تھے جن کی رگوں میں پٹھانی خون موجزن تھا۔ ذرا سی بات میں بھڑک اٹھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو طلباء ان سے دبے دبے رہتے۔ یہ بھی انہی میں سے ایک تھا اس لیے اس کی سرشت میں بھی ولولہ تھا۔ کسی سے دبنے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ وہ ان کے درمیان رہ کر اسکول لیونگ ایگزام کی تیاری کر رہا تھا کہ اسکول میں ایک ذرا سی بات پر انتظامیہ اور طلبا میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس اختلاف نے جلد ہنگامے کی صورت اختیار کر لی اور طلبا نے بورڈنگ ہاؤس میں آگ لگا دی۔ انتظامیہ نے اس جرم کی پاداش میں ان لوگوں کو جو لیڈری کر رہے تھے اسکول سے رسٹریکٹ کر دیا گیا۔ ایسے تمام طلبا کا دو دو سال کے لیے رسٹیکشن ہوا تھا۔ اس لپیٹ میں وہ بھی آ گیا تھا۔ اسے اب تک امید تھی کہ امتحان میں فرسٹ کلاس نمبر ملیں گے مگر نتیجہ یہ نکلا تھا۔ اسے سخت صدمہ پہنچا۔ اس نے انگریزی تعلیم پر لعنت بھیجی اور مدرسہ عالیہ رام پور کے درجہ منشی عالم میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال اس نے امتحان دیا اور پنجاب بھر میں اول آیا۔ دوسرے سال منشی کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں اول آیا۔ فارسی کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ اب کیا کیا جائے اس فکر نے گھیر لیا۔ بالآخر قرعہ فال انگریزی تعلیم پر منتج ہوا۔ منشی فاضل کی ڈگری مل ہی چکی تھی اس لیے پرائیویٹ امتحان کی فوراً اجازت مل گئی۔ میٹرک، انٹر اور بی اے کے امتحانات ایک ایک سال کے وقفے سے دے کر ڈگری حاصل کر لی پھر 1925ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اب وہ کسی بھی سرکاری محکمے میں نوکری کر سکتا تھا مگر اسے تو درس و تدریس سے دلچسپی تھی اس نے بی اے پاس کرتے ہی چیفس کالج لاہور میں ملازمت تلاش کر لی تھی۔ 1925ء میں ہی حکومت پنجاب نے اسے ایک دیسی ریاست کے کم سن نواب کا اتالیق بنا کر بھیجا تھا۔ وہاں وہ ایک سال تک رہا پھر وہاں سے دہلی آ گیا تھا جہاں ہندو کالج میں اردو فارسی کا لیکچرر مقرر ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا پھر 1928ء میں ڈھاکا یونیورسٹی میں سینئر لیکچرار بن کر آ گیا۔ بنگال کی سرزمین نے ایسا پاؤں پکڑا کہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بالآخر ڈھاکا ہی کی مٹی میں 29 جولائی 1969ء میں دفن ہو گیا۔ اس قابلِ فخر استادِ اردو کو لوگ اس کی شاعری کی وجہ سے زیادہ جانتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام نشاطِ رفتہ اردو اہم شعری مجموعوں میں شمار ہوتا ہے اور ہم اسے عندلیب شادانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

☆☆☆

☆اویس شیخ کا اظہار ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ”اداریہ میں اس مرتبہ آپریشن ضرب عضب کا دائرہ وسیع کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ یقیناً یہ وقت کی ضرورت ہے اور حالات کا تقاضا بھی۔ ان کامیابیوں کی مرہون منت ہی ہم دہشت گردی پر کسی حد تک کنٹرول کر سکے ہیں۔ ”خوب آدمی“ کا تذکرہ بہت اچھا لگا۔ واقعتاً شعر کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ”شہرِ خیال“ کی جانب گامزن ہوئے تو سدرہ صاحبہ مسند صدارت پر براجمان تھیں۔ تحریر اچھی تھی۔ نزاہت انشال کا خط مجھے سب سے اچھا لگا۔ نزاہت یہ سالار تو دور کی بات، ان کی ایک پرچھائی بھی ہمارے اسلامی مملکت کے سربراہان میں نظر نہیں آتی۔ سب کے سب اپنی ذاتی خواہشات اور نام نہاد عوامی امنگوں پر حکمرانی کرتے نظر آتے ہیں۔ سب چھوڑیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی قابلیت پر کسے شک ہے؟ مگر ہماری نااہلی کی بدولت پوری دنیا میں بدنام ہو گئے۔ اس کے بعد چودھری عامر شہزاد کا مکتوب پڑھا۔ خط کیا تھا تابڑ توڑ حملے تھے۔ آپ نے جن علاقوں کی سیکیورٹی کا ذکر کیا تو جناب اس میں کوئی شک نہیں، ان علاقوں کو سیکیور کرنا جان جوکھوں میں ڈالنے والی بات ہے۔ ہماری آئی ایس آئی کا شمار دنیا کی بہترین، قابلِ اعتماد اور قابلِ فخر ایجنسیوں میں ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا آج سے تین سال قبل اسی ماہ یعنی اپریل کی 7 تاریخ کو سیاچن کے گیاری سیکٹر میں بٹالین ہیڈ کوارٹر پر برفانی تودا گر گیا تھا۔ کیمپ میں اس وقت 135 لوگ موجود تھے۔ کیمپ میں کرنل، میجر، کیپٹن بھی موجود تھے۔ یہ 2012ء کا ایک عظیم سانحہ تھا۔ 135 لوگ برف کی 80 فٹ موٹی قبر میں دفن ہو گئے تھے۔ پوری قوم اس عظیم سانحے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دوسروں کا پتا نہیں۔ میری اپنی کیفیت کیا تھی؟ میں اس وقت تک دعا کرتا رہا جب تک فوجی جوانوں کے جسدِ خاکی نہ مل گئے۔ ہماری سانس اور آس پاک فوج کے ساتھ ہے۔ ان کی بہادری کی بدولت ہم لوگ آزادی کی سانسیں لے رہے ہیں۔ ورنہ بھارت ایٹمی طاقت بننے کے بعد ہمیں کچا چبانے کے لیے تیار تھا۔ اب ہلکا پھلکا تبصرہ تحریروں پر بھی کر لیا جائے۔ ”چار روحوں والا“ انجیلو مصور کم مجسمہ ساز کمال کا تھا۔ سنس کرت کے حوالے سے مضمون پہلی بار پڑھا۔ میرا شمار بھی سنس کرت پڑھنے والوں میں تھا۔ معلوماتی تحریر تھی۔ ماہِ موسم بہار میں اپنی پسندیدہ شخصیات کا مطالعہ کیا۔ باقی چھوڑ دیں۔ انور فرہاد کی تحریر نہیں پڑھی۔ خالد صاحب کی تحریر دلچسپ تھی۔ شیر اور چیتے کا شکار جان جوکھوں میں ڈالنے والا کام ہے۔ معمولی غفلت انسان کو موت کے منہ میں لے جا سکتی ہے۔ ڈارون کے سفر کا تذکرہ اک نیا باب تھا۔ منظر امام نے دنیا کی دیواروں کی سیر کروائی۔ شاعرانہ انداز نے تحریر کو چار چاند لگا دیے۔ مریم خان صاحبہ کا مضمون ہو، میں کیسے نہ پڑھتا۔ کمال کی تحریر تھی۔ ایسی سرنگوں میں جانے کا مطلب سیدھے سادھے خودکشی ہے۔ کسی شے کی کھوج لگانا کتنا مشکل ہے تحریر پڑھ کے اندازہ ہوا۔ ”چندا ماموں“ پڑھ کے بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ تحریر دل کو لگی۔ اموشنل انٹیلی جینس تحریر پوری سمجھ نہ آئی۔ ”خواب“ مضمون بھی قابلِ تعریف تھا مگر بندے کو حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ سچ بیانیوں میں ”ضدی“ بہت پسند آئی۔ جس طرح کا آغاز تھا۔ اختتام بالکل اس کے برعکس ہوا۔ بلاشبہ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے واقعات جنم لیتے ہیں۔ پھر افسانہ اور ناول پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ”شناخت“ پسند نہیں آئی۔ ”نہ خدا ملا“ پڑھی، منٹو نے کہا تھا ”عورت کبھی محبت نہیں کرتی اور جب کرتی ہے تو اپنا سب کچھ فنا کر دیتی ہے۔“ اس قول کی تفسیر مجھے اس سچ بیانی میں نظر آئی۔ ”قصہ درد“ پڑھ کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بہت دکھی سچ بیانی تھی۔ ”ساون“ نے تو رلا دیا۔ یتیمی کا زخم بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ”انا پرستی“ میں بہت سے اسباق پوشیدہ تھے۔ پڑھے لکھے والدین کا اپنی اولاد پر وحشیانہ تشدد یقیناً ایک زیادتی ہے۔ بچے اسی طرح احساسِ محرومی کا شکار ہوتے ہیں۔ ”تیسرا کون“

میں معاشرے میں ایک اور کریہہ جرم کا راز کھلا۔ شیطانیت کس حد تک آگے جاسکتی ہے یہی کچھ اس سچ بیانی میں دیکھنے کو ملا۔ ''بہکے قدم'' سچ بیانی محبت اور نفرت کا مجموعہ تھی۔ ''سیاست'' پڑھ کے ہنسی آگئی۔ کس کس جگہ یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔''

☆ رانا محمد سجاد کا خلوص نامہ مظفرگڑھ سے۔ ''سدرہ بانو ناگوری صاحبہ علی سفیان آفاقی کا تذکرہ کررہی تھیں۔ واقعی ان کی کمی کوئی پوری نہیں کرسکتا۔ اعجاز حسین صاحب کا جامع تبصرہ بھی موجود تھا۔ سید انور عباس حاضر تھے۔ جناب کیسے ہیں آپ؟ چودھری عامر شہزاد کا جذباتی خط موجود تھا۔ پاک فوج کے بارے میں جو آپ کے جذبات ہیں وہی پوری قوم کے ہیں۔ محمد سلیم قیصر، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، منشی محمد عزیز اور اویس شیخ کے خطوط زبردست تھے۔ طاہرہ گلزار اپنے خط کے مختصر کرنے پر احتجاج ریکارڈ کرا رہی تھیں۔ ارباز خان کے ذریعے شاہد جہانگیر کا پتا چلا۔ رب تعالیٰ جلد از جلد صحت یابی عطا فرمائے۔ سرگزشت میں شامل ہونے کے لیے اس بار خط جلدی لکھ رہا ہوں۔ ''مینا کماری'' کے بارے میں انور فرہاد کا پُراثر مضمون پڑھا۔ بہت دلچسپ تھا۔ واقعی مینا کماری کی اداکاری ایسی ہی تھی۔ فلم پاکیزہ دیکھی ہے خوب صورت اداکاری نے اس فلم کو بھارتی تاریخ کی ایک یادگار فلم بنا دیا ہے۔ کمال امروہوی پر افسوس ہوا۔ فلم میں اتنے ہمدردانہ جذباتی مناظر لکھنے والے دوسروں کی زندگیوں کو پیش کرنے والے، ناانصافی پر بڑے بڑے ڈائیلاگ لکھنے والے خود کتنے ناانصاف رہے۔ افسوس ہوا یہ سب پڑھ کر کچھ عرصہ قبل غالباً سرگزشت میں کمال صاحب کی بیٹی کے تاثرات تھے اور وہ اپنے والد کو بے قصور قرار دے رہی تھیں۔ خدا جانے کون سی بات درست تھی۔ ماہ موسم بہار میں ہم سے بچھڑنے والوں کا تذکرہ خوب رہا۔ اب کی بار شمارہ بہترین رہا۔ سرورق کی، کچھ عرصے سے جنتی شخصیات پر پڑھائیں محسوس ہوتا ہے کہ ساجد امجد صاحب جلد از جلد اس شخصیت پر مضمون مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ وزیر آغا صاحب کے بارے میں آپ سے فرمائش کی تھی کہ کوئی تحریر شائع کیجیے گا اور اداکاراؤں پر بھی سلسلہ شروع ہونا چاہیے (کوشش ہے کہ ہر ماہ کسی ایک پاکستانی یا کسی اور ملک کے اداکار کی مکمل سرگزشت دی جائے)۔''

☆ محمد احمد رضا انصاری کا پیام، کوٹ ادو سے۔ ''میرا پہلا خط شائع کرنے کا شکریہ۔ بچوں کے رسالوں میں تو میرے بہت خط شائع ہوئے لیکن بڑوں کے کسی رسالے میں پہلی مرتبہ جگہ ملی۔ اپریل کا سرگزشت تیس تاریخ کو ملا۔ سرورق بہترین تھا۔ اداریہ پڑھ کر سب سے پہلے ''شہر خیال'' میں پہنچے۔ سدرہ بانو ناگوری کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ سید انور عباس شاہ آپ کا تبصرہ بھرپور تھا۔ شاہد جہانگیر شاہد کو خدا تعالیٰ جلد صحت یاب کرے (آمین)۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ خلاشناس، چار روحوں والا، دیواریں، پھندا اور چندا ماموں بہت اچھی تحریریں تھیں۔ پہلی سچ بیانی کچھ فلمی سی لگی۔ بھائی کا بستر مرگ پر سچ بتانا اور دم توڑ دینا۔ ''ساون'' کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی باقی تحریریں نہیں پڑھیں۔ انکل جی آپ علمی آزمائش میں شخصیت والا سلسلہ ختم کردیں اس کی جگہ کوئی دوسرا سوال و جواب والا سلسلہ شروع کردیں (آپ ہی کوئی مشورہ دیں جس میں قارئین کی شمولیت لازمی ہو)۔''

☆ سید انور عباس شاہ کا دریا خان بھکر سے تحفہ۔ ''پچھلے دنوں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جن کا کہنا تھا کہ ایک زمانے میں وہ ماہنامہ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ میں کتابت کرتے تھے۔ انہوں نے رسالوں کی تیاری کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ واقعی یہ ایک پیچیدہ اور محنت طلب کام ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی انتھک محنت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انکل معراج کیسے آدمی ہیں تو انہوں نے وہ بات کی جو پہلے ہی سے ہمارے دل و دماغ میں تھی۔ انہوں نے کہا کہ معراج رسول صاحب تو بہت ہی عظیم انسان ہیں۔ ''شہر خیال'' میں سدرہ بانو ناگوری اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کی حقدار ٹھہریں۔ اعجاز حسین سٹھار کا تبصرہ بھی بہت دلکش اور خوب صورت تھا۔ واقعی علی سفیان آفاقی کی کمی ہمیں بہت شدت سے محسوس ہوتی رہے گی۔ قیصر عباس خان اپنا خوب صورت تبصرہ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد لے کر حاضر ہوئے۔ بھئی کہاں تھے آپ؟ نزاہت افشاں اور چودھری عامر شہزاد نے بھی خوب لکھا۔ محمد سلیم قیصر واقعی ہم قارئین ایک خاص رشتے سے منسلک ہیں۔ قارئین سے آپ کی اس قدر چاہت دل کو بھلی لگی۔ خداوند کریم آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور وہ دن جلد آئے جس دن ہم آپ کے خط میں سینٹرل جیل کا لفظ نہ پڑھیں۔ اس کے علاوہ خیام پیرزادہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی محمد عزیز مے، اویس شیخ، احمد خان توحیدی کے خطوط بھی شاندار تھے۔ طاہرہ گلزار عرف باجی گل بھرپور تبصرے کے ساتھ ''شہر خیال'' پر چھا گئیں۔ جن عظیم ہستیوں کے بچھڑنے کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کا ہمیں بھی بے حد دکھ ہوا تھا۔ معزز ترین ہستی جناب شاہد جہانگیر شاہد کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں پڑھ کر دل کو ایک شاک سا لگا۔ دل بہت

افسردہ ہوا۔ خداوند کریم ان کو جلد از جلد صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین)۔ ارباز خان سے گزارش ہے کہ وہ ان کی تازہ صورتِ حال سے ضرور مطلع فرمائیں (ابھی ابھی شاہد جہانگیر شاہد کے صاحبزادے کا فون آیا ہے کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔ قارئین کو بھی شکریہ کہا ہے کہ انہوں نے صحت یابی کی دعا کی)۔ سیاست، دفتری معاملات پر مبنی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ اس سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ آدمی کو اپنے کام میں Expert ہونا چاہیے کیوں کہ کام ہی سے آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ ''بہکے قدم'' ایک بے حد دکھی تحریر تھی۔ اریبہ کے ساتھ کافی ظلم اور زیادتیاں ہوئیں۔ عالیہ نے تو اپنی طرف سے اریبہ کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن مثل مشہور ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔ خدا کرے اب اریبہ کی زندگی میں سکون آگیا ہو اور وہ چین سے اپنے بال بچے کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہو۔ ''تیسرا کون'' کا انجام بہت ہی بھیانک ثابت ہوا۔ ماہ موسم بہار یعنی اپریل کے بارے میں معلومات نے تو رسالے کو چار چاند لگا دیے۔ مصنف کا اسپیشل شکریہ۔ ''نہ خدا ملا'' تحریر سبق آموز تھی۔ ثمینہ نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ خدا تمام بہنوں کو بھٹکنے سے محفوظ رکھے۔ ''شناخت'' ایک بہت ہی دلچسپ اور بار بار پڑھنے کے لائق تحریر تھی۔ ایک بے مقصدی بات پر شہریار کا کافی مالی نقصان ہوا جس کام پر اس نے لاکھوں روپے خرچ کیے وہ کام مفت میں بھی ہو سکتا تھا۔ اس کہانی سے ہمیں یہ بھی سبق ملتا ہے کہ محنت ہی میں عظمت ہے۔ دنیا میں ایسے غریب ترین انسان بھی گزرے جنہوں نے کسی قسم کی سہولت میسر نہ ہونے کے باوجود بھی صرف اور صرف انتھک محنت سے عظیم رتبے حاصل کیے اور اپنے آپ کو منوایا۔ ''ضدی'' بھی ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ ''چندا ماموں'' بھی ایک دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تحریر تھی۔ چاند کے متعلق ایک دلچسپ بات میں بھی بتاؤں کہ چاند کی سطح پر کھڑے ہو کر آپ زمین کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو اوپر دیکھنا پڑے گا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ کو اور تمام قارئین کرام کو پُرخلوص سلام۔''

☆ قیصر خان کی بھکر سے آمد۔ اداریہ پاکستان کے استحکام کے بارے میں تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت میں رکھے اس خوب صورت پاکستان کو۔ شاہد جہانگیر شاہد صاحب کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور بہت جلد صحت یاب و تندرست کرے (آمین)۔ باقی سارے دوستوں کے تبصرے مزے دار تھے۔ شگفتہ مشتاق صاحبہ کو اللہ تعالیٰ تمام مشکلات سے نجات دے (آمین)۔ بہت سے نئے دوست اچھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے لیکن خیام پیرزادہ تو بہت گرم تھے جناب آپ کی خام خیالی ہے جنگ کی، ہر بندہ اپنی اپنی رائے دے رہا ہے، دے سکتا ہے جیسا کہ آپ نے دی ہے۔ باقی آپس میں جنگ نہیں ہوگی آپ بے فکر رہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے کزن کے بیٹے کا ایک بار پھر افسوس کا اظہار کروں گا کہ خط چھپ نہ سکا۔ ''ضدی'' وہ ضدی تھا ضرور لیکن احساس کا جذبہ تھا اس میں، اللہ اس کی مغفرت کرے۔ ''شناخت'' ایک بے وقوف بندے کی خوب صورت کہانی؟ ''نہ خدا ملا'' ہمارے بھکر سے لکھاری محمد عارف قریشی صاحب کی کہانی پڑھنے کو ملی۔ خوب صورت نام ہے، نہ خدا ملا۔ پتا نہیں یہ عشق ہے یا ہوس کہ وہ اپنا ہنستا بستا گھر اجاڑ کر محبت پانے کو چلی، بدعقل عورت۔ ''بہکے قدم'' ایک نفسیاتی سچ بیانی ہے بس اتنی التجا ہے کہ کبھی کوئی ایسے کیس کو ایزی نہ لے۔''

☆ ایم انور باڑی چم سیرے ہوتی مردان سے رقم طراز ہیں۔ ''پہلی فرصت میں ''شہر خیال'' کی سیر کے لیے عینک درست کی اور صدارت کی کرسی پر اس شخصیت کی زیارت کی جس کا ذکر اکثر آفاقی صاحب کرتے تھے۔ آہ! آفاقی صاحب واقعی آفاقی شخصیت تھے۔ عبقری مزاج اور درست عقیدے اور مرنجاں مرنج مرد تھے۔ خداوند عظیم وجلیل انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ عموماً فلمی دنیا سے متعلقہ لوگوں کو بہت کم لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیوں کہ ان کا ہیولائی تصور، ناگفتنی کے چوراہے پر منڈلاتی نظر آتی ہے لیکن آفاقی صاحب کی طرف نگاہ اگر اٹھتی بھی ہے تو عزت وتکریم کی نگاہ ہوتی ہے۔ ''شہر خیال'' کے اکثر باسی اور سیاح سنجیدہ طبیعت کے مالک نظر آتے ہیں۔ سرگزشت مجھے بہت دیر سے ملا اسی لیے تبصرہ نہیں کر سکتا۔ ہاں ایک تجویز ہے کہ رسالے کے اوّلین صفات پر رنگین اشتہارات ہوتے ہیں اگر یہ آخری تین چار صفحات پر بھی ہوں تو سونے پر سہاگہ ہوگا۔''

☆ آصف ضیا، لطیف آباد حیدر آباد سے مرقوم ہیں۔ ''آج پھر اپنی ایک تحریر ''انداز بیاں'' لے کر آپ کی بزم میں حاضر ہوں۔ پسندیدگی کی صورت میں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر ممنون فرمائیے گا۔ سرگزشت والوں کی خدمت میں میرا سلام حاضر ہے۔''

☆ احسان سحر میانوالی سے لکھتے ہیں۔ ''پہلی مرتبہ اپنے ایک جاننے والے بزرگ کی سچ بیانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ دشمنی ایک ایسا زہر ہے جو نسلوں کو برباد کر دیتی ہے اور رقابت کی دشمنی تو سب سے خطرناک ہے۔ اس سچ بیانی میں بھی آپ کو کچھ ایسا ہی ملے گا۔ اُمید کرتا ہوں پڑھنے والے سبق ضرور سیکھیں گے۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار کا مراسلہ نور پور تھل سے۔ ''پہلے جب پرچہ ہاتھ میں آتا تھا تو سب سے پہلے ''فلمی الف لیلہ'' پر نظر جا ٹھہرتی تھی اور پورا مضمون ایک نشست میں پڑھ کر دم لیتے تھے۔ اب وہ راتیں گزر گئیں۔ کتنا عجیب لگتا ہے یہ مجبوری ہے عادتیں بدلنا پڑیں گی لیکن ایک تشنگی رہے گی۔ ''ماہ موسم بہار'' غیر متوقع طور پر دلچسپ رہا بلکہ معلومات کا خزانہ ثابت ہوا اور یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ''مینا کمال'' نے کسی حد تک فلمی الف لیلہ کی کمی پوری کی ہے۔ کمال امروہوی کا بڑا نام ہے لیکن مینا کی حد تک انہوں نے بڑی ناانصافی سے کام لیا ان کی کسمپرسی کی حالت میں موت کا بے حد افسوس ہوا۔ ''سراب'' تسلسل کے ساتھ اور انتہائی دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہی ہے اس لیے ختم کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ سچ بیانیوں میں ''ضدی'' اوّلین تحریر ہے۔ کامران کی خود پسندی، ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے کافی ٹینشن میں تھے لیکن انجام پڑھ کر دل دکھی ہو گیا۔ انسان کے کتنے منصوبے ہوتے ہیں لیکن اوپر فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اس لیے کمزور اور بے بس لوگوں کی دل آزاری سے بچنا چاہیے۔ ''شناخت'' مزاح کے رنگ میں ایک نقطہ سمجھایا گیا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کے خطبہ میں یہ واضح بیان کیا تھا کہ اپنا نسب چھپانے والا انتہائی گناہ کا مرتکب ہوگا۔ واقعی بزرگوں کا جو پیشہ رہا ہو انہوں نے حلال اور محنت کی کمائی سے ہماری نشوونما کی اور ہم اعلیٰ عہدوں اور باعزت مقام پر پہنچے۔ ''نہ خدا ملا'' میں ثمینہ دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کر رہی ہیں۔ خود یونیورسٹی میں پڑھتی رہیں لیکن شخصیت کی تعمیر نہ ہو سکی اور تین معصوم بچوں کے ساتھ پانچ سالہ ازدواجی زندگی کو لات مار کر ایک ملک زادہ پر دل ریجھ گئی۔ اگر کسی معمولی کاشت کار کا انتخاب کرتی تو اسے محبت مان لیتے لیکن یہ تو سید ھا وسیع جائیداد اور ظاہری جاہ و جلال کو تنخواہ دار شوہر پر فوقیت دی۔ ''قصہ درد'' میں ملک صاحب کے رویہ بدلنے پر حیران بیٹھا ہوں۔ ان کی اصول پرستی اور غریب پروری میں کسی کو شک نہ تھا لیکن وہ بھی بیٹے کی باتوں میں آگئے۔ ''ساون'' صرف مسلمانوں کے جذبات جگانے، حقیقی راہ دکھانے اور ذمہ داری کا احساس دلانے کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ ساون محض ایک علامتی کردار ہے لیکن ہم جن جھمیلوں میں الجھے ہیں یہاں سے نکل پائیں گے تو صحیح سمت چلنے کا خیال آئے گا۔ بھلا کسی کو کیا پڑی ہے کہ خوامخواہ میں جھنجٹ گلے میں ڈالے ہم جیسے بھی ہیں روز و شب کے معمول سے باہر نہیں آنا چاہتے پھر تن آسانی ہمارا اوڑھنا بچھونا ٹھہرا۔''

☆ مجید احمد جائی نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''اداریہ پڑھا۔ بجا فرما رہے ہیں لیکن کیا کریں اب تو ہر شعبے میں دہشت گرد دندنا رہے ہیں۔ اپنوں میں چھپے دشمن پاک وطن کی بقاء کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اور اپنے ہتھکنڈے آزماتے رہتے ہیں۔ خوب آدمی، ایک صفحے میں مکمل جانکاری دینا کوئی آپ سے سیکھے۔ شیخ محمد ابراہیم کے بارے میں پڑھ کر اش اش کر اٹھے۔ ''شہر خیال'' کی وادی میں قدم رکھا تو سدرہ بانو ناگوری کو صدارت کی کرسی پر براجمان پایا۔ اعجاز حسین سٹھار خوب فرما رہے تھے۔ سید انور عباس شاہ آپ کی بات بھلی لگی۔ پاکستانی تاریخ میں تحقیق، تفتیش سے آگے کوئی جاتا ہی نہیں ہے۔ قائداعظم کی ایمبولینس کا واقعہ، محترمہ بے نظیر بھٹو کا قتل، لیاقت علی خان کا قتل اور اب منی لانڈرنگ کیس اور ان جیسے ہزاروں واقعات تفتیش سے آگے بڑھ ہی نہیں سکے۔ چودھری عامر شہزاد، محمد سلیم قیصر، غلام حسین ضیا، خیام پیرزادہ، آفتاب احمد، نصیر اشرفی، اویس شیخ، احمد خان توحیدی، شگفتہ مشتاق، شہزاد احمد خان، انجم فاروق ساحلی۔ فیروز علی عاجز، محمد حمزہ، سہیل احمد عباسی، ارباز خان، محمد عارف قریشی کے تبصرے شاندار تھے۔ منشی محمد عزیز مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار سدا رخوش رہیں۔ شاہد جہانگیر شاہد کے ایکسیڈنٹ کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ صحت کی بادشاہی اور اپنی رحمت کے سائے تک خوش و خرم رکھے (آمین)۔ خیریت سے آگاہ ہی دیجیے گا۔ ہمارا لیٹر جو کہ ای میل کیا گیا تھا نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر رہ گیا۔ ''شہر خیال'' سے نکلتے ہی اپنے پسندیدہ سلسلے سچ بیانی میں پہنچا۔ ''تیسرا کون'' میں مصنف کے اس جملے سے میں اتفاق نہیں کرتا ''سخت مزاجوں کے چہرے بتا دیتے ہیں کہ اندر سے کتنے بے رحم ہوں گے۔'' سخت مزاج نرم دل ہوتے ہیں، نہ کہ بے رحم۔ جہاں تک ماسٹر نسیم کی بات ہے تو ہوس پرستی انسان کو شیطان بنا دیتی ہے۔ ''شناخت'' میں شہریار نے بہت خوب صورت پیغام دیا۔ ویلڈن اور جو وکیل کا کردار پیش کیا وہ آج کل کے جدید دور میں سرعام ہے۔ کالے کوٹ، کردار کے بھی کالے ہوتے ہیں۔ ''نہ خدا ملا'' محمد عارف قریشی، ایسی عورتوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کہتے ہیں عورت ہی گھر کو جنت اور

جہنم بناتی ہے۔ ثمینہ نے خود ہی اپنی زندگی برباد کرلی۔ ''قصہ درد'' پروفیسر ڈاکٹر نرگس وقار، عیان جیسے ناسور ہمارے گلی، محلوں میں آزادانہ گھومتے ہیں۔ جاگیردار دولت کے نشے میں غریبوں کو کچل رہے ہیں۔ نہ ان کی عزتیں محفوظ ہیں نہ وہ آزادانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم آزاد وطن میں بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ''ضدی'' سرورق کہانی زبردست تھی اور شمارے کی جان تھی۔ اس کے بعد ساون، انا پرستی، سیاست، بہکے قدم بھی خوب رہی۔ ''سراب'' کامیابی کی منزلیں طے کرتی آگے بڑھ رہی ہے۔ ''دیواریں'' منظر امام کا شکریہ جو معلومات فراہم کرتے ہیں۔ فلم نامہ، مینا کمال، کمال کی تحریر تھی۔ ''چندا ماموں'' چاند کے متعلق دل چسپ حقائق دے رہی تھی۔ ''خواب'' خواب تو ہر چھوٹا بڑا دیکھتا ہے۔ شکر خداوندی ہے کہ خواب دیکھنے پر پابندی نہیں ہے۔ ''ماہ موسم بہار'' موقع کی مناسبت سے تحفہ خاص تھی۔ باقی کی کہانیاں ابھی پڑھنی باقی ہیں۔ محترم میں ایک آپ بیتی ای میل کرچکا ہوں۔ دل درد کا سمندر کے نام سے (یہ سرگزشت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں)۔ ''بیت بازی'' میں نسیم منظر، فصیح بخاری، جاوید الحسن، احمد ترین، قمرالحسن، فدا حسین طوری کے جواب پسندیدہ تھے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت اور اس کے باسیوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے (آمین)۔''

☆ حبیب الرحمٰن نے لاہور جیل سے لکھا ہے۔ ''ہماری حکومت بجلی کے بحران کو حل کرنے کے روزانہ نت نئے طریقے تلاش کرتی رہتی ہے اور توانائی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے دوسرے ممالک سے مدد مانگ رہی ہے۔ اس توانائی کے بحران کا مسئلہ میں باآسانی حل کرسکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا پلانٹ بنا سکتا ہوں۔ بجلی ہماری مین چیز ہے اگر ہم بجلی سستی کرلیں تو ہماری تمام چیزیں سستی ہوجائیں گی کیوں کہ تمام اشیاء یا مشینری بجلی سے ہی چلتی ہیں۔''

☆ شگفتہ مشتاق نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت بیک وقت معلوماتی اور تفریحی رسالہ ہے۔ پہلی مرتبہ انکل سفیان آفاقی کی کسی تحریر کے بغیر رسالہ کچھ عجیب سا لگا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ ''ماہ موسم بہار'' ہر ماہ کی مناسبت سے یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ''دیواریں'' بے حد معلوماتی تحریر تھی۔ ''چندا ماموں'' بہت دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ نیوٹن کے بارے میں پہلی مرتبہ اتنے تفصیلی انداز میں معلومات ملیں۔ سچ بیانیوں میں ''ساون'' پہلے نمبر پر رہی۔ ایک معذور بچے کی نظر سے ہمارے رویوں اور نام نہاد مسلمانی کا بالکل ٹھیک تجزیہ کیا گیا۔ ہم اسلام کی سنہری تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ''ضدی'' میں کامران کا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ غلط رویہ کی ذمہ داری ان کے والدین کی تھی۔ اولاد میں فرق نہیں کرنا چاہیے۔ باقی سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں۔''

☆ منشی محمد عزیز نے لندن سے لکھتے ہیں۔ ''امجد اسلام امجد نے کہا تھا ''دل میں کتنے عہد باندھے تھے بھلانے کے اسے۔ وہ جب ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا۔'' امجد صاحب نے تو نہ جانے کس ذات شریف کی خاطر یہ شعر کہا ہوگا لیکن میں یہ سرگزشت کے لیے گنگناتا رہتا ہوں۔ جی ہاں عمر کے اس حصے میں اب گنگنانا بھی شروع کردیا ہے۔ سچ کہوں سرگزشت نے مجھے ایک دم اتنا ''دولت مند'' کردیا ہے کہ کچھ لوگ مجھ سے جیلس ہونے لگے ہیں۔ لاہور سے اسلام آباد اور کراچی سے پشاور تک میرے بہت ہی اچھے اور پیارے دوست رہتے ہیں اور یہ مملکت خداداد مجھے پہلے سے بھی خوب صورت لگنے لگا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جارہی ہے اور محبتوں کا یہ سلسلہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ گڑیا رانی سدرہ بانو ناگوری اس ماہ مسند صدارت پر تھیں، مبارک باد۔ نزابت افشاں! آپ کی لائبریری کی تو زیارت کرنا چاہیے۔ شگفتہ مشتاق کے لیے دعا گو ہیں۔ سہیل احمد عباسی! اب دیکھیے ناصر حسین رند، عبدالرؤف عدم کے ساتھ اس ماہ رانا محمد شاہد، بشریٰ افضل بھی غیر حاضر تھے۔ اللہ تعالیٰ سبھی کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ شاہد جہانگیر شاہد کی درازی عمر اور صحت یابی کے لیے خصوصی طور پر دعا گو ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ اور عمر خضر عطا فرمائے (آمین)۔ سدرہ بانو ناگوری، سید انور عباس شاہ، احمد خان توحیدی، طاہرہ گلزار، انجم فاروق ساحلی کے خطوط تبصرے سے بھرپور تھے۔ اداریے میں انکل محترم دشمن کی کارستانیوں سے آگاہی دے رہے تھے۔ ''خلا شناس'' میں سر آئزک نیوٹن کے ابتدائی حالات زندگی کا پڑھ کر حیرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے کام نرالے ہیں کہ وہ بچہ جس کی صحت وعمر کے حوالے سے اس کے والدین تک مایوس تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتنی شہرت عطا کی۔ محترم شکیل صدیقی نے مائیکل انجلو کے حالات زندگی کا بہت خوب صورتی سے احاطہ کیا۔ محمد ایاز راہی قدیم ترین زبان سنسکرت کے حوالے سے مختصر مگر جامع مضمون کے ساتھ حاضر تھے۔ ماہ موسم بہار کے سلیم الحق فاروقی کیا وہی والے سلیم فاروقی ہیں یا کوئی اور (یہ اور

ہیں) بہرحال مضمون بہترین تھا موسم کے حوالے سے۔ ویلڈن محترم انور فرہاد صاحب! کیا کمال کی جوڑی لائے ہیں مینا کمال کی اینا کماری شاعرہ بھی تھیں، اس بات کا پتا ان کی نظمیں پڑھ کر چلا۔ ایک چھوٹی سی چھلانگ لگا کر منظرامام کی دیوار تک جا پہنچے۔ میرا مطلب ہے مضمون دیواریں تک جن میں محترم لکھاری نے دنیا بھر کی مشہور دیواروں پر مفصل مضمون لکھا ہے۔ شیراز خان خوابوں کے حوالے سے اچھا مضمون لائے ہیں۔ ہم نے تو پڑھا ہے کہ خواب نبوت کا چھیالیس واں حصہ ہوتے ہیں۔ مقابلہ بیت بازی میں نزہت افشاں، روفی بانو، نعمان مصطفیٰ اور نزابت پروین کا۔ انتخاب پسند آیا۔''

☆ ناصر حسین رند کا مکتوب بہاولپور سے۔ ''آپ کا لاجواب اظہاریہ پڑھا اور دل کی گہرائیوں سے دعا نکلی کہ رب العزت آپ کو اپنی امان میں رکھے (آمین)۔ اللہ تعالیٰ نے شب قدر کو جو نعمت ہمیں عطا فرمائی اس کی حفاظت بھی صرف وہی کرسکتا ہے۔ ''چار روحوں والا'' شکیل صدیقی کی کہانی کمال کی تھی۔ ''مینا کمال'' فلمی الف لیلہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے سرگزشت میں شامل کی گئی۔ خوب رہی ''دیواریں'' اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف تھی۔ ''چندا ماموں'' چاند کے متعلق منیر خان کی بہترین، شاندار لیکن مختصر تحریر تھی۔ ''خواب'' شیراز خان کی معلومات سے لبریز تحریر تھی لیکن یہ بھی مختصر تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے انسان عالم خواب میں ہے مرے گا تب جاگے گا۔ سلور جوبلی کی تیاری زوروشور سے جاری ہے اس کی تجویز ہمارے لیے ایک اعزاز ہے۔ اس کی بہتری کے لیے تھوڑا سا اضافہ کرتے چلیں کہ اگر سلور جوبلی کا ٹائٹل انفرادیت لیے ہوئے ہو اس کے صفحات میں اضافہ کردیں، چاہے قیمت بڑھا دیں۔ دوسرا اس میں بھکر کے نواحی علاقے دریا خان کے قصبہ کہاوڑ کلاں کے آدم خوروں کا واقعہ۔ بھکر کے آدم خوروں کی معلومات آپ کو سید انور عباس شاہ اور قیصر خان دے سکتے ہیں۔ ان دونوں واقعات کا چرچا 2012 کو اخباروں اور میگزینوں میں بھی رہا ہے۔ کسی سسپنس اور پُراسرار تحریریں لکھنے والے سے یہ تحریریں لکھوایے گا۔ ورنہ مزا کرکرا ہوجائے گا۔''

☆ فیروز علی عاجز گل آباد بنگی ضلع چارسدہ سے رقم طراز ہیں۔ ''سرگزشت کا شمارہ چار پانچ چکر کاٹنے کے بعد فیض نیوز ایجنسی سے آنکھوں کے سامنے آیا۔ ہم نے وہیں کھڑے ہوکر اپنا خط دیکھ لیا۔ میں تو خوشی سے نہال ہوگیا۔ خطوط میں طاہرہ گلزار، سید انور عباس شاہ، اعجاز حسین سحار کے خطوط اچھے لگے۔ کہانیوں میں پہلے نمبر پر ''خلاشناس'' رہی۔ دوسرے نمبر پر ''سراب'' پڑھی۔ شہباز ملک پھر ڈیوڈ شاہ کے قبضے میں پہنچ چکا ہے اور خطرناک مہم پر روانہ ہوگیا ہے۔ ''دیواریں'' معلوماتی تحریر تھی۔ ''مدھیہ پور کا چیتا'' شکار کے بارے میں اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ سچ بیانیوں میں ''ضدی'' اور ''سیاست'' پڑھی باقی ابھی پڑھی نہیں ہیں۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کی کراچی سے آمد۔ ''اداریہ پڑھ کر ہاتھ بے اختیار پاک فوج کی سلامتی کے لیے اٹھ گئے۔ انکل آپ نے درست فرمایا کہ اس وطن میں سازشوں کا جال وسیع تر ہوگیا ہے۔ ہم خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں لیکن یہ وطن بھی ہمیں یونہی تھالی میں سجا سجایا نہیں مل گیا تھا۔ یہ پیارا وطن تو شہیدوں کے لہو اور لاکھوں قربانیوں کا ثمر ہی تو ہے کہ عظیم ماؤں کے لاڈلے اور بہادر سپوت اپنا آپ بھلا کر اس وطن کی حفاظت میں جتے ہوئے ہیں۔ ہماری پاک فوج کے جوان اور لیاقت علی خان کے یہ آخری الفاظ کہ خدا پاکستان کی حفاظت کرے دشمنوں پر ایسا ضرب لگائیں گے کہ وہ اپنی پہچان بھول جائے گا۔ ہم نہیں تو ہماری آنے والی نسلیں امید سحر طلوع ہوتے دیکھیں گی۔ خدا نے چاہا تو صبح قیامت تک یہ وطن قائم دائم رہے گا۔ ''شہر خیال'' میں صدارت کی کرسی حاصل کرکے اچھا لگا۔ ابو نے جب مجھے میسج کرکے بتایا کہ تمہارا خط پہلے نمبر پر آیا ہے تو میں نے کہا اوہ تو ابو آپ بھی اپریل فول منا رہے ہیں؟ عامر شہزاد بھائی آپ نے میرا خط پسند کیا شکریہ لیکن آپ نے جو باتیں لکھی ہیں ان کے جواب میں ہمارے پاس خاموشی ہے۔ فقط خاموشی ہم بولنے کا حق نہیں رکھتے لیکن خاموشی پر اختیار ضرور رکھتے ہیں۔ طاہرہ باجی ایک بات آپ کی ہمیں سمجھ نہیں آئی آپ نے لکھا ہے کہ آپ کو زیڈ اے بھٹو کی پھانسی پر شاک لگا تھا۔ آپ کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس وقت 10 سال کی تھیں۔ 10 سالہ بچی کے لیے شاک؟ کچھ عجیب سا نہیں لگتا جب کہ اس وقت میڈیا بھی آج کی طرح طاقت ور نہیں تھا۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات کی بھی بھرمار نہیں تھی۔ سہیل احمد عباسی، بھائی میں طاہرہ گلزار کے بارے میں آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہوں۔ اپریل میں ان کا خط پڑھ کر ہم تو سہم ہی گئے۔ پشاور کے شاہد جہانگیر شاہد بھائی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ خدا پاک جلد از جلد ان کو صحت یاب کرے (آمین)۔ طاہر الدین بیگ بھی آج کل ''شہر خیال'' میں شرکت نہیں کر رہے۔ شگفتہ صاحبہ رب تعالیٰ آپ کی مشکلات

آسان کرے، آمین۔ ’’خلا شناس‘‘ ڈاکٹر ساجد امجد کی لاجواب رہی۔ نصاب کی کتابوں میں نیوٹن کے بارے میں مختصر مختصر پڑھ رکھا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے بے حد شاندار تحریر لکھ کر ہمیں نیوٹن سے متعارف کروایا۔ ابن کبیر کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ انور فرہاد نے فلمی دنیا کی سیر کروائی گویا آفاقی انکل کی جدائی پر مرہم رکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ شکریہ فرہاد انکل اسی طرح وقتاً فوقتاً فلمی دنیا کی سیر کروادیا کریں۔ جانے والے کی یادیں تازہ ہوتی رہیں گی۔ سنا ہے کہ بھارت میں مینا کماری پر فلم بنانے کی تیاری کی جارہی ہے۔ منظر امام کی زبانی مشہور دیواروں کا تذکرہ اچھا لگا۔ ’’خواب‘‘ اچھی تحریر تھی۔ ہمارا تو خوابوں سے فقط اتنا تعلق تھا کہ ہم نیند کے زیادہ شوقین نہیں لیکن کچھ خواب نہ دیکھیں تو گزارہ نہیں ہوتا۔ لیکن انوکھے خوابوں کا تذکرہ ہمیں حیران کرگیا۔ ’’سراب‘‘ کا ٹیمپو انتہائی سست جارہا ہے۔ ڈیوڈ شا آخر اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر برف کے جہنم میں جا پہنچا اب دیکھیے کہ برف والا ڈیوڈ شا کا استقبال کس طرح کرتا ہے۔ پہلی سچ بیانی میں ’’ضدی‘‘ بھائی کی آخری خواہش نے اداس کردیا۔ انسان بھی عجب شے ہے جیتا ایسا ہے کہ کبھی مرنا ہی نہ ہو اور مرا ایسے جاتا ہے جیسے کبھی جیا ہی نہ ہو۔ ’’نہ خدا ملا‘‘ میں ثمینہ نے اپنا گھر برباد کر کے بڑی غلطی کی آخری تحریر عمدہ رہی ہمایوں وحید نے یہ جملہ درست ثابت کردکھایا کہ ہمت مرداں مدد خدا۔‘‘

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ’’31 مارچ کو سرگزشت ملا۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ انکل کی باتیں پڑھیں۔ ایک علمی سرگزشت میں ہمیں معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔ کرسی صدارت مبارک ہو جی سدرہ بانو ناگوری آپ نے کراچی کا نقشہ خوب کھینچا ہے۔ حقیقت میں تو یہی ہورہا ہے۔ سدرہ جی مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ محفل تو ہر طرح سے پذیرائی کرتی ہے۔ ہمارے تبصرے کی۔ ان کا شکریہ۔ نزاہت افشاں میرا مطلب تھا کہ میرے حلقے میں یا ملنے والوں میں یہ جذبہ نہیں ہے نہ ہی حوصلہ افزائی کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں نہ لکھا کرو۔ میں مرتو سکتی ہوں لکھنا نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ میری زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ کل میرے اسکول کا سالانہ رزلٹ تھا۔ اس کے بعد اسٹاف نے سیر و تفریح کا پروگرام بنالیا۔ ہم گریزن پارک گئے خوب انجوائے کیا۔ محمد سلیم قیصر آپ کی باتیں اچھی لگیں۔ کہانیاں پڑھنے کا ٹائم نہیں ملا۔ انشاء اللہ اگلے شمارے میں تبصرہ لکھوں گی۔‘‘

☆ عامر شہزاد چکسوئم شورکوٹ سے لکھتے ہیں۔ ’’شہر خیال میں مسند صدارت پر براجمان سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کا بزرگانہ بیان دل کو چھو گیا۔ اویس شیخ جی ہمارے پچھلے تبصرے کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ابھی میں ’’شہر خیال‘‘ میں اتنا پرانا نہیں ہوا ہوں کہ اپنے سینئرز کے تبصرے پر تنقید کرسکوں۔ طاہرہ گلزار جی کا تبصرہ بڑی عقلمندانہ باتوں کا جھرمٹ تھا۔ شکیل صدیقی صاحب کی ’’چار روحوں والا‘‘ اچھی کاوش تھی۔ ڈارون کا سفر، پھندا، چندا ماموں زبردست تحریریں تھیں۔ باقی ابھی پینڈنگ میں رکھا ہے تاکہ خط کے بعد پڑھ سکوں۔‘‘

☆ محمد عثمان آفریدی کی گڑھی نوبت خان پشاور سے آمد۔ ’’سرگزشت کا کافی عرصے سے قاری ہوں۔ ہر ماہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ مطالعے کی کچھ پیاس بھی بجھتی ہے اور معلومات میں اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔ سرگزشت اپنی مثال آپ ہے۔ میرے پاس کافی شمارے ہیں۔ دنیاوی گورکھ دھندوں سے فراغت کے بعد زیرِ مطالعہ رہتی ہیں۔ پہلی مرتبہ ایک مختصر مضمون ’’موت کی شعاعیں‘‘ کے نام سے جو کہ لیزر شعاع کے متعلق ہے کے ساتھ انٹری کررہا ہوں۔ امید ہے معیار پر پورا اترے گا۔ اگر شائع ہو جائے تو مزید کچھ لکھنے کی ہمت بندھ جائے گی۔ دعا ہے کہ سرگزشت کی ترقی کا یہ سفر جاری رہے۔ (اس پرچے سے فارغ ہوکر پڑھ لیا جائے گا اس انتظار میں نہ رہیں کہ ایک چھپے گا تو دوسرا بھیجوں گا بھیجتے رہیں)۔‘‘

☆ عبدالجبار رومی انصاری لاہور سے لکھتے ہیں۔ ’’سرگزشت کے ’’شہر خیال‘‘ میں یہ میری پہلی خیال آفرینی ہے، اُمید ہے ویلکم کیا جائے گا۔ پاک وطن میں ہر طرح کی دہشت گردی ختم کرنے کے لیے ضرب عضب کے کاری وار جاری ہیں اور اس کے بڑھتے ہوئے دائرہ کار کے مطابق کامیابیاں بھی حاصل ہورہی ہیں اور امن کے خواب کی جلد تعبیر دیکھیں گے۔ شہر خیال میں سدرہ بانو، کراچی کی حالت زار پر روشنی ڈالتے ہوئے سوگوار سی دکھائی دیں۔ علی سفیان آفاقی کو اللہ تعالیٰ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور اچھے لوگوں کا خلا کب پورا ہوتا ہے ہاں کہیں نہ کہیں ان کا عکس ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اعجاز حسین سنشار، سید انور عباس، عامر شہزاد، غلام حسین مینا کی اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ عزیزے اور اویس شیخ کے تفصیلی خط بھی اپنی مثال آپ تھے۔ احمد خان تو حیدی کیسے ہیں آپ؟ یہ الفاظ کا جادو ہی تو ہوتا ہے جو ہم بھی پڑھنے کے لیے کھنچے چلے آتے ہیں۔

طاہرہ گلزار بھی بہت حساس ہیں۔ لگتا ہے تبھی آپ کی آنکھیں بھی نمی سے سیراب رہتی ہیں۔ سوگواریت اور بشاشیت سے ملا جلا بھرپور خط بہت اچھا لگا لیکن آپ اپنا دل اتنا کمزور نہ رکھیں نا۔ شگفتہ مشتاق، اللہ تعالیٰ آپ کے حالات بہتر کرے۔ شہزاد احمد اینڈ فیروز علی میں بھی یہاں نیو ہوں۔"

☆ اللہ دتہ چشتی، کوٹ بخشہ سے لکھتے ہیں۔ "سارے کا سارا سرگزشت ہی لائق ستائش تھا مگر نیوٹن اور مائیکل اینجلو کی بابت پڑھ کر تو مزہ ہی آ گیا۔ پوری ٹیم کو اس قدر شاندار شمارہ نکالنے پر مبارک باد۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا اظہاریہ پشاور سے۔ "سرگزشت کی مقبولیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب میرے ایکسیڈنٹ اور بیماری کے بارے میں "شہر خیال" میں یہ خبر شائع ہوئی۔ یقین کریں کہ بہت سے ایسے لوگوں نے بھی رابطہ کیا جن کو میں نہیں جانتا تھا۔ اس علالت نے مجھے ان سے متعارف کیا۔ اسپتال میں عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کا ایک میلہ لگا ہوا تھا اور سب ہی میرے لیے دست بہ دعا تھے۔ بعض اوقات حادثے بھی انسان کے لیے بہتری کا باعث بن جاتے ہیں اور انسان کو آنے والی بیماری کا قبل از وقت یا بروقت علم ہو جاتا ہے اور وہ احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا جب بے ہوشی کے دوران میرے مختلف ٹیسٹ کیے گئے تو معلوم ہوا کہ میرے دل کی دھڑکن 72 کی بجائے 27 درجے پر تھی اور اسی طرح پہلے بلڈ پریشر اور شوگر بڑھ گئی اور پھر انتہائی درجے پر کم ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا ٹیسٹوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو مسلسل 10 یوم تک جاری رہا۔ آخر 10 یوم تک CCU میں گزارنے کے بعد گھر منتقل ہو گیا۔ اب گھر پر ہی زیرِ علاج ہوں۔ اپریل کا سرگزشت بسترِ علالت پر ہی نظر سے گزرا۔ پرچہ ہر لحاظ سے قابلِ تعریف ہے لیکن آفاقی صاحب کی کمی پھر بھی محسوس ہوتی رہی۔ ہم نے ان سے ہمیشہ رہبری حاصل کی۔ وہ ایک نہایت ہمدرد اور وضع دار انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے (آمین)۔ میں اپنے دوستوں وزیر محمد اعوان، گل حمید (مرحوم) کے بھتیجے ڈاکٹر احمد جمال خان، محمد سلیم اور شہر خیال کے دوستوں وحید ریاست بھٹی، جاوید سرکانی۔ منشی محمد عزیز مے، طاہرہ گلزار، شوکت رحمان خٹک اور قارئین سرگزشت کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ "ماں اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا انمول تحفہ ہے مگر ہائے انسان......! اس تحفے کی قدر و قیمت کا احساس اس وقت ہی ہوتا ہے جب یہ پاس نہیں ہوتا۔ صرف دو ہستیوں کو ہی معلوم ہے کہ ماں کیا ہے؟ ایک ماں کو بنانے والا اور دوسرا ماں بننے والی۔ ماں......! میری ماں جو شرافت، دیانت اور محنت کا حسین مرقع تھیں، محبت و شفقت کا دریا، اپنی اولاد کے لیے ہی نہیں بلکہ اولاد کی اولاد کے لیے بھی۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ہم ایک گھنے سایہ دار شجر سے محروم ہو گئے ہیں۔ میں شہر خیال کے تمام احباب کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میری والدہ محترمہ کے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جانے پر تعزیت کی۔ منشی محمد عزیز، ڈاکٹر قرۃ العین، طاہرہ گلزار، سید انور عباس شاہ، وحید ریاست بھٹی، بشریٰ افضل، سدرہ بانو ناگوری، ناصر حسین رند، شاہد جہانگیر اور نزابت افشاں کا مشکور ہوں کہ آپ نے تعزیت کا اظہار کیا۔ دعا کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کر دے اور ان کی آخری منزل کو نور سے بھر دے (آمین)۔"

☆ ملک عاشق حسین ساجد کا خلوص نامہ ہیڈ بکائی مظفر گڑھ سے۔ "ماشاءاللہ سرگزشت بہت عروج پر جا رہا ہے۔ اس بار محترم علی سفیان آفاقی مرحوم کی تحریر کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ "خوب آدمی" محترم معراج رسول صاحب کا اداریہ زبردست تھا۔ کہانیوں میں محترم انور فرہاد کی "مینا کمال" محترم طارق عزیز کی "ڈارون کا سفر" محترم کاشف زبیر کی "سراب" لاجواب تھیں۔ اسی طرح سچ بیانیوں میں محترمہ سلمیٰ غزل کی "بہکے قدم" محترم پروفیسر ڈاکٹر نرگس وقار کی "قصۂ درد" متاثر کن تھیں۔ صفحہ بہ صفحہ تراشے عمدہ اور بہترین تھے۔"

تاخیر سے موصول خطوط

اشفاق محمد، لاڑکانہ۔ منظر اعوان، ساہیوال۔ احمد تبریز، جہلم۔ فرحت اللہ نیازی، شیخوپورہ۔ واجد حسن واجد، خان پور۔ نیاز بٹ، جھنگ۔ فرمان علی سید، چنیوٹ۔ فیض بخش، فیصل آباد۔ نگار ارم، ممتاز حسن، سرگودھا۔ ہدایت علی، ملتان۔ بخش ملکی، کوٹ ادو۔ فرقان حسن خان، ڈی آئی خان۔ ارباز خان، کوئٹہ۔ ناصر حسن، پشاور۔

فلسفی

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ دانشوری میں یکتا تھا۔ اپنے دور میں عقل مند ترین شخص کہلاتا تھا۔ اسی لیے اس نے گردش دہر کی چاپ قبل از وقت محسوس کرلی تھی اور بارغم زیست اٹھائے، آنسوئوں کے چراغ جلائے ترک وطن پر مجبور ہو گیا۔ پردیس میں پھول سے دن مہتابی راتیں، وہ ایامِ حسین خواب ہو گئے مگر نگر نگر ڈگر ڈگر پھرتے ہوئے بھی وہ وطن کو بھولا نہیں۔ حب الوطنی کی ریسماں اسے کھینچتی رہی مگر وہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں کے لوگ اس کی دانائی کے معتقد ہوتے رہے۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ لوگوں کے ذہن پر ثبت ہوتا رہا۔ اس کی کہی ہوئی باتوں کے مجموعہ کو اتنی پذیرائی ملی کہ کئی سو سال گزرنے کے بعد بھی لوگ اسے اہمیت دیتے ہیں۔ آج بھی وہ مجموعہ مقبولیت کی معراج پر ہے۔ اسی وجہ سے اسے بابائے جمہوریت بھی کہا جاتا ہے۔

یونان کے ایک بہت بڑے فلسفی کا زندگی نامہ

یونان کے دارالحکومت ایتھنز کے بازاروں میں چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نانبائیوں نے اپنی دکانیں کھول لی تھیں، لوہاروں کے کارخانوں میں بھٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ ہتھوڑے چلنے لگے تھے۔ مجسمہ ساز بڑی بڑی پتھر کی سلیں اٹھائے چلے جارہے تھے کہ اب انہیں بہت دن کے رکے ہوئے کام کا دوبارہ آغاز کرنا تھا۔ نوجوان بھی بڑی تعداد میں گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند دن پہلے یونان پر ایک جنگ مسلط ہوگئی تھی اور نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کر کے میدانِ جنگ کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ یہ معرکہ گرم ہونے سے پہلے سرد ہوگیا۔ جنگ ملتوی ہوگئی۔ نوجوان واپس آگئے اور اب دور امن کے نظارے دیکھنے بازاروں میں نکل آئے تھے۔

ایتھنز کے مشہور فلسفی سقراط کا تو شغل بلکہ فریضہ ہی یہ تھا کہ سوالات اٹھاتا تھا اور وہ بھی بازاروں میں۔ اس کے گرد بھیڑ لگ جاتی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے خلاف باتیں کرتا تھا۔ اس لیے نوجوان اس کے گرویدہ تھے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ دیوتاؤں کا قائل بھی تھا۔ وہ خود کو دیوتاؤں کا پیغامبر کہہ کر لوگوں کو مخاطب کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر یہ کلمات تھے۔

”عقل مند دیوتاؤں نے مجھے دانش کی جستجو کا حکم دیا ہے۔“

کئی خوبرو نوجوان اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سقراط کی مینڈک نما آنکھوں نے دیکھا کہ ایک بیس بائیس سال کا نوجوان سامنے سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ایسا خوب صورت اور بجیلا ہے کہ اس کے ساتھ چلنے والے اس کے گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے اب تک کے شاگردوں میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا۔ کیا ایلسی بیاویز بھی نہیں؟ سقراط نے اپنے ایک تازہ دوست کے بارے میں سوچا جسے اپنی خوب صورتی پر بڑا ناز تھا اور تھا بھی خوب صورت...... نہیں ایسا تو وہ بھی نہیں۔ آنے والا لڑکا کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ سقراط بوکھلا سا گیا کہیں وہ بھیڑ میں گم ہی نہ ہوگیا ہو لیکن وہ کہیں گم نہیں ہوا تھا بلکہ کسی دکان پر رک کر دکاندار سے کچھ باتیں کرنے لگا تھا۔ سقراط ایک جگہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگا کہ جب وہ دکاندار سے فارغ ہوکر اس کی طرف آئے گا تو وہ اس سے اس کے بارے میں پوچھے گا۔ پوچھے گا کہ سنگ تراش تو میں

ہوں اسے کس نے تراشا ہے۔

وہ لڑکا دکان سے ہٹ گیا تھا اور اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ قریب آیا تو وہ ایک گیت گا رہا تھا۔ سقراط کو یاد آیا کہ وہ اس گیت کو پہلے بھی سن چکا ہے۔ لڑکا گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سقراط کو اچانک اپنا خواب یاد آ گیا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے ایک خواب مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ خواب میں ایک سنہری پرندہ دیکھتا رہا تھا جو ایک گیت گاتا تھا۔ اس کے گرد چکر لگاتا تھا اور اپنی چونچ میں دبا ہوا پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیتا تھا اور غائب ہو جاتا تھا۔ وہ لڑکا اس وقت وہی گیت گا رہا تھا۔ اس کے بول بالکل وہی تھے جو وہ خواب میں سن چکا تھا۔ اس کا ذہن رسا فوراً سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ فوراً آگے بڑھا اور اس لڑکے کو جالیا۔

''نوجوان! کیا تم مجھے جانتے ہو؟''

''آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ یہاں کے سب سے بڑے فلسفی سقراط ہیں۔''

''مگر میں تو تمہیں نہیں جانتا۔''

''آپ مجھے کیسے جانیں گے۔ میں کسی ہنر میں یکتا نہیں کہ آپ جیسے فلسفی کے ہمراہ چلنے کا اعزاز حاصل کرتا۔''

''پھر تم مجھے جانتے کیسے ہو؟''

''میں تو آپ کو نہیں جانتا۔''

''تم نے ابھی کہا کہ تم مجھے جانتے ہو۔''

''میں نے کہا تھا کہ آپ کو کون نہیں جانتا۔ یہ کب کہا تھا کہ میں جانتا ہوں۔ سب جانتے ہیں' اس لیے میں بھی جانتا ہوں۔''

''اوہ تم تو بنے بنائے فلسفی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ، ابھی جو تم گیت گا رہے تھے وہ تم نے کہاں سنا؟''

''خواب میں۔''

''خواب میں؟''

''ایک پرندہ آکر مجھے خواب میں یہ گیت سناتا ہے جو مجھے یاد ہو گیا۔''

''اس کا مطلب ہے......'' سقراط نے کہا اور ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے آسمان سے آنکھیں نیچے اتاریں اور اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔ ''تم ابھی میرے ساتھ کہیں چلو۔ میں تمہیں کچھ راز کی باتیں بتانے والا ہوں۔''

''کہاں چلنا ہوگا؟''

''تم میرے ساتھ ورزش گاہ تک چلو گے؟ وہاں اور لوگ بھی ہوں گے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا اور میرا مطلب بھی پورا ہو جائے گا۔ میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

وہ لڑکا اس کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ورزش گاہ تک پہنچ گیا۔ یہاں ایک حلقہ احباب جمع تھا جو سقراط کے انتظار میں تھا۔ اس لڑکے کو دیکھ کر بہت سے لوگ چونکے تھے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان کے لیے اجنبی تھا بلکہ اس لیے کہ اس وقت وہ سقراط کے ساتھ تھا۔ سقراط کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس پر بھی سقراط کا جادو چل گیا اور وہ بھی دیوتاؤں کا مخالف ہو گیا۔

سقراط کے اثر سے دوسرے لوگوں نے بھی سوال کرنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا جس طرح سقراط سوال کرتا تھا اور انہی سوالوں کی بوچھاڑ میں وہ حقیقت کی روح تک پہنچ جاتا تھا اور دوسرے شخص کو قائل کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی ایک نوجوان یہی شعبدہ بازی کر رہا تھا۔ وہ دوسرے نوجوان سے کہہ رہا تھا میں ابھی ثابت کر دوں کہ تمہارا باپ کتا ہے۔

''تم کہتے ہو تمہارے پاس ایک کتا ہے۔''

''ہاں۔''

''اس کے بچے بھی ہوں گے؟''

''ہاں، ہیں۔''

''اور کتا ان کا باپ ہے؟''

''مجھے یقین ہے وہی ان کا باپ ہے۔''

''اور کیا وہ تمہارا نہیں ہے۔''

''یقیناً ہے۔''

''اس سے ثابت ہوا کہ کتا ایک باپ ہے اور وہ تمہارا ہے۔ اسی لیے وہ تمہارا باپ ہے۔''

سقراط نے پہلے تو تبسم کیا پھر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا پھر افلاطون سے مخاطب ہوا۔

''تم نے شعبدہ بازی دیکھی؟ یہ لوگ میری نقل کرتے ہیں اور نقل بھی بھونڈی۔ میں تو سچائی کی تلاش میں ہوں۔ میں تو لوگوں سے پوچھتا ہوں انہیں سکھاتا نہیں۔ اسی لیے سوال کرتا ہوں۔ جواب تو مجھے بھی معلوم نہیں' آؤ میں تمہیں بتاتا ہوں میرے سوالوں کی روح کیا ہے۔'' وہ اسے لے کر اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں پہلوان اپنے کپڑے بدلتے تھے۔

یہ لڑکا کوئی اور نہیں وہ تھا جس کے مقدر میں دنیا کا

پہلا باقاعدہ فلسفی ہونا لکھا تھا۔ یہ جب پیدا ہوا اس کا نام اس کے دادا کے نام پر ارسٹوکلور رکھا گیا تھا لیکن اس کے کشتی کے استاد نے اس کی اچھی صحت اور چوڑے چکلے شانوں کو دیکھ کر اسے پلاٹون کہنا شروع کر دیا جس کا مطلب تھا چوڑے چکلے شانوں والا پھر یہی نام کثرت استعمال سے پلاٹون ہو گیا اور معرب ہو کر افلاطون ہو گیا۔

افلاطون کے والد کا نام ارستون تھا جو شاہی خاندان کی باقیات سے تھا۔ اس کی والدہ کا نام کشی ٹون تھا اور اس کا تعلق ایتھنز کے معروف قانون داں اور شاعر سولون کے خاندان سے تھا۔ وہ چارمیڈس کی بہن اور کرسٹاس کی بھتیجی تھی۔ یہ دونوں اس وقت حکومت میں شامل تھے۔ یہ تیس جابروں کی حکومت تھی۔ ان میں سے دو میڈس اور کرسٹاس تھے۔

افلاطون جب جوانی کی منزلوں میں تھا تو ایتھنز کی حکومت اپنے زوال کی منازل طے کر رہی تھی۔ شہری ریاستیں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ چکی تھیں۔ ایک طبقہ شہری ریاست پر حکمرانی کرنے والوں کا تھا جبکہ دوسرا طبقہ رعایا کا تھا۔ حکمراں جابر تھے اور رعایا مجبور۔ حکمراں اخلاقی ضوابط سے بے نیاز ہو کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے جبکہ محکوم لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے تھے۔

ایک روایت کے مطابق جب ارستون کی بیوی حاملہ تھی اور اس کے پیٹ میں افلاطون تھا تو ارستون کو ایک یونانی دیوتا اپالو خواب میں دکھائی دیا اور خوشخبری سنائی کہ اس کے ہاں بہت ہی فطین اور شہرت دوام حاصل کرنے والا لڑکا پیدا ہوگا۔

ایک روایت اور بھی ملتی ہے کہ شیر خواری کے زمانے میں افلاطون جھولے میں سویا ہوا ہوتا تھا کہ شہد کی مکھیاں اس کے ہونٹوں پر بیٹھ کر بہت ہی ترنم کے ساتھ اسے لوری سناتی تھیں۔

غرض ان کہانیوں کے سائے میں اس کی پرورش ناز و نعم کے ساتھ ہونے لگی۔ یہ گھرانا امیر ترین گھرانوں میں سے تھا لہٰذا کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ افلاطون عیش کے جھولے میں جھول رہا تھا۔ ابھی وہ چار یا پانچ سال کی عمر کو پہنچا تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ وہ ابھی چھوٹا تھا۔ اسے اچھی تعلیم اور بہتر تربیت کی ضرورت تھی۔ اس کی ماں اس کی طرف سے سخت پریشان رہنے لگی تھی۔ اس پریشانی کا حل اس نے یہ نکالا کہ دوسری شادی کر لی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور ابھی جوان بھی تھی۔ اس پر اس کے ایک قریبی رشتے دار پیری لیمپس کی نظر پڑ گئی۔ ادھر اُدھر سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ شادی کی خواہش مند ہے۔ پیری لیمپس سیاست داں تھا اور کئی سالوں تک ایتھنز کے سفیر کی حیثیت سے ایرانی بادشاہ کے دربار میں خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ سیاسی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ مشہور رہنما پیری کلیز تو اس کا ہر وقت کا ساتھی تھا۔ ایک روز چھ گھوڑوں کی بگھی میں سوار پیری کلیز افلاطون کے گھر پہنچ گیا۔ افلاطون کی ماں اس کے آنے کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ شاید یہ سمجھی ہو کہ وہ اس کے شوہر کی تعزیت کے لیے آیا ہوگا۔ بات تو یہ بھی انہونی سی تھی لیکن بہر حال اس نے ایک قومی رہنما کی حیثیت سے پیری کلیز کا استقبال کیا اور اپنے گھر کے سب سے شاندار کمرے میں بٹھایا۔ پیری کلیز نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”مجھے آپ کے شوہر کی وفات کا سخت صدمہ ہوا ہے۔“

”صدمے کی تو بات ہی ہے۔ ابھی میرے بچے چھوٹے ہیں افلاطون تو صرف پانچ سال کا ہے۔“

”اسی لیے تو میں حاضر ہوا ہوں۔ ان بچوں کی تربیت کا وقت ہے۔ اچھی تعلیم کی ضرورت ہے۔“

”اگر آپ اس لیے تشریف لائے ہیں کہ میرے لیے کوئی وظیفہ وغیرہ مقرر کروا دیں گے تو یہ مجھے گوارا نہیں ہوگا۔“

”یہ تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا۔ میں تو کسی اور مقصد سے حاضر ہوا ہوں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔“ پیری کلیز نے کہا اور کچھ دیر کے لیے دونوں طرف خاموشی چھا گئی۔ جب افلاطون کی ماں کچھ نہ بولی تو پیری کلیز نے بات آگے بڑھائی۔ ”پیری لیمپس کو تو آپ جانتی ہوں گی۔ وہ آپ کے بچوں کا نیا باپ بننے کے لیے تیار ہے۔ وہ آپ کے لیے مضبوط سہارا ثابت ہوگا۔“

”آپ خود یہاں تشریف لائے ہیں یا اس نے آپ کو بھیجا ہے؟“

”اس نے بھیجا ہے اور نیک تمناؤں کے ساتھ بھیجا ہے۔“

”یہ بات اسے خاندان کے پیمانے پر اٹھانی چاہیے تھی۔ یہ بات اس نے آپ کے بھائی چامیڈس اور چچا

کرسناس کے سامنے بھی اٹھائی تھی۔ شاید وہ بھی کسی وقت آپ سے ملاقات کریں۔''

''پیری لیمپس اگر مجھ سے خود ملاقات کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔''

''آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔ وہ ضرور آپ سے ملیں گے۔''

یہ ملاقات ایک خوشگوار فضا میں ختم ہوئی۔ بعد میں پیری لیمپس اس سے ملا اور دونوں نے باہمی رضامندی سے شادی کرلی۔ پیری لیمپس کا اپنی پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا اس کا نام ڈیموس تھا۔

افلاطون کا بچپن ایک بڑے سیاسی گھرانے میں گزرنے لگا۔ یہ وہ پُرآشوب دور تھا جب ایتھنز جنگ کی تباہ کاریوں کا پوری طرح شکار ہو چکا تھا۔

افلاطون نے اپنے زمانے کے معروف اساتذہ سے گرامر، موسیقی، منطق، فلسفہ اور جمناسٹک میں مہارت حاصل کی۔ وہ بہترین پہلوان بھی تھا۔

افلاطون کے پہلے استاد کا نام کریٹی لیس تھا جس نے افلاطون کو ہراقلیتوس کے نظریات کا علم دیا۔ اس نے مروجہ تعلیم کے مطابق فن موسیقی سیکھی اور مذہبی اور اخلاقی اصولوں پر مبنی ہومر کی نظموں کو حفظ کیا۔ اس وقت یونان میں غیر ملکی سوفسطائی، امرا کے ذہنوں پر حکومت کر رہے تھے۔ ان کے اخلاقیات کے درس میں یہ بات خاص طور پر شامل تھی کہ ریاست حکمرانوں کی خواہشات کی غلام ہے لہٰذا افلاطون نے سوفسطائیوں کے نظریات سے مکمل واقفیت حاصل کی۔

اس کی تربیت ایک سیاسی گھرانے میں ہوئی تھی۔ فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی اور فطری رجحان شاعری کی طرف تھا۔ وہ ابھی اپنے لیے کسی شعبے کا انتخاب کرنے ہی والا تھا کہ اس کی ملاقات سقراط سے ہوگئی۔ سقراط کی ملاقات نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اس کا رجحان سیاست کی طرف ہو چکا تھا لیکن سقراط کی صحبت نے اسے سیاست سے بددل کردیا۔ کچھ المیہ ڈرامے لکھے تھے انہیں بھی اپنے ہاتھ سے جلا دیا۔ اب وہ سقراط کا شاگرد بھی تھا اور اس کا دوست بھی تھا۔ اب وہ سقراط کے نظریات کو فلسفہ بنانے کے لیے اس کی باتوں کو لکھتا جا رہا تھا۔ سقراط دنیا کا وہ واحد فلسفی تھا جس نے ایک لفظ کاغذ پر تحریر نہیں کیا تھا۔ اس کی تمام تعلیمات زبانی تھیں۔ قدرت نے افلاطون کے ہاتھوں یہ انتظام مہیا کردیا کہ افلاطون اس کی گفتگو قلم بند کرتا رہا۔ سقراط جب ورزش گاہ میں اپنے شاگردوں کے ساتھ ہوتا تو افلاطون ایک گوشے میں بیٹھا اس کے مکالمے تحریر کرتا جاتا۔ وہ بازار میں نکلتا تو افلاطون اس کے ساتھ ہوتا۔ اس کے رشتے دار تنگ تھے کہ وہ سقراط کے ساتھ کیوں رہتا ہے لیکن وہ سقراط کے اندر چھپی ہوئی دانش سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ اس روشنی کو اپنے اندر چھپا لینا چاہتا تھا۔

افلاطون سے ملاقات کے بعد سقراط کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ افلاطون اس کے لیے مضبوط سہارا بن گیا تھا۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ افلاطون جو اعلیٰ گھرانے کا فرد ہے تو لوگ یہ بھول جاتے تھے کہ سقراط کا باپ ایک سنگ تراش تھا اور اس کی ماں دائی تھی۔ افلاطون جب سقراط کے ساتھ ساتھ ہاتھ باندھ کر چلتا تھا تو سقراط کی اہمیت اچانک بڑھ جاتی تھی۔ ایتھنز کے لوگوں کو یقین ہونے لگتا تھا کہ دیوتا اس سے خوش ہیں اسی لیے تو افلاطون کو اس کے سحر میں جکڑ دیا ہے۔

سقراط سورج نکلتے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور پھر تمام دن بازار یا ورزش گاہ میں باتیں کرتا رہتا۔ اس کا عقل مند سامع افلاطون اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسے میلوں چلنا تھا اور یہ سفر وہ بازاروں میں طے کر رہا تھا۔ محدود بازاروں کے اتنے چکر جیسے وہ میلوں چل کر آیا ہو۔

''جو میں دیکھ رہا ہوں وہ دوسرے لوگ کیوں نہیں دیکھ رہے ہیں؟'' وہ افلاطون سے کہتا۔

''اس لیے کہ دوسرے لوگوں کے پاس وہ دانش نہیں جو چیزوں کو روشنی میں لاتی ہے۔''

''مجھے افسوس یہ ہے کہ یہ سب ایسے غار میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں جہاں باہر کی روشنی نہیں آتی۔ شہر میں اچھی باتیں ہوتی ضرور ہیں لیکن ہمیشہ اچھی باتیں کیوں نہیں ہوتیں۔ لوگ نیکیاں کرتے ضرور ہیں لیکن انہیں نیکیوں کا شعور نہیں۔''

☆☆☆

ایکروپولس کے مندر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ سقراط بھی اس وقت وہاں موجود تھا کہ صف اوّل کا سیاسی رہنما فارقلیس وہاں آیا۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ایتھنز میں وہ کون تھا جسے سقراط نہ جانتا ہو لیکن یہ بوڑھا اس کے لیے اجنبی تھا۔ وہ فارقلیس کے ساتھ تھا اس لیے کوئی معمولی آدمی بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ ایشیائے کوچک کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام فیثا

غورث ہے۔ بہت عقل مند اور نظریہ ساز ہے۔

ضروری نہیں تھا کہ سقراط ان باتوں کو اہمیت دیتا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں دی نہ فار قلیس پہ نہ فیثا غورث پر۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ ایتھنز کے بازاروں میں فیثا غورث کے نظریات کے خوب چرچے ہونے لگے لیکن جب اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آسمان پر پتھر ہیں دیوتا نہیں تو اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ چمکتی ہوئی دھات کا ٹکڑا ہے اور چاند مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں روشنی نہیں بلکہ اس پر سورج کی روشنی اپنا عکس ڈالتی ہے۔ جس سے وہ چمکتا ہے۔ چاند میں پہاڑ اور وادیاں ہیں شاید لوگ بھی ہوں۔

یہ نظریہ سامنے آتے ہی فار قلیس کے دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اسے مذہبی معاملہ بنا دیا۔ پورا یونانی فیثا غورث کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ شور اتنا مچا کہ فیثا غورث کی آواز دبانے کے لیے حکومت کو ایک قانون پاس کرنا پڑا۔ یہ قانون ان لوگوں کے خلاف تھا جو مذہب پر عمل نہیں کرتے اور آسمانی چیزوں کے متعلق نظریات پیش کرتے ہیں۔ اس قانون کا سہارا لے کر فیثا غورث کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر الحاد کا الزام تھا۔ اسے سزائے موت سنائی جا سکتی تھی لیکن فار قلیس اس کے کام آیا اور عدالت نے اسے موت کی سزا سنانے کی بجائے شہر بدر کرنے کا حکم سنایا۔ وہ ایشیائے کوچک کو واپس چلا گیا۔

افلاطون ان مناظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فیثا غورث کی تعلیمات سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اسے دیکھا ضرور تھا لیکن جس نظریے کا اس نے اظہار کیا تھا اس میں اسے کچھ صداقت معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ فیثا غورث نے جو کچھ کہا ہے وہی سچ ہے۔ وہ کئی دن اسی الجھن میں گرفتار رہا بالآخر اس نے اپنے استاد سقراط کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

''آپ کی کیا رائے ہے۔ سورج کوئی دیوتا نہیں سورج دھات کا ٹکڑا ہے؟ جیسا کہ فیثا غورث کہتا ہے؟''

''میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔''

''ہمارے بزرگوں کا کہنا تو کچھ اور ہے۔''

''ہو سکتا ہے فیثا غورث غلط ہو۔''

''آپ نے اس کی غلطی پکڑی کیوں نہیں؟''

''میں نے کہا نا کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔'' سقراط نے کہا۔ ''وہ ایک سائنس داں ہے اس نے بطور سائنس داں ایک نظریہ قائم کیا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کا نظریہ جھٹلانے والے۔''

''مذہب تو کچھ اور کہتا ہے۔''

''جو مذہب کہتا ہے اسے ثابت کرنے کی ضرورت ہے اور میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔'' افلاطون سمجھ گیا کہ سقراط اس معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط برت رہا ہے۔ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ اگر فیثا غورث اسے کہیں ملا تو وہ اس کے نظریات کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرے گا۔ یہ موقع بہت جلد آنے والا تھا۔

☆☆☆

ایتھنز میں جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے تھے۔ بحری بیڑوں کو سمندروں کا سینہ چیر کر آگے کی طرف جانا تھا۔ ایتھنز میں عام بھرتی کا اعلان ہو گیا۔ ہر شخص جو اسلحہ اٹھا سکتا تھا یعنی مضبوط اور جوان تھا اسے فوج کے ساتھ جانا تھا۔ افلاطون کو بھی جانا پڑا جبکہ سقراط کو بوڑھا ہونے کی وجہ سے ایتھنز میں چھوڑ دیا گیا۔ افلاطون کو سقراط سے جدا ہونا پڑا۔

اس جنگ میں نہ صرف ایتھنز کو شکست ہوئی بلکہ اس کے بارہ جہاز ڈوب گئے۔ جہاز ڈوبنے کا ذمے دار ان نو کمانداروں کو ٹھہرایا گیا جو فوج کے ساتھ تھے۔ ان نو کمانداروں کو واپس بلا لیا گیا تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہ مقدمہ چلانے کے لیے جو مجلس بنائی گئی اس میں سقراط کو بھی شامل کیا گیا۔ سقراط، سیاست سے دور رہتا تھا لیکن اسے اس مجلس میں شامل ہونا پڑا۔

ان نو کمانداروں پر جس نے الزام لگائے تھے وہ تھیرانیز نامی بحری کپتان تھا۔ سقراط نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تھیرانیز خود کو بچانے کے لیے کمانداروں پر الزام لگا رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کمانداروں کی سزا کے خلاف ووٹ دے گا۔ اس کے ووٹ نہ دینے سے بھی سزا یقینی تھی لیکن اس کا ضمیر تو مطمئن رہتا کہ اس نے ووٹ نہیں دیا۔

ووٹ ڈالنے کے لیے دو مٹکے رکھ دیے گئے ایک سزا کے لیے دوسرا نجات کے لیے۔

''میں اس مسئلے پر ووٹ لینے کی مخالفت کروں گا۔ یہ تجویز ہی غیر قانونی ہے کہ ووٹ لیا جائے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟'' سقراط نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

''میں پاگل نہیں ہوں جو تمہارا ساتھ دوں۔ اپنے

غورث ہے۔ بہت عقل مند اور نظریہ ساز ہے۔"

ضروری نہیں تھا کہ سقراط ان باتوں کو اہمیت دیتا۔ اس نے کوئی توجہ نہیں دی نہ قارقلیس پر نہ فیثا غورث پر۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ ایتھنز کے بازاروں میں فیثا غورث کے نظریات کے خوب چرچے ہونے لگے لیکن جب اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آسمان پر پتھر ہیں دیوتا نہیں تو اس کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ چمکتی ہوئی دھات کا ٹکڑا ہے اور چاند مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس میں روشنی نہیں بلکہ اس پر سورج کی روشنی اپنا عکس ڈالتی ہے۔ جس سے وہ چمکتا ہے۔ چاند میں پہاڑ اور وادیاں ہیں شاید لوگ بھی ہوں۔

یہ نظریہ سامنے آتے ہی قارقلیس کے دشمنوں کو موقع مل گیا۔ انہوں نے اسے مذہبی معاملہ بنا دیا۔ پورا یونانی فیثا غورث کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ شور اتنا مچا کہ فیثا غورث کی آواز دبانے کے لیے حکومت کو ایک قانون پاس کرنا پڑا۔ یہ قانون ان لوگوں کے خلاف تھا جو مذہب پر عمل نہیں کرتے اور آسمانی چیزوں کے متعلق نظریات پیش کرتے ہیں۔ اس قانون کا سہارا لے کر فیثا غورث کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر الحاد کا الزام تھا۔ اسے سزائے موت سنائی جا سکتی تھی لیکن قارقلیس اس کے کام آیا اور عدالت نے اسے موت کی سزا سنانے کی بجائے شہر بدر کرنے کا حکم سنایا۔ وہ ایشیائے کوچک کو واپس چلا گیا۔

افلاطون ان مناظر کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ فیثا غورث کی تعلیمات سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اسے دیکھا ضرور تھا لیکن جس نظریے کا اس نے اظہار کیا تھا اس میں اسے کچھ صداقت معلوم ہوتی تھی۔ اس کا دل کہتا تھا کہ فیثا غورث نے جو کچھ کہا ہے وہی سچ ہے۔ وہ کئی دن اسی الجھن میں گرفتار رہا بالآخر اس نے اپنے استاد سقراط کی رائے جاننے کی کوشش کی۔

"آپ کی کیا رائے ہے۔ سورج کوئی دیوتا نہیں سورج دھات کا ٹکڑا ہے؟ جیسا کہ فیثا غورث کہتا ہے؟"

"میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔"

"ہمارے بزرگوں کا کہنا تو کچھ اور ہے۔"

"ہو سکتا ہے فیثا غورث غلط ہو۔"

"آپ نے اس کی غلطی پکڑی کیوں نہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔" سقراط نے کہا۔ "وہ ایک سائنس داں ہے اس نے بطور سائنس داں ایک نظریہ قائم کیا۔ ہم کون ہوتے ہیں اس کا نظریہ جھٹلانے والے۔"

"مذہب تو کچھ اور کہتا ہے۔"

"جو مذہب کہتا ہے اسے ثابت کرنے کی ضرورت ہے اور میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔" افلاطون سمجھ گیا کہ سقراط اس معاملے میں حد سے زیادہ احتیاط برت رہا ہے۔ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ اگر فیثا غورث اسے کہیں ملا تو وہ اس کے نظریات کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرے گا۔ یہ موقع بہت جلد آنے والا تھا۔

☆☆☆

ایتھنز میں جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے تھے۔ بحری بیڑوں کو سمندروں کا سینہ چیر کر آگے کی طرف جانا تھا۔ ایتھنز میں عام بھرتی کا اعلان ہو گیا۔ ہر شخص جو اسلحہ اٹھا سکتا تھا یعنی مضبوط اور جوان تھا اسے فوج کے ساتھ جانا تھا۔ افلاطون کو بھی جانا پڑا جبکہ سقراط کو بوڑھا ہونے کی وجہ سے ایتھنز میں چھوڑ دیا گیا۔ افلاطون کو سقراط سے جدا ہونا پڑا۔

اس جنگ میں نہ صرف ایتھنز کو شکست ہوئی بلکہ اس کے بارہ جہاز ڈوب گئے۔ جہاز ڈوبنے کا ذمے دار ان نو کمانداروں کو ٹھہرایا گیا جو فوج کے ساتھ تھے۔ ان نو کمانداروں کو واپس بلا لیا گیا تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ یہ مقدمہ چلانے کے لیے جو مجلس بنائی گئی اس میں سقراط کو بھی شامل کیا گیا۔ سقراط، سیاست سے دور رہتا تھا لیکن اسے اس مجلس میں شامل ہونا پڑا۔

ان نو کمانداروں پر جس نے الزام لگائے تھے وہ تھیرانیز نامی بحری کپتان تھا۔ سقراط نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تھیرانیز خود کو بچانے کے لیے کمانداروں پر الزام لگا رہا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کمانداروں کی سزا کے خلاف ووٹ دے گا۔ اس کے ووٹ نہ دینے سے بھی سزا یقینی تھی لیکن اس کا ضمیر تو مطمئن رہتا کہ اس نے ووٹ نہیں دیا۔

ووٹ ڈالنے کے لیے دو مٹکے رکھ دیے گئے ایک سزا کے لیے دوسرا نجات کے لیے۔

"میں اس مسئلے پر ووٹ لینے کی مخالفت کروں گا۔ یہ تجویز ہی غیر قانونی ہے کہ ووٹ لیا جائے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟" سقراط نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا۔

"میں پاگل نہیں ہوں جو تمہارا ساتھ دوں۔ اپنے

ساتھ مجھے بھی مرواؤ گے۔ میں تو تمہیں بھی مشورہ دوں گا کہ ایسی حرکت مت کرنا۔''

''میں اپنے ضمیر کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا۔ میں جس بات کو غلط سمجھتا ہوں اسے غلط کہوں گا۔''

''تم جو چاہے کرو مجھے اپنی جان عزیز ہے۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا حالانکہ میں جانتا ہوں تم ٹھیک ہو۔''

اب یہ کام سقراط کو اکیلے ہی کرنا تھا۔ وہ اس تجویز کی مخالفت کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اس کی حمایت میں کوئی بھی کھڑا نہ ہوا۔ وہ چیختا رہ گیا۔ اس کے احتجاج کے باوجود رائے شماری ہوئی اور کمانداروں کو موت کی سزا سنادی گئی۔

اس اختلاف کی سزا اسے بعد میں بھگتنی پڑی۔ تھیرا نیز اس حرکت کو بھولا نہیں تھا۔

ایتھنز کی مکمل شکست اور کئی سال تک مسلسل ہتھیار ڈالنے کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی تو اسپارٹا کے کماندار نے تھیرانیز کو شہر میں آمریت قائم کرنے میں مدد دی۔ جمہوریت کی بساط لپیٹنا آسان نہیں تھا لیکن اسپارٹا کو فتح مل چکی تھی اور اسپارٹا تھیرا نیز کے ساتھ تھا۔ اس کے 29 ساتھی تھے جو ل کر تیس ہوئے تھے۔ مجلس پر قابض ہوگئے۔ ان میں افلاطون کے بہت سے رشتے دار شامل تھے۔ افلاطون کو بھی اس نئی حکومت میں شامل ہونے کی پیشکش کی گئی لیکن اب وہ پوری طرح سقراط کے اثر میں آچکا تھا۔ اس نے اس پیشکش کو پائے حقارت سے ٹھکرادیا۔

تھیرانیز ابھی سقراط کو بھولا نہیں تھا۔ اقتدار میں آتے ہی اسے سقراط کی گوشمالی کا خیال آیا۔ اگر اس کا قلع قمع نہیں کیا گیا تو بڑا فتنہ برپا ہوسکتا ہے۔ اس نے سقراط کو طلب کرلیا۔

''تم اپنی تعلیم بند کردو۔''

''میں نیکی کی تعلیم دیتا ہوں۔''

''ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ نیکی کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنا چھوڑدو۔''

''مجھے دیوتاؤں کا حکم ہے کہ میں تعلیم دیتا رہوں۔ اگر میں غلط تعلیم دے رہا ہوں تو دیوتا خود مجھ پر عذاب نازل کریں گے۔ تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''دیوتاؤں سے پہلے ہم تم پر عذاب نازل کریں گے۔''

''میں جس طرح بھی ہوا اپنا دفاع کروں گا۔'' سقراط نے بڑی بے پروائی سے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

وہ چلا آیا تھا لیکن فکر مند ضرور تھا۔ اسے یقین تھا کہ حکم عدولی کے الزام میں گرفتار کرلیا جائے گا۔ گھر پہنچتے ہی وہ دروازے پر کان لگا کر بیٹھ گیا کہ ابھی دستک ہوگی اور سپاہی اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ کئی گھنٹے گزر گئے لیکن کوئی نہیں آیا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو سقراط اسی طرح ورزش گاہ میں پہنچا۔ اسی طرح شاگردوں کے ساتھ مباحثہ کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اسی طرح بازاروں میں نکلا اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتا رہا۔

رات ہوئی تو اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ یہی سمجھا کہ گرفتاری کا وقت آگیا۔ اس نے اپنی بیوی کو الوداع کہا۔ کندھے پر چادر ڈالی اور دروازے پر پہنچ گیا۔ سامنے افلاطون کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے اندر قدم رکھ دیا۔

''میں یہ سمجھا تھا کہ جابر حکمرانوں نے میری گرفتاری کے احکام بھیج دیے۔''

''شاید ایسا نہ ہو۔'' افلاطون نے کہا۔

''کیوں کیا جابر حکمران مجھ سے ڈرنے لگے ہیں۔''

''وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ جمہوریت پسند جو ملک بدر کردیے گئے تھے واپسی کی تیاری کررہے ہیں۔ اب اسپارٹا والوں نے بھی ہاتھ اٹھالیا ہے۔ سپاہیوں کے مظالم بڑھتے جارہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ایتھنز کے لوگ بھی بغاوت پر آمادہ ہیں۔ بہت جلد یہاں جمہوری دور واپس آجائے گا۔ ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جمہوری دور میں اظہار رائے کی آزادی ہوگی۔ بس اب کچھ دنوں کے لیے آپ اپنا وعظ بند کردیں۔''

''میری زبان میرے اختیار میں نہیں۔ دیوتاؤں کا یہی حکم ہے کہ میں نیکی کی تلقین کرتا رہوں۔''

''میرے کئی رشتے دار اس حکومت میں شامل ہیں۔ میں اپنے تعلقات استعمال کروں گا اور آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''تم جو جی چاہے کرو میں سچ کہتا رہوں گا۔''

وہ بہت دیر تک وہاں رکا رہا اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ اسی ملاقات میں یہ بھی طے ہوا کہ دو دن بعد مذہبی تہوار میں شرکت کے لیے بندرگاہ پی ایز جانا ہے۔ افلاطون ایسے مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ اسے سقراط سے باتیں

کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ بھی چلنے کو تیار ہو گیا۔

ایتھنز کا شہر بھی ایک بڑے میلے کا روپ دھارنے لگا تھا۔ سوانگ بھرے جا رہے تھے، دکانیں سج گئی تھیں۔ جلوس کی روانگی کا دن آیا تو بچوں کے چہروں پر طرح طرح کے بھیانک رنگ پھیر دیے گئے۔ بعض بڑوں نے بھی اپنے چہرے بھیانک کر لیے۔ سقراط سخت افسردہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ مذہبی رسومات اپنی جگہ لیکن دیوتاؤں نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ اپنے چہرے بھیانک کر لو۔ سڑکوں پر اچھلتے کودتے پھرو۔ اس وقت وہ اور بھی افسردہ ہو جاتا تھا جب وہ یہ سوچتا تھا کہ اسے بھی ان لوگوں کے ساتھ جانا ہوگا۔ وہ بچپن میں بھی ایک مرتبہ ایسے ہی ایک جلوس میں شامل ہوا تھا لیکن وہ بچپن تھا پھر اس نے سوچ لیا کہ وہ اور افلاطون الگ راستے سے جائیں گے اس جلوس میں شامل نہیں ہوں گے۔

اس نے ایسا ہی کیا، وہ اور افلاطون الگ راستے سے بندرگاہ پی ایز پہنچ گئے۔

وہ دونوں مذہبی فرائض سے فارغ ہو کر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں سقراط کا دوست پولے مارکس مل گیا۔ پولے مارکس پی ایز ہی کا رہنے والا تھا۔ اس کا گھر قریب تھا اس نے دعوت دی۔

''رات کو مشعل بردار جلوس نکلے گا۔ اس لیے آپ لوگ میرے ساتھ ٹھہریں۔ ہم یہ شاندار جلوس بھی دیکھیں گے اور رات کو باتیں بھی کریں گے۔''

سقراط نے یہ دعوت قبول کر لی۔ رات کو جلوس دیکھنے کے بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ پولے مارکس کے گھر والے بھی اس گفتگو میں شامل ہو گئے۔ گفتگو بڑھاپے کے حوالے سے شروع ہوئی اور پھر گفتگو عدل و انصاف تک پہنچ گئی۔

کسی نے کہا۔ ''حق دار کو حق دینا عدل ہے۔''

کوئی بولا۔ ''دوستوں کے ساتھ بھلائی کرنا اور دشمنوں کے ساتھ برائی کرنے کو عدل کہتے ہیں۔''

جب سب اپنی اپنی رائے دے چکے تو سقراط نے لب کشائی کی۔ ''فرد کے ذہن میں انصاف کے تصور کی جستجو کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ پورے شہر میں انصاف کے کردار کی تلاش کی جائے کیونکہ فرد اس کل معاشرے کا ایک جزو ہے۔''

افلاطون اس گفتگو کو لکھتا جا رہا تھا۔ بعد میں سقراط کے یہی خیالات اس کی تصنیفات کا موضوع بنے۔

☆☆☆

تیس جابر حکمران اپنی الجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے سپاہیوں کے مظالم کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ سپاہی بھی بے قصور تھے۔ ان کی تنخواہیں ادا نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کے لیے اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ دولت مندوں کے گھروں میں گھسیں اور انہیں لوٹ لیں۔ کسی کی عزت کسی کا مال محفوظ نہیں تھا۔ جو آواز اٹھاتا اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ سیاست دانوں کی ہلاکت کا بازار الگ گرم تھا۔ افلاطون جمہوریت پسندوں کی آمد کا انتظار کر رہا تھا تاکہ ان کی انصاف پسندی سے امن قائم ہو۔ شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کے اس سے مراسم تھے اور وہ ان کی بھرپور مدد کر رہا تھا کم از کم اتنی کہ یہاں کے حالات سے انہیں باخبر کر رہا تھا۔

جب مظالم بہت بڑھنے لگے تو ان تیس جابر حکمرانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ آپس کے ان اختلافات نے یہ رنگ دکھایا کہ تھیرانیز کو اس کے اپنے ہی لوگوں نے قتل کر دیا۔ جمہوریت پسند جو جلا وطن کر دیے گئے تھے لڑتے بھڑتے اپنے وطن لوٹ آئے۔ حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

امن و امان قائم ہوئے بھی چار سال کا عرصہ گزر گیا۔ افلاطون بھی مطمئن تھا سقراط بھی خوش تھا۔ افلاطون تو یہاں تک سوچنے لگا تھا کہ اب وہ سیاست میں حصہ لے گا۔ اسے جمہوریت سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اس کے یہ خواب اس وقت دم توڑ گئے جب جمہوریت پسندوں نے یہ حکم جاری کیا کہ کوئی کسی پر نکتہ چینی نہیں کرے گا۔ کسی کے عقائد میں دخل نہیں دے گا۔ سقراط اس قانون کی براہِ راست زد میں آتا تھا۔ وہ اس قانون کو ماننے کو تیار نہیں تھا۔ سچ کہنے سے نہیں رک سکتا تھا۔

اس نے اعلان کرنا شروع کر دیا۔ ''سچ تمام لوگوں کی میراث ہے۔ میں سچ بولتا رہوں گا۔''

اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہونے والا ہے۔ افلاطون بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اب جمہوریت ہے اس کے استاد پر کوئی آفت نہیں آئے گی لیکن اس تک بعض تکلیف دہ خبریں پہنچ گئیں۔ وہ یہ خبریں سنتے ہی سقراط کے گھر پہنچ گیا۔

''مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا ہے اور عنقریب آپ کو عدالت میں طلب کیا جانے

والا ہے۔“

”یہ تو میں تم سے سن رہا ہوں۔“

”اس خبر میں مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔“ افلاطون نے کہا۔ ”یہ وقت آنے سے پہلے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ کچھ دنوں کے لیے آپ یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ مگارا کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں ہمیں پناہ مل جائے گی۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی واپس آجائیں گے۔“

”برائی کا جواب برائی سے دینا میرا شیوہ نہیں۔ ایک برائی جمہوریت پسند کر رہے ہیں کہ میری زبان بندی چاہتے ہیں۔ دوسری برائی میں کروں کہ یہاں سے بھاگ جاؤں پھر میں کس منہ سے نیکی کی باتیں کروں گا۔“

”زندہ رہنے کے لیے یہ قدم اٹھانا ضروری ہے۔“

”زندہ رہنا اتنا اہم نہیں۔ صحیح انداز سے زندہ رہنا اہم ہے۔ صحیح انداز یہ ہے کہ میں ظلم کا مقابلہ کروں۔ لوگوں کو بتاؤں کہ میرا حق مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا تم گھر جا کر آرام کرو اور میری تعلیمات پر عمل کرتے رہو۔“

افلاطون کو اس کی گفتگو سے یہ احساس ہوا جیسے سقراط مرنے کے لیے تیار ہو گیا ہو اور اسے وصیت کر رہا ہو اور ہدایت کر رہا ہو کہ میری جو تعلیمات ہیں ان پر نہ صرف خود عمل کرنا بلکہ انہیں دوسروں تک پہنچانا۔

افلاطون اس طرح اس کے سرہانے بیٹھا رہا جیسے سقراط کی میت پر بیٹھا ہو پھر خاموشی سے اٹھا اور سقراط سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔

دوسرے دن ایتھنز کے بازاروں میں وہی چمکیلی دھوپ نکلی جو نکلتی تھی۔ دکانیں بھی اسی طرح کھلیں۔ بے فکروں کے قہقہے بھی اسی طرح گونج رہے تھے۔ دوپہر تک یہی کیفیت رہی لیکن دوپہر کے بعد ایک پُراسرار خاموشی پہرا دینے لگی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

”سقراط کو عدالت نے طلب کر لیا ہے۔ اس پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ ان دیوتاؤں کو نہیں مانتا جن کا شہر معتقد ہے۔“

”یہ بھی سنا گیا ہے کہ مقدمہ دائر کرنے والے نے عدالت سے درخواست کی ہے کہ اسے موت کی سزا دی جائے۔“

”اگر یہ الزام ثابت ہو گیا تو موت کی سزا تو ہونا ہی ہے۔“

”الزام تو ثابت ہو ہی جائے گا کیونکہ انیطوس بھی اس کے خلاف ہو گیا ہے۔ وہ ایسا مقرر ہے کہ جھوٹ کو سچ ثابت کر دے۔“

”سقراط اتنا برا تو نہیں کہ اسے موت کی سزا دی جائے۔ وہ تو بے ضرر سا آدمی ہے۔ اس کے خیالات کچھ بھی ہوں لیکن وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ اپنی جوانی میں اس نے وطن کے دفاع کے لیے جنگیں بھی لڑی ہیں۔“

”اس پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ وہ نوجوانوں کو گمراہ کر رہا ہے اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات میں ملوث ہے۔“

”یہ تو وہ نوجوان ہی بتا سکتے ہیں لیکن برا ہو گا اگر سقراط کو سزا ہو گئی۔ ویسے بھی اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ خود ہی مر جائے گا۔ عدالت کیوں اپنے ہاتھ اس کے خون سے رنگ رہی ہے۔“

”ہمارے تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہو گا وہی جو بڑے چاہیں گے۔“

”ہاں بھائی، یہ تو ہے۔“

”قدیم رسم کے مطابق اس کے بیوی بچوں کو ماتمی لباس پہنا کر عدالت میں لایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے عدالت اپنا فیصلہ بدل دے۔“

”ہو تو سکتا ہے لیکن سقراط ہے بہت ضدی وہ کبھی معافی نہیں مانگے گا۔“ بازار میں ملے جلے اثرات تھے۔ کچھ لوگ اس کے حق میں بھی باتیں کر رہے تھے۔

”اگر سقراط نے جرح شروع کر دی تو تم جانتے ہو وہ کس طرح معاملے کو الٹ کے رکھ دیتا ہے۔“

”حقیقت تو یہ ہے کہ اس جیسا دانشمند ایتھنز میں دوسرا کوئی نہیں۔“

”بھائی یہ تو سچ ہے کہ اس نے لوگوں کے ذہن تبدیل کر دیے ہیں۔“

”اس کی قدر اس کے جانے کے بعد ہو گی۔“

کئی دن تک باتوں سے بازار بھرے رہے بالآخر وہ دن آ گیا جب سقراط کو عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ صبح ہوتے ہی افلاطون اس کے گھر پہنچ گیا۔ کچھ اور دوست بھی آ گئے تا کہ اس کے ساتھ عدالت جائیں۔ عدالت کو بھی تو معلوم ہو کہ اس کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہیں۔ یہ سب دوست اور شاگرد رنجیدہ نظر آ رہے تھے لیکن سقراط ہمیشہ کی طرح خوش بھی تھا اور چاق و چوبند بھی۔ دوستوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ

مزید دمکنے لگا۔ تیار تو بیٹھا ہی تھا۔ اپنی چادر کندھے پر ڈالی اور دوستوں کے ہمراہ گھر سے نکل آیا۔ وہ جس بازار سے گزرتے تھے لوگ سقراط کو دیکھ کر تاسف کا اظہار کرتے تھے۔ بعض جگہوں پر اس کے حق میں نعرے بھی بلند ہوئے۔

ایتھنز کے پانچ سو ایک شہری جو بذریعہ قرعہ اندازی جیوری کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ عدالت میں پہنچ گئے۔ سقراط کے حاضر ہوتے ہی افتتاحی دعا پڑھی گئی اور کارروائی کا آغاز ہو گیا۔

سقراط پر جو الزامات تھے پڑھ کر سنائے گئے۔ وہ ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا اور جب صفائی پیش کرنے کے لیے اس کا نام پکارا گیا تو اس نے کہنا شروع کیا لیکن عجیب بات یہ کہ اس نے عدالت کی بجائے شہریوں کو مخاطب کیا۔

”ایتھنز کے لوگو! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جس وقت مجھ پر الزام لگانے والے تقریریں کر رہے تھے اس وقت تم کیا محسوس کر رہے تھے لیکن میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تقریریں سن کر میں یہ بھول گیا تھا کہ میں کس طرح کا آدمی ہوں پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ سچ تو انہوں نے بالکل بولا ہی نہیں۔ ایتھنز کے لوگو جو کام میں اس وقت انجام دے رہا ہوں اس پر دیوتاؤں نے مجھے مامور کیا ہے۔ دیوتا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فلسفے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں لہٰذا اگر میں موت کے ڈر سے اپنے مقام پر ڈٹا نہ رہوں تو یہ فعل نہایت برا ہوگا۔“ اس کی تقریر جوں جوں آگے بڑھتی گئی مخالفت کی ایک لہر سی ابھرتی چلی گئی۔

”مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ اپنے بیوی بچوں کو ماتمی لباس پہنا کر لاؤں تاکہ مجھ پر رحم کھایا جائے۔ ایتھنز والوں جیوری کے ارکان نے تو قانون کے مطابق فیصلے کرنے کا حلف اٹھایا ہے۔ میں انہیں یہ ترغیب کیوں دیتا کہ وہ قانون کے خلاف فیصلہ کریں۔ اگر میری سزا موت ہے تو وہ اس سزا میں تخفیف کیوں کریں۔ اگر تم مجھے اس شرط پر معاف کر دو کہ میں اب خاموش رہوں تو میں اس شرط پر رہا ہونے سے انکار کرتا ہوں۔“

اس کے اس اعلان کے ساتھ ہی کچھ دیر کے لیے سناٹا پھیل گیا پھر عدالت کا کمرا آوازوں سے گونجنے لگا۔ ہر شخص رائے زنی کر رہا تھا کہ دیکھیے عدالت کیا فیصلہ کرتی ہے۔

ان آوازوں کو کاٹتے ہوئے ایک آواز بلند ہوئی یہ نقیب کی آواز تھی جو رائے شماری کا اعلان کر رہا تھا۔

مٹکے ایک طرف رکھ دیے گئے۔ ایک حمایت کے لیے دوسرا مخالفت کے لیے۔ جیوری کے پانچ سو ایک ارکان ایک ایک کر کے ان مٹکوں میں اپنا ووٹ ایک ایک کر کے ڈالتے رہے۔

رائے شماری کے بعد وہ صرف تیس ووٹوں سے مجرم ثابت ہوا۔ فرق اتنا کم تھا کہ اس کی سزا بہ آسانی جلاوطنی میں بدل سکتی تھی۔ اس سے کہا بھی گیا تھا کہ وہ یہ درخواست کرے اس کے دوستوں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن اس نے یہ کہہ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

”جب میں اپنے وطن میں سچ بولنے کی پاداش میں یہاں کھڑا ہوں تو کوئی اور سرزمین مجھے کیسے برداشت کرے گی اور خاموش میں رہ نہیں سکتا۔ مجھے موت کی سزا دے دی جائے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ ایتھنز کے لوگ سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔“

جب مجرم خود سزا مانگ رہا تھا تو عدالت کیا کرتی۔ قید خانے کے حکام آئے اور اسے لے گئے۔

اسے دوسرے دن موت کو گلے لگانا تھا لیکن ایک اتفاقی حادثے نے اس کی موت کو ایک مہینے کے لیے ٹال دیا۔ یہ ایک مہینا اس کے دوستوں کے لیے بہت تھا۔

افلاطون سرگرم ہو گیا کہ کسی طرح اسے قید خانے سے نکال کر تھیسلی بھیج دیا جائے۔ افلاطون نے کرائٹو کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور دونوں مل کر اس کے فرار کے لیے کوششیں کرنے لگے۔ افلاطون ایک نامور خاندان کا فرد تھا۔ اس کے پاس نہ تعلقات کی کمی تھی نہ رشوت دینے کے لیے رقم کی۔ اس نے بھاری رشوت کا وعدہ کر کے جیلر اور پہرے داروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ایک ایسے آدمی کا انتظام بھی کر لیا جو سقراط کو تھیسلی تک پہنچا سکتا تھا۔ تمام انتظامات کرنے کے بعد جب سقراط سے بات کی گئی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میرے ملک کے قانون نے مجھے موت کے قابل سمجھا ہے میں یہ قانون نہیں توڑ سکتا۔“

یہی جواب وہ اس وقت بھی دے چکا تھا جب مقدمہ چلنے سے پہلے افلاطون نے اسے فرار کا مشورہ دیا تھا۔ افلاطون سمجھ گیا کہ اب اسے رضامند نہیں کیا جا سکتا۔ افلاطون اور کرائٹو کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں کہ سقراط نے موت کے فلسفے پر گفتگو شروع کر دی۔ موت کے معنی کیا ہیں اس کے بعد کیا ہوگا۔ کیا موت، زندگی ختم ہونے کا نام ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، افلاطون اسے سننے سے قاصر تھا۔ صدمے نے اس کی سماعت اس سے چھین لی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے یہ الفاظ ادا کیے۔

''اب میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''اب میری فکر چھوڑو اپنا خیال رکھنا۔''

اب کرائٹو کی بھی ہمت ہوئی۔ ''ہم آپ کو کیسے دفن کریں۔''

''مرنے کے بعد میں ''آپ'' نہیں رہوں گا۔ میں تمہارے پاس نہیں رہوں گا۔ میرا جسم ہوگا جو تمہارے پاس ہوگا۔ اس کے ساتھ جو بھی چاہو سلوک کرنا۔''

وہاں بیٹھے بیٹھے افلاطون کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ مایوسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ مایوسی یہ تھی کہ وہ ہزار کوشش کے بعد بھی سقراط کو بچا نہیں سکا تھا اور اب کوئی اُمید نظر بھی نہیں آرہی تھی۔ اس کی ٹانگیں اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں۔ اس نے کئی مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر اٹھ نہ سکا۔ اس نے اُمید بھری نظروں سے کرائٹو کی طرف دیکھا۔

''کرائٹو، کیا تم میرے ساتھ میرے گھر تک چل سکتے ہو؟''

''کیوں ایسی کیا ضرورت پیش آگئی۔''

''میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں اس قابل بھی نہیں کہ گھر تک جا سکوں۔ تم مجھے گھر چھوڑ کر آجاؤ۔''

کرائٹو ابھی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا کہ سقراط کی بیوی اور بچے کئی دوسری عورتوں کے ہمراہ سقراط سے ملاقات کے لیے آگئے۔ اب کرائٹو کو وہاں سے ہٹنا ہی تھا۔ اس نے افلاطون کو سہارا دیا اور سقراط کو اکیلا چھوڑ دیا۔

افلاطون گھر پہنچتے ہی بستر پر گر گیا۔ ایک دن اور ایک رات اس پر غشی طاری رہی۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ اس کی آنکھ کھلی تو ایتھنز اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ ایتھنز کی روشنی ایک قبر میں دفن ہو چکی تھی اور وہ قبر تھی سقراط کی۔

افلاطون نے ہوش میں آتے ہی سقراط کے بارے میں پوچھا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے سوتے ہی وہ سب کچھ ہو گیا جس کا اسے خدشہ تھا۔ حکومت نے یہ دیکھتے ہی کہ سقراط کے حق میں آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں اسے بہت جلدی میں اسی رات زہر کا پیالہ پلا دیا جس رات وہ سقراط کے پاس سے اٹھ کر آیا تھا۔

''آمریت کے دور میں تو زباں بندی کا حکم جاری کیا گیا تھا جمہوریت پسندوں نے اس آواز کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ جمہوریت پسند تو آزادی اظہار کا دعویٰ کرتے ہیں کہنے اور کرنے میں کتنا تضاد ہے۔ سیاست ہے ہی بری چیز۔ چاہے وہ آمریت کا دور ہو یا جمہوریت کا۔''

سقراط کی ناحق موت نے اسے جمہویت سے متنفر کر دیا۔

وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر نکلا لیکن پھر گھبرا کر واپس آگیا۔ ایتھنز کے بازاروں کو دیکھ کر اسے یوں لگا جیسے ایتھنز ابھی ابھی کسی جنگ سے گزرا ہو۔ یہ اس کی نظر کا دھوکا تھا یا کیا تھا لیکن ایتھنز ویران پڑا تھا۔ بعض جگہوں پر اس نے سقراط کے بارے میں ہونے والی گفتگو سنی۔ لوگوں کو اب پچھتاوا ہو رہا تھا کہ انہوں نے سقراط کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ کئی جگہوں پر اس نے یہ باتیں سنیں کہ کسی ممکنہ شورش کو دبانے کے لیے سقراط کے شاگردوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ افلاطون تو بہت ہی زیادہ خطرے میں تھا۔ آمریت کے دور میں اس کے بہت سے رشتے دار حکومت میں شامل تھے۔ اس کے ماموں اور تایا نے سیکڑوں جمہوریت پسندوں کو قتل کیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کچھ بعید نہیں کہ اس کے رشتے داروں کا انتقام اس سے لیا جائے گا اور سقراط سے تعلق رکھنے کے جرم کو جواز بنا کر اسے گرفتار کر لیا جائے۔

سقراط کے دیگر تلامذہ گرفتاری سے بچنے کے لیے میگارا کا رخ کر رہے تھے۔ اس نے بھی ایتھنز چھوڑ دیا اور میگارا کے ایک مقام یوکلینڈ میں رہ کر اس وقت کے فلسفیانہ نظریات کا تفصیلی مطالعہ کرنے لگا۔ فیثا غورث کی چند تصنیفات ہاتھ لگ گئیں ان کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔ میگارا میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ مختلف ملکوں اور شہروں کی سیاحت کرتا ہوا مصر چلا گیا۔ مصر بھی قدیم تہذیبوں کا ایک نادر نمونہ تھا۔ دانش مندوں کا ملک تھا۔ تعلیم کے مواقع تھے۔ فیثا غورث کی تعلیمات سے وہ کسی حد تک واقف ہو چکا تھا جس میں ریاضی کا بہت عمل دخل تھا۔ اس نے ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ علم نجوم اس نے یہیں رہ کر حاصل کیا یہاں سے وہ اٹلی چلا گیا۔ غالباً فیثا غورث کی کشش ہی اسے اٹلی لے کر گئی تھی۔ اس سے پہلے ایتھنز میں وہ اسے دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

یونان کے اردگرد سمندر میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ساموس واقع ہے۔ اس جزیرے میں حضرت مسیح سے چھ صدی پہلے 582 قدیم میں فیثا غورث پیدا ہوا۔ اس کا باپ نہایت دولت مند شخص تھا جس نے اپنے بیٹے کی تربیت پر بے دریغ روپیا صرف کیا۔ اس کو اعلیٰ تعلیم، دینے کے لیے بہترین اتالیق مقرر کیے۔ فیثا غورث کی عمر صرف بیس سال تھی کہ وہ حصول علم کا جذبہ لے کر کسی طویل سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہ پہلے بابل پہنچا جو قدیم دنیا کا سب سے مشہور شہر تھا۔ یہ شہر اس زمانے میں بھی علوم وفنون کا مرکز تھا۔ جب یونانیوں کی حالت وحشیانہ تھی۔ اس نے یہاں رہ کر یہاں کے مشہور اساتذہ سے جتنا ممکن ہوسکا علم حاصل کیا۔ یہاں سے اس نے مشرق کی راہ لی اور کئی برس سفر کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد وہ برعظیم پاک وہند کے اس علاقے میں پہنچا جو اب بہار کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں اس کی ملاقات بدھ مت کے بانی گوتم بدھ سے ہوئی۔ یہ صرف ملاقات نہیں تھی بلکہ وہ گوتم بدھ سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ کسی شاگرد کی طرح ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے خیالات سے واقفیت حاصل کرتا رہا۔ ان اصولوں سے واقفیت حاصل کرتا رہا جو بدھ مت کی بنیاد ہیں۔

چند برس بہار میں گزارنے کے بعد وہ مصر چلا گیا اور مصری عالموں سے جیومیٹری کا علم حاصل کیا اور پھر اپنے غور وفکر سے اس میں چند جدید علمی مسائل دریافت کیے۔

وہ جب یونان سے روانہ ہوا تھا تو ایک نوجوان لڑکا تھا لیکن جب طویل سفر سے واپس آیا تو اس کی عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی تھی اور وہ ایک سنجیدہ مزاج مفکر بن چکا تھا۔

اس نے سب سے پہلے اٹلی کے ایک مشہور شہر کروٹونا میں بود وباش اختیار کی۔ یہاں اس نے اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی ایک بستی بسائی تھی۔ اس بستی میں وہ لوگ اشتراکی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اپنی ساری دولت برادری کے مشترکہ فنڈ میں شامل کرتے رہتے تھے اور پھر اس مشترکہ فنڈ سے تمام اراکین اپنی ضرورت کے مطابق بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی امیر ہو اس کے لیے اپنی ساری نقدی اور پونجی مشترکہ کھاتے میں داخل کرنا لازمی تھا۔ اس مشترکہ خزانے کا اہتمام چند منتخب افراد کرتے تھے جو ماہرین اقتصادیات کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اس مشترکہ فنڈ کو تجارت میں بھی لگاتے تھے جس کے منافع سے فنڈ بڑھتا رہتا تھا اور کچھ عرصہ

بعد دوگنا تگنا ہوجاتا تھا۔ اگر کوئی شخص برادری سے نکلنا چاہتا تو اس کا روپیا منافع کے ساتھ اس کو واپس کر دیا جاتا تھا۔

فیثا غورث کے فلسفے میں عورت کا بہت احترام تھا اور وہ عورت کو ترقی کی راہ میں مردوں کے دوش بدوش دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے حلقے میں عورتیں بھی برابر شریک ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض تو علمیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچ گئی تھیں۔ انہی فاضل عورتوں میں اس کی اپنی بیوی بھی تھی۔

فیثا غورث کو اعداد سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ اس کا یہ مقولہ کہ دنیا میں صرف اعداد ہی حقیقی اشیا ہیں بہت مشہور ہے۔ اس نے موسیقی کے پیمانے پر بھی تحقیقات کی تھیں اور موسیقی کے درمیانی وقفوں کا پتا لگایا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک آلہ بھی ایجاد کیا تھا جو بلاشبہ سائنس کے قدیم ترین آلات میں سے تھا۔

چاند کے متعلق فیثا غورث نے پہلی بار یہ حقیقت بیان کی کہ اس کی روشنی اصلی نہیں بلکہ وہ سورج سے روشنی لیتا ہے اور پھر اسے زمین کی طرف منعکس کر دیتا ہے۔

افلاطون جب اٹلی پہنچا تو فیثا غورث کی آباد کردہ بستی عروج پر تھی۔ وہ فیثا غورث سے ملاقات کے لیے اس بستی میں پہنچا۔ بوڑھا فیثا غورث خود بھی علم کا شائق تھا اور علم کے طلب گاروں کا قدر دان بھی تھا۔ وہ افلاطون کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ افلاطون، سقراط کا شاگرد ہے تو وہ اس کی طرف مزید متوجہ ہوا۔ افلاطون جانتا تھا کہ سقراط، فیثا غورث کا مخالف نہیں تھا۔ اسے وہ زمانہ یاد آگیا جب فیثا غورث، ایتھنز آیا تھا۔ اس کی رسائی فیثا غورث کے چند نظریات تک تھی لیکن اب وہ اس کے فلسفے سے پوری طرح آشنا ہو رہا تھا۔ اس کی بستی کے اشتراکی اصولوں کا بھی قائل ہوتا جا رہا تھا بلکہ دل سے قائل ہو گیا تھا۔ اس نے وہاں کے ایک شخص سے کہا بھی تھا کہ وہ ان اصولوں کو اپنے فلسفے کا حصہ بنائے گا۔ وہ فیثا غورث کے اعداد و شمار کے فلسفے سے بھی اتنا متاثر ہوا کہ اسے بھی اپنے فلسفے کا حصہ بنا لیا۔

فیثا غورث کو موسیقی سے خاص شغف تھا۔ اس کے شاگردوں کا روزمرہ کا پروگرام علی الصباح موسیقی سے شروع ہوتا تھا۔ افلاطون اس سے اتنا متاثر ہوا کہ خود اس کے فلسفے میں موسیقی کو خاص مقام حاصل ہوا۔

فیثا غورث کی بہت سی باتوں کو وہ اپنی یادداشت میں محفوظ کر کے اٹلی سے سسلی چلا گیا۔ یہاں اس کا کوئی واقف کار نہیں تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا کہ اس کی دوستی ایک شخص ڈیان سے ہو گئی جو بادشاہ کا مشیر تھا۔

سسلی میں ڈائنو مین نامی بادشاہ کی حکومت تھی۔ وہ مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اس نے یونانی ریاستوں سے اچھے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اس کے دربار میں علم دوستی اور فن پروری عروج پر تھی۔

ڈیان سے افلاطون کی دوستی پرورش پا رہی تھی۔ جب بے تکلفی ہو گئی تو ڈیان نے یہ بتانے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کیا کہ اس کا تعلق فیثا غورثی جماعت سے ہے۔ اس جماعت کے لوگ خفیہ رہتے تھے اور کسی کے سامنے اپنی شناخت ظاہر نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے کچھ مخصوص علامتی نشان مقرر کر لیے تھے جس سے وہ ایک دوسرے کو پہچان لیتے تھے۔ ان علامتوں میں بعض ایسے معنی پوشیدہ ہوتے تھے جن کو فیثا غورث کے سوا کوئی اور نہ سمجھ سکتا تھا۔

ڈیان کو جب معلوم ہوا کہ افلاطون فیثا غورث کے لیے دل میں عقیدت رکھتا ہے اور اس کے نظریات سے متاثر ہے اور اس سے ملاقات کر چکا ہے تو اس نے اپنی شناخت ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

ڈیان پہلے ہی افلاطون کی علمی حیثیت کا اندازہ کر چکا تھا اور دل میں قائل ہو چکا تھا کہ اسے بادشاہ کے دربار میں ہونا چاہیے۔ اس نے افلاطون کو ڈائنوسیس کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ اس سے مل کر اتنا خوش ہوا کہ اسے درباریوں میں شامل کر لیا۔ افلاطون نے اس کثرت سے مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا کہ دنیا بھر کے علوم کا خزانہ بن گیا تھا۔ اسے یہاں اپنی صلاحیتوں کے ظہور کا ایسا موقع ملا کہ بادشاہ اس کی گرفت میں آگیا۔ وہ اسے ایک پل کے لیے خود سے جدا ہونے نہ دیتا۔ یہ افلاطون کی زندگی کا سنہری دور تھا۔ بادشاہ اس پر دولت نچھاور کر رہا تھا۔ افلاطون کو یہاں ایسی فراغت ملی ہوئی تھی کہ اس نے اپنے تجربات کو قلم بند کرنا شروع کر دیا۔ جن اساتذہ سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی ان کے نظریات کو اپنے نظریات سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔

وہ ابھی اپنے خیالات کو مجتمع کر ہی رہا تھا کہ محلاتی سازشوں نے رنگ دکھایا۔ بادشاہ اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ دوسرے درباریوں کو یہ قربت ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے بادشاہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ اس کے خلاف اتنا بھڑکایا کہ بادشاہ اس کی طرف سے بدگمان رہنے لگا۔ طبقہ

اشرافیہ مسلسل پیچھے لگا ہوا تھا۔ انہی دنوں کوئی ایسی بات اس کے منہ سے نکل گئی کہ بادشاہ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا پھر اس کی دربدری کے احکامات جاری ہو گئے۔ اسے یونان جانے والے ایک جہاز پر چڑھا دیا گیا۔

وہ اب بھی مطمئن تھا کہ سسلی سے نکال ضرور دیا گیا ہے لیکن وہ بے وطن نہیں۔ یہ جہاز یونان جا رہا ہے وہ ابھی اپنے وطن ایتھنز چلا جائے گا۔ ایتھنز کا خیال آتے ہی اسے اپنی ماں یاد آئی۔ رشتے داروں کا خیال آیا۔ اسے یونان سے نکلے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے جب ایتھنز چھوڑا تھا۔ شباب کی منزلوں میں تھا اور اب ادھیڑ عمر ہو چکا تھا۔ جب تک تحصیل علم میں مشغول رہا اسے ایتھنز کا خیال تک نہ آیا لیکن اب وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ سقراط کو مرے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اب اس کے سامنے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب وہ ایتھنز میں آرام کے دن گزار سکتا تھا۔ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو سکتا تھا۔ وہ ایتھنز جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔

یہ تو اسے بعد میں معلوم ہوا کہ سپارٹا کا سفیر بھی اس جہاز میں سفر کر رہا ہے البتہ یہ اسے معلوم نہیں تھا کہ سپارٹا اور ایتھنز میں دوبارہ جنگ چھڑ گئی ہے اس لیے وہ اس سفیر کی طرف سے بے فکر تھا۔

سپارٹا کے سفیر کو در پردہ یہ ہدایت مل چکی تھی کہ اس جہاز پر افلاطون سفر کر رہا ہے اسے کسی طرح ٹھکانے لگا دو۔ ایک روز وہ سفیر افلاطون سے ملاقات کے لیے آیا اور اس کی بہت کچھ تعریف کرنے کے بعد اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

”اب ایتھنز والوں سے ہماری دشمنی ختم ہو چکی ہے۔ سپارٹا والے تمہاری تو بہت ہی قدر کرتے ہیں۔ انہیں یہ افسوس ہمیشہ رہتا ہے کہ تم محض ہماری وجہ سے ایتھنز چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“

”میں سپارٹا والوں کی وجہ سے نہیں گیا تھا۔ سقراط کے سیاسی قتل نے مجھے مجبور کیا تھا۔“

”اچھا ہوا تم نے وضاحت کر دی۔ اگر تمہارے دل میں ہماری طرف سے کوئی بات نہیں تو پھر دوستی پکی ہے۔“ سفیر نے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ ”تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔“

وہ ایک منصوبے کے تحت افلاطون کو اعتماد میں لیتا جا رہا تھا۔ جہاز ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ افلاطون، حالات سے بے خبر سفیر کی دوستی اور جہاز کی سیر سے لطف اندوز ہوتا رہا یہاں تک کہ جہاز آئی گینا کے جزیرے پر رکا۔

”آؤ ذرا جہاز سے نیچے اتر کر جزیرے کی سیر کرتے ہیں۔“

سفیر اسے جہاز سے نیچے لے آیا۔ وہ ایک منصوبے کے تحت افلاطون کو جزیرے پر لایا تھا۔ آئی گینا کی حکومت جنگ میں سپارٹا کی حامی تھی۔ یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ جزیرے پر ایتھنز کا کوئی باسی نظر آئے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔ جب وہ غلاموں کی منڈی کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا منصوبہ بدل دیا۔ وہ منڈی کے مہتمم کے پاس گیا اور اسے افلاطون کے بارے میں بتایا۔ اس نے افلاطون کو فوراً خرید لیا۔ اس اُمید میں کہ نہایت بھاری قیمت پر فروخت ہو گا کیونکہ غلام ایتھنز سے تعلق رکھتا ہے۔

سفیر نے افلاطون کو وہیں چھوڑا اور خود جہاز پر آ گیا۔ کچھ دیر بعد جہاز روانہ ہو گیا۔ افلاطون ایک جگہ بیٹھ کر سفیر کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں دو مقامی باشندے اس کے پاس آئے۔

”سپارٹا کا سفیر تمہیں بلا رہا ہے۔“

”وہ تو مجھے یہاں بیٹھا کر گیا ہے۔“

”اب ایک اور جگہ بلا رہا ہے۔“

افلاطون کو اس کے بارے میں کیا شک ہو سکتا تھا۔ وہ اٹھا اور ان دو آدمیوں کے ساتھ چل دیا۔ وہ اسے ایک پہاڑ کے پیچھے لے گئے۔ وہاں کچھ لوگ اور موجود تھے اسے ایک جوڑا کپڑوں کا دیا گیا۔

”یہ کپڑے پہن لو۔“

”یہ تو غلاموں کے پہننے کے کپڑے ہیں۔“

”تم اب غلام ہی ہو۔ شکر کرو کہ غلام بن کر زندہ رہو گے ورنہ حکم تو یہ ہے کہ ایتھنز کا کوئی باشندہ یہاں مل جائے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔ موت یا غلامی سے کوئی ایک چیز منتخب کرو۔“

افلاطون جس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ایک شخص تلوار لیے اس کے سر پر کھڑا تھا کہ غلاموں کی منڈی میں بکنے کے لیے تیار ہو جاؤ یا موت قبول کر لو۔ افلاطون نے سوچا کہ اگر زندہ رہا تو فرار کی کوئی نہ کوئی صورت باقی رہے گی۔ شاید بھاگنے کا موقع مل ہی جائے۔ اس نے غلام بننا منظور کر لیا۔ منظوری ملتے ہی اسے منڈی میں پہنچا دیا گیا۔ لوگ اس طرح غلاموں کی خرید و فروخت کر رہے تھے جس طرح مویشی بکتے ہیں۔

چرب زبان دکان دار غلاموں کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ ان کی صفات گنوا رہے تھے۔ خریدار بھی ان غلاموں کو اچھی طرح دیکھ بھال رہے تھے کہ ان میں کوئی عیب کوئی خامی تو نہیں۔ انہیں چلا پھرا کر دیکھا جارہا تھا۔ ان سے گفتگو کر کے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جارہا تھا۔ اسے بھی ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا۔ اس کی عمر زیادہ ہوگئی تھی اس لیے اسے خریدنے والے کم ہی تھے۔ اس سے گفتگو کرنے والے اس کی قابلیت دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ انہیں اس سے خوف آنے لگتا تھا کہ یہ کیسا غلام ہے جو کئی زبانوں کا ماہر ہے۔ عالموں کی طرح گفتگو کرتا ہے لیکن اسے خریدنے والے ناپید تھے۔

کئی دن گزر گئے اسے کسی نے نہیں خریدا۔ اسے بیچنے والے بھی تنگ آگئے تھے اور سوچنے لگے تھے کہ اسے قتل کر کے حکومت سے جو انعام ملتا ہے وہ لے لیا جائے۔ یہ لالچ بھی آتا تھا کہ اسے بیچنے کی صورت میں زیادہ رقم ملے گی۔ آخر ایک دن انہوں نے طے کرلیا کہ اگر آج یہ غلام فروخت نہ ہوسکا تو اسے قتل کر دیں گے۔ خوانخواہ اس کے کھانے کا خرچ اٹھایا جارہا ہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی دن ایک قیروانی فلسفی ''انسی اس'' کا گزر اس بازار سے ہوا۔ وہ غلاموں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک جگہ افلاطون کو کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ افلاطون کو اس کے نظریات کے حوالے سے جانتا تھا اور اس کا قدر دان تھا۔ اس کی علم دوستی کام آئی اور اس نے اس قیمتی غلام کو خرید لیا۔ افلاطون بھی اسے جانتا تھا۔ اس لیے خوش ہوا کہ وہ کسی عام آدمی کے ہاتھوں میں نہیں جارہا ہے۔

منڈی سے نکلتے ہی اس نے انسی اس سے کہا۔ ''مجھے یہ خوشی ہے کہ تم نے مجھے خریدا ہے۔ میں تمہارا غلام ضرور ہوں لیکن تم سے گفتگو کرنے میں لطف آئے گا۔''

''میں نے تمہیں اس لیے نہیں خریدا کہ تم میرے غلام بن کر رہو۔ میں نے تمہیں رہا کرنے کے لیے خریدا ہے تاکہ تم اپنی علمیت سے دنیا کو فائدہ پہنچاؤ۔ تم جب تک زندہ ہو میری نہیں فلسفے کی خدمت کرتے رہو۔ شاید تمہارے نام کے ساتھ تاریخ میں میرا نام بھی زندہ رہ جائے گا۔''

یہی ہوا بھی۔ فلسفی انسی اس تاریخ کی بھول بھلیوں میں کہیں گم ہو چکا ہوتا لیکن اس کی علم دوستی نے اسے زندہ رکھا۔ آج جب افلاطون کا نام آتا ہے تو انسی اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اگر اس نے افلاطون کو رہا نہ کروایا ہوتا تو دونوں گمنامی کی تاریکیوں میں گم ہو گئے ہوتے۔ افلاطون بھی، انسی اس بھی۔

افلاطون ایتھنز واپس پہنچا تو سپارٹا کی ایتھنز سے جنگ ختم ہو چکی تھی۔ بظاہر امن وامان تھا لیکن اس نے اپنے عہد شباب میں خون کے جو دھبے دیکھے تھے اور جمہوریت پسندوں کے ہاتھوں سقراط کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک دیکھا تھا اسے وہ بھولا نہیں تھا۔ اسے سیاست سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس نے ایک ایسے مفکر کا روپ دھار لیا جو اپنے نظریات سے ایتھنز کو ایک مستحکم اور پائدار حکومت دے سکے۔

وہ پوری دنیا کے علم کا نچوڑ لے کر ایتھنز آیا تھا لیکن اس کے خیالات پر سقراط اور فیثا غورث کے نظریات کی گہری چھاپ تھی۔ اس نے سقراط کی صحبت میں رہ کر جو کچھ سیکھا تھا اور اٹلی میں فیثا غورث کے ساتھ جو چند روز گزارے تھے۔ اب وہ انہیں عملی شکل دینے کا خواہاں تھا۔ وہ ایسے خیالات دنیا کو دینا چاہتا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر ایک مثالی معاشرہ تشکیل پا سکے اور ایسے لوگ تیار کرنا چاہتا تھا جو اس کے فلسفے کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔ اس نے اپنے رشتے داروں سے کچھ رقم لی اور ایک باغ خرید لیا۔ وہ فیثا غورث کو دیکھ چکا تھا کہ اس نے کس طرح ایک بستی بسائی ہے اور اس میں اپنے شاگردوں کی تعلیم وتدریس کا انتظام کیا ہے۔ اس کے پاس ابھی اتنے وسائل نہیں تھے اس لیے اس نے اس باغ میں ایک اکیڈمی قائم کی۔ اس اکیڈمی میں ریاضی، قانون اور سیاسی نظریات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا بلکہ عطیات کے ذریعے اکیڈمی کی ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا۔ اس اکیڈمی میں باقاعدہ لیکچر دیے جاتے تھے جو ذریعہ تعلیم تھے اس اکیڈمی کے ارکان ہر ماہ مل کر کھانا کھاتے تھے۔ وہ فیثا غورث کے فلسفہ اعداد سے بہت زیادہ متاثر تھا اس لیے ریاضی کو اعلیٰ سچائی کا علم قرار دیتا تھا۔ اس اکیڈمی میں وہ شخص داخل نہیں ہوسکتا تھا جو علم ہندسہ سے نابلد ہو۔

اسی باغ میں بیٹھ کر وہ اپنی بعض تصانیف کی طرف راغب ہوا۔ خیالات کو جمع کیا تو سقراط اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ کیا میری مظلومیت تم پر قرض نہیں؟ کیا تم میرے احوال سے دنیا کو آگاہ نہیں کرو گے؟ اس نے سقراط کے مقدمے کی روداد لکھنا شروع کردی۔ وہ سقراط کا شاگرد تھا اور سقراط کی تعلیمات مکالموں پر مشتمل تھی۔ وہ زندگی بھر مکالمے بولتا رہا تھا۔ افلاطون نے بھی مکالماتی انداز اختیار کیا۔ خیالات

افلاطون کے تھے اور مکالمے بولنے والا کردار سقراط تھا۔
افلاطون نے سقراط کی زبانی اس مقدمے کی روداد بیان کی۔
لکھ وہ رہا تھا لیکن سقراط اپنے حق میں دلائل دے رہا تھا۔

''آپ جج حضرات کو چاہیے کہ موت کے بارے میں اچھی توقعات وابستہ کریں۔ کم سے کم اس بات کی حقیقت پر ایمان رکھیں کہ ایک نیک آدمی کو کوئی برائی ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لیے میرا (سقراط) یہ انجام بھی محض اتفاق نہیں ہے بلکہ مجھے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ میرے لیے اب مرنا اور دنیا کی تکالیف سے چھٹکارا پانا ہی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے الہامی نشان نے مجھے ٹوکا نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میں ان سے قطعاً خفا نہیں جنہوں نے مجھے مجرم ٹھہرایا جنہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا۔ تاہم جب انہوں نے مجھ پر الزام لگائے تھے تو ان کی نیت یہی تھی کہ مجھے نقصان پہنچائیں۔ مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔ جب میرے بیٹے بڑے ہو جائیں اور پھر وہ اگر نیکی کے مقابلے میں مال و دولت کو ترجیح دینے لگیں تو آپ لوگ انہیں ایسے ہی تنگ کیجیے گا جیسے میں آپ لوگوں کو کیا کرتا تھا۔ اگر آپ لوگ ایسا کریں گے تو میں اور میرے بیٹے دونوں آپ کے ہاتھوں انصاف پائیں گے۔ اب جانے کا وقت آگیا ہے۔ ہم اپنے اپنے راستوں کی طرف جاتے ہیں۔ میں مرنے کو اور آپ زندہ رہنے کو۔''

اس کتاب کا نام افلاطون نے اپالوجی (Apology) رکھا۔

دوسری کتاب اس نے کرائٹو (Crioto) لکھی۔
اس کتاب میں سقراط کو بغیر کسی معقول الزام میں جیل میں ڈالے جانے اور وہاں سے فرار ہونے کی تشکیل اور سقراط کے انکار کے بارے میں مکمل دلائل لکھے۔ اس نے لکھا کہ سقراط نے زنداں سے فرار ہونے سے کیوں انکار کیا۔
سقراط عمر بھر ایتھنز کی تمام حکومتی پالیسیوں اور سیاسی رہنماؤں پر تنقید کرتا رہا تھا لیکن یہاں وہ اس بگڑی ہوئی ریاست سے اپنی عمیق اور سادہ وفاداری کا اظہار کرتا ہے۔
سقراط کے جو خیالات اس کتاب میں ظاہر کیے وہ یہ تھے کہ بے شک ایتھنز نے اپنے اداروں کی غلط روی سے اسے غیر منصفانہ طور پر موت کی سزا سنائی لیکن عمر کے جو ستر سال اس نے ایتھنز میں بسر کیے وہ ریاست کے قوانین اور رسوم کے ساتھ ایک خاموش مشاق کی حیثیت رکھتے ہیں۔
سقراط اس تحفظ کا شکر گزار ہے جو ان قوانین کی وجہ

جذبہ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے
عزیز الرحمن نے اپنی کتاب 'قلم مجلس، المعروف، شعروں کی ڈکشنری جلد اول میں اس شعر کو انشا اللہ خان انشا سے منسوب کیا ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا ہے جبکہ انشا کی کسی معتبر کلیات میں یہ شعر کہیں موجود نہیں ہے۔
ڈاکٹر شفیق علی خان نے اپنی کتاب اردو کے ضرب المثل اشعار میں اس شعر کو داغ دہلوی کے نام لکھا ہے۔
شمس بدایونی نے بھی اپنی کتاب، شعری ضرب المثل، جلد دوئم؛ روشن پبلی کیشنز بدایوں 1988ء، میں اس شعر کو داغ کے نام لکھا ہے جب کہ داغ دہلوی کے چاروں شعری مجموعوں ہگل زار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ، اور یادگار داغ میں یہ شعر کہیں نہیں ہے اور نہ ہی کسی معتبر کلیاتِ داغ میں یہ موجود ہے، درحقیقت یہ شعر کسی غیر معروف شاعر کا ہے داغ، یا انشا کا ہرگز نہیں۔
(ذرہ حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

سے اسے نصیب ہوا۔ وہ بدی کا جواب بدی سے دینا نہیں چاہتا اور نہ ہی قانون کی خلاف ورزی اسے منظور ہے۔
سقراط پر بدکاری کا الزام لگایا گیا۔ افلاطون نے اگلی کتاب میں مکالماتی انداز میں نیکی اور تقویٰ پر بحث کی اور اس الزام کے مہمل ہونے پر بحث کی۔
سقراط عدالت جا رہا ہے جہاں اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ راستے میں اسے ایوتھر فرو نامی نوجوان ملتا ہے جو انصاف کی خاطر خود اپنے باپ جس نے بڑی بے دردی سے ایک غلام کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا پر مقدمہ دائر کرنا چاہتا ہے۔ اس حوالے سے سقراط ارتقا پر بات کرتے ہوئے معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایوتھر فرو کے ذہن میں اتقا کا کیا تصور ہے۔ یہاں سے مکالمے شروع ہوتے ہیں۔ ایوتھر و فرو ارتقا کی کئی تعریفیں پیش کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سقراط کی جرح کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس بحث کے خاص نقطے کے ذریعے بالواسطہ انداز میں سقراط پر عائد فرد جرم کے مہمل ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔ افلاطون نے وہ بیان بھی لکھ دیا جو سقراط نے عدالت کے سامنے دیا تھا۔
اس مکالمے کو پڑھ کر سقراط کے رویے کے شعوری اور

لاشعوری محرکات سے حیرت ناک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

وہ ان تصنیفات میں مشغول تھا کہ سسلی کے اس بادشاہ کا انتقال ہوگیا جس نے اسے ملک بدر کیا تھا۔ اس کے تخت پر اس کا بیٹا ڈیونی سی اوس دوم بیٹھا۔

ڈیان یا ڈیون جس سے افلاطون کی دوستی ہوگئی تھی اور جس کے توسط سے وہ بادشاہ کے دربار تک پہنچا تھا۔ ابھی اسے بھولا نہیں تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد جب اس کا بیٹا تخت پر بیٹھا تو ڈیان نے افلاطون سے رابطہ کیا اور اسے سسلی آنے کی دعوت دی تاکہ وہ سسلی میں رہ کر نئے بادشاہ کی تربیت کرسکے۔ افلاطون کے ذہن میں ایک مثالی ریاست کا نقشہ تھا۔ وہ سسلی کو اس کا عملی نمونہ بنانا چاہتا تھا اسی لیے وہ ایک ہی بلاوے پر سسلی چلا گیا لیکن یہاں آکر اسے نہایت تلخ تجربہ ہوا۔ اس نے نئے بادشاہ کو کسی اور ہی رنگ میں دیکھا۔ یہ بادشاہ پچھلے بادشاہ سے بھی گیا گزرا تھا۔ انانیت اور حسد کا پتلا تھا۔ وہ کچھ سیکھنے کی بجائے افلاطون کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی اپنے مشیر ڈیان سے بھی بگڑ گئی لہٰذا افلاطون ایتھنز واپس آگیا۔

اس کے ذہن میں جو ایک مثالی ریاست کا نقشہ تھا اور جسے وہ سسلی میں متعارف کروانا چاہتا تھا ایک خواب بن کر رہ گیا۔ اس خواب کو اس نے اپنی کتاب الجمہوریہ (Republic) میں بند کردیا۔ ایتھنز میں جمہوریت تھی لیکن اس کے فوائد حاصل نہیں ہورہے تھے۔ اس کتاب میں اس نے ان وجوہات کو تلاش کیا جو جمہوریت کو بے ثمر کررہے تھے اور ایک ایسا خاکہ پیش کیا جو ایک ریاست کو مثالی ریاست بناتا ہے۔

افلاطون کے بعد جن دانشوروں نے مثالی ریاست کا خاکہ پیش کیا وہ سب دانشور افلاطون کی اسی بے مثال تصنیف سے متاثر ہوکر ایسے خاکے بیان کرتے رہے ہیں۔ سب اسی کے خوشہ چیں ہیں۔

یہ کتاب افلاطون کی مثالی مملکت کے آئین کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے اپنی مثالی مملکت کا نظم ونسق چلانے کے لیے جن نظام ہائے زندگی کی ضرورت محسوس کی ان پر بحث کی ہے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ عدل کے بارے میں ہے اور دوسرے حصے میں سیاست کا تصور، مثالی ریاست اور عام دنیاوی ریاستوں کے فرق کو واضح کیا ہے۔ یہ کتاب محض ایک کتاب نہیں بلکہ افلاطون کے نظریات کا خزانہ ہے۔ مثالی مملکت کے اجزائے ترکیبی کے علاوہ زندگی کے بنیادی عمل کو اجاگر کرنے کے لیے اخلاقی، فلسفیاتی اور تاریخی بلکہ غیر سیاسی نظریے جو اس دور میں علم سیاسیات کا حصہ تھے بیان کیے گئے ہیں۔

افلاطون نے اپنے دور کے یونانی معاشرے کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عدل وانصاف کی بنیاد پر ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایتھنز میں اشتراکی نظام رائج کیا جائے۔

اس کا خیال تھا کہ سیاسی فتنوں پر صرف فلسفی حکمران قابو پاسکتے ہیں۔ اسی لیے اس نے صحیح فلسفی پیدا کرنے پر زور دیا جس کے لیے تعلیم اور معاشرے کی تنظیم میں کارفرما اخلاقی اصولوں پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔ اس نے اپنے خاکے میں معاشرے کو تین طبقوں میں تقسیم کیا۔ حاکم طبقہ جو ملک کے نظم ونسق کا ذمے دار ہوتا ہے۔ فوجی طبقہ جو ملک کو اندرونی اور بیرونی حملے سے محفوظ رکھتا ہے اور تیسرا اہم طبقہ مزدوروں، کسانوں اور ہنرمندوں کا ہوتا ہے۔ یہ طبقہ ریاست کے تمام افراد کے لیے ضروریاتِ زندگی مہیا کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ تمام طبقات کو یقین دلادیں کہ سب لوگ مادرِ وطن کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ مادرِ وطن سب طبقات کی مشترکہ ماں ہے۔

اس کتاب میں اگرچہ انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی تھی لیکن زیادہ تر توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر تھی۔ اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر ہے۔ فلسفے کی بلندی، اتحاد کا جلوہ، اخلاق کا سبق، تعلیم کے مسائل، سیاسی زندگی میں رہنمائی وغیرہ سب کچھ اس کتاب میں موجود ہے۔ افلاطون کے نزدیک ہر اچھا انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت یا ریاست کا رکن بنتا ہے اور چونکہ اچھا آدمی صرف اچھی ریاست میں پیدا ہوسکتا ہے اس لیے افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ اور پھر اس ریاست کے لیے فلسفۂ اخلاق اور پھر اجتماعی تعاون کے لیے تخصیص کار کے اصول پیش کرنے پڑے۔

افلاطون نے اس کتاب میں نظام تعلیم، ماہیت عدل اور نظام معیشت پر مفصل بحث کی ہے۔ افلاطون کے نزدیک عدل کوئی مہارت یا ہنرمندی نہیں بلکہ روح کی ایک صفت ہے اور ذہن کی ایک عادت ہے۔ حکومت اگر فن ہے تو اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا اور حکمران کے لیے اگر وہ سچا ہے بے غرض اور محکوموں کے مفاد کا

ضامن ہونا لازمی ہے۔ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانش مند زیادہ قوی اور زیادہ خوش حال ہوتا ہے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ شجاعت سے ریاست کی حفاظت کرے۔ دولت مندوں کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد متعین کریں اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست سے ان پر عمل کروائیں۔

اس کتاب میں افلاطون نے ریاست کی معیشت کو مضبوط کرنے کے لیے ایک اشتراکی نظام پیش کیا۔ اس نظام کی بدولت اسے تاریخ میں اشتراکیت کے بانی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

”لوگوں کو ذاتی ملکیت کی اجازت نہ ہو اور وہ حدود کے اندر رہ کر دولت ریاست کے لیے پیدا کریں۔“

”عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں اور وہ مردوں کے ساتھ مل کر ہر قسم کا کام کریں۔“

”حکمرانوں کو مال و دولت کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔“

”حکمران طبقے کا کوئی ذاتی مکان نہ ہوگا۔ ان کو مشترکہ میز پر ایک ہی جگہ مل کر کھانا کھانا ہوگا۔“

”محافظ طبقہ صرف ضروری جائداد رکھ سکے گا۔ فالتو املاک سے کوئی تعلق نہ رکھے گا۔“

اس کے نزدیک دنیا میں سب انسان مساوی نہیں اس لیے حکمران وہی ہو سکتے ہیں جنہیں فلسفی کہا جاتا ہے اور جو عقل مندی اور ذہانت میں اعلیٰ ترین مقام رکھتے ہیں۔ انہیں لامحدود اختیارات حاصل ہوں لیکن عیش و عشرت کے لیے مراعات کی اجازت نہ ہو۔

افلاطون اجتماعی مفاد کے لیے خاندانی اشتراکیت کے ذریعے مشترکہ اولاد کی تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہے کیونکہ مال و دولت کی طرح اولاد بھی ریاست کی ملکیت ہوگی۔ بچوں کو والدین سے پیدا ہوتے ہی الگ کر دیا جائے گا اور ریاستی دائیاں ان کی پرورش الگ طور پر کریں گی۔ اسی طرح بچوں کو اپنے والدین اور والدین کو اپنے بچوں کے بارے میں علم نہ ہوگا بلکہ وہ تمام بچوں کو اپنے ہی بچے سمجھیں گے۔ جس سے بچوں کی حق تلفی نہ ہوگی اور تمام ذہن اور قابل بچے اعلیٰ عہدوں تک پہنچیں گے۔

اس طرح نہ خاندان ہوگا نہ ہی حکمران ذاتی مفاد میں ٹکراؤ پیدا کریں گے۔

الجمہوریہ میں جو نظام تعلیم پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے ہے۔ پہلے حصے کی تعلیم کا مقصد شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لیے تیار کرنا ہے جبکہ دوسرے حصے کا مقصد ان میں سے چند کو حکمران کا اہل بنانا ہے۔ پہلے حصے میں جذبات کی تہذیب اور سیرت کی تربیت جبکہ دوسرے حصے میں فلسفہ و حکمت کی معرفت پیش نظر ہے۔

افلاطون نے اپنے نظریہ تعلیم میں انسانی ذہن پر ادب کے اثرات کو بہت کم اہمیت دی ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاضی کو زیادہ گہرے اثرات کا ذریعہ کہا ہے (یہ فیثا غورث کی صحبت کا نتیجہ تھا) اس نے اپنے نظریہ تعلیم میں موسیقی کو بھی بہت اہمیت دی تھی۔ یہ نظریہ بھی فیثا غورث کا چربہ معلوم ہوتا ہے۔

افلاطون کا کہنا تھا ”جو شخص موسیقی سے واقف نہیں اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔“

”جو شخص موسیقی سے نابلد ہوتا ہے اس کے جذبات غیر متوازن ہوتے ہیں۔ موسیقی کے معنی مکمل ہم آہنگی کے ہیں۔ موسیقی قابلِ سماعت ہو یا نہ ہو لیکن یہ طے شدہ اصول ہے کہ ایک آہنگ اور توازن ہی دنیا کو منتشر ہونے سے بچائے ہوئے ہے۔ سیارے اور ستارے اگر کائنات کا جسم ہیں تو موسیقی اس کی روح ہے۔ اگر یہ توازن نہ ہو تو زمین و آسمان ڈھیر ہو جائیں۔ اس لیے موسیقی ہر فرد کی تعلیم کے لیے ضروری ہے۔“

یہ تعلیم بیس سال تک کے لیے تھی۔ اس کے بعد ایک امتحان کے ذریعے انتخاب ہونا چاہیے۔ جو طالب علم اس امتحان میں نااہل ثابت ہو اسے مزدور، کسان یا تجارت پیشہ بنا دیا جائے۔ جو طالب علم اہل ثابت ہو اسے علم ہندسہ، علم ہیئت اور ریاضی کی تعلیم دی جائے۔ اس کا دورانیہ مزید دس سال ہو۔

اب ان کامیاب طلبہ کا تیس برس کی عمر میں سائنسی علوم کی تکمیل کے بعد امتحان ہو۔ جو طلبہ ناکام ہوں انہیں سپاہ گری کا کام سونپا جائے۔ جو طلبہ کامیاب ہوں ان کو مزید پندرہ سال فلسفے کی تعلیم دی جائے۔ یہ وہ ہوں گے جو فلسفی حکمران کا کردار ادا کرنے کے قابل ہوں گے۔

تعلیم حاصل کرنا یا نہ کرنا افراد کی مرضی پر نہ ہوگا بلکہ ریاست کے تمام افراد کو لازمی تعلیم دی جائے گی۔

ایتھنز میں سوفسطائی معلم نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم کے بعد سیاست اور خطابت کا درس دیتے تھے تاکہ ان فنون پر عبور حاصل کرنے کے بعد وہ سیاسی زندگی میں اعلیٰ مقام کو

حاصل کرسکیں۔ افلاطون خطابت کو خود فریبی کے مترادف سمجھتا تھا لہٰذا اس کے نصاب میں خطابت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اپنے نصاب تعلیم میں علم الحساب، علم الاشکال، موسیقی اور فلسفے کو ترجیح دیتا تھا۔ ان علوم میں فلسفے کو آخر میں اور باقی علوم کو ابتدا میں پڑھایا جاتا تھا۔ وہ ریاضی کی تعلیم کو فلسفے کی تعلیم کا پیش خیمہ قرار دیتا تھا۔

افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں نظام تعلیم کے جو تصورات پیش کیے تھے مختلف اقوام بالخصوص یورپی ممالک کے لیے سنگ میل ثابت ہوئے اور آج بھی مختلف ممالک میں حالات و ماحول کے مطابق ترمیم و اضافہ کے ساتھ رائج ہیں۔

اس کتاب کی ہر دور میں پزیرائی کی گئی۔ روسو کہتا ہے الجمہوریہ جیسی عظیم کتاب نظام تعلیم پر نہ اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ اس کے بعد لکھی جائے گی۔ جیورٹ کے مطابق الجمہوریہ ایک یونیورسٹی ہے۔ جان لاک لکھتا ہے کہ افلاطون نے اپنی اس تصنیف میں جو تعلیمی تصورات پیش کیے ہیں یہ تصورات ایک باضابطہ تعلیم کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ ابن خلدون کے مطابق الجمہوریہ کے تعلیمی تصورات یورپی ممالک کے نظام ہائے تعلیم کی فلسفیانہ اساس ہے۔

☆☆☆

افلاطون کی شہرت اب تمام ریاستوں میں پھیل چکی تھی۔ وہ اپنی اکیڈمی میں اپنے نظریات کے مطابق طلبہ کو تعلیم دے رہا تھا۔ اس اکیڈمی کو دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آ رہے تھے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی ایتھنز میں داخل ہو اور افلاطون سے ملے بغیر چلا جائے۔ ایتھنز کی حکومت بھی اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

ایک روز افلاطون اپنی اکیڈمی کے باغ میں ایک پیڑ کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ اس کا چہیتا شاگرد ارسطو اس کے قریب ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا یہ نوجوان مقدونیہ کا رہنے والا تھا اور افلاطون کی شہرت سن کر اس کی اکیڈمی میں آ گیا تھا۔ افلاطون کو اس سے بڑی امیدیں تھیں۔ وہ اسے اپنی اکیڈمی کا موتی کہتا تھا۔ ارسطو بہت ذہین تھا۔ اس کی یہی ذہانت کبھی کبھی افلاطون کے نظریات سے اختلاف پر آمادہ بھی کردیتی تھی جسے افلاطون ہنس کر ٹال دیتا تھا یا مزاحاً یہ فقرہ کہتا تھا۔

''ارسطو وہ بچھڑا ہے جو سارا دودھ پی کر ماں کو دولتیاں مار رہا ہے۔''

اس وقت بھی وہ افلاطون سے کسی اختلافی بحث میں الجھا ہوا تھا کہ کسی اجنبی شخص کو اس طرف آتے ہوئے دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ کتنے ہی لوگ تھے جو افلاطون سے ملنے کے لیے آتے رہتے تھے۔ ارسطو نے اس کے بیٹھنے کے لیے زمین صاف کی۔ وہ شخص آیا اور زمین پر افلاطون کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''میں سسلی سے آیا ہوں۔ آپ کے دوست ڈیان (ڈیون) نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میں اس کا ایک پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''اگر تم کہو تو میں اپنے اس شاگرد کو یہاں سے ہٹا دوں؟''

''اگر یہ یہاں موجود بھی رہے تو کوئی حرج نہیں۔''

''پھر جو تمہیں کہنا ہے وہ کہو۔''

''ڈیان نے آپ کو ایک مرتبہ پھر سسلی بلایا ہے۔''

''جب تک ڈیونی سی اوس دوم زندہ ہے اس کی کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوسکتیں۔ میرا وہاں جانا بے کار ہے۔''

''یہ پیغام دراصل ڈیونی سی اوس کی طرف سے ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ڈیان کے بارے میں افلاطون کی خواہشات کا احترام کرے گا۔ آپ اگر اپنے نظریات کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں تو یہ بہترین موقع ہے۔''

افلاطون کو ایک مرتبہ پھر امید ہوگئی کہ اس کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔

ارسطو نے یہ جسارت کی تھی کہ وہ اسے سسلی جانے سے روکے لیکن افلاطون فیصلہ کرچکا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر جہاز میں بیٹھا تھا اور سسلی کی طرف جا رہا تھا۔

بادشاہ واقعی بدل گیا تھا۔ افلاطون کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش بھی آیا اور چند روز تک اس کے نظریات کو غور سے سنتا بھی رہا لیکن پھر اپنی فطرت پر لوٹ آیا اور اپنے اس عہد پر قائم نہیں رہا کہ وہ ڈیان کے بارے میں افلاطون کی خواہشات کا احترام کرے گا اور نہ ہی تعلیم میں کوئی دلچسپی لی۔

افلاطون دوبارہ ناکام لوٹ آیا۔

چند سال بعد ڈیان نے ڈیونی سی اوس دوم پر حملہ کرکے اسے تخت سے محروم کردیا لیکن یہ کامیابی عارضی ثابت ہوئی اور صرف تین برس بعد ڈیان کو قتل کردیا گیا۔

افلاطون کی آخری امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔
ایتھنز آنے کے بعد وہ بہت پریشان تھا۔ اب اس پر سسلی کے دروازے بالکل بند ہو چکے تھے۔ اب اس کے سامنے حال نہیں مستقبل تھا۔ وہ ایسے کارنامے انجام دینا چاہتا تھا جس سے لوگ مستقبل میں فائدہ اٹھائیں۔ ہر بڑے آدمی کی طرح اسے یہ گلہ تھا کہ اس کا عہد اس کی قدر دانی نہیں کر رہا ہے۔ ایک مرتبہ پھر وہ اپنے خیالات تحریر کرنے میں مشغول ہوگیا۔ سقراط پھر اس کے سامنے تھا جو عمر بھر نیکی، عدل وانصاف اور اخلاقی اقدار کا درس دیتا رہا تھا۔ اس نے سقراط کی زبانی مکالمات تحریر کیے اور اس کی ''کتاب گورگیاس'' وجود میں آگئی۔ اس کتاب میں اس نے عملی سیاست داں، طاقتور کے حقوق، ہر قیمت پر عدل اور فلسفی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس نے سقراط کی زبان میں یہ ثابت کیا کہ حق پر عمل درآمد ہی انسان کا بنیادی مقصد ہے اور خطابت ناقص اور گمراہ کن فن ہے۔ سقراط کے مطابق سیاست داں کہلانے کا وہی مستحق ہے جو اخلاقی اقدار سے باخبر ہو اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھائے۔
ایک کتاب مینو (Meno) لکھی جس میں نیکی کی تعلیم پر بحث کی۔ پوری کتاب ایک بحث پر مشتمل ہے۔ اہم مسئلہ یہ موضوع بحث ہے کہ استاد کہاں سے بہم پہنچائے جائیں جو نیکی کی تعلیم دے سکیں۔ اس بحث میں ایک کردار سقراط بھی موجود ہے۔ افلاطون، سقراط کی زبان سے یہ مکالمے کہلواتا ہے۔
''ہماری روحوں نے بار بار جنم لیا ہے اور یہ روحیں دونوں جہانوں کی ہر بات سے واقف ہیں۔ یہ وقوف روحوں میں موجود تو ہے لیکن گہنا گیا ہے۔ تعلیم وتربیت کا کام اتنا ہے کہ اس خوابیدہ وقوف کو جگادے گا۔''
بحث ہوتی رہتی ہے لیکن آخر تک یہ ثابت نہ ہوسکا کہ نیکی کس طرح سکھائی جاسکتی ہے اور سقراط یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ آسمانی توفیق شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔
نیکی اور حسن پر کئی کتابیں تحریر کرنے کے بعد ایک مرتبہ وہ پھر اپنے فلسفے ''خطابات کے نقائص'' کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا یہ فلسفہ اس کی کتاب مینکسی نس میں پوری آب وتاب سے ظاہر ہوا۔ اس کتاب کا اصل مضمون یہ ہے کہ تمام دنیاوی حسن، حسن حقیقی کے باعث ہے۔ اس کتاب میں افلاطون کا افسانوی اسلوب عروج پر نظر آتا ہے۔

اگاتھون نامی ڈراما نگار کے گھر پر ہونے والی ضیافت میں سقراط شامل ہے۔ تمام لوگ عشق کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔
''عشق دو طرح کا ہوتا ہے۔ اعلیٰ تر اور ادنیٰ تر۔ ادنیٰ میں مردوں اور عورتوں سے دل لگایا جاتا ہے اور نفسانی خواہشات کی تسکین کے سوا کسی بات کا خیال نہیں آتا۔'' پاؤ سانیاس کہتا ہے۔
مشہور طربیہ نگار ارسطو فانیس نے دعویٰ کیا۔ ''انسان اصل میں مکمل تھے اور ان کی تین جنسیں تھیں مرد، عورت اور مخنث۔ زیوس دیوتا نے ناراض ہوکر انہیں دونیم کردیا۔ تب سے وہ دن رات اپنے نصف کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ عشق دراصل اپنی تکمیل کی خواہش اور جستجو ہے۔ مرد عورت خواہاں ہیں کہ کسی طرح وہی حسین دور وصال لوٹ آئے۔'' اس کے بعد صاحب خانہ اگاتھون تقریر کرتا ہے اور پھر سقراط گفتگو کرتا ہے۔
''عشق حیاتی اور ابدی دنیا کے مابین رابطوں میں سے ایک ہے۔ اگرچہ وسیع پیمانے پر تمام لوگ اچھائی سے عشق کرتے ہیں لیکن عام طور پر اس سے جنسی لگاؤ ہی مراد ہوتا ہے۔ عشق کے اس قماش کے دوام کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ توالد وتناسل کا سہارا لیا جائے۔ اس سے روح کی وہ سرگرمی مراد ہے۔ جس کی برکت سے نہ صرف تمام فنون جنم لیتے ہیں بلکہ تمدنی ارتقا سے معاشرہ نظم وضبط سے متعارف ہوتا ہے۔ حقیقی عاشق وہی ہے جو فلسفی ہو اور حیات کی دنیا سے بلند ہوکر جی سکے۔ ان روحانی مراحل میں پہلے کسی فرد سے پھر اس کے جسمانی حسن اور آخر روح کے جمال سے عشق کیا جائے (گویا یہ سفر مجاز سے حقیقت تک ہے)
افلاطون نے ایک اور کتاب فیڈو میں بقائے دوام کا نظریہ پیش کیا۔ اس وقت کی دنیا میں ایتھنز کے رہنے والوں کے لیے یہ بالکل انہونی سی بات تھی کہ روح ہمیشہ کے لیے باقی رہ سکتی ہے۔ سقراط یہی پیغام پہنچاتا رہا تھا لیکن چند شاگردوں کے سوا کوئی اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ افلاطون نے اس کتاب میں یہی پیغام سقراط کی زبانی بیان کیا۔ اس کتاب میں بھی اس نے مکالماتی انداز اختیار کیا۔ کتاب کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جب سقراط کو موت کی سزا دی جانے والی ہے۔ کئی قریبی دوست قید خانے میں اس سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ موت کا ذکر چھیڑتا ہے تو سقراط

دعویٰ کرتا ہے کہ جو آدمی صحیح معنوں میں فلسفی ہوتا ہے اسے موت کی دہشت نہیں ہوتی پھر وہ اگلی زندگی پر گفتگو کرتے ہوئے خطاب کرتا ہے۔

''انسانی روح لافانی ہے۔ زندگی کا سرچشمہ روح ہے۔ اس طرح روح کے ابدی ہونے میں کلام نہیں۔ ہم ابدی معاملات کا جو علم رکھتے ہیں وہ سب روح کی دین ہے۔''

اس کے بعد جلاد زہر کا پیالہ لے کر آجاتا ہے سقراط یہ کہتے ہوئے زہر پی لیتا ہے۔

''میرے مرنے کے بعد شفا کے دیوتا کو ایک مرغا بھینٹ دے دینا۔''

مرغے کی بھینٹ شفایاب ہونے پر دی جاتی تھی۔ اس طرح سقراط مرتے مرتے یہ بتایا گیا کہ زندگی ایک عارضہ ہے اور موت اس کا علاج ہے۔ میں چونکہ موت کی طرف جا رہا ہوں اس لیے شفایاب ہوگیا لہٰذا مرغا بھینٹ دے دینا۔

افلاطون ذہن کے مقابلے میں حسی ادراک اور عقل کے مقابلے میں عشق کو اہمیت دیتا تھا۔ سقراط کے بھی یہی نظریات تھے۔ افلاطون نے اپنے ان نظریات کی تشریح کے لیے فائیڈروس نامی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اس نے عشق کے متعلق مباحث کو نئی آب و تاب کے ساتھ یکجا کیا۔ یہ کتاب بھی مکالموں کی شکل میں تھی۔ سقراط کی زبان سے مکالمہ ادا کرتے ہوئے لکھا۔

''انسانی روح ایسے رتھ کی مانند ہے جس میں دو ایسے گھوڑے جتے ہوں جس میں ایک روحانی اور دوسرا شائستہ ہو۔ منطقی اور علوی کشاکش میں مبتلا روح کو اگر عشق کی رہنمائی نصیب ہو جائے تو وہ اس عالم غیب کی سیر کرسکتی ہے جو ماورائی حقیقتوں کا امین ہے۔ یہی نہیں بلکہ عشق سے سرشار انسان عالم ناسوت میں بھی بہت سے عالی ظرفانہ کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ عشق دیوتاؤں کی دین ہے جو انسانی صلاحیتوں کو جلا بخشتا ہے۔''

''حکمران کو فلسفی ہونا چاہیے۔'' افلاطون ہمیشہ سے کہتا چلا آیا تھا۔ اپنی کتاب الجمہوریہ میں بھی اس نے یہی نظریہ پیش کیا تھا۔

اپنی عمر کے آخری ایام میں اس نے اس نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنی مشہور زمانہ تصنیف پالیٹکس پر کام کیا۔ اس کتاب کا مقصد تحریر حکمران کا مثالی تصور پیش کرتا تھا۔ افلاطون کے نزدیک مدبر تمام علوم کا حامل اور قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ ماتحتوں پر جبر کرنے کا حق رکھتا ہے۔ جہاں فلسفی موجود نہ ہو وہاں قانون کی حکومت ہونی چاہیے۔

''جب تک قدرت یا تو مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو دانا اور ایمان دار یعنی فلسفی بنا دے یا پھر دانا اور ایمان دار فلسفیوں کو ریاستوں کا حکمران بنا دے اور جب تک ان دو میں کوئی ایک کام نہیں ہوگا ریاست کی سماجی زندگی اور اقتصادی و سیاسی حالات کبھی درست نہیں ہوں گے۔''

افلاطون کے نزدیک مدبر، ربط اور مقصدیت پیدا کر کے افراد اور سماج کو مملکت بنا سکتا ہے۔ اس کتاب میں عدل کی جگہ اعتدال اور دستور اور حقیقی علم کی بجائے ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کو سیاسی زندگی کا اصول قرار دینا ہے۔

افلاطون جب لوگوں میں مقبول ہو چکا اور اس کی باتوں پر کان دھرے جانے لگے تو اس نے 'ریاست' تحریر کی جس میں اس نے ایک مثالی ریاست کا تصور پیش کیا۔ یہ کتاب صرف سیاست کے موضوع تک محدود نہ تھی بلکہ اخلاقی، نفسیاتی، مذہبی، تعلیمی، تاریخی اور فلسفیانہ نظریات کی حامل تھی جو ایک بہتر نظام زندگی کا عکس پیش کرتی تھی۔ اس کتاب میں اس نے اپنے نظریات کو دلائل اور مثالوں کی روشنی میں واضح کیا تھا اور اس حقیقت کو منکشف کیا تھا کہ ریاست میں بنیادی اصولوں کو اغراض و مقاصد کی بنا پر اخذ کیا جاتا ہے۔

ریاست سے مراد سیاسی دستور ہے۔ دستور سے مراد ایسا نظام ہے جس سے افراد مل جل کر معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں لیکن ہر انسانی تنظیم سیاسی نہیں ہوتی اور نہ ہر معاشرہ ریاست ہوتا ہے۔ ریاست میں اس نے ریاست کی ماہیت معلوم کی ہے اور اس پر مفصل بحث کی ہے اور یہی اس کے سیاسی فلسفے کا محور ہے۔

افلاطون سے پہلے سیاسی مفکرین اس بارے میں غور کرتے رہے کہ انسانی مسائل کو حل کرنے میں کیا ہم حقیقی علم تک پہنچ سکتے ہیں۔ افلاطون کے مطابق عقل اور ذہانت میں برتر لوگ ہی اصل سچائی کو پا سکتے ہیں اور انسانی مسائل حل کرسکتے ہیں۔

افلاطون کے نزدیک جمہوریت محض دھوکے اور فریب پر مبنی ہوتی ہے۔ جو اس اصول کو تسلیم کرتی ہے جس کا

معاشرے میں کوئی وجود نہیں ہوتا اور ایسے لوگوں کی رائے کو علم کا درجہ دیتی ہے جو جہالت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

افلاطون کے مطابق فلسفی حکمران ہر طرح کے اختیارات کے مالک ہوں اور ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہوں جبکہ قانون کی رو سے حکمران اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتا۔ جس طرح طبیب مرض کو دیکھ کر دوا تجویز کرتا ہے اسی طرح ہر مسئلے کا حل بھی اس کی نوعیت کے مطابق ہونا چاہیے نہ کہ مروجہ قوانین کے مطابق۔

افلاطون کے نزدیک ایک مثالی ریاست میں عدل و انصاف کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ریاست میں استحکام اسی وقت ہوتا ہے جب عدل و انصاف کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اس طرح دانائی، بہادری، شجاعت اور اعتدال کو معاشرے میں فروغ ملتا ہے۔ عدل کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ جو شخص جس چیز کا اہل ہو اس سے وہی کام لیا جائے۔ سیاسی نظام عدل اسی صورت قائم رہ سکتا ہے جب معاشرے کو تین طبقوں، فلسفیوں، سپاہیوں اور کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر طبقے میں اس کے کام تقسیم کر دیے جائیں۔

سیاسیات میں افلاطون کا سب سے بڑا کارنامہ اس کی مثالی ریاست ہے۔ جس کی تقلید میں دوسرے فلسفیوں نے اپنی تخلیقی ریاستوں کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس کے فلسفہ نیکی کو بہت سے مفکرین نے تسلیم کیا کہ ریاست میں حکومت کی سرپرستی سے نیکی پھیلائی جا سکتی ہے اور ریاست کو امن و آشتی کا گہوارہ بنایا جا سکتا ہے۔

افلاطون کے نزدیک علم سیاسیات ایک ایسی سائنس ہے جو ان تمام دوسری سائنسوں سے اعلیٰ و برتر ہے جن کا تعلق عمل سے ہے۔ یہ سائنس دراصل ریاست کی حکومت کو درست خطوط پر چلانے کی سائنس ہے اور سیاست داں ایک گڈریے کے مانند ہے جو اپنے سارے ریوڑ کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اس کے تمام احکامات انسانوں کی اجتماعی بہتری کے لیے ہوتے ہیں۔

وہ اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے ہمت جمع کی اور قوانین کے بارے میں اپنے خیالات جمع کرنے شروع کیے۔ اس کتاب میں نظریہ امثال کی روشنی میں دنیاوی ریاست کے قوانین اور عام آدمی کی زندگی کے بارے میں بحث کی گئی۔ یہ بھی مکالموں کی صورت میں ہے۔ تین شرکا ہیں جن کے درمیان یہ مکالمہ ہے۔ شر سے بچنے کے لیے

مثالی ریاست میں سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ سرکاری رقوم کے غبن، جنسی جرائم، غداری، دہریت اور مقدس چیزوں کی بے حرمتی کی سزا موت تجویز کی گئی۔ کسی فرد کو سونا چاندی رکھنے کی اجازت نہیں۔ لوگ صرف روزمرہ کی ضروریات کے لیے اپنے پاس ریزگاری رکھ سکتے ہیں۔ جہیز لینے دینے پر مکمل پابندی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا یکساں انتظام ہے۔ غلاموں سے بیگار لی جائے گی اور غیر ملکیوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جائے گا۔ اس کتاب میں اس نے مذہبی قوانین اور جزا و سزا پر بھی بحث کی تھی۔

افلاطون کے نزدیک بنیادی چیز یہ ہے کہ قانون سازی کا کام شروع کرے تو اس کے ذہن میں مکمل نیکی کا تصور موجود ہونا چاہیے۔ ریاست اور ریاستی قوانین شہریوں کی اخلاقی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں جو تمام پہلوؤں سے ہونی چاہیے۔

افلاطون کے خیال میں عقل و دانش اور تدبر کا دارومدار ضبط نفس پر ہے اور عقل ہمارے ذہن یا ریاست میں صرف اسی صورت کام کرتی ہے جب ہم آہنگی موجود ہے جو بذاتِ خود ضبط نفس کی پیداوار ہے۔

افلاطون کے نزدیک جنگ ایک سیاسی بیماری کے مانند ہے۔ جو ریاستی جنگ ہی کو اپنا نصب العین بناتی ہیں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتی ہیں کہ وہ اصولی طور پر مکمل ریاست کا درجہ نہیں رکھتیں اور ان کا نظریاتی وجود نامکمل ہوتا ہے۔

”ریاست میں کوئی قلعہ بندی نہیں کرنی چاہیے یہاں تک کہ شہر کی فصیل بھی نہیں ہونی چاہیے۔“

افلاطون کے نزدیک ریاست کا اقتصادی ڈھانچا ایسا ہونا چاہیے کہ اس پر اچھے قانون کی بنیاد رکھی جا سکے۔ آئین بادشاہت اور جمہوریت کا مرکب ہو اور اس میں حکم کا عنصر موجود ہو۔

☆☆☆

افلاطون کا فلسفہ جو اپنی انتہا کو پہنچ کر ایک بحر ذخائر بن گیا ابتدا میں ایک چھوٹا سا جھرنا تھا جس کا سرچشمہ سقراط کی ذات تھی۔ اس نے اپنے آخری ایام میں صرف مابعد الطبیعات پر تنقیدی خیالات و نظریات سے استفادہ کیا۔ اس لیے اس کی فکر پر خاندانی ماحول کے علاوہ فیثا غورث، سقراط اور سوفسطائیوں کے انکار کی جھلک نمایاں ہے۔ ایک متمول اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر وہ اعلیٰ مرتبہ کے

حامل لوگوں کو حکومت کرنے کا حق دار اور جمہوریت کو بدترین طرز حکومت قرار دیتا تھا۔

وہ ستراط کی فلسفہ سیاست سے متاثر تھا اس لیے اس کے بے شمار تخیلات کو اپنی کتب کی زینت بنایا۔ اس نے اپنی بے جملہ کتب مکالمات کی صورت میں پیش کیں۔ یہ انداز بھی اس نے ستراط سے مستعار لیا تھا۔ اپنے تصورات کی بنیاد بھی ستراط کے نظریات علم نظریہ حقیقت اور نیکی کے علم پر رکھی۔ افلاطون کے ان تصورات پر اس کے استاد ستراط کی گہری چھاپ ہے۔ نیک زندگی کا حصول، اخلاقیات اور علم کی بالادستی کا تصور، نظریہ عدل و مکالماتی طریقہ مطالعہ، جمہوری طرز حکومت سے نفرت، قانون اور فلسفی حکمرانوں کی تابعداری کے تصورات دراصل ستراط کے ہیں جنہیں افلاطون نے اپنے تصورات میں شامل کرلیا۔

☆☆☆

اس کے نظریات ہوا میں تحلیل ہوتے جارہے تھے۔ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا لیکن اس کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش عمل میں نہیں آرہی تھی۔ وہ ایتھنز کی حکومت میں ذرا سی بھی جنبش پیدا نہ کرسکا تھا۔ اس کے خیالات اس عہد کے فلسفیوں کے لیے گراں قدر تھے لیکن حکمرانوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگ رہی تھی۔ اس ایک فرد نے زندگی کا آئین مرتب کردیا تھا۔ زندگی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا جس کا حل اس نے پیش نہ کردیا ہو یہاں تک کہ ادب و آرٹ کو بھی اس نے اپنی کتب کا حصہ بنالیا۔

اس کے تمام نظریات کی بنیاد عدل وانصاف پر تھی۔ اس کے نظریہ انصاف کا دارومدار غیر دخل اندازی اور عدم مداخلت پر ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو وہی کام کرنا چاہیے جس کی جانب اس کا فطری میلان ہو، دوسروں کے کام میں مداخلت نہ کرے کیونکہ مداخلت کرنے سے اس کا نہ صرف نقصان ہوگا بلکہ معاشرے میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔

افلاطون کا خیال ہے کہ مثالی ریاست کی تنظیم میں فرائض کی تخصیص ہونی چاہیے اور ہر شخص کو اپنے کام کے سوا دوسروں کے کام سے غرض نہیں رکھنی چاہیے۔

افلاطون کا نظریہ انصاف اور یک جہتی کے اصولوں پر مشتمل ہے کیونکہ جو ریاست مناسب آہنگ اور توازن سے جنم لیتی ہے اس میں انصاف منظم اتحاد کا مطالبہ کرتا ہے۔

☆☆☆

سسلی کے بادشاہ ڈیونی سی اوس دوم نے اسے مثالی ریاست کو عملی جامہ پہنانے کے لیے طلب کیا تھا۔ وہ کم از کم دو مرتبہ سسلی گیا لیکن بادشاہ اپنے عہد سے پھر گیا۔ اس ناکامی نے اسے نڈھال کردیا تھا۔ بہت دن وہ صاحب فراش رہا پھر اپنی تصنیفات میں مشغول ہوگیا لیکن یہ دکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا کہ وہ ناکام رہا ہے۔ اس کی مصروفیات نے اسے اپنی صحت کی طرف سے غافل کردیا تھا۔ وہ معاشرے کی صحت کے لیے اقوال زریں رقم کرتا رہا لیکن اپنی صحت کی طرف سے بے پروا ہوگیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ کس تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

347 ق م میں وہ اسی برس کا ہوگیا تھا۔ لکھنے لکھانے کا کام ختم ہوجانے کے باعث وہ اپنے شاگردوں میں گھرا رہتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اس کے شاگرد ہی اس کی اولاد تھے۔ وہ اپنی قائم کردہ اکیڈمی میں نئی نسل تیار کرنے کا شاندار کارنامہ انجام دے رہا تھا۔

کئی دن سے طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ اس کے ایک نوجوان شاگرد کی شادی تھی جس میں اسے بھی جانا تھا۔ اس کا شاگرد دل برداشتہ تھا کہ اب افلاطون اس کی شادی میں کیسے شریک ہوگا لیکن افلاطون جانے کے لیے بضد تھا۔ اسے ایک آرام دہ سواری میں ڈال کر شادی کی تقریب میں پہنچا دیا گیا۔

اس کے تمام شاگرد شادی کی خوشیوں میں شریک تھے اور وہ ایک کونے میں کرسی پر براجمان تھا۔ رات گئے شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو شاگردوں کو استاد کی یاد آئی۔ وہ اس کے پاس واپس آئے کہ اب چلنے کی تیاری کی جائے۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ دو شاگردوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا بدن ایک جانب جھول گیا۔ اس کی روح اپنے استاد ستراط کے پاس جاچکی تھی۔

ایتھنز سوگ میں ڈوب گیا۔ اسی روز اسے دفن کردیا گیا۔ روایت کے مطابق لوگوں نے اس کی قبر پر کھڑے ہوکر ان الفاظ میں اسے خراج تحسین پیش کیا۔

”اس عظیم فلسفی کی چھوڑی ہوئی یادیں رہتی دنیا تک قائم رہیں گی۔“

ماخذات

افلاطون، کامران اعظم سوہدروی

افلاطون، حیات فلسفہ اور نظریات، ملک اشفاق

سالگرہ کے دن

غلام حسین میمن

سالگرہ ہی کے دن مر جانے والے اہمیت کے حامل اشخاص کی تعداد بہت زیادہ ہے پھر بھی انتہائی مقبول افراد کی ایک چھوٹی سی فہرست قارئین کی معلومات میں اضافے کی خاطر شاملِ اشاعت ہے۔ ان میں سے ایسے بہت کم ہوں گے جنہیں آپ نہ جانتے ہوں لیکن شاید یہ آپ کے علم میں نہ ہو کہ وہ اسی تاریخ کو اس دنیا سے گزر گئے جس تاریخ کو پیدا ہوئے تھے۔

شائقینِ علم کی معلومات کے لیے ایک دلچسپ مضمون

ولیم شیکسپیئر:

''یہ دنیا ایک اسٹیج ہے جہاں ہر شخص آتا ہے اور اپنا کردار ادا کرنے کے بعد چلا جاتا ہے۔'' اس خوب صورت جملے اور کئی شاہکار ڈراموں کا خالق ولیم شیکسپیئر انگریزی زبان کا بڑا ادیب اور شاعر مانا جاتا ہے۔ وہ 23 اپریل 1564ء کو برطانیہ کے علاقے اسٹریٹ فورڈ ایون میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے ماں باپ کا تیسرا بچہ تھا۔ اس سے قبل ان کے دو بچے پیدائش کے بعد مر چکے تھے۔ اس لیے شیکسپیئر کی ماں ''میری'' اور باپ ''جون شیکسپیئر'' کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ بھی رہے نہ رہے لیکن ولیم شیکسپیئر نہ صرف زندہ رہا بلکہ اس نے برطانیہ کے علاوہ دنیا بھر میں اپنی منفرد تحریروں کی بدولت شہرت بھی پائی۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے حوالے سے زندہ جاوید ہے۔ ولیم شیکسپیئر کی پیدائش اس کے والدین کے لیے مبارک ثابت ہوئی۔ کیوں کہ اس کے بعد ان کے آنگن میں 4 بچوں نے مزید آنکھیں کھولیں اور وہ سب زندہ رہے۔

چمڑے کے دستانوں اور اون کے کاروبار سے وابستہ شیکسپیئر کے والد جب ہائی بیلف بنے تو شیکسپیئر کی شہرت میں اضافہ ہوگیا۔ کیوں کہ اس کے والد کا یہ عہدہ میئر کے برابر تھا۔ ہائی بیلف کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اسٹیج ڈراموں کے لیے لائسنس جاری کرتا تھا جس کے لیے ڈرامے دیکھنے

لازمی تھے۔ اس موقع پر ولیم شیکسپیئر بھی باپ کے ہمراہ ہوتا اور یوں ڈراموں سے اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔

شیکسپیئر نے ایک گرامر اسکول سے اپنی تعلیم حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اپنی پسند کی شادی کی۔ شادی کے تین سال بعد ہی وہ تھیٹر میں کام کرنے کی غرض سے اکیلا ہی لندن کی جانب عازم سفر ہوا۔ تاریخی اور مذہبی ہوتے، جن کی نوعیت مزاحیہ اور المیہ ہوتی تھی۔ ولیم شیکسپیئر کو یہ ڈرامے دیکھنے میں بے حد لطف آتا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے خود اداکاری کرنا اور ڈراما لکھنا بھی شروع کر دیا۔ پھر کامیابی آہستہ آہستہ اس کے قدم چومنے لگی۔ کچھ عرصے بعد وہ لندن کی مشہور ڈراما کمپنی لارڈ چیمبر لینز مین کا حصے دار بن گیا۔

ولیم شیکسپیئر نے جو ڈرامے لکھے وہ بہت جلد مشہور ہونے لگے۔ اس کے ڈرامے جس تھیٹر میں دکھائے جاتے وہاں تماشائیوں کی لمبی لمبی قطاریں اس کی مقبولیت کی گواہی دیتیں۔ اس کا لکھا ہوا ڈراما ہنری ششم کی مقبولیت اتنی رہی کہ اسے ایک سال میں پندرہ بار اسٹیج کیا گیا۔

1592ء کا سال لندن کی تاریخ میں طاعون کی وجہ سے موت کی علامت بنا رہا۔ اس عرصے میں تھیٹر بھی بند رہے۔ اس نے فراغت کے اس عرصے میں کئی خوب صورت نظمیں لکھیں جنہیں سانیٹ (Sonnet) کہا جاتا ہے۔

دو سال بعد تھیٹر دوبارہ کھلے تو اس نے نظمیں لکھنا بند کر کے ڈرامے لکھے۔ اب وہ برطانیہ کے شاہی دربار میں بھی مشہور ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنا ڈراما A midsummer Night Dream ملکہ الزبتھ کے سامنے ایک شادی کی تقریب میں پیش کیا۔ اس نے اپنا ایک اور مشہور ڈراما میکبتھ (Macbeth) شاہ جیمز اوّل کی فرمائش پر لکھا تھا۔ پھر ایک واقعے نے اسے اپنے خاندان کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔ ایک روز تھیٹر میں اسٹیج کے دوران گھاس پھوس کی چھت پر آگ بھڑک اٹھی اور ساری عمارت راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اس حادثے سے شیکسپیئر کا دل ٹوٹ گیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوبارہ اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت وہ عمر کی 49 بہاریں دیکھ چکا تھا اور 38 ڈرامے اور 150 سے زائد نظمیں اس کے نوکِ قلم سے نکل چکی تھیں۔ عزت اور دولت اس کے قدم چوم رہی تھیں۔

بالآخر 23 اپریل 1616ء کو ہیملٹ، رومیو اینڈ جیولیٹ، مرچنٹ آف وینس، کامیڈی آف ایررز، کنگ لیئر اور میکبتھ سمیت کئی شاہکار ڈراموں کا خالق اس دنیا سے اپنا کردار ادا کر کے چلا گیا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ:

علامہ سید سلیمان ندویؒ 22 نومبر 1884ء کو پٹنہ (صوبہ بہار) کے ایک قصبے دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد اور بڑے بھائی سے گھر اور مدرسے میں حاصل کی۔ 1901ء میں سید سلیمان ندوی ندوۃ العلماء لکھنو میں داخل کرا دیے گئے جہاں سے انہوں نے 1906ء میں سند حاصل کی۔ یہاں آپ کو مولانا فاروق چڑیا کوٹی، سید محمد علی مونگری، مولانا حفیظ اللہ اور علامہ شبلی نعمانی جیسے جید علماء سے اکتساب فیض کے مواقع میسر آئے۔ ایک بار دارالعلوم ندوہ میں نواب محسن الملک تشریف لائے تو سید سلیمان ندوی نے ان کی شان میں عربی زبان میں ایک قصیدہ پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ اسی طرح 1904ء میں آپ نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی شان میں ایک فارسی قصیدہ لکھا۔ اس پر مولانا نے

آپ کو اپنی تربیت میں لے لیا۔

علامہ شبلی نعمانیؒ کے پاس ہر ماہ عربی کے جو رسائل آیا کرتے تھے، سید سلیمان ندوی کو ان سے مطالعے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ جب 1904ء میں ندوۃ العلماء نے اپنا پرچہ ''الندوہ'' جاری کیا تو سید سلیمان ندوی اس کے مدیر بنے۔

1906ء میں آپ کی دستار بندی کی گئی۔ اس موقع پر آپ نے نہایت شستہ اور فصیح و بلیغ برجستہ تقریر عربی زبان میں کی۔ اس پر استاد محترم علامہ شبلی نعمانی کا خوشی کے باعث یہ حال تھا کہ اپنی نشست سے اُٹھ کر اپنے سر کا عمامہ اتار کر اپنے گوہر نایاب شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔

1908ء میں آپ دارالعلوم ندوہ ہی میں علم الکلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار ''الہلال'' (کلکتہ) میں شامل ہوئے۔ پٹنہ میں عربی اور فارسی کے استاد بھی رہے۔

1914ء میں سید سلیمان ندوی نے اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی یاد میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کی بنیاد ڈالی اور ایک رسالہ ماہنامہ ''معارف'' کا اجراء کیا۔ بہار سے انہوں نے کئی کتب شائع کیں جنہوں نے لازوال شہرت پائی۔ افغانستان پر جب نادر شاہ نے قبضہ کرلیا تو نادر شاہ کی دعوت پر علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ جانے والے وفد میں آپ بھی شامل تھے۔ آپ بھوپال میں قاضی کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

علم و ادب کے باب میں آپ کی بے شمار کتابیں یادگار ہیں۔ سب سے بڑا کارنامہ تو آپ کا یہ رہا کہ آپ نے اپنے استاد محترم مولانا شبلی نعمانی کی مشہور کتاب ''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ سلم'' کو مکمل کیا جو ان کے انتقال کی وجہ سے نامکمل رہ گئی تھی۔ آپ کی ایک یادگار تصنیف ''حیاتِ شبلی'' بھی ہے۔ یہ نہ صرف آپ کے استاد علامہ شبلی نعمانی کی سوانح عمری ہے بلکہ ہندوستان کی ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کی سو سالہ تاریخ بھی ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف میں خطباتِ مدارس، دروس الادب، برید فرنگ، لغات جدید، عربوں کی جہاز رانی، رحمت عالمؐ، نقوش سلیمانی، ارض القرآن، سیرۃ عائشہؓ اور عرب وہند کے تعلقات شامل ہیں۔

ایک موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا تھا ''علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟'' آپ کی ہمہ گیر علمی خدمات کے اعتراف میں علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لیٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

1950ء میں آپ پاکستان آئے اور وزیر اعظم پاکستان نے آپ کو دستور ساز اسمبلی کا مشیر مقرر کیا۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ پاکستان میں بھی دارالمصنفین، اعظم گڑھ کی طرز پر ایک ادارہ قائم ہو، چنانچہ آپ نے مسجد باب الاسلام میں مکتبہ الشرق کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔

آپ نے 22 نومبر 1953ء کو عین اپنی سال گرہ والے دن کراچی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ گورنمنٹ اسلامیہ آرٹس کالج کراچی کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ اس کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ کراچی سیکریٹریٹ کے پاس ایک مسجد بھی ان کی یادگار ہے۔

مریم جناح:

قائد اعظم محمد علی جناح کی دوسری شریک حیات رتی جناح، جن کا نام قبولِ اسلام کے بعد مریم رکھا گیا۔ وہ 20 فروری 1900ء کو پیدا ہوئیں۔ رتی ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت سر ڈنشا پٹیٹ کی بڑی صاحبزادی تھیں جن کا تعلق پارسی مذہب سے تھا۔ جب ان کی پہلی ملاقات قائد اعظم سے ہوئی تو قائد اعظم ان کی غیر معمولی ذہانت، شاعرانہ ذوق، کثرتِ مطالعہ اور خوش ذوقی سے بے حد متاثر ہوئے۔ دونوں کی شخصیت نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا۔

جب رتی کے والد سر ڈنشا پٹیٹ کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو

انہوں نے بیٹی پر پابندی عائد کردی کہ وہ مسٹر جناح سے ملنا ترک کردیں۔ انہوں نے رتی کی کم عمری کو جواز بنا کر عدالت سے حکم امتناعی بھی حاصل کرلیا۔ قائد اعظم نے ہمیشہ قانون کا احترام کیا۔ اس لیے وہ رتی سے ڈیڑھ سال تک نہیں ملے۔ جب رتی قانونی طور پر بالغ ہوگئیں تو انہوں

نے والدین کی دولت اور گھر بار چھوڑ کر 18 اپریل 1918ء کو بمبئی (موجودہ ممبئی) میں اسلام قبول کرلیا۔ اگلے دن 19 اپریل 1918ء کو ان کی شادی قائداعظم محمد علی جناح سے ہوگئی۔

قائداعظم کی اہلیہ مریم جناح اپریل 1928ء کو علاج کی غرض سے فرانس کے مشہور شہر پیرس چلی گئیں۔ 20 فروری 1929ء کو عین اپنی 29 ویں سالگرہ کے دن ان کا انتقال ہوگیا۔ اس وقت قائداعظم محمد علی جناح دہلی میں دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے قیام پذیر تھے۔ کہتے ہیں کہ مریم جناح کی جدائی کا غم قائداعظم کی زندگی اور شخصیت پر ہمیشہ رہا۔ جب تدفین کا وقت آیا تو قائداعظم ان کی قبر کو مٹی دیتے وقت رو پڑے تھے۔

اسکندر مرزا:

پاکستان کی تاریخ میں پہلے صدر کا اعزاز پانے والے اسکندر مرزا کا تعلق پاک فوج سے تھا۔ وہ 13 نومبر 1899ء کو بمبئی میں مرشد آباد (بنگال) کی ایک نواب فیملی میں پیدا ہوئے۔ الفنسٹن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگلستان کی رائل ملٹری اکیڈمی سینڈھرسٹ سے کمیشن حاصل کیا۔ اس کے بعد 1921ء میں ہندوستان کی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ 1926ء تک آرمی میں خدمات انجام دیں۔ بعدازاں انڈین پولیٹیکل سروس میں منتخب ہوکر ایبٹ

آباد، بنوں، نوشہرہ اور ٹانک میں بہ طور اسسٹنٹ کمشنر کام کیا۔ اس کے بعد 1931ء تا 1936ء تک ہزارہ اور مردان کے اضلاع میں بہ طور ڈپٹی کمشنر فرائض انجام دیے۔ بعدازاں کچھ عرصہ پولیٹیکل ایجنٹ (خیبر) کام کرنے کے بعد 1940ء تا 1945ء تک پشاور کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام پر 1946ء میں حکومتِ ہند نے جوائنٹ سیکریٹری دفاع مقرر کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اسکندر مرزا نے سیکریٹری وزارت دفاع کا عہدہ سنبھالا اور 1954ء تک اس پر فائز رہے۔ مئی 1954ء سے ستمبر 1954ء تک مشرقی پاکستان کے گورنر رہے۔ جولائی 1955ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے خرابی صحت کی بنا پر میجر جنرل اسکندر مرزا کو اپنا قائم مقام گورنر جنرل بنا دیا۔ جب 6 اکتوبر 1955ء کو غلام محمد مستعفی ہوئے تو اسکندر مرزا پاکستان کے چوتھے گورنر جنرل بن گئے۔ جب 23 مارچ 1956ء کو پہلا آئین نافذ ہوا تو انہیں پاکستان کا پہلا صدر بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

اسکندر مرزا کے تین سالہ عہد صدارت میں چار وزرائے اعظم نامزد ہوئے۔

1۔ چودھری محمد علی 11 اگست 1955ء تا 13 ستمبر 1956ء

2۔ حسین شہید سہروردی 13 ستمبر 1956ء تا 18 اکتوبر 1957ء

3۔ آئی آئی چندریگر 18 اکتوبر 1957ء تا 16 دسمبر 1957ء

4۔ ملک فیروز خان نون 16 دسمبر 1957ء تا 7 اکتوبر 1958ء

بالآخر 7 اکتوبر 1958ء کو انہوں نے ملک میں مارشل لاء نافذ کردیا مگر یہ ڈراما چند روز تک ہی چلا کیوں کہ 27 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب خان نے ان کی حکومت کو برطرف کرکے اپنی حکومت بنالی۔ اس فوجی انقلاب کے بعد اسکندر مرزا اپنی بیگم کے ہمراہ لندن چلے گئے جہاں ایک ہوٹل میں ملازمت کرلی۔ 13 نومبر 1969ء کو انہوں نے لندن میں ہی وفات پائی۔ انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں پاکستان میں قبر نہ دی جائے اس لیے ان کو تہران میں دفن کیا گیا۔

ابنِ صفی:

پاکستان میں اردو سری ادب کے بانی ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ وہ 26 جولائی 1928ء کو ضلع الہ

آباد میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ ابتداء میں شعر و شاعری بھی کی۔ ان کا تخلص اسرار ناروی تھا۔ 1948ء میں انہوں نے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری توجہ جاسوسی ناول نگاری کی جانب مرکوز رکھی اور قلمی نام "ابن صفی" اختیار کیا۔ ان کا شمار اردو کے اہم لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ وہ عوامی سطح پر مقبول ترین ناول نگار تھے۔ ان کے ناول ہر سطح کے قارئین میں مقبولیت کی سند پاتے تھے۔ فلسفہ، مذہب، تاریخ، ادب، سائنس، تجسس، سیر و سیاحت، سراغ رسانی اور طنز و مزاح غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے کو انہوں نے نہایت سادہ اور صاف ستھری اردو میں پیش کیا۔ کردار نگاری اور پلاٹ کی بُنت میں انہیں کمال حاصل تھا۔

مشہور انگریزی ناول نگار خاتون اگاتھا کرسٹی جب پاکستان آئیں تو انہوں نے ابن صفی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ابن صفی نے 300 کے قریب ناول لکھے۔ وہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے نام سے ناول لکھتے تھے۔ کرنل فریدی کیپٹن حمید، قاسم، علی عمران، جوزف، سلیمان (باورچی) روشی ایکسٹو اور جولیانا ان کے مشہور کردار ہیں۔

26 جولائی 1985ء کو ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی:

پاکستان کے نامور ماہر تعلیم، سائنس دان اور دانش

قوانین بنائے ہیں جا دیکھتا ہوں

یہ دنیا بہت مزے کی ہے۔ آپ ذرا دنیا کا ایک چکر تو لگا کر دیکھیں۔ ایسے ایسے مناظر اور واقعات دکھائی دیں گے کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ کیا نہیں ہے اس دنیا میں۔ کتنے ممالک ہیں اور ان ممالک کے قوانین ہیں۔ قوانین کیوں بنائے جاتے ہیں۔ نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے۔ مجرموں کو سزائیں دینے کے لیے۔ لیکن دنیا کے بہت سے ملکوں میں ایسے بھی قوانین ہیں جن کے بارے میں جان کر آپ کو حیرت ہوگی۔ آپ سوچتے ہی رہ جائیں گے کہ کیا ایسا بھی ہوتا ہے۔ ہم نے ایسے ہی کچھ قوانین کا جائزہ لیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

☆ لوگ اپنے کتوں کو بہت عزیز رکھتے ہیں لیکن آپ نے یہ کہیں نہیں سنا ہوگا کہ کتوں کی عزت نفس کو اگر ٹھیس پہنچائی جائے تو یہ جرم ہے۔ اوکلاہاما میں اگر آپ اپنے کتے کو منہ چڑائیں تو آپ کو گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ آپ کتے کے سامنے الٹی سیدھی شکلیں بھی نہیں بنا سکتے۔ کیوں کہ ان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔

☆ اوتاہ کی ایک کاؤنٹی ہے جسے سالٹ لیک کاؤنٹی کا نام دیا گیا ہے۔ وہاں آپ اپنے وائلین کو کاغذ میں لپیٹ کر چل نہیں سکتے۔ یہ وہاں جرم تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہوشیار رہیں اگر آپ کے پاس وائلین ہے تو یوں ہی کھلا لے جائیں۔

☆ سان فرانسسکو میں آپ اپنے گھوڑے کے چارے کے ڈھیر کو چھ فٹ سے اونچا نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کر لیا تو آپ کا گھوڑا حکومت ضبط کر لے گی۔

☆ ڈیون (ٹیکساس کا ایک شہر) وہاں ایک عجیب و غریب قانون ہے۔ وہاں اگر کوئی بڑھئی یہ چاہے کہ اپنے گھر میں یا کسی بھی جگہ کپڑے اتار کر فرنیچر بنائے تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

☆ مونٹانا۔ یہاں کوئی شخص اپنے گھر کے پچھلے صحن میں شام کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا (ہاں البتہ مکان کے اگلے حصے میں بیٹھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے)۔

☆ کیلیفورنیا میں کوئی گاڑی اگر ساٹھ میل کی رفتار سے بغیر ڈرائیور کے چل رہی ہو تو یہ جرم ہے۔ (سوال یہ ہے کہ خدا کے بندو۔ گاڑی بغیر ڈرائیور کے کیسے چلے گی۔ فرض کرو کسی طرح چل بھی رہی ہو تو کیا ضروری ہے کہ جب وہ ساٹھ میل رفتار کی حد تجاوز کر جائے تب ہی جرم ہے چلو اگر ایسا ہی ہے تو کس کو پکڑو گے۔ ڈرائیور تو ہے نہیں۔ اسی کو کہا جاتا ہے۔ "ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے")۔

☆ فلوریڈا میں کوئی شخص اگر گاؤن پہنے گھوم رہا ہو اور اس نے گاؤن کے فیتے نہیں باندھے ہوں تو اس پر جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔

مرسلہ: انیس گردیزی۔ ملتان

ورڈ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی 2 جنوری 1908ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ 1925ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کیا اور پھر 1928ء میں برطانیہ کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ 1931ء میں جرمنی کی لیپزگ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے کے بعد وطن واپس آئے اور اپنی مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ میں استاد مقرر ہو گئے۔

1937ء میں جامعہ عثمانیہ نے کوانٹم میکانیات پر ان کے لیکچروں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی جو 11 ابواب پر مشتمل تھی۔ اس کا انتساب انہوں نے اپنے استاد ڈاکٹر ورنر ہائزنبرگ کے نام کیا۔ ہائزنبرگ نے کتاب کے مطالعے کے بعد کہا۔

''یہ کتاب میں نے بہت دلچسپی اور اور لطف لیتے ہوئے پڑھی ہے۔ ہندوستان کی نیشنل اکیڈمی آف سائنسز نے انہیں 1938ء میں گولڈ میڈل دیا۔ 1940ء میں انجمن ترقی اردو نے ان کی کتاب شائع کی۔ یہ آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت پر اردو میں پہلی اور عام فہم تصنیف ہے۔ انہوں نے یہ کتاب دراصل علامہ اقبال کی فرمائش پر ہی تحریر کی تھی۔ علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ کوئی آئن اسٹائن کے کاموں کو اردو زبان میں تحریر کرے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کو فارسی، عربی، جرمنی اور فرانسیسی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔

1950ء میں وہ پاکستان ایک وفد کے ہمراہ آئے تھے۔ انہیں کل پاکستان سائنس کانفرنس میں مدعو کیا گیا تھا۔ پاکستان آتے ہی انہیں مختلف جامعات سے وائس چانسلر بننے کی پیش کش کی گئی۔ سردار عبدالرب نشتر نے انہیں جامعہ پنجاب کا عہدہ پیش کیا۔ وزیر تعلیم فضل الرحمٰن نے انہیں جامعہ کراچی سنبھالنے کی پیش کش کی مگر ان کا جواب تھا کہ وہ واپس جا کر علی گڑھ یونی ورسٹی میں تدریسی خدمات دینا چاہتے ہیں مگر پھر ایک ناخوش گوار واقعے نے انہیں ہمیشہ کے لیے پاکستان میں رہنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس ناخوش گوار واقعے کے نتیجے میں ان کی جائیداد اور قیمتی لائبریری حکومت بھارت نے ضبط کر لی۔

1950ء میں پشاور یونی ورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر اور ڈائریکٹر ریسرچ کے طور پر ان کا تقرر کیا گیا۔ تین سال بعد انہیں اس جامعہ کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ علامہ آئی آئی قاضی کے بعد 1960ء میں وہ سندھ یونی ورسٹی کے چانسلر مقرر ہوئے۔ 1964ء میں انہیں نئی مجوزہ یونی

ورسٹی اسلام آباد کا وائس چانسلر بنایا گیا۔ وہ قائداعظم یونی ورسٹی اسلام آباد کے بانی اور پہلے وائس چانسلر تھے۔

انہوں نے کچھ عرصہ پاکستان اکیڈمی آف سائنسز کی سربراہی بھی کی۔ وہ اقبالیات سے خصوصی شغف رکھتے تھے۔ اقبالیات کے موضوع پر ان کی دو تصانیف ''اقبال کا تصور زمان و مکان'' اور ''کلامِ اقبال میں موت و حیات'' ان ہی کے شغف کا مظہر ہیں۔

1960ء میں حکومتِ پاکستان نے انہیں ستارۂ امتیاز اور 1981ء میں ہلالِ امتیاز دیا۔ انہیں جرمنی کی حکومت نے بھی اعلیٰ اعزاز سے نوازا تھا۔

2 جنوری 1998ء کو 90 سال کی عمر میں عین اپنی سالگرہ کے دن انہوں نے اسلام آباد میں آخری سانس لی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

فیروز نظامی:

لاہور کے موسیقار خاندان کے ایک فرد جو 15 نومبر 1910ء کو پیدا ہوئے۔ وہ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی نذر محمد اور معروف ادیب سراج نظامی کے بڑے بھائی تھے۔ قیام

پاکستان سے قبل ہندوستان میں بننے والی فلم جگنو میں موسیقی دے کر انہوں نے اپنا نام چمکایا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد دو فلموں میں انہوں نے ناقابلِ فراموش موسیقی دی جن میں دوپٹہ اور چن وے شامل ہیں۔ 15 نومبر 1975ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔

ایف ای چودھری:

15 مارچ 1909ء کو سہارن پور میں پیدا ہونے والے ایف ای چودھری (فاسٹن ایلمر چودھری) نے صحافتی فوٹوگرافی کو اس وقت اپنا ذریعہ معاش بنایا جب پاکستان کی تحریک آزادی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ انہوں نے اپنے کیمرے کی آنکھ سے تحریک پاکستان، قیام پاکستان اور پاکستان کے اہم واقعات کو محفوظ کیا اور ہمیشہ کے لیے یادگار بنا دیا۔

انہیں فوٹوگرافی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ابھی وہ اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ 1920ء میں صرف گیارہ سال کی عمر میں پہلی تصویر اپنے دوست کی بنائی۔ 1943ء میں لاہور کے مشہور سینٹ انتھونی اسکول میں سائنس ٹیچر بنے اور اسی دور میں قائداعظم کی پہلی تصویر بنائی۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی بے شمار تصاویر لیں جو آج تک شائع ہو رہی ہیں لاہور میں پاکستان ٹائمز کے اجراء پر جز وقتی فوٹوگرافر بنے۔

1949ء میں وہ پاکستان ٹائمز کے باقاعدہ ملازم ہوئے جہاں سے 1973ء میں سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے قرارداد پاکستان سے قیام پاکستان تک کے سات سالہ دور کے ہر جلسے اور مظاہرے کی تصاویر بنائیں جو ہندوستان بھر کے اخبارات نے شائع کیں۔

104 سال تک کی عمر میں بھی انہیں لاہور کا ہر اہم واقعہ ازبر تھا۔ وہ کئی اخبارات کے اجراء کے گواہ، عمارتوں

کے بننے کے احوال سے واقف اور حکومتوں اور سیاستدانوں کے کام اور انداز پر بلاتکان بولتے تھے۔ سنیما گھروں کے بننے اور اجڑنے، گلوکاروں اور اداکاروں سے لے کر فلموں کے واقعات بھی سامعین کو سناتے تھے۔

مسجد شہید گنج کے سانحے کے موقع پر قائداعظم محمد علی جناح کی لاہور آمد اور قائداعظم محمد علی جناح کا بحیثیت گورنر جنرل حلف اٹھانے والی تصویر بھی ان ہی کے کیمرے کی آنکھ کا کارنامہ ہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ خدمت، صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی اور تحریکِ پاکستان کا گولڈ میڈل دیا۔

ہماری ملکی تاریخ کا یہ عکاس 104 بہاریں دیکھ کر 15 مارچ 2013ء کو لاہور میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔

صحرائے اعظم

طارق عزیز خان

دنیا کے سب سے اہم خطہ پر ایک معلوماتی تحریر کہ اس صحرا اعظم میں کیسے کیسے زمینی انقلابات آئے اسے کیوں خطرناک ترین علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے۔

شمالی افریقا میں واقع صحرائے اعظم دنیا کا سب سے بڑا صحرا ہے۔ جس کا کل زمینی رقبہ 94 لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ یہ شمالی افریقا کے 11 ممالک اری ٹریا، مصر، سوڈان، لیبیا، الجزائر، تیونس، مراکش، موریطانیہ، مالی، چاڈ اور نائیجر پر مشتمل ہے۔ یہ درمیان سے 1610 کلومیٹر طویل اور شرقاً غرباً 5150 کلومیٹر عریض ہے۔ صحرائے اعظم پر مشتمل ممالک کی مجموعی آبادی 23 کروڑ کے لگ بھگ ہے جبکہ خاص صحرائے اعظم کے وسطی حصے میں 30 لاکھ لوگ بستے ہیں جن کی اکثریت

مصر، سوڈان، لیبیا اور الجزائر کے بربر قبائلیوں پر مشتمل ہے۔ صحرائے اعظم کے شمال میں کوہ اطلس اور بحیرہ روم جنوب میں دریائے نائیجر کا بیسن مشرق میں بحیرہ احمر اور مغرب میں شمالی بحر اوقیانوس واقع ہیں۔ صحرائے اعظم کے طول و عرض میں خشک پہاڑی سلسلے، بنجر علاقے اور اس کے ذیلی صحرا پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں مصر، سوڈان اور لیبیا میں واقع صحرائے لیبیا، صحرائے نوبیا اور صحرائے عرب نمایاں ہیں۔ جبکہ اہم پہاڑی سلسلوں میں نائیجر میں واقع کوہ ائیر جنوبی الجزائر میں کوہ آہاگ گار شمالی چاڈ میں کوہ تی بیستی (Tibesti) اور بنجر علاقوں میں مالی اور نائیجر پر مشتمل ساحیل (Sahel) اہم ہیں۔

صحرائے اعظم کا سب سے بلند مقام شمالی چاڈ میں واقع ماؤنٹ ایمی کوسی ہے جس کی بلندی 11204 فٹ (3415 میٹر) ہے جبکہ سب سے نچلا مقام شمالی مصر میں واقع قطارا (Qattara) ہے جو سطح سمندر سے 436 فٹ (132 میٹر) نیچے واقع ہے۔ صحرائے اعظم کے مشرقی حصے میں بہنے والے دنیا کے سب سے بڑے دریائے نیل کی لمبائی 6695 کلومیٹر (4160 میل) ہے اور شمالی چاڈ میں واقع اکلوتی جھیل چاڈ کا رقبہ 17800 مربع کلومیٹر ہے۔ صحرائے اعظم دنیا کے سب سے خشک، بنجر اور گرم ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ یہاں بارش کی سالانہ اوسط 130 ملی میٹر (5 انچ) ہے۔ جبکہ موسم سرما کا کم سے کم درجۂ حرارت 5 ڈگری اور گرمیوں سے زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 54.4 ڈگری سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ صحرائے اعظم میں دنیا کا سب سے گرم ترین مقام شمالی لیبیا میں خط استواء سے 32.31 ڈگری شمال اور 13 ڈگری مغرب کے خط پر واقع العزیزیا (Al Aziziyah) ہے جہاں 1922ء میں زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 58 ڈگری سینٹی گریڈ (136 ڈگری فارن ہائیٹ) ریکارڈ کیا گیا تھا۔ دنیا کا دوسرا جبکہ صحرائے اعظم کا سب سے خشک ترین مقام شمالی سوڈان میں دریائے نیل کے کنارے واقع Wadi Halfa ہے جہاں سالانہ بارش کی اوسط 2.5 ملی میٹر (0.10 انچ) ہے۔

صحرائے اعظم کی تاریخ کا ایک اہم واقع 18 فروری 1979 کو پیش آیا جب الجزائر کے بیشتر جنوبی علاقوں میں برف باری ہوئی۔ اس دن برف کا طوفان قریب ایک گھنٹے جاری رہا جس سے جنوبی علاقوں میں ٹریفک معطل ہو کر رہ گئی۔ یاد رہے کہ صحرائے اعظم کے شمال میں واقع کوہ اطلس کے پہاڑوں پر موسم سرما میں برف گرنا معمول کی بات ہے تاہم صحرا کے وسطی حصے میں دکھائی دینے والا موسم کا یہ تیور حیرت انگیز تھا۔ صحرائے اعظم میں پائی جانے والی اہم معدنیات میں تیل و گیس اہم ہیں جن کے وسیع ذخائر لیبیا، تیونس اور الجزائر میں ملے ہیں۔ صحرا کے خشک و گرم ماحول میں پائی جانے والی جنگلی حیات میں اونٹ سب سے نمایاں ہے، جو صحرائے اعظم کے بے رحم ماحول کو برداشت کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایک وقت میں 40 گیلن پانی پی سکتا ہے اور قریب ایک ماہ تک بغیر حلق تر کیے اپنی ٹانگوں پر گزارہ کر سکتا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اونٹ ضرورت پڑنے پر سمندری پانی بھی پی سکتا ہے۔ شمالی افریقہ کے بربر قبائلیوں کی زندگی میں اونٹ ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اونٹ کا گوشت کھاتے ہیں، اس کا دودھ پیتے ہیں اور اس کی موٹی کھال سے اپنے خیمے تیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مردہ اونٹ کا پنجر انہیں ریت کے خوفناک طوفانوں میں پناہ مہیا کرتا ہے۔ بربر لوگ سینکڑوں اونٹوں پر مشتمل قافلوں کی صورت میں صحرائے اعظم کی خاک چھانتے ہیں۔ 1906ء میں فرانسیسی مہم جوؤں کے ایک گروپ نے صحرائے اعظم میں 20 ہزار اونٹوں پر مشتمل قافلہ دیکھا تھا۔ اونٹ کے علاوہ سوڈان اور جنوبی مصر کے علاقوں میں ایڈکس (Addax) ہرن، لیبیا اور الجزائر کے صحرائی علاقے میں متعدد اقسام کے نایاب صحرائی سانپ جبکہ تیونس اور مراکش میں باربری بھیڑ پائی جاتی ہے۔

صحرائے اعظم کو انگریزی میں صحارا (Sahara) کہا جاتا ہے جو دراصل عربی لفظ ''صحرا'' سے ماخوذ ہے۔ یہاں کے طول و عرض میں ملنے والی سبزی خور ڈائنوسار کی ہڈیاں (Fossil) اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ کبھی سرسبز رہا ہوگا۔ صحرائے اعظم کی سرحدوں پر انسانی سرگرمیوں کا ریکارڈ آخر برفانی دور یعنی قریب 12 ہزار سال پہلے ملتا ہے۔ یہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا جنم ہوا جن میں 3300 قبل از مسیح سے 30 ق م تک قائم دریائے نیل کی قدیم مصری تہذیب، 800 ق م میں قائم شمالی افریقہ کی فونیشن تہذیب اور دریائے نائیجر کے بیسن میں 13 ویں 14 ویں صدی عیسوی میں قائم سلطنت آف مالی نمایاں ہیں۔ یورپین کا صحرائے اعظم سے پہلا رابطہ 450 قبل مسیح میں ہوا، جب شمالی افریقہ کی ساحلی پٹی پر مشتمل قدیم ریاست کارتھیج (Carthage) سے تعلق رکھنے والے مہم جو، ہائے ملکو (Himilco) نے بحیرہ روم کو پار کر کے مغربی یورپ میں قدم رکھا۔ 1154 میں

مراکش سے تعلق رکھنے والے مسلمان جغرافیہ داں الادریسی (Al Idrisi)(1100-1166) نے سسلی کے بادشاہ راجر دوئم کے لیے چاندی کی ایک پلیٹ پر دنیا کا نقشہ بنایا جس میں صحرائے اعظم کو دکھایا گیا تھا۔ اگلی دو صدیوں کے دوران صحرائے اعظم یورپین کے لیے ایک سربستہ راز بنا رہا، یہاں تک کہ مشہور مسلمان سیلانی ابن بطوطہ نے ایک باقاعدہ مہم کے تحت صحرائے اعظم کے مغربی حصے کو پار کیا۔

ابن بطوطہ نے 1351ء کی خزاں میں شمالی مراکش کے شہر فیس (Fes) سے اپنے تاریخی سفر کا آغاز کیا۔ وہ جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے مشرقی مراکش میں واقع تاریخی شہر جل ماسا (Sijilmasa) میں داخل ہوا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے بتاتے چلیں کہ مراکش میں واقع فیس اور سی جل ماسا وہ تاریخی شہر ہیں جہاں بالترتیب 760ء اور 790ء میں پہلی اسلامی کالونی کی بنیاد رکھی گئی۔ مراکش کے بعد ابن بطوطہ نے موجودہ الجزائر کے مغربی صحرائی علاقے کو پار کیا۔ وہ جنوری 1352ء میں شمالی ماریطانیہ کے صحرائی علاقے الغزیب El Gseib)) میں داخل ہوا۔ اس کا قافلہ فروری کی شروعات میں جمہوریہ مالی کے شمالی حصے میں واقع علاقے تاغازا (Taghaza) پہنچا۔ اس مقام پر ابن بطوطہ کا واسطہ مقامی ماسوفا (Masufa) قبائل سے پڑا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ نمک کی خشک جھیلوں سے اٹی اس سرزمین میں واقع مقامیوں کے گھر بھی نمک کی سلوں سے بنے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے تاغازا میں چند روزہ قیام کے بعد جنوب کی طرف سفر جاری رکھا۔ وہ مئی 1353ء میں دریائے نائیجر کے کنارے واقع مالی کے مشہور تاریخی شہر ٹمبکٹو پہنچا۔ اس نے اگلے چند ہفتے تک ٹمبکٹو کی سیاحت کی اور جولائی میں سلطنت مالی کے دارالحکومت بماکو (Bamako) میں داخل ہوا۔ جہاں اس کی مسلمان حکمران سلیمان مانسا سے ملاقات ہوئی۔ ابن بطوطہ نے پایا کہ مانسا ایک دولت مند حکمران تھا جس کے دربار میں موجود ہر شے سونے سے بنی تھی۔ مقامی لوگ مسلمان لیکن تہذیب سے کوسوں دور تھے۔ اُن کی عورتیں لباس سے بے پروا معلوم ہوتی تھیں اور معاشرے میں جنسی بے راہ روی عام تھی۔ ابن بطوطہ اگلے آٹھ ماہ تک سلیمان مانسا کا مہمان بنا رہا۔ اس دوران بادشاہ نے اس کی دل بستگی کے لیے اپنی بیٹی سمیت عریاں کنیزوں کا تحفہ پیش کیا، جنہیں ابن بطوطہ نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اکتوبر میں ابن بطوطہ نے وطن واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مراکش واپس جانے والے اس کے قافلے میں 600 عریاں لڑکیاں بھی شامل تھیں جنہیں فروخت کرنے کے لیے یورپ لے جایا جا رہا تھا۔ ابن بطوطہ تین سالہ صحرا گردی کے بعد 1354ء کی شروعات میں مراکش واپس پہنچا۔ اس نے مقامی حکمران سلطان ابوعنان فارس (Abu Inan Faris) کی ہدایت پر اپنے تاریخی سفر سے متعلق یادداشتوں کو قلم بند کروایا۔ بدقسمتی سے ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامے کی روداد اگلی چار صدیوں تک منظر عام سے غائب رہی۔ حتیٰ کہ اس دوران کسی مسلمان حکمران نے بھی اس نادر روزگار تاریخی دستاویز کو تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یورپ میں 1800ء کے آغاز میں بعض عرب اسکالرز کی تحریروں کی بنیاد پر جرمن اور انگریزی زبان میں ابن بطوطہ کے تاریخی سفر سے متعلق اقتباسات شائع ہوئے۔ 1830ء میں فرانس کے الجزائر پر قبضے کے دوران فرانسیسیوں کو الجزیرہ شہر سے ابن بطوطہ کے اصل سفرنامے کے پانچ قدیم نسخے ملے۔ ان نسخوں کو فوری طور پر پیرس روانہ کر دیا گیا۔ جہاں فرنچ اسکالر Charles Defremery اور Beniamino Sanguinetti نے ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ انہوں نے تین سال کی تحقیق کے بعد ان نسخوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا جس کے بعد فرانس میں The Journey کی چار جلدوں پر مبنی پہلی کتاب شائع کی گئی۔ فرانس کے بعد پوری دنیا کی قابلِ ذکر زبانوں (غالباً اردو کے سوا) میں ابن بطوطہ کے تاریخی سفرنامے کے ترجمے شائع ہوئے۔ جس کے نتیجے میں یورپین اقوام کو صحرائے اعظم کے پوشیدہ گوشوں سے متعلق باقاعدہ معلومات حاصل ہوئیں۔

1790-91ء میں لندن کی افریقین ایسوسی ایشن نے میجر ڈینیل ہوگ ٹن کو صحرائے اعظم کی چھان بین کے لیے مغربی افریقا روانہ کیا۔ ہوگ ٹن نے مراکش سے اپنے سفر کی شروعات کی بجائے جنوب میں واقع سینی گال سے اپنی مہم شروع کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ وہ اپنے دو درجن ساتھیوں کے ساتھ 1791ء کے موسم بہار میں سینی گال کی بندرگاہ ڈاکار (Dakar) پہنچا۔ ہوگ ٹن اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ابھی کے دوران سینی گال اور مالی کے سرحدی علاقے میں سفر کر رہا تھا کہ اس کی پوری مہم ڈینگی وائرس کا شکار ہو گئی۔ ہوگ ٹن کی ناکام مہم کے بعد 1795-96ء میں اسکاٹس مہم جو منگو پارک نے افریقین ایسوسی ایشن کے تعاون سے صحرائے اعظم کی جنوبی سرحدوں پر بہنے والے دریائے نائیجر کو دریافت کیا۔ وہ مالی کے تاریخی شہر ٹمبکٹو تک رسائی حاصل کرنے والا پہلا

یورپین تھا۔(منگو پارک کی مہم کے حوالے سے کہانی سرگزشت ڈائجسٹ میں شائع ہوچکی ہے۔)

منگو پارک کی کامیابیوں نے تاریک براعظم کے اندرونی گوشوں میں کامیابی کے نئے چراغ روشن کردیے۔ جس کے بعد جرمن مہم جو، فریڈرچ ہورن مین (Friedrich Konrad Hornemann) نے صحرائے اعظم کی باقاعدہ چھان بین کا فیصلہ کیا۔ فریڈرچ کونرڈ ہورن مین 15 ستمبر 1772ء کو شمالی جرمنی کے شہر ہائلڈشیم (Hildesheim) میں پیدا ہوا۔ اس نے 1795ء میں یونیورسٹی آف گوٹن گین (جرمنی) سے عربی زبان میں ڈگری حاصل کی اور بہتر مواقعوں کی تلاش میں انگلینڈ چلا آیا۔ وہ 1796ء میں لندن کی افریقن ایسوسی ایشن سے وابستہ ہوا۔ ہورن مین نے لندن میں قیام کے دوران ابن بطوطہ کے سفرنامے کا مطالعہ کیا۔ وہ صحرائے اعظم کے موسم، جغرافیہ اور معاشرت سے متعلق ابن بطوطہ کی فراہم کردہ معلومات سے متاثر ہوا۔ ہورن مین کی ترغیب پر افریقن ایسوسی ایشن نے اسے صحرائے اعظم کی چھان بین کی مہم پر افریقا روانہ کردیا۔

ہورن مین ستمبر 1797ء میں مصر پہنچا جو اس زمانے میں برطانیہ کی نوآبادی تھا۔ اس نے قاہرہ میں قیام کے دوران اپنی عربی زبان میں استعداد کو بہتر بنایا، مصری رسم و رواج کو قریب سے دیکھا اور مغرب کی طرف جانیوالے قافلوں سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ 1798ء کی گرمیوں میں اسے مکہ معظمہ سے آنیوالے حاجیوں کے ایک قافلے کے بارے میں پتہ چلا جو قاہرہ میں تازہ دم ہونے کے بعد مغربی لیبیا کے علاقے فیزان (Fezzan) جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مقدس سفر سے آنیوالے قافلے میں شامل ہونے کے لیے مسلمان ہونا لازمی شرط تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہورن مین نے ایک ترک مملوک (Mamluk) تاجر کا روپ دھارا اور قافلے کی خیمہ بستی میں پہنچ گیا۔ اس نے کچھ دیر کی چھان بین کے بعد ایک دولت مند نومسلم جرمن جوزف فرینڈنبرگ (Joseph Freudenburg) کو تلاش کرلیا۔ ہورن مین نے نومسلم جرمن کو اپنا نام یوسف بتایا اور اسے لیبیا تک کے سفر میں بطور مترجم اپنی خدمات پیش کیں۔ جوزف فرینڈنبرگ کی رضامندی کے بعد سالار قافلہ نے ہورن مین کو قافلے میں شامل کرلیا۔

5 ستمبر 1798ء کے دن ہورن مین لگ بھگ 500 اونٹوں اور قریب دو ہزار حاجیوں پر مشتمل قافلے کے ساتھ وابستہ ہوکر قاہرہ سے روانہ ہوا۔ اگلے دو ہفتے کے سفر کے دوران اس کا قافلہ شمال مغربی مصر کے نمک کی جھیلوں پر مشتمل علاقے Qattara Depression کو پار کرکے سیوا (Siwa) کے نخلستان میں پہنچا۔ یہ مقام خط استواء سے 29.12 ڈگری شمال اور 25.31 ڈگری مشرق کے خط پر لیبیا کی سرحد سے 50 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ قافلے نے یہاں ایک ہفتہ قیام کرکے پانی اور خوراک جمع کی۔ وہ مغرب کی طرف سفر کرتا ہوا اکتوبر کی شروعات میں صحرائے اعظم کے ذیلی ریگستان صحرائے لیبیا کی حدود میں داخل ہوا۔ یہ دھول سے اٹا ایک ویران بنجر علاقہ تھا جہاں میلوں تک پھیلے ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سر پر آگ برساتے سورج اور پاؤں کے نیچے گرم ریت کے سرکتے فرش پر چلنا نہ صرف دشوار بلکہ صبر آزما بھی تھا، تاہم رسی سے بندھے سینکڑوں اونٹ قطار در قطار قدیم صحرائی راستے پر آرام سے چلتے جارہے تھے۔ انہوں نے قریب ڈھائی ماہ کے سفر کے دوران صحرائے لیبیا کو عبور کیا اور 17 نومبر کے دن مغربی لیبیا کے علاقے فیزان میں واقع شہر مرزک (Murzuk) پہنچے۔ جہاں قیام کے دوران ہورن مین کے سرپرست کا بخار میں مبتلا ہوکر انتقال ہوگیا۔ ہورن مین نے اپنی مہم کے پہلے مرحلے کے دوران صحرائے اعظم کے مشرقی حصے میں کل دو ہزار پانچ سو کلومیٹر کا سفر طے کرلیا تھا۔ مرزک میں قیام کے دوران اس نے طے کیا کہ وہ صحرائے اعظم کے جنوبی حصے میں واقع جھیل چاڈ (Lake Chad) کو دریافت کریگا۔ جہاں سے وہ نائجیریا کی حدود میں داخل ہوکر

انڈیانا (Indiana)

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایک ریاست، رقبہ 26168 مربع میل یا 93700 مربع کلومیٹر۔ 1816ء میں یہ ریاست 19 ویں ریاست کی حیثیت سے ریاست ہائے متحدہ امریکا میں شامل ہوئی۔ دارالحکومت انڈیاپولس ہے۔ آب وہوا گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد ہوتی ہے۔ شروع میں اس پر فرانسیسیوں نے قبضہ کیا۔ 1763ء میں انگریز مسلط ہوئے۔ 1783ء میں امریکیوں کے قبضے میں آئی۔ اناج، تمباکو وغیرہ اہم فصلیں ہیں۔ معدنیات بھی بہ افراط پائی جاتی ہیں۔ ادویہ سازی، موٹریں، بجلی کا سامان اور لوہے اور فولاد کی صنعتیں روزافزوں ہیں۔

مرسلہ: عطیہ اکبر۔ کوئٹہ

بحراوقیانوس کے کنارے پہنچ سکتا تھا۔ہورن مین نے جون 1799ء تک مرزک شہر میں قیام کیا۔وہ اگست میں لیبیا کے ساحلی شہر ٹریپولی (Tripoli) پہنچا۔جہاں اس نے برطانوی قونصل خانے کے توسط سے صحرائے اعظم کے مشرقی حصے (صحرائے لیبیا) میں سفر سے متعلق تحریری معلومات (Journals) لندن روانہ کیں۔ہورن مین اکتوبر کے آخر میں مرزک واپس پہنچا۔جہاں اس نے صحرائے اعظم کے اندرونی حصے کے جغرافیہ، موسم اور جھیل چاڈ تک رسائی کے راستوں سے متعلق معلومات حاصل کیں۔

دسمبر 1799ء میں ہورن مین نے ایک چھوٹے قافلے سے وابستہ ہوکر جنوب کی طرف سفر کی شروعات کیں۔اس نے جنوری 1800ء کے آخر میں خط سرطان کو عبور کیا اور نائیجر (Niger) کی حدود میں داخل ہوا۔جو اس زمانے میں فرانسیسی علاقہ مانا جاتا تھا۔ہورن مین کا قافلہ اگلے دو ماہ کے دوران نائیجر میں جنوب کی طرف گامزن رہا۔صحرائے اعظم میں سفر کا یہ مرحلہ دشوار ترین تھا۔ہورن مین نے اس سفر کے دوران صحرا کی وسعت کو محسوس کیا۔اسے راستے میں انسانوں اور جانوروں کے سینکڑوں ڈھانچے بکھرے دکھائی دیے جو اس بات کے گواہ تھے کہ یہاں زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔اس کے ساتھ سفر کررہے ایک بربر نے بتایا کہ صحرا میں ان کا مکمل دارومدار اپنے اونٹوں پر ہوتا ہے۔اگر دورانِ سفر پیاس کے ہاتھوں ان کی جان پر بن آئے تو وہ اپنے اونٹ کو ہلاک کرنے کے بعد اس کے پیٹ میں جمع شدہ پانی پی کر اپنے حلق تر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔بربر نے انکشاف کیا کہ یہاں پیاس کی نسبت ریت میں زندہ دفن ہوکر مرنے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔صحرا میں اچانک چلنے والے طوفانی ہواؤں کے جھکڑ میں ریت کے جگہ بدلتے ٹیلے کب آپ پر حملہ آور ہونگے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ہورن مین نے یہاں آوارہ گھوم پھر رہے بربروں کو دیکھا جو دراصل صحرا گردی کا شکار ہوئے' اپنے پیاروں کو تلاش کررہے تھے۔

ہورن مین 1800ء کے موسم گرما میں صحرائے اعظم کو پار کر کے نائیجیریا کی حدود میں داخل ہوا جو اس زمانے میں برطانیہ کی نوآبادی تھا۔نائیجریا میں اس کا پہلا پڑاؤ خط استواء سے 13 ڈگری شمال اور 7.36 ڈگری مشرق کے خط پر واقع شہر کٹ سینا (Katsina) تھا۔شہر میں قیام کے دوران ہورن مین کا توہم پرست ہاؤسا (Hausa) قبائل سے واسطہ پڑا۔کٹ سینا میں نائیجیریا سے تعلق رکھنے والے مسلمان تاجروں کے قافلے بھی ٹھہرے ہوئے تھے جن کی منزل شمال میں واقع لیبیا تھا۔

ہورن مین نے شہر میں قیام کے دوران خود کو مسلمان ظاہر کیا۔اس نے جھیل چاڈ دریائے نائیجر سے متعلق معلومات حاصل کیں۔مقامیوں نے اسے بتایا کہ جھیل چاڈ مشرق میں دو ہفتے جبکہ دریائے نائیجر جنوب مغرب میں ایک ہفتے کی پیدل مسافت پر واقع تھا۔ہورن مین نے پہلے دریائے نائیجر تک رسائی کا فیصلہ کیا۔وہ 1800ء کے موسم خزاں میں شمال مغربی نائیجیریا پر مشتمل نوپے سلطنت (Kingdom of Nupe) کی حدود میں داخل ہوا۔اس نے موسم سرما کے شروعاتی دن نوپے میں گزارے اور جنوب میں دریائے نائیجر تک رسائی کا سفر شروع کیا۔وہ 1801ء کی شروعات میں دریائے نائیجر کے 30 کلومیٹر شمال میں واقع شہر بوکانی (Bokani) پہنچا۔بدقسمتی سے ہورن مین کو مزید آگے جانا نصیب نہ ہوا۔وہ بوکانی شہر میں ملیریا کا شکار ہوا اور فروری 1801ء میں انتقال کرگیا۔

فریڈرچ کونریڈ ہورن مین نے صحرائے اعظم کو شمال سے جنوب کی طرف پار کرنے کی مہم کے دوران مجموعی طور 5500 کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔جس میں قاہرہ سے لیبیا کے شہر مرزک تک صحرائے لیبیا میں 2500 کلومیٹر اور مرزک سے نائیجیریا تک صحرائے اعظم کے وسطی حصے میں 3000 ہزار کلومیٹر کا سفر شامل ہے۔1801ء کے وسط میں جرمنی میں جبکہ 1802ء میں انگلینڈ میں... ہورن مین کے قاہرہ سے لیبیا کے شہر مرزک تک کے سفر کی روداد شائع ہوئی۔بدقسمتی سے ہورن مین کے لیبیا سے نائیجیریا تک کے سفر کے حالات منظر عام پر نہ آسکے۔جون 1803ء میں ٹریپولی کے برطانوی قونصل خانے کو دو سال پہلے نائیجیریا کے شہر بوکانی میں "یوسف" (ہورن مین) نام کے ایک شخص کے انتقال کی خبر موصول ہوئی۔1810ء میں لندن کی افریقن ایسوسی ایشن نے ٹریپولی کے برطانوی قونصل خانے کے حوالے سے نائیجیریا میں ہورن مین کے انتقال کی تصدیق کی۔1911ء میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اور 1993ء میں مائیکروسافٹ کارپوریشن کے انکارٹا انسائیکلوپیڈیا کے ذرائع نے ہورن مین کے نائیجیریا میں انتقال کے واقعے کو درست قرار دیا جس کے بعد اس بات میں کوئی ابہام نہ رہا کہ جرمن مہم جو ہنرچ کونرڈ ہورن مین، صحرائے اعظم کو اس کے تمام تر خطروں سمیت پار کرنیوالا پہلا یورپین تھا۔

کھیل

منظر امام

جسمانی چستی و پھرتی کے لیے تو ضروری ہے ہی ذہنی استعداد کو بھی بڑھانے میں کھیل اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے دنیا بھر میں قسم قسم کے کھیل رائج ہیں مگر کچھ ایسے عجیب و غریب کھیل بھی کھیلے جاتے ہیں جن کی تفصیل سن کر ہی ہونٹوں پر ہنسی آجائے۔

چند حیرت انگیز کھیلوں کا ذکر خاص

کھیل ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ ہماری ذہنی اور جسمانی نشوونما کرتے ہیں۔ پوری دنیا میں طرح طرح کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ بہت سے کھیلوں سے ہم واقف ہیں۔ کیوں کہ ان میں سے اکثر ہمارے یہاں بھی کھیلے جاتے ہیں، اگر کھیلے نہ بھی جاتے ہوں تو بھی ہم ان کے بارے میں سنتے رہتے ہیں۔ ان کھیلوں میں کرکٹ، فٹ بال، ٹینس، بیڈ منٹن، اسکواش، رگبی، ہاکی وغیرہ ہیں لیکن بہت سے کھیل ایسے ہیں جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ایسے کھیل دنیا کے مختلف علاقوں میں کھیلے جاتے ہیں اور وہاں کی تہذیب کے نمائندہ کھیل کہلاتے ہیں۔ آئیں ایسے ہی کچھ انوکھے کھیلوں سے آپ کا تعارف کرواتے ہیں۔

Arm wrestling

بازوؤں کی طاقت آزمانے کا کھیل

یہ کھیل ویسے تو صدیوں سے ہمارے یہاں بھی کھیلا جاتا ہے۔ اس میں دو آدمی آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنی کہنیاں میز کے وسط میں رکھ کر پنجے ملا کر ایک دوسرے کا ہاتھ گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ 50ء کی دہائی میں اس کھیل کو دنیا میں تسلیم کرلیا گیا اور کئی ملکوں میں

اس کے ٹورنامنٹ ہونے لگے۔ 70ء اور 80ء کے درمیان مشہور اداکار سلویسٹر اسٹالون کی ایک فلم نے اس کھیل کو اور مقبول کردیا۔ اب یہ کھیل دنیا کے پچاس ملکوں میں باقاعدہ رائج ہے۔

Beard and moustache championship

(داڑھی اور مونچھوں کا مقابلہ)

اس کھیل کی ابتدا جرمنی سے ہوئی تھی اور پہلی چیمپئن شپ بھی وہیں منعقد ہوئی تھی۔ اس کھیل میں داڑھیوں اور مونچھوں کا مقابلہ ہوا کرتا ہے اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس کی داڑھی یا مونچھیں شاندار یا عام ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ اس کھیل کی کئی کیٹگریز ہیں۔

1۔ شاندار مونچھیں (اس میں بھی کئی اقسام کی مونچھیں ہیں)۔
2۔ آدھے چہرے کی داڑھی۔
3۔ پورے چہرے کی داڑھی وغیرہ۔
یہ ٹورنامنٹ ہر دو سال کے بعد ہوا کرتا ہے اور کئی ممالک سے شوقین اس میں حصہ لیتے ہیں۔

The bed racing

بیڈ صرف سونے کے لیے ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کو

ایک کھیل میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کھیل کو بیڈ ریسنگ کہتے ہیں۔

اس کی ابتداء نارتھ یارک شار ٹاؤن میں ہوئی تھی۔ پہلے پہل یہ کھیل صرف فوجیوں کے لیے ہوا کرتا تھا لیکن اب عام لوگوں کو بھی اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اس میں چھ چھ لوگوں کی ایک ٹیم ہوتی ہے جس میں سے پانچ مسہری کو دھکے لگاتے ہیں۔ دوڑاتے ہیں۔ ان مسہریوں میں پہیے لگے ہوتے ہیں۔ ٹیم کا ایک ممبر مسہری پر لیٹا ہوتا ہے۔

یہ ریس پانچ کلومیٹر کی ہوتی ہے اور راستے میں چڑھائیاں بھی ہوتی ہیں۔ مسہری کو مقررہ منزل تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ کس ٹیم نے اپنی مسہری کو کس انداز سے سجایا ہے۔ مقررہ مقام تک پہنچانے کے بعد راستے میں ایک دریا بھی عبور کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر یہ ریس ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ریس جسمانی طاقت کی ہوا کرتی ہے۔ ہے نا دلچسپ ریس۔

Beer miles

اس ریس کی ابتدا کینیڈا میں ہوئی تھی۔ اس میں گراؤنڈ کے چار چکر لگانا پڑتے ہیں۔ یہ تو خیر کوئی بات نہیں لیکن اصل کھیل یہ ہے کہ ہر کھلاڑی کو دوڑ شروع کرنے سے پہلے بیئر پلا دیا جاتا ہے۔ یہ ریس پہلی بار 1989ء میں کینیڈا میں ہوئی تھی۔ ہر کھلاڑی کو بارہ اونس کی مقدار میں بیئر پلائی جاتی ہے اور شرط یہ ہوتی ہے کہ اگر دوڑ کے دوران میں کسی کھلاڑی نے قے کردی تو اس کو میدان کا ایک فالتو چکر لگانا پڑ جاتا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس کھلاڑی نے میدان کے چار چکر مکمل کرلیے ہیں۔

موجودہ ورلڈ ریکارڈ ہولڈر جیمس میسن ہے۔ اس نے چار اعشاریہ چالیس سیکنڈ میں اپنی دوڑ مکمل کی تھی۔ اس کھیل

میں خواتین بھی شرکت کرتی ہیں۔ موجودہ دوڑ دسمبر میں ٹیکساس میں ہوئی۔

Beer crate running

kasten lauf

یہ بھی اپنی نوعیت کی ایک الگ ہی دوڑ ہے۔ اس میں دو ٹیمیں ہوتی ہیں اور ہر ٹیم کے پاس بیئر کے کریٹ ہوتے ہیں۔ ہر کریٹ میں اچھا خاصا وزن ہوتا ہے۔ ان کو دس کلومیٹر کا فاصلہ کریٹ کندھوں پر رکھ کر دوڑنا

پڑتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شرط یہ ہوتی ہے کہ دوڑتے ہوئے بیئر پیتے ہوئے جانا ہے۔ منزل پر ساری بوتلیں خالی ہونی چاہئیں۔

راستے بھر نگرانی کرنے والے بھی ہوتے ہیں جو اس بات کی جانچ کرتے ہیں کہ کسی ٹیم نے اپنی بیئر راستے میں تو نہیں گرادی۔

یہ دوڑ جرمنی میں شروع ہوئی تھی اور ان علاقوں میں زیادہ مقبول ہے جہاں جرمن بولی جاتی ہے۔

Bicycle polo

پولو سے تو سب ہی واقف ہیں۔ یہ انتہائی مہارت جفاکشی اور دلیری کا کھیل ہے۔ پاکستان میں گلگت میں عام

طور پر کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل گھوڑوں پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے۔ سائیکل پولو بھی اسی کی ایک شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں گھوڑوں کی جگہ سائیکل ہوتی ہے۔ اس کے قوانین بھی تقریباً وہی ہیں جو عام پولو کے ہوتے ہیں۔ اس کی ابتدا 1891ء میں آئرلینڈ میں ہوئی تھی اور اب تک کھیلی جاتی ہے۔

Bird man sky

یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں پرواز تو کی جاتی ہے
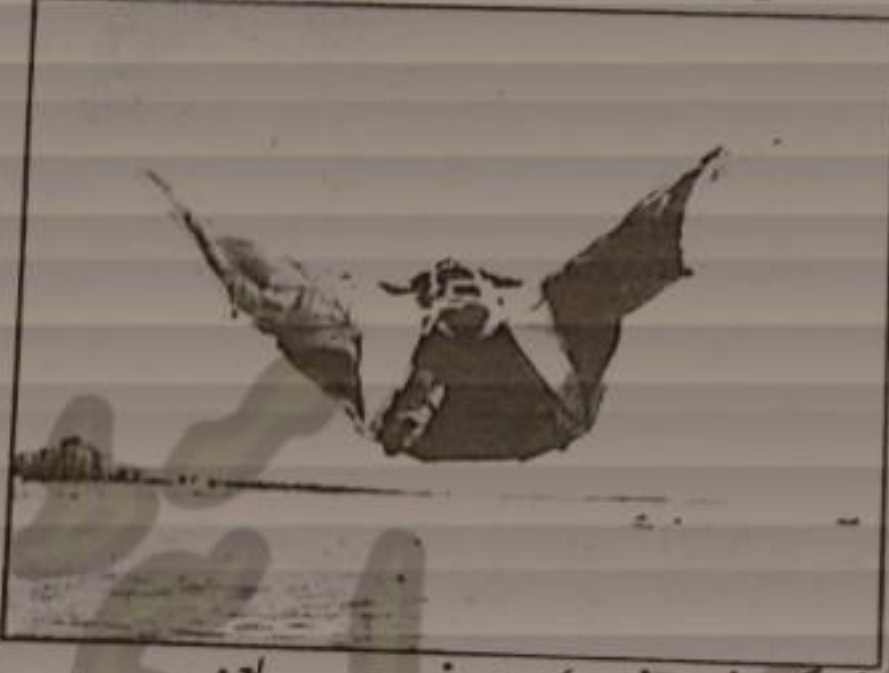
لیکن کسی مشین پر نہیں بلکہ انسانی طاقت پر۔ یعنی بڑے بڑے مصنوعی پر باندھ کر کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگا کر پرواز کرنی پڑتی ہے۔ یہ کھیل 1971ء میں انگلینڈ میں شروع ہوا تھا اور اب دنیا کے کئی ممالک میں کھیلا جاتا ہے۔

Boomrang throwing

بوم رینگ آسٹریلیا کے قبائلیوں کا ایک قدیم کھیل ہے اور شکار کا طریقہ بھی ہے۔ یہ ایک تیز دھار اوزار ہے جس کو اس انداز سے ہدف کی طرف پھینکا جاتا ہے کہ نشانے

پر لگ کر شکاری کے پاس واپس آجائے۔ ورلڈ بوم رینگ کا پہلا ٹورنامنٹ 1988ء میں آسٹریلیا میں ہوا تھا۔ اب یہ دنیا کے بہت سے ممالک میں کھیلا جاتا ہے۔

Camel wrestling

آپ نے بیلوں، مرغوں، مینڈھوں اور انسانوں کی

جنگ تو دیکھی یا سنی ہوگی۔ یہ جنگ اونٹوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ عجیب وحشت ناک جنگ ترکی میں ہوا کرتی ہے۔ ایک مادہ اونٹ کو ایک طرف باندھ دیا جاتا ہے اور دو نر اونٹ اس کو حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ بہت وحشت ناک جنگ ہوتی ہے۔ دونوں اونٹ لہولہان ہو جاتے ہیں اور انسان انہیں دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔

Elephant polo

یہ پولو ہی کی ایک قسم ہے لیکن فرق یہ ہے کہ روایتی پولو گھوڑوں پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے اور یہ پولو ہاتھیوں پر کھیلا جاتا

ہے۔ ہاتھیوں کو قابو میں رکھنا عام آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اسی لیے ہاتھیوں سے کام لینے والے ماہر مہاوت ہوتے ہیں۔ اس کھیل کی ابتدا اس وقت سے ہوئی تھی جب انگریز ہندوستان آئے تھے اب یہ کھیل تھائی لینڈ میں عام ہے۔ اس کے میدان کی لمبائی چوڑائی اصل پولو کے میدان سے کم ہوا کرتی ہے۔

Extreme ironing

یہ بھی ایک دلچسپ لیکن انوکھا گیم ہے۔ اس میں حصہ لینے والے ڈھیر سے کپڑے کم سے کم وقت میں استری کر کے دکھاتے ہیں۔ ویسے تو یہ کھیل ہمارے یہاں ہر گھر میں ہوا کرتا ہے لیکن گھر کے کام کے طور پر۔ کسی مقابلے میں

حصہ لینے کے لیے نہیں۔ اس گیم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ گیم کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ کھلاڑیوں سے یہ کہہ دیا جائے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر کپڑے استری کریں یا پانی میں جا کر کریں ہے نا مشکل کام لیکن اگر کھیلنا ہے تو ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

Gurning face

دنیا کا یہ احمقانہ کھیل 1297ء میں برطانیہ میں شروع ہوا تھا اور آج تک ستمبر کے مہینے میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ وہ کھیل ہے جس میں قدرت کی بنائی ہوئی شکل کو بگاڑ کر دکھایا جاتا ہے۔ یہ منہ بنا بنا کر دکھاتے ہیں اور جس نے سب سے زیادہ مضحکہ خیز منہ بنایا ہوتا ہے۔ وہ انعام کا حقدار ہوتا ہے۔

دنیا کا سب سے مکروہ منہ بنا کر دکھانے والا ورلڈ چیمپئن انگلینڈ کا جیکسن ہے۔ اس شخص نے یہ مقابلہ چار بار جیتا ہے۔ منہ بگاڑ کر دکھانے والے کو گرنز کہا جاتا ہے۔

Canine free style dancing

یہ ایک طرح کا ڈانس ہے اور ورزش بھی۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ کتے بھی رقص کرتے ہیں اور موسیقی ایسی منتخب کی جاتی ہے کہ ڈانس کرنے والے نازک مزاج کتوں کو ناگوار نہ گزرے۔ ایک وقت میں لاتعداد انسان اور کتے ایک ساتھ ڈانس کرتے ہیں۔

Hairy back compitition

اگر آپ کی پشت پر اتنے بال ہیں کہ جب آپ اپنی قمیص اتار دیں تو ایسا لگے جیسے آپ نے سوئیٹر پہن رکھا ہے تو آپ اس مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔ یہ انوکھا مقابلہ ہر

اکتوبر کو امریکا میں ہوا کرتا ہے۔

Hemp olympic

نیو ساؤتھ ویلز آسٹریلیا کا یہ کھیل بھی اپنی جگہ انوکھا ہے۔ یہ مقابلہ ہر سال ہوا کرتا ہے۔ ایک لمبی سی سرنگ

ہے۔ حصہ لینے والوں کو اپنی پشت پر بوجھ رکھ کر رینگتے ہوئے پوری سرنگ پار کرنی ہوتی ہے جو اچھی خاصی طویل ہے۔

Memory sport

یہ کھیل یادداشت کا امتحان ہے۔ اس کے کئی مرحلے ہوتے ہیں۔
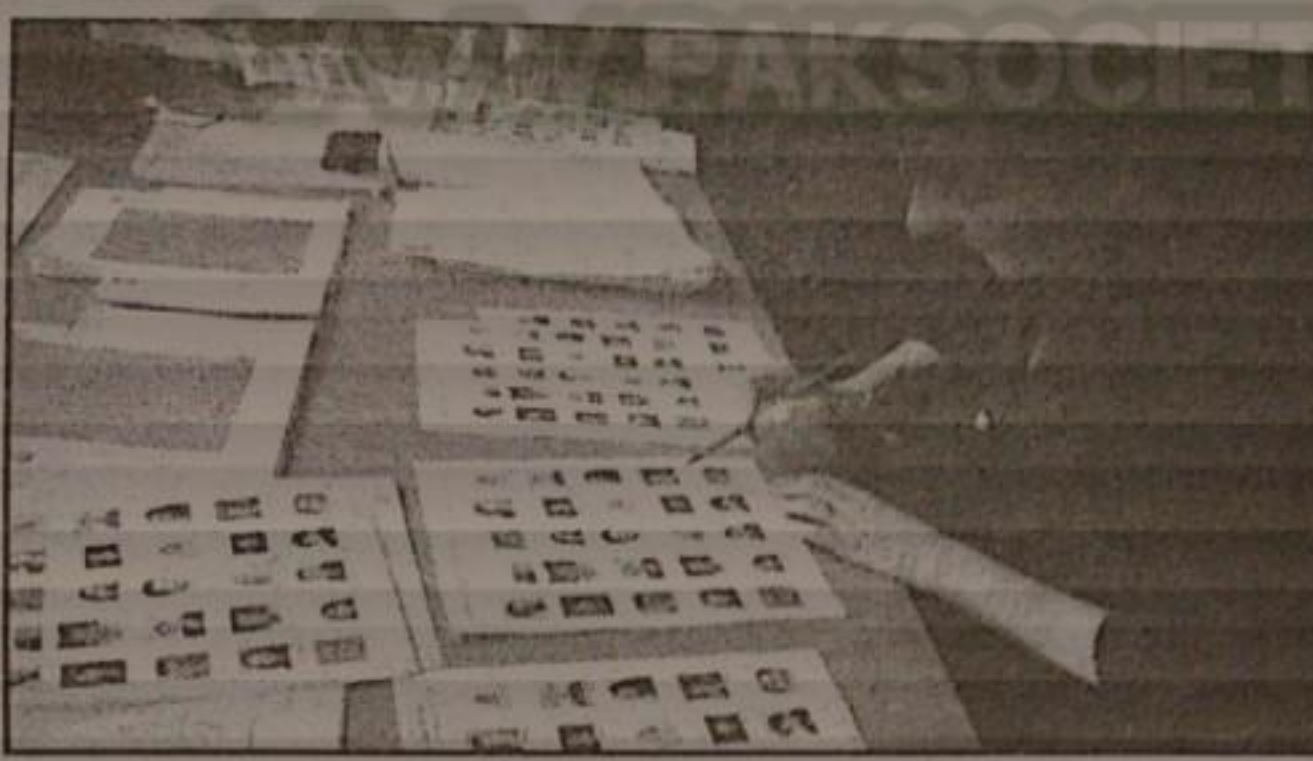
1۔ پندرہ منٹ میں سیکڑوں نام پڑھ کر سنا دیے جاتے ہیں۔ اب ناموں کو یاد کر کے بتانا ہوتا ہے۔

2۔ اسی طرح نمبر بتائے جاتے ہیں اور ترتیب سے سنانے پڑتے ہیں۔

3۔ تاش کے پتوں کو اچھی طرح پھینٹ کر بے ترتیبی سے دکھائے جاتے ہیں اور تریب سے بتانا پڑتا ہے کہ پہلے کون سا کارڈ دکھایا گیا تھا اور دسویں نمبر پر کون سا کارڈ تھا۔ یہ ایک دلچسپ مقابلہ ہے اور اس کی بھی چمپئن شپ ہوا کرتی ہے۔

Plunge for distance

یہ مقابلہ بیک وقت تیراکی اور سانسیں روکنے کا ہے۔ دیکھا یہ جاتا ہے کہ غوطہ لگانے کے بعد کتنی دیر تک کوئی تیراک

پانی کے نیچے رہا ہے۔ پہلے اس کھیل کو تیراکی سے منسلک کر دیا گیا تھا لیکن اب اس کو الگ کر کے کھیلا جاتا ہے۔

Rope climbing

ایک اونچے ستون سے رسی باندھ دی جاتی ہے اور حصہ لینے والے باری باری اسی رسی کے ذریعے اوپر جانے کی کوشش کرتے ہیں اور جس کا دورانیہ سب سے کم ہو اس کو انعام مل جاتا ہے۔

Running with the bull

یہ کھیل اتنا اجنبی تو نہیں ہے لیکن بہت وحشیانہ ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ نے بھی ٹی وی یا فلموں میں ضرور دیکھا ہوگا۔

یہ کھیل اسپین میں کھیلا جاتا ہے اور بہت مقبول ہے۔ ہر سال بہت سے لوگ اپنی ہڈیاں تڑواتے ہیں۔ کبھی کبھی بیلوں کا شکار بھی ہو جاتے ہیں اور موت کے گھاٹ اتر

جاتے ہیں، اس کے باوجود یہ پاگل پن ہر سال ہوا کرتا ہے۔

اس میں ہوتا یہ ہے کہ بہت سے لوگ خطرناک سانڈوں کو اشتعال دلا کر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ بپھرے ہوئے بیل ان کے پیچھے ہوتے ہیں۔ بہت ہی تنگ گلیاں ہوتی ہیں۔ اِدھر اُدھر جانے کا راستہ بھی نہیں ہوتا۔ تماشا دیکھنے والوں کا بھی ہجوم ہوا کرتا ہے اور یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ جو ایک بڑے سے اسٹیڈیم میں جا کر ختم ہوتا ہے۔ وہاں ایک دوسرا تماشا ہوتا ہے۔ بل فائٹر ان بپھرے ہوئے

بیلوں کو تلواروں سے زخمی کر کے مار دیتے ہیں۔ یا خود مر جاتے ہیں۔ اب ایسے کھیلوں کو کیا کہا جائے۔

Land diving

یہ بے تکا کھیل کئی جزیروں میں کھیلا جاتا ہے اور اسے ان جزیروں کا روایتی کھیل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ نوجوان اونچے درختوں سے زمین پر کود جاتے ہیں اور

زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو ان کو سپورٹ دے سکے۔ یوں سمجھیں کہ ننگی زمین پر کودنا پڑتا ہے اور تماشا یہ ہے کہ ان کی دونوں ٹانگیں بھی بندھی ہوتی ہیں۔ اب تک بے شمار حادثے اس انوکھے کھیل کی وجہ سے ہو چکے ہیں۔

Lizard racing

یہ کھیل آسٹریلیا کا ہے۔ ایک بڑے میدان میں ایک گول دائرہ بنا دیا جاتا ہے اور وہاں سے بہت فاصلے پر کھلاڑی چھپکلیوں کی طرح زمین پر لیٹے ہوتے ہیں۔ کھیل شروع ہوتے ہی دائرے کی طرف رینگنا شروع کر دیتے ہیں جو سب سے پہلے پہنچ جائے جیت جاتا ہے۔

Sheep counting game

یہ ایک سادہ سا، بے ضرر کھیل ہے۔ اس میں حصہ لینے والوں کے سامنے سے ایک مقررہ تعداد میں بھیڑیں تیزی سے گزار دی جاتی ہیں اب جس نے بھی صحیح تعداد بتا

دی وہ جیت جاتا ہے۔

Stair climbing

یہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سیڑھیاں چڑھنے کا کھیل ہے۔ اس کا اہتمام بہت سے ملکوں میں ہوتا ہے۔ اونچی عمارتوں کی سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں اور جو جیت جاتا ہے اسے نیویارک بھیجا جاتا ہے

جہاں اس گیم کا فائنل ہوتا ہے۔

اس فائنل میں ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں جو کہ 1430 ہیں اور وہ بھی دس منٹ کے عرصے میں، ہے ہمت تو حصہ لیں۔

Ottery tar barrels

یہ کھیل برطانیہ کے ایک قصبے میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ پورے دن کا کھیل ہوتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ گرم کولتار کے ڈرم شہر کے مختلف مقامات پر رکھ دیے جاتے ہیں حصہ

لینے والے ان ڈرمز کو تلاش کر کے مقررہ مقام تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایک تو یہ ڈرمز انتہائی گرم ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تلاش بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔ اس کے باوجود یہ کھیل ہر نومبر کی پانچ تاریخ کو پابندی سے کھیلا جاتا ہے۔

Three sided foot ball

آپ نے اب تک ایسا فٹ بال دیکھا ہوگا جو دو ٹیموں کے درمیان کھیلا جاتا ہے لیکن یہ ایسا گیم ہے جس میں بیک وقت تین ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ ہے نا دلچسپ بات۔ یہ کھیل ہالینڈ کے ایک آرٹسٹ جان کی اختراع ہے۔ اس

میں گول پوسٹ بھی تین ہوتے ہیں اور بیک وقت تینوں ٹیمیں کھیل شروع کر دیتی ہیں۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ گول کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس ٹیم پر گول سب سے کم ہوئے ہیں۔

Under water hocky

فٹ بال کے بعد اب ہاکی کا بھی سن لیں۔ یہ ہاکی ایک بڑے سے سوئمنگ پول میں پانی کے نیچے کھیلی جاتی

ہے۔ اس میں ہاکی کی مہارت کے ساتھ ساتھ تیراکی کی مہارت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس کی گیند اور اسٹک کا سائز عام ہاکی سے مختلف ہوتا ہے۔

Quidditch

جے کے رولنگ نے جس وقت ہیری پوٹر سیریز لکھی ہوگی۔ اس وقت اس کو اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ اس کی کتابوں میں لکھا ہوا ایک کھیل اتنا مقبول ہو جائے گا۔

کہانی میں تو یہ ہوتا ہے کہ کردار جھاڑو ٹانگوں کے بیچ میں دبا کر پرواز کرتے اور کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔ اس کھیل میں بھی حصہ لینے والے کھلاڑی اسی طرح جھاڑو ٹانگوں کے درمیان دبا

کر کھیلتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کہانی کے کردار پرواز کرتے ہیں لیکن یہ کھلاڑی پرواز نہیں کرتے بلکہ والی بال کھیلتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے والی بال کھیلا جاتا ہے۔ فرق اس میں یہ ہے کہ جھاڑو ان کی ٹانگوں کے درمیان رہتا ہے۔

ماہِ مئی

سلیم الحق فاروقی

تپتے ہوئے دنوں کا مہینا ”ماہِ مئی“ اس مہینے میں کئی اہم لوگوں نے جنم لیا۔ کئی مقبولیت کی معراج پا لینے والے لوگوں نے دنیا کو خیر آباد کہا۔ انھی میں سے چند ایک اہم شخصیات کا مختصر مختصر احوال۔

معلومات جمع کرنے کے شائقین کے لیے ایک خوبصورت تحریر

مئی کا مہینا جولین اور جارجین کلینڈر میں پانچواں مہینا ہے۔ 31 دن کا یہ مہینا جنوب میں موسم خزاں اور شمال میں موسم بہار کا مہینا ہے مگر یونانی دیوی مایا کے نام پر رکھا گیا کیوں کہ یونانی اس مہینے میں مایا کے نام پر ایک میلہ منعقد کرتے تھے۔ مئی سے متعلق جواہرات میں زمرد کو منسوب کیا گیا ہے۔ لی لی پھول اس کا نشان ہے۔ ثور کو اس مہینے سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس مہینے کی ہماری اہم شخصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

ٹیپو سلطان

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصف آخر ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین دور ہے۔ ایک طرف مغل بادشاہ کے علاوہ ریاستی حکمران اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے تو دوسری جانب انگریزی افواج اپنے قدم جمانے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ اس دور کی دیگر مشہور شخصیات کے علاوہ ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ میں بھی دو اقدار مشترک نظر آتی ہیں، اوّل تو یہ کہ نا صرف حکمران تھے بلکہ بذاتِ خود سپہ سالار ہونے کے ناتے میدانِ جنگ میں اپنی موجودگی کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ دوسری اہم ترین وجہ، جو ان کی بدنصیبی بھی کہی جا سکتی ہے وہ ان کی صفوں میں غداروں کی موجودگی ہے۔ بلکہ اگر انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو تقریباً ہر دور میں اس قسم کے کردار نظر آتے ہیں۔ ”یوٹو بروٹس“ اور ”جعفر از بنگال صادق از دکن“ کا مرثیہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ وجہ شائد یہ ہے کہ بہادر لوگوں کو تلوار کی بجائے پیٹھ کے خنجر سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ مسلم ہندوستان میں ”ابوالفتح فتح علی خان ٹیپو سلطان“ بھی ایسا ہی ایک حکمران تھا جس کو تلوار کی جگہ پیٹھ کے خنجر سے ہی شکست دینا ممکن ہو سکا۔

20 نومبر 1750ء کو میسور کے حکمران حیدر علی کے گھر پیدا ہونے والے فتح علی خان ٹیپو سلطان نے ابتدائی دور میں حصول علم کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھی لیکن جلد ہی تیزی سے بدلتے حالات کے باعث اس کے والد حیدر علی اس سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ موجودہ حالات تعلیم سے زیادہ سپہ گری کی طرف توجہ مانگ رہے ہیں اور پھر ٹیپو سلطان نے بھی حالات کی نزاکت کی وجہ سے اپنی توجہ سپہ گری کی طرف مرکوز کر دی۔ پھر وہ وقت جلد ہی آ گیا۔ حیدر علی نے انگریزوں

کے خلاف جاری جدوجہد کے درمیان میں ہی آخری سانس لیتے ہوئے اپنے بیٹے ٹیپو سلطان کو تاج وتخت کے ساتھ انگریزوں کا بڑھتا ہوا خطرہ بھی ترکے میں دیا۔

ٹیپو سلطان نے آخر دم تک انگریزی فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھے رکھا۔ بالآخر 4 مئی 1799ء کو وہ وقت بھی آن پہنچا جب ٹیپو سلطان نے اپنے اس مقولے کو عملی طور پر ثابت کر دکھایا کہ ''گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہوتی ہے''۔ ٹیپو سلطان کی شہادت ''اپنوں'' کی غداری کے باعث ہی ممکن ہوسکی اور مشہور یہی ہے کہ ٹیپو سلطان کی نعش دیکھ کر انگریز جرنیل بے اختیار یہ کہہ اٹھا کہ اب ہمیں ہندوستان پر مکمل تسلط سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ٹیپو سلطان کی شہادت کے کچھ ہی عرصہ کے بعد ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا لیکن ٹیپو سلطان کے اس درس آزادی نے یہ اثر دکھایا کہ اگرچہ ہندوستان تو انگریزوں کے قبضے میں آ گیا لیکن وہ ہندوستانی دل پر قبضہ نہ کرسکا اور ٹیپو کی شہادت کے محض ڈیڑھ سو سال بعد انگریزوں کو ہندوستان کو خیر آباد کہنا پڑا۔ ٹیپو سلطان کی وصیت کے عنوان سے علامہ اقبال کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تو رہ نورد شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کر ہو جا دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھو نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

شوکت تھانوی

ایک نوعمر طالب علم نے نئی نئی شاعری شروع کی، اس کی ایک ابتدائی غزل کا ایک شعر تھا:

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوئی
ترے کوچے میں جا کر ہم ذلیل و خوار ہوئے

اس نوجوان شاعر نے کوشش کر کے یہ غزل اپنے دور کے معروف رسالے میں شائع کروائی، جب یہ رسالہ چھپ کر آ گیا تو بڑے اہتمام سے وہ رسالہ گھر میں اس طرح رکھ دیا کہ گھر والوں کی نظریں صرف اس رسالے پر پڑے بلکہ وہ غزل بھی ان کی نظروں میں آجائے۔ جب اس نوجوان کے والد کی نظر اس غزل پر پڑی تو گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا، شاعری سے زیادہ والد محترم کو اس بات پر اعتراض تھا

کہ آخر یہ لڑکا اس کی گلی میں جاتا ہی کیوں ہے؟ تو دوان کی والدہ نے ان کے والد کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی غرض سے دہائی دی کہ بچہ ہی تو ہے، غلطی سے چلا گیا ہوگا، میں سمجھا دوں گی آئندہ نہیں جائے گا، آپ اس بار معاف کر دیں۔

یہ چاقصہ ہے مشہور مزاح نگار، صحافی اور شاعر جناب شوکت تھانوی کا۔ اگرچہ ان کا آبائی وطن ضلع مظفرنگر کا قصبہ تھانہ بھون تھا لیکن وہ 2 فروری 1904ء کو ضلع متھرا میں پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی قصبے بھون کی نسبت سے ہی وہ تھانوی کہلائے۔ وہ طویل عرصے تک لکھنو میں مقیم رہے جہاں وہ صحافت، شاعری اور مزاح نگاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ جب نیرنگ خیال کے 1930ء کے سالنامہ نمبر میں ان کا مزاحیہ افسانہ سودیشی ریل شائع ہوا تو ان کا شمار صف اوّل کے مزاح نگاروں میں ہونے لگا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ پہلے کراچی میں رہائش اختیار کی بعد میں راولپنڈی میں جا بسے۔ وہ راولپنڈی میں روزنامہ جنگ سے منسلک ہوئے۔ یہاں وہ روزنامہ جنگ کے مدیر مقرر ہوئے اس کے ساتھ ہی جنگ میں چھپنے والے ان کے مستقل کالم ''وغیرہ وغیرہ'' اور ''پہاڑ تلے'' قارئین میں بہت مقبول ہوئے۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے ان کا مستقل فیچر ''قاضی جی'' بھی بہت مقبول تھا۔ ان کی کتابوں میں موج تبسم، بحر تبسم، دنیائے تبسم، برق تبسم، سیلاب تبسم، سودیشی ریل، قاعدہ بے قاعدہ، جوڑ توڑ، سنی سنائی، بار خاطر اور ان کی خودنوشت ''ما بدولت'' شامل ہیں۔

وہ 4 مئی 1963ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور میاں میر کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ شوکت تھانوی کی فیملی پلاننگ کے حوالے سے مزاحیہ نظم بہت مشہور ہوئی، اس کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

اے مرے بچے، مرے لخت جگر، پیدا نہ ہو
یاد رکھ پچھتائے گا تو، میرے گھر پیدا نہ ہو
تجھ کو پیدائش کا حق تو ہے، مگر پیدا نہ ہو
میں ترا احسان مانوں گا اگر پیدا نہ ہو

سید ضمیر جعفری

ہم نے کتنے دھوکے میں سب جیون کی بربادی کی
گال پہ اک تل دیکھ کے ان کے سارے جسم سے شادی کی

لبوں پہ تبسم پھیلاتے اس شعر کا انداز ہی بتا رہا ہے کہ

اس کا خالق اپنے منفرد انداز میں زندگی کی تلخیوں کو مسکراہٹوں میں تبدیل کر دیا کرتا تھا۔ اس شعر کا خالق معروف مزاح گو شاعر ضمیر جعفری کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ ان کے کلام کی مثال دیتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ کون سا شعر چھوڑا جائے۔ اب آپ ان کے خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے ہی دو اشعار ملاحظہ کیجیے، ایک ہی مقصد کے لیے دو مختلف خیال کتنے اچھوتے انداز میں پیش کرتے ہوئے ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

شوق سے لخت جگر، نور نظر پیدا کرو
ظالمو تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

اسی نظم میں یہی موضوع ایک بالکل دوسرے انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں بتاتا ہوں زوال اہل یورپ کا پلان
اہل یورپ کو مسلمانوں کے گھر پیدا کرو

ضمیر جعفری کا پورا نام سید ضمیر حسین تھا اور ضمیر کو وہ بطور تخلص استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ یکم جنوری 1914ء کو ضلع جہلم کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مروجہ ابتدائی و ثانوی تعلیم کے بعد علاقائی روایات کے مطابق فوج میں شمولیت اختیار کی اور میجر کے عہدے تک پہنچنے کے بعد توپ و تفنگ والی فوج سے ریٹائرمنٹ حاصل کی اور قلم کو اپنا ہتھیار مانتے ہوئے ادب کے میدان میں مسکراہٹوں کے تیر

برساتے رہے۔ انہوں نے راولپنڈی سے روزنامہ ''باد شمال'' نکال کر میدان صحافت میں بھی اپنے جوہر دکھائے، اس کے علاوہ پاکستان نیشنل سینٹر سے وابستہ ہو کر ادب کی جلاء میں عملی اقدامات کرنے کے علاوہ اسلام آباد کے ترقیاتی ادارے سی ڈی اے میں اپنی انتظامی صلاحیتوں کا استعمال بھی کرتے رہے۔

وہ بنیادی طور پر تو ایک مزاح گو شاعر تھے لیکن منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے سنجیدہ شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کی کتابوں میں مافی الضمیر، لہو ترنگ، مسدس بدحالی، ضمیریات، کارزار، ضمیر ظرافت اور نشاط تماشہ شامل ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کی پذیرائی کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے ان کو ''صدارتی تمغہ حسن کارکردگی'' عطا کیا۔

ان کا نیویارک میں 12 مئی 1999ء کو انتقال ہوا جبکہ ان کی تدفین مندرہ ضلع راولپنڈی کے قریب واقع سید محمد شاہ بخاری کے پہلو میں ہوئی۔

انہوں نے اردو ادب اور اہل قلم پر کس قدر اثر ڈالا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کی برسی کے موقع پر اسلام آباد میں منعقد ہونے والے ایک تعزیتی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ان کے بیٹے اور معروف فوجی جرنیل جنرل احتشام ضمیر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ واحد تعزیتی تقریب دیکھی ہے جس میں قہقہے بکھر رہے تھے۔

درد میں لذت بہت، اشکوں میں رعنائی بہت
اے غم ہستی ہمیں دنیا پسند آئی بہت

سعادت حسن منٹو

''ہمارا معاشرہ عورت کو کوٹھا چلانے کی اجازت تو دیتا ہے مگر تانگا چلانے کی اجازت نہیں دیتا''

معاشرتی دوغلے پن پر طنز کا اتنا بڑا وار یقیناً منٹو کے علاوہ کوئی اور نہیں کرسکتا ہے۔ اتنے بڑے اور کاٹ دار طنز کا ہی نتیجہ ہے کہ جب بھی کوئی اردو ادب کی متنازع ترین شخصیات کی فہرست مرتب کرنے بیٹھے گا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس فہرست میں منٹو کا نام سرفہرست نہ ہو۔ یہ واضح رہے کہ یہاں متنازع سے مراد اس کی سوچ یا کردار نہیں بلکہ اس کی تحریروں سے کھڑے ہو جانے والے ادبی تنازعات ہیں۔

منٹو بیسویں صدی کے ان حساس فنکاروں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جن پر اس صدی کی بدلتی ہوئی جغرافیائی

حدود اور معاشرتی اقدار نے بہت زیادہ اثر ڈالا۔

منٹو کا بچپن چونکہ سگی اور سوتیلی اولاد کی کشمکش میں گزرا لہٰذا اسی کشمکش نے منٹو کی ذات میں ایک بہت ہی حساس اور خاموش طبع انسان کو جنم دیا اس کے ساتھ ہی ابتدائی عمر کی معاشرتی ناانصافیوں نے اس کے اندر ایک معاشرے کے باغی اور سرکش انسان کو بھی جنم دیا۔ اسکول دور میں مسلسل ناکامی دراصل اس کی لاشعوری سرکشی اور بغاوت کا اظہار ہی تھا۔ منٹو نے میٹرک کا امتحان بھی تین دفعہ کی ناکامی کے بعد ہی پاس کیا۔ اس کے بعد ہندو سبھا کالج میں ایف اے میں داخلہ لیا لیکن جلد ہی وہاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا تو ایم او کالج میں داخلہ لے کر انسانی نفسیات کے مطالعے کو اپنا موضوع بنا لیا اور یہیں سے منٹو کو اپنی اظہار ذات کا موقع ملنا شروع ہو گیا۔

تقسیم ہند تک وہ بھارت کی فلمی دنیا میں بطور کہانی کار اپنا مقام بنا چکے تھے، لیکن قیام پاکستان کے ساتھ ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گئے، اس موقع پر ہندستانی فلمی صنعت کے نمایاں افراد نے بہت کوشش کی کہ منٹو پاکستان منتقل نہ ہوں لیکن بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے کی ہنگامہ خیزیوں اور خون کی بہتی ندیوں نے منٹو کو اپنے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور کر دیا اور وہ پاکستان چلے آئے۔

پاکستان میں منٹو کے لکھے ہوئے افسانے معاشرے کی دورخی اور منافقت سے بغاوت کا اظہار ہیں۔ یہاں منٹو کے افسانوں اور کہانیوں کے بے باک رنگ نے اتنی ہلچل مچائی کہ منٹو کو پابندیوں اور عدالتی کارروائیوں کے ساتھ قید و بند اور جرمانوں کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ منٹو کی معاشرے سے اس بے باک بغاوت میں اس ماحول کا بھی ایک بڑا ہاتھ تھا جو قیام پاکستان کے لاہور منتقل ہونے کے بعد ان کو ملا۔ دراصل وہ ہجرت کے بعد لاہور کے جس فلیٹ میں مقیم ہوئے وہاں ان کے پڑوس میں پروفیسر جی ایم اثر، مستنصر حسین تارڑ کے والدین اور ملک معراج خالد جیسے اہل علم رہا کرتے تھے اور یوں منٹو کا فلیٹ لاہور میں موجود اہل علم و اہل قلم کا مرکز ٹھہرا۔ یہاں اکثر و بیشتر اہل قلم کی محافل جما کرتی تھیں۔

منٹو کے مشہور افسانوں میں ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، کھول دو، دھواں، اللہ دتہ، الو کا پٹھا اور اوپر نیچے درمیان شامل ہیں۔ معاشرے میں تلاطم پیدا کردینے والا یہ معروف افسانہ نگار جو 11 مئی 1912ء کو ضلع لدھیانہ کے موضع سمبرالہ میں پیدا ہوا 18 جنوری 1955ء کو کثرت شراب نوشی کے باعث جگر تباہ کروانے کے بعد لاہور میں سفر آخرت پر روانہ ہوگیا۔ منٹو کی قبر پر نصب کردہ کتبہ کی تحریر خود ان کی اپنی ہے، جس میں بھی وہ معاشرے کو جھنجوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہاں تحریر ہے کہ ”میری قبر کا کتبہ۔ یہ لوح سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں تھا (منٹو)“

حسرت موہانی

جدوجہد آزادی نے برصغیر کو جو زعماء عطا کیے ان میں سے اکثر میں ہمیں کثیرالجہتی خصوصیات کے حامل نظر آتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک مولانا حسرت موہانی بھی ہیں۔ وہ شاعر، صحافی، سیاستدان اور دانشورانہ شخصیت کا حسین مرقع تھے۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ بغاوت کا سیاسی امتزاج بھی خوب نظر آتا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے اکثر اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یا

نہیں آتی تو ان کی یاد برسوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

یا ان کے ایک مشہور گیت کے چند اشعار

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے
تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

دراصل حسرت موہانی جو یکم جنوری 1875ء کے ہنگامہ خیز دور میں یوپی کے علاقے موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے تھے اور علی گڑھ کے ایم اے او کالج کے فارغ التحصیل تھے اس دور کی ہنگامہ خیزیوں اور علی گڑھ کی تعلیم نے ان کے مزاج میں نکھار سا پیدا کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے علی گڑھ سے ہی ایک رسالہ ”اردو معلیٰ“ کے نام سے جاری کیا اور ساتھ ہی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کرکے اپنی سیاسی زندگی کا حقیقی آغاز کیا۔ اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا میں شامل ہوگئے بالآخر آل انڈیا مسلم لیگ میں پڑاؤ ڈال لیا۔ مولانا حسرت موہانی کو ”اردو معلیٰ“ میں ایک مضمون کی اشاعت پر بغاوت کے الزام میں مقدمے کا سامنا بھی کرنا پڑا جس میں ان کو جرمانے کے علاوہ دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ جیل میں ان

کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا جو عادی اخلاقی مجرموں کے ساتھ کیا جاتا۔ ان سے باقاعدہ آٹے کی چکی پسوائی جاتی اور روزانہ ایک من گندم پیسنا ان کی ذمہ داری تھی۔ ان ہی حالات میں انہوں نے وہ مشہور شعر کہا جو نا صرف ان کی شاعری کا حسین نمونہ ہے بلکہ سرکاری سلوک پر طنز کا ایک بھرپور تازیانہ بھی ہے، وہ کہتے ہیں:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

انہوں نے اس قید کے دوران اپنے اور دیگر قیدیوں پر گذرنے والے حالات پر ایک کتاب بھی ''قید فرنگ'' کے نام سے تحریر کی، یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے معرکۃ الآراء کتاب مانی جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے پاکستان آنے کی بجائے ہندوستان میں رہائش کو ہی ترجیح دی، اور وہیں 13 مئی 1951ء کو شہر لکھنو میں اس مجاہد آزادی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور وہیں مدفون ہوئے۔

سبط علی صباء

فوج کی ڈسپلن زدہ زندگی میں بظاہر یہ تصور بھی محال نظر آتا ہے کہ اس سے ادب کے لطیف گوشوں کا کوئی شگوفہ پھوٹ سکے لیکن اگر ہم اردو ادب کو اٹھا کر دیکھیں تو اس کے متعدد ادیب اور شاعر ہم کو آتش و آہنگ کے اسی میدان سے کلام نرم و نازک کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں۔ فوج کی اس پابند زندگی سے ادب کی آزاد فضاؤں میں آکر اپنا نام بنانے والوں میں سے ایک بڑا نام سبط علی صبا کا بھی ہے۔

سبط علی صبا 11 نومبر 1925ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوے۔ انہوں نے بھی علاقائی روایات کے مطابق اپنی عملی زندگی کا آغاز بری فوج میں شمولیت سے کیا بعد میں وہ پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ سے منسلک ہوگئے۔ خطۂ پوٹھوار کے اس خوبصورت علاقے نے ان کی شاعری کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس علاقے کی جغرافیائی اور موسمی حالات نے ان کی شاعری پر کس طرح اثر ڈالا یہ ان کے دوست آفتاب اقبال عظیم کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

''جب واہ ایک نیم آباد بستی ہوا کرتا تھا اور شہر بننے کے مراحل میں تھا، میں اس آبادی کی آبادی اور ویرانے کے ویرانے میں قیام پذیر تھا، سبط علی صبا روز ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہمارے کوارٹر آ پہنچتے۔ اس کوارٹر میں ہم چار دوست توصیف تبسم، توصیف حسن، اصغر قادری اور میں رہا کرتے تھے۔ ان کی آمد ہمارے کمروں اور صحن میں خوشگوار ہلچل مچا دیا کرتی تھی۔ بے تکلفی اور حس مزاح میں رچی ہوئی گفتگو، شعر و ادب کی باتیں، دن بھر کی وارداتیں، لطیفہ بازی، چائے اور سگریٹ نوشی سے دن بھر کی تھکن اتر جاتی۔ چھٹی کے دن وہ اور میں باقاعدگی سے حسن ابدال یا ٹیکسلا کی جانب پیدل ہی نکل پڑتے۔ یہ ایک لمبی چپ کا سفر ہوتا تھا جس کے دوران مشق سخن جاری رہتی''

صباء کی سڑک گردی کے دوران مشق سخن ایک ایسا تجربہ تھا جس کے لطف کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس کو تنہائی میں سڑک گردی کا بھرپور موقع ملا ہو، کسی بھی حساس دل کے لیے اس دوران فطرت کا مطالعہ اور قدرت کا مشاہدہ وہ نعمتیں ہیں جو بھرپور میسر ہوتی ہیں اور اس سے جو ادب جنم لیتا ہے اس سے فیضیاب ہونے کے لیے صباء کی شاعری عطیۂ خداوندی سے کم نہیں۔ اس سڑک گردی نے صباء کو ایک عام انسان کے اتنا قریب کر دیا کہ اس کی شاعری میں ایک عام آدمی سوچتا ہوا نظر آتا ہے۔ صباء نے اپنی زندگی میں زیادہ توجہ ادب کی آبیاری پر ہی رکھی۔ شائد اسی وجہ سے وہ اپنا ایک مجموعہ کلام ''ابر سنگ'' کے نام سے ترتیب دے سکے اور وہ بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کے احباب نے وہی مجموعہ کلام ''طشت مراد'' کے نام سے طبع کروایا۔

سپردِ خاک ... 14 مئی 1980ء کو واہ کینٹ میں ... کیا اور اسی مٹی کی خوراک بنے جس کی راہوں پر ... وہ اپنی روحانی غذا تلاش کرتے رہے۔

ان کی شاعری میں سے چند نمائندہ اشعار ملاحظہ کیجیے، جن میں سے پہلا شعر تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن سے رستے بنا لیے

لوگوں کی چادروں پہ بناتی رہی وہ پھول
پیوند اس نے اپنی قبا میں سجا لیے

ہر حملہ کے دوش پہ ترکش کو دیکھ کر
ماؤں نے اپنی گود میں بچے سجا لیے

عبیداللہ علیم

معروف اردو شاعر عبیداللہ علیم 12 جون 1939ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد 1952ء میں اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان چلے آئے۔ پاکستان میں اردو میں ایم اے کیا اور پھر 1969ء میں پاکستان ٹیلی ویژن سے بحیثیت پروڈیوسر منسلک ہوگئے۔ یہاں ان کی تعلیم اور ادبی ذوق نے ان کی صلاحیتوں اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو اتنا صیقل کیا کہ وہ جلد ہی پاکستان ٹیلی ویژن کے معروف پروڈیوسرز کی فہرست میں نمایاں نظر آنے لگے۔ لیکن افسوس یہاں ان کے ساتھ وہی ہوا جو عموماً حساس دل کے ملازمت پیشہ افراد کے ساتھ ہوتا ہے، ان کی اپنے حکام بالا سے نہیں بنی اور 1978ء میں انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن سے اپنا تعلق ختم کرلیا۔

وہ ایک اچھے پروڈیوسر ہی نہیں بہت اچھے شاعر بھی تھے، وہ انسانی احساسات اور جذبات کو جس عمدہ طریقے سے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں وہ دل کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

محبتیں بھی عجیب اس کی نفرتیں بھی کمال
مری ہی طرح کا مجھ میں سما گیا اک شخص

ان کی غزلوں میں محبت اور سماجی جدوجہد کا ایک حسین امتزاج نظر آنے کے ساتھ ساتھ اس میں دور جدید کی حسن و عشق کے تصورات میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا اثر بھی خوب نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری اظہارِ حسن و عشق کے غلاف میں معاشرتی ناانصافیوں پر نوحہ کناں نظر آتی ہے،

نروان

ایک روز جب بابا اکیلے بیٹھے تھے تو میں ان کے سامنے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''بابا آپ سب لوگوں سے بار بار نروان کا ذکر کرتے ہیں یہ نروان کیا ہوتا ہے؟''

بابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''بیٹا نروان میں ''نر'' کا مطلب ہے۔ ''بغیر'' اور ''وان'' کا مطلب ''ہوا'' پھر کہنے لگے کبھی تم نے تالاب کو دیکھا ہے جب ہوا چل رہی ہو اور اس کی سطح پر لہریں پیدا ہو گئی ہوں اس وقت نہ تو اردگرد کے ماحول کا عکس تالاب میں نظر آتا ہے اور نہ تالاب کی تہہ میں پڑی ہوئی کوئی چیز دکھائی دیتی ہے لیکن جب ہوا تھم جائے تو باہر کی ساری دنیا اس میں نظر آنے لگتی ہے اور خود اس کی تہہ بھی ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ بس یہ حالت انسان کی ہے جب تک وہ خواہشات کی زد میں رہے گا اسے نہ تو باہر کا کوئی علم حاصل ہوگا اور نہ اندر کی کائنات اس پر منکشف ہو سکے گی۔ خواہشات کی آندھی رک جائے تو سمجھو بینائی مل گئی نروان حاصل ہوگیا۔

(ڈاکٹر وزیر آغا کے نروان سے اقتباس)

مرسلہ: رضوان تنولی کریڑوی۔ کراچی

مثلاً ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

اس نے پوچھا بڑے پیار سے کیسے ہو علیم
اے غم عشق ذرا اور فروزاں ہونا
اور پھر وہ دوسری جگہ کہتے ہیں
میں یہ کس کے نام لکھوں جو الم گذر رہے ہیں
میرے شہر جل رہے ہیں، میرے لوگ مر رہے ہیں

عبیداللہ علیم 18 مئی 1998ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور وہ اسٹیل ملز کے قریب رزاق آباد میں ''باغ احمد'' نامی قبرستان میں مدفون ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں کے نام چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، ویران سرائے کا دیا اور نگار صبح کی امید ہے۔

کمال احمد رضوی

یہ جرأت صرف کمال احمد رضوی جیسا عظیم قلمکار ہی کرسکتا ہے کہ ایک کردار جو اس کو خود ادا کرنا ہے اس کے لیے اپنے مقابل کردار کے منہ سے کہلوائے کہ ''یار الن تو بہت بڑا کمینہ ہے''۔ اس قسم کا جملہ لکھنے اور اپنے منہ پر کہلوانے کے لیے اپنی ذات کی انتہائی درجے پر نفی کرتے ہوئے اپنے تخلیق کردہ کردار کو ترجیح دینے کی ہمت بہت کم ہی افراد کر پاتے ہیں۔ لیکن کمال احمد رضوی کا یہی کمال ہے کہ وہ معاشرے کی برائیوں پر نشتر زنی کرتے ہوئے کسی کو بار خاطر نہیں لاتے ہیں۔ جب ان کی تحریر کی کاٹ اور اداکاری کا جوہر ملتے ہیں تو ایک بھرپور ڈراما جنم لیتا ہے۔ اسی لیے تو ان کے بارے میں منیر نیازی کا یہ جملہ زبان زد عام ہے کہ کمال احمد رضوی چاقو سے گدگداتا ہے۔

وہ یکم مئی 1930ء کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک قصبہ گیا میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد دیگر متعدد قلمکاروں کی طرح وہ 1951ء میں پاکستان آگئے، لیکن وہ تنہا ہی پاکستان آئے اور ان کے گھر والوں نے بھارت میں ہی قیام کو ترجیح دی۔ پاکستان آنے کے بعد تھیٹر میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا، ان کا تھیٹر کا پہلا معروف ڈراما ''بالا کی بدذات'' 1960ء میں پیش ہوا۔ اس ڈرامے کی کامیابی نے ان کی اپنی کامیابی کی راہیں کھول دیں اور وہ آگے سے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ پی ٹی وی کے آغاز سے ہی وہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ یہاں ان کے ڈراموں نے دھوم مچانا شروع کردی۔ پی ٹی وی میں ان کی قسط وار ڈراما سیریل ''چور مچائے شور'' اور ''میرا ہمدم میرا دوست''

نے تو مقبولیت حاصل کی ہی لیکن عوام الناس میں ان کی سب سے بڑی شناخت ڈراما سیریل ''الف نون'' بنی۔

''الف نون'' میں ان کا لکھا ہوا کردار ''الن'' کسی بھی شاطر، عیار، مکار اور فریبی انسان کے لیے استعارے کا درجہ حاصل کرگیا، یہ کردار انہوں نے خود ہی ادا کیا تھا۔ جبکہ اس کے سامنے ''ننھا'' کا کردار، جو رفیع خاور مرحوم نے ادا کیا تھا وہ کسی بھی بے وقوفی کی حد تک معصوم شخص کے لیے استعارے کا درجہ حاصل کرگیا۔ ایک ہی سیریل میں دو ایسے کردار تخلیق کرنا جو اپنی اپنی جگہ استعارے کا درجہ حاصل کرلیں کمال احمد رضوی جیسے عظیم ڈراما نگار کے لیے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس سیریل میں معاشرتی برائیوں اور منافقتوں پر جس تیکھے اور میٹھے انداز میں نشتر زنی کی جاتی تھی وہ کمال احمد رضوی کا ہی خاصہ ہوسکتا ہے۔ ان کی یہ سیریل اتنی مقبول تھی کہ 1965ء سے لے کر 1982ء تک مختلف وقفوں کے ساتھ ٹی وی پر چار دفعہ پیش کی گئی اور یقیناً اگر یہ سیریل آج بھی پیش ہو اتنی ہی زیادہ بلکہ شائد اس سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کرے۔

ان کی کتابوں میں شیشوں کا مسیحا، گاہے خنداں گاہے گریاں اور مرغابی کے علاوہ دیگر زبانوں سے تراجم پرمبنی کتب دغاباز اور کیرو کی ہاتھ کی لکیر شامل ہے۔

ثنا ثاقب

وہم کا عارضہ دنیا کے ہر خطے میں پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے ایمان کی کمزوری قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ خبط مگر اس عارضے کا تذکرہ دلچسپی کا سامان ہے۔

ان چند وہموں کی اقسام جو انسان کو پریشان کردیتا ہے

آپ نے اکثر سنا ہوگا۔ ”بھائی اس سے کیا بات کرنا وہ تو جنونی ہے۔“

”اوہو تم پر تو جنون سوار ہو گیا ہے۔“

اس قسم کی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ آخر یہ جنون ہے کیا۔ کسی بھی کام کو کرنے کی شدید خواہش اور بار بار کرتے چلے جانا، نفع نقصان کی پروا کیے بغیر۔

یا اپنے ذہن میں کوئی بھی خیال پختہ کر لینا اور اس پر ڈٹ جانا۔ آپ نے اپنے اردگرد ایسے بے شمار لوگوں کو ضرور

دیکھا ہوگا جو اگر کسی کام میں لگے ہوئے ہوں تو کسی کی پرواہی نہیں کرتے۔

یا پھر آپ نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہوگا جو بے جا قسم کے خوف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ ان کے ذہن پر کسی بات کی سنک سوار ہو جائے پھر وہ اپنی سنک سے باہر ہی نہیں آتے۔

اس قسم کے جنون کی ایک اور قسم بھی ہوتی ہے کہ ایسے لوگ چونکہ اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں اس لیے ان کا جنون دنیا کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔

یہ دنیا بھر کے کامیاب سائنس داں، موجد، مفکر، ادیب، فلاسفر یہ سب کیا تھے۔ جنونی ہی تو تھے۔ اگر وہ نفع و نقصان کے چکر میں رہتے تو شاید آپ کے اردگرد جو سائنسی ایجادات دکھائی دے رہی ہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

نہ جیپ ایجاد ہوتی، نہ ریل چلتی، نہ کمپیوٹر ہوتا، غرض یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایک بے موقع اور بے مصرف زندگی ہوتی۔

یہ جنونی ہی تھے جنہوں نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے لیکن یہ مثبت طرز فکر رکھنے والے جنونی تھے اور دوسری قسم کے جنونی وہ ہوتے ہیں جو خود اپنے لیے یا معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جاتے ہیں۔

ایسے لوگ اپنے ذہن کے صندوق سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ جو کچھ ان کے ذہن پر سوار ہو جائے بس وہی ان کا جنون بن جاتا ہے۔

انگریزی میں اس قسم کے جنون کو مانیا (Mania) کہا جاتا ہے۔

ایسے جنون کی بے شمار اقسام ہیں۔ یہ اپنی ذات اور اپنی سوچ کے خول میں رہنے والے انسان ہوتے ہیں۔ ہم نے اس مضمون میں چند مانیا کے حوالے دیے ہیں۔

ویسے تو اس قسم کے جنون کی بے شمار اقسام ہیں لیکن میں نے ان ہی کو منتخب کیا ہے جو عام ہیں اور آپ نے بھی ایسے مریضوں کو ضرور دیکھا ہوگا۔

اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے ذرا ذرا سی بات پر ناراض، کسی بھی معاملے میں انتہائی شدید عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بظاہر وہ بالکل درست اور صحت مند نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ مریض ہوتے ہیں۔ مانیا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

تو چلیں ایک نظر مختلف قسم کے Manias کو دیکھتے ہیں۔

جنون طب نفس میں ایک شدید مزاجی مرض کہا جاتا ہے۔ اس مرض کی علامات Elation تندی، اشتعال (Agitation)، فرط ہیجان (Hyper excilability) اور فرط سرگرمی (Hyper activity) وغیرہ ہوا کرتی ہیں۔

خیالات و گفتار میں تیزی و ہیجانی کیفیت کو علم طب میں پرواز افکار Flight of ideas کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

شدید قسم کے جنون کو ہائپر مانیا اور ہلکے قسم کے جنون کو ہائپو مینیا کہا جاتا ہے۔

Ablotomania

آپ نے اکثر کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہوں گے جو اپنے آپ کو ہر وقت دھوتے اور پاک رکھنے کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بار بار ہاتھ دھو رہے ہیں۔ جا جا کر نہا رہے ہیں۔ دن بھر میں دس دفعہ چہرہ صاف کر رہے ہیں۔ انہیں ہر وقت یہ وہم لگا رہتا ہے کہ وہ گندے ہو چکے ہیں۔ یا کچھ لگ گیا ہے۔ اس کیفیت کو Ablotomania کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نارمل بات نہیں ہے کہ آپ صرف یہ سمجھ لیں کہ وہ بہت صفائی پسند ہے۔ صفائی پسند ہونا ایک دوسری بات ہے اور اس جنون میں مبتلا ہونا دوسری بات۔

Agromania

کچھ ایسے لوگ بھی ہمارے اردگرد بہت بڑی تعداد میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا بند جگہوں پر دم گھٹنے لگتا ہے۔ جو بند گاڑی میں سفر نہیں کر سکتے۔ جو لفٹ میں سوار نہیں ہوتے۔ (ویسے بند جگہوں کے خوف کو کلاسٹروفوبیا بھی کہا جاتا ہے)۔

اگرو مانیا میں مبتلا لوگ کھلی جگہ میں رہنے کی شدید خواہش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ بند جگہوں پر نہیں رہ سکتے۔

میدانوں اور پارکوں میں جا کر اپنے آپ کو بہت خوش اور آزاد محسوس کرتے ہیں۔

Anglomania

یہ بہت دل چسپ مانیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ آپ اسے مانیا نہ سمجھیں اور یہ کہہ دیں کہ ملک سے باہر جانا آدمی کی خواہش ہوتی ہے۔ درست ہے لیکن خواہش اور بات ہے۔ جنون اور ہے۔

اینگلو مانیا ایک جنون ہے۔ ایسے لوگ اپنے ملک کی ہر چیز سے الرجک ہوتے ہیں۔ انہیں یہاں کا ماحول، یہاں کی

زندگی، یہاں کی طرزِ معاشرت، پھر بھی اچھی نہیں لگتی۔
وہ ہر حال میں انگلینڈ یا فرانس وغیرہ جانا چاہتے ہیں۔
اس لیے اس جنون کو اینگلو مانیا کہا جاتا ہے۔

Antho mania

ہوسکتا ہے کہ آپ کے نزدیک پھولوں سے محبت رکھنے والا شخص باذوق، حساس اور لطیف ترین جذبات کا مالک ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔
پھولوں سے محبت رکھنے والے حساس جذبات کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ فطرت کے بہت قریب ہوتے ہیں لیکن اگر یہ شوق حد سے زیادہ ہوجائے تو یہ جنون کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔
ماہرین نفسیات اسے انتھو مانیا کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسا شخص پوری دنیا سے بے پروا ہو کر صرف پھولوں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

Aphrodisio mania

یہ ایک خطرناک قسم کا جنون ہے۔ اس جنون میں مبتلا شخص معاشرے کے لیے مکروہ ہو جاتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔
ایسا شخص جنسی جنونی ہوتا ہے۔ وہ اس جذبے کے آگے بے بس ہو کر اندھا ہو جاتا ہے۔ آپ نے اکثر ایسے لوگوں کے بارے میں سنا یا پڑھا ہوگا جو اس جذبے سے مغلوب ہو کر کسی کو قتل تک کر بیٹھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ جنس کا جذبہ فطری ہوا کرتا ہے لیکن جب یہ حد سے تجاوز کرجائے تو غیر فطری ہو جاتا ہے اور خطرناک بھی۔
صحیح تربیت اور مستعار اس جذبے کو کنٹرول میں رکھنے کے کام آتا ہے۔

Biblio mania

یہ بھی بہت عام ہے۔
آپ نے اکثر والدین کو اپنے بچے کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہوئے ضرور سنا ہوگا: ''میرا بیٹا تو کتابوں کا کیڑا ہے۔''
یعنی اسے ہر وقت پڑھتے رہنے کی عادت ہے۔ عام طور پر تو یہ شاید اچھی بات سمجھی جاتی ہو لیکن ماہرینِ نفسیات اسے بھی ایک طرح کا جنون سمجھتے ہیں۔
ان کا کہنا ہے کہ ایسا شخص بائبلیو مانیا کا مریض ہوتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زندگی کو فطری انداز سے گزارنا چاہیے۔
ایسا نہ ہو کہ آپ کتابوں کے چکر میں پوری دنیا سے کٹ کر رہ جائیں۔

Broxo mania (دانت پیسنے کی عادت)

بچوں میں یہ عادت عام طور پر پائی جاتی ہے۔ ویسے تو یہ روز مرہ یا محاورہ ہے کہ وہ غصے میں دانت پیسنے لگا لیکن یہ محاورے دانت پیسنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک جنون بھی ہے۔
بہت سے والدین ایسے بچوں کو ڈاکٹرز کے پاس بھی لے جاتے ہیں کہ میرے بچے کو دانت پیسنے کی عادت ہے۔
ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر کوئی وقتی ترکیب آزما کر معاملات کو ختم کردے۔ لیکن ماہر نفسیات اس عادت کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
آخر کیوں، بچے میں کسی قسم کا احساس یا خوف ہے کہ وہ اپنی اصلی کیفیت کو چھپانے کے لیے دانت پیسنے لگا ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنے کے بعد اس کا علاج شروع ہوتا ہے۔

Cacadamo Mania

جی ہاں یہ بھی ایک نفسیاتی مرض ہے۔
ہمارے یہاں ایسے کیسز بہت عام ہیں۔ عام طور پر غریب یا کم تعلیم یافتہ طبقے میں۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں شخص پر یا خود اس پر کسی جن یا آسیب کا اثر ہوگیا ہے۔
اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ کسی ماہر نفسیات کو دکھانے کی بجائے اس شخص کو کسی عامل بابا کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ ایسے بابا ہمارے یہاں ہر محلے میں پائے جاتے ہیں۔
یہ نام نہاد بابا انہیں الٹی سیدھی ترکیبیں آزما کر اور مریض کے لواحقین سے پیسے اینٹھ کر اسے اور زیادہ نفسیاتی مریض کردیتے ہیں۔
تعویذ گنڈوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ (ایسا شخص کسی جن یا آسیب وغیرہ کے اثر میں آئے یا نہ آئے باباؤں کے اثر میں ضرور آجاتا ہے)۔

Catapada mania

یہ بھی ایک خطرناک جنون ہے۔ اس جنون میں مبتلا افراد خود اپنی ذات کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ یہ جنون ہے بلندی سے کود جانے کا جنون۔ جی ہاں یہ بلندی سے خوف کے بالکل برعکس ہوا کرتا ہے۔ بلندی سے خوف کھانے والے تو بلندی پر جانے سے خوف زدہ رہتے ہیں لیکن اس مانیا کے مریض بلندی پر جاکر کود جانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں اور جب انہیں موقع ملے تو کود بھی جاتے ہیں۔ پھر یا تو جان گنوا دیتے ہیں یا معذور ہو جاتے ہیں۔ خودکشی کا رجحان بھی اس جنون کی ہی ایک قسم ہے۔

اگر اس قسم کا کوئی آدمی آپ کے آس پاس ہو تو اسے بلندی پر نہ جانے دیں۔ خاص طور پر اسے چھت سے جھانکنے یا اونچی بالکونی سے دیکھنے کی اجازت نہ دیں۔ ورنہ اس کا یہ جنون اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔

Clino mania

عام طور پر ہم یہ کہتے ہیں کہ اسے دیکھو ہر وقت بستر توڑتا رہتا ہے یا وہ بہت سست ہوتا جارہا ہے۔ کام وام تو کوئی نہیں صرف بستر پر پڑا رہتا ہے لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ یہ ایک طرح کا جنون یا مانیا ہے۔ اس جنون کو Clino mania کہا جاتا ہے۔ یعنی بستر پر پڑے رہنے کا شوق۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسا شخص اپنی عملی زندگی میں کس طرح ناکام ہوتا ہوگا۔ اس میں کام کرنے کی تحریک ختم ہو جاتی ہے۔

وہ رات دن بستر پر گزارنا چاہتا ہے۔ ایسے شخص کو نحوست زدہ، سست یا کاہل کہہ کر نظر انداز کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مناسب علاج ہونا چاہیے۔

ماہرین نفسیات کے خیال میں یہ کوئی اچھی اور صحت مند علامت نہیں ہے۔

Capro mania

اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

شدید پسند اور شدید ناپسندیدگی۔ یوں ہی بغیر کسی خاص سبب کے کسی شخص کو کسی خاص چہرے سے شدید محبت یا شدید نفرت ہو جاتی ہے۔

شدید محبت کی صورت میں وہ ہر وقت اسے دیکھتے رہنا چاہتا ہے اور نفرت کی صورت میں اس چہرے کے حامل شخص کا دشمن ہو جاتا ہے۔

آپ نے کئی بار اس قسم کی بات سنی ہوگی۔ ”یار مجھے اس کے چہرے سے نفرت ہے۔ جی چاہتا ہے اس کا چہرہ مسخ کردوں۔“ یا اس قسم کی کوئی اور بات۔

اگر کسی میں اس قسم کی کوئی علامت ظاہر ہونے لگے تو اس کی طرف سے بے پروائی برتیں۔ بلکہ اس کی طرف دھیان نہ دیں۔

ایسے شخص کو ہوشیار نفسیاتی معالج کی ضرورت ہے۔

Docno mania

یہ کوئی عام جنونی نہیں بلکہ بہت ہی خطرناک قسم کا جنونی ہے۔

قاتل دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو وقتی اشتعال میں آکر کسی کا خون کردیتے ہیں اور دوسرے وہ جو کسی کو مارنے کی بہت ٹھنڈے دل سے پلاننگ کرتے رہتے ہیں۔

یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس قسم کے مریض مقتول سے واقف بھی ہوں۔ یا مقتول سے ان کی کوئی دشمنی بھی ہو۔ بس ان کے دلوں میں کسی کا خون بہانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ خون کردیتے ہیں۔ آپ نے سیریل کلرز کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ یہ ویسی ہی وبا ہے۔ ایک ایسا شخص تھا جس کا مشغلہ اس عورت کا خون کرنا تھا جس کے بال سرخ ہوں اس طرح اس نے کئی عورتوں کو ٹھکانے لگادیا۔

ایک شخص اس بات پر خون کرتا تھا کہ مقتول کی آواز اسے بری لگتی تھی۔ بس اس کی آواز سن کر اسے خون بہانے کی خواہش ہونے لگتی تھی۔

بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر لذت سکون محسوس کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے نفسیاتی مریض ہمارے معاشرے کے لیے کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی آنکھیں اور ان کی جسمانی حرکات یہ بتا دیتی ہیں کہ اس وقت ان کے ذہن میں کیا آندھیاں چل رہی ہیں اور وہ کسی کا خون کرنے کے لیے کتنے بے چین ہو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اسلحہ بھی خون مانگتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ صرف مفروضہ ہو لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ جس کی جیب میں اسلحہ یا کسی قسم کا ہتھیار ہو اس کی نفسیاتی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔

وہ درشت مزاج اور غصہ ور ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس جو اسلحہ ہے وہ اسے کسی کا خون کرنے کے لیے اکسا رہا ہوتا ہے۔

بہر حال یہ کیفیت ایک مرض ہے اور اس مرض کا علاج بہت ضروری ہے۔

Doro mania

یہ ایک مختلف قسم کا جنون ہے۔

ہوسکتا ہے کہ آپ اسے جنون کہنے پر راضی نہ ہوں بلکہ آپ کہیں کہ فلاں آدمی بہت وضع دار اور رکھ رکھاؤ والا ہے۔ وہ ہمیشہ آنے جانے والوں کو تحفے دیا کرتا ہے۔

یہ بھی ایک جنون ہے۔ جی ہاں غیر فطری طور پر بغیر کسی سبب کے تحائف دینا بھی ایک مانیا ہے۔ اس میں مبتلا شخص سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ یہ فیاضی نہیں بلکہ مرض کی ایک کیفیت ہے کہ آپ تحفے دیتے چلے جائیں۔ چاہے کسی سے قرض لینا

پڑ جائے۔ اس قسم کا ابنارمل رویہ رکھنے والے دریا دل نہیں کہے جاسکتے۔ بلکہ ماہرین نفسیات کے خیال میں وہ مریض ہوتے ہیں اوراس مرض کو ڈورومانیا کہا جاتا ہے۔

Driapeto mania

عام طور پراس مانیا کے شکار نوعمر ہوا کرتے ہیں۔

حالانکہ بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی، گھر میں ہر قسم کا آرام ہوتا ہے ان سے بہت پیار بھی کیا جاتا ہے۔ ان کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ان میں ایک خواہش بہت شدید ہوتی ہے اور وہ ہے گھروں سے بھاگ جانے کی خواہش۔

ایسے نوجوانوں سے جب پوچھا جاتا ہے کہ تم گھر سے کیوں فرار ہوئے تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

صرف ایک ہی بات ہوتی ہے کہ نہ جانے کیوں۔ انہیں بھاگ جانے کی خواہش ہوئی اور وہ بھاگ نکلے۔ نوعمر لڑکے اور لڑکیاں جب اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ان کے ساتھ بہت برائیاں ہوا کرتی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھ لگ کر اپنی زندگی برباد کر بیٹھتے ہیں۔

یہ والدین کا فرض ہے کہ وہ ایسے بچوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔ ان کے رجحان کو دیکھیں ان کی باتوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ ان کے ذہنوں میں کیسے خیالات پروان چڑھ رہے ہیں۔

کوشش کریں کہ انہیں کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جائیں۔ تاکہ وہ ان کے ذہنوں میں جھانک کر ان کے اس اضطراب کا خاتمہ کر سکے۔

Ecdemo mania

مشہور شاعر مجاز نے کہا تھا۔ "اے غم دل کیا کروں۔

اے وحشت دل کیا کروں"

ان کی یہ نظم آوارہ بہت مشہور ہے اور شاید آوارہ گردی کی اس خواہش کے پیچھے وہی ایک ڈی مانیا ہو۔

یہ ابنارملٹی عام طور پر بڑوں میں ہوا کرتی ہے جو بلاوجہ راتوں کو یا دن میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ آوارہ گردی کسی بے نام اداسی کا سبب ہوتی ہے۔

گھر واپس جانے کا خیال ان کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ بقول فیض کے "گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آوے"۔

شاعروں، ادیبوں اور رومان پسند حساس لوگوں کے ساتھ یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی ہوا کرتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اس مرض کو ماہرین نفسیات ایک ڈی مانیا کہتے ہیں۔

اس سے آپ کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے مزاج کی جو کیفیت بھی ابنارمل ہو جائے یا حد سے زیادہ ہو جائے وہ ایک جنون ایک مانیا ہے۔ زندگی میں اس کے اعتدال کی ضرورت اور اہمیت ہوا کرتی ہے۔

آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے۔ لیکن کبھی کبھی تو گھر جانا چاہیے۔

یہ آوارہ گردی کبھی کبھی تنہائی کے سبب بھی ہوا کرتی ہے۔ ایسی آوارہ گردی تو بہرحال اپنا ایک جواز رکھتی ہے لیکن یوں ہی آوارہ گردی کرنا مزاج کا آوارہ پن نہیں بلکہ ایک مرض ہے۔

Ego mania

یہ بھی بہت تکلیف دہ مرض ہے۔ جی ہاں حد سے زیادہ خود پسندی (انانیت) مرض کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

ایسے شخص کے نزدیک اہمیت صرف اس کی اپنی ذات کی ہوتی ہے۔ دوسروں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت یا کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ Sold Cestared ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ دنیا کے بہت سے ڈکٹیٹر اور بادشاہ وغیرہ اس مرض میں مبتلا تھے۔

ان کے زوال کا سبب بھی یہی ہوتا تھا کہ وہ کسی کا مشورہ بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے جو کچھ کہہ دیا وہ کہہ دیا۔

انا یا عزت نفس کا احساس اور اس کی حفاظت ایک بہت اچھا اور بہادرانہ طرز عمل ہے۔ لیکن جب یہ حد سے زیادہ ہو جائے تو پھر مرض بن جاتا ہے۔

شاعروں، ادیبوں اور مفکروں نے اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے خود اسلامی نقطہ نظر سے بھی خود پسندی ایک مرض ہے۔

یہ مرض انسان کو تکبر کی طرف لے جاتا ہے اور تکبر خدا کو پسند نہیں ہے۔

Ergaso mania

ہو سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک ایسے لوگ جو ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں۔ بہت جفاکش اور محنتی ہوں۔ آپ ان کی تعریف بھی کرتے ہوں کہ فلاں کو دیکھو کہ ہر وقت اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ لیکن یہ خبط جب حد سے زیادہ ہو جائے تو پھر جنون (مانیا) ہو جاتا ہے۔

آپ نے بھی ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہوں گے

جنہیں اپنے کام سے اتنا عشق ہوتا ہے کہ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو کر باقی سب کچھ بھول جاتے ہیں۔

وہ صرف کام کرتے رہتے ہیں۔ انہیں کھانے پینے اور گھر کی طرف دھیان دینے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ کام ان کے نزدیک ایسی عبادت ہے جس کو ہر وقت ادا کرتے رہنا چاہیے۔

یہ کوئی صحت مندر رجحان نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ کام کے علاوہ زندگی کے دوسرے مشاغل کی طرف بھی توجہ دی جائے۔ ورنہ انسان نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتا ہے۔

چڑچڑاپن، اداسی کا احساس، غصہ یہ سب اس کی فطرت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات اس لیے اس کو ایک مرض سمجھتے ہیں۔

Mrlo mania

جی ہاں آپ اس شخص کو یہ نہ سمجھیں کہ وہ بہت باذوق ہے اور میوزک پر جان دیتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک مرض ہے۔

ہر وقت موسیقی کو اپنے سر پر سوار رکھنا، یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں آپ کو بہت سے لوگ مبتلا نظر آتے ہیں۔

اگر گھر میں ہوں تو زور زور سے ڈیک بجا رہے ہیں اگر گاڑی میں ہوں تو بھی ان کا یہ مشغلہ جاری رہتا ہے اگر پیدل چل رہے ہوں تو کانوں میں ائرفون لگا رہتا ہے۔

یہ سب مرلو مانیا کی علامات ہیں۔ ایسے ایبنارمل لوگ آپ کو ہر جگہ مل جائیں گے۔ وہ بھی اس مرض کے درجے میں آتے ہیں۔ جنہیں خود گانے بجانے کا شوق ہے۔

ان کی زندگی بس اس کے گرد گھوم کر رہ جاتی ہے۔ وہ کسی اور کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ان سے جب دنیا کے حالات کے بارے میں دریافت کیا جائے تو ان کا یہ جواب ہوتا ہے کہ بھائی مجھے کیا معلوم۔ مجھے تو میوزک ہی سے فرصت نہیں ملتی۔

یہ زندگی گزارنے کا غیر صحت مندانہ رویہ ہے۔ اس لیے ماہرینِ نفسیات اسے مرض سمجھتے ہیں۔

Hiaro mania

یہ ایک خطرناک جنون ہے۔ اعتدال پسندی سے بہت ہٹ کر۔

اس میں مبتلا ہونے والا شدید مذہبی نظریات رکھتا ہے۔ وہ اپنے عقیدے اور اپنے دلائل کے علاوہ کچھ اور سننے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔

اس کا مذہب سب سے بہتر، اس کا عقیدہ سب سے اعلیٰ اور اس کے دلائل سب سے وزنی ہوتے ہیں۔ بس اس کا یہی خیال ہوتا ہے۔

ایسا شخص بحث مباحثے کو پسند کرتا ہے اور نہ جاننے پر خاموش رہنے کی بجائے الٹے سیدھے دلائل دینے لگتا ہے اور کبھی کبھی ایسی شدید جنونی کیفیت میں وہ ناراض یا غصے ہو کر اپنے مخالف پر حملہ بھی کر بیٹھتا ہے۔ کسی دوسرے مسلک والے کو نقصان پہنچانے کو ثواب سمجھتا ہے۔

تو یہ رجحان انتہائی خطرناک ہے اور یہ کسی مذہب کے ساتھ وابستگی یا محبت کا نہیں بلکہ اس مرض کی علامت ہے جس کو ہائرومانیا کہتے ہیں۔

Noso mania

یہ ایک ایسا وہم ہے جس میں ہزاروں لوگ مبتلا ہیں۔

اس وہم کے حامل افراد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بیمار ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیماری ان کو لگی رہتی ہے۔ ہر گھر میں ایسی عورتیں اور مرد آپ کو مل جاتے ہیں جن کا زیادہ وقت ڈاکٹرز کے پاس گزرتا ہے اور جو دواؤں اور بے تکے علاج پر ہزاروں لاکھوں خرچ کرتے رہتے ہیں۔

کبھی ان کے سر میں درد ہوتا ہے، کبھی جوڑوں میں، کبھی سانس بند ہونے لگتی ہے، کبھی کچھ اور ہونے لگتا ہے۔

جب کہ اسی فیصد کیسز میں یہ صرف ان کا وہم ہوتا ہے۔ اور ایسا وہم ایک دن انہیں واقعی بیمار ہی کر دیتا ہے۔

ایسے لوگ نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ ہو جاتے ہیں اگر کسی میں اس قسم کی کوئی علامت آپ کو واضح طور پر محسوس ہو تو فوراً توجہ دیں اور کسی ماہر نفسیات سے رجوع کریں۔ دوسری صورت میں ایسے مریض واقعی شدید مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بہت ہی ہائپر ٹینشن، بلڈ پریشر اور دل کی بیماریوں وغیرہ میں۔

Micro mania

یہ ایک حیرت انگیز اور پریشان کن قسم کا وہم ہے۔

اس میں مبتلا شخص یہ سمجھتا ہے کہ دن بہ دن اس کا قد چھوٹا ہوتا جا رہا ہے اور وہ اس فکر میں گھلتا رہتا ہے۔

اس کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی جائے اس کے قد کی پیمائش کر کے دکھایا جائے اسے پھر بھی یقین نہیں آتا۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ وہ بہت تیزی سے بونا ہوتا جا رہا ہے۔

ممکن ہے کہ اس قسم کے مرض کی مثال ہمارے یہاں بہت کم ہو۔ لیکن یہ وہم اپنی جگہ حقیقت ہے۔

ماہرینِ نفسیات اپنے خاص طریقۂ علاج سے اس کے

ذہن سے اس وہم کو نکالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

Macro mania

مائکرو مانیا کے بالکل برعکس وہم ہے۔

مائکرو مانیا میں انسان خود کو چھوٹا ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ (محاورتاً نہیں بلکہ جسمانی طور پر) اور مائکرو مانیا میں خود کو بڑا قد آور محسوس کرتا ہے (جسمانی طور پر)۔

وہ اس وہم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ دن بہ دن اس کا قد بڑھتا چلا جارہا ہے۔ اس وہم کے حامل افراد اونچی محرابوں وغیرہ کے نیچے سے بھی سر اس طرح جھکا کر گزرتے ہیں جیسے ان کا سر ابھی ٹکرا جائے گا۔ اس وہم میں مبتلا ہو کر انہیں خود کو سنبھالنے میں پریشانی ہوجاتی ہے۔

ایسے لوگوں کا علاج بھی ماہر نفسیات ہی کر سکتا ہے۔

ایسے لوگ صرف اپنے آپ ہی کو نہیں بلکہ دوسری چیزوں کو بھی ان کے حجم میں بڑھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور بعض اوقات اپنے اس وہم کی وجہ سے اوروں کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔

Necro mania

یہ بہت گھناؤنا اور قابلِ نفرت جنون ہے۔

اس میں مبتلا افراد سماج اور خدا کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو مردہ اجسام سے بدفعلی کرتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات قبرستانوں میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ قبرستان میں جاکر عورتوں کے تازہ جسم نکال کر اپنے اس قبیح فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے چہرے خدا کی طرف سے مسخ کردیے جاتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص کسی گھناؤنے گناہ میں ملوث ہے (چاہے ہم اس کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں)۔

ہوتا یہ ہے کہ جب اس قسم کے لوگ پکڑے جاتے ہیں تو لوگ ان پر سخت قسم کا تشدد کرتے ہیں۔ پولیس کے حوالے کردیے جاتے ہیں۔ اس گھناؤنے جرم پر ان کی سزائیں اپنی جگہ لیکن انہیں نفسیاتی مریض ہی سمجھنا چاہیے اور حکام کو چاہیے کہ ان کی سزا کے دوران میں ان کے لیے کسی سائکاٹرسٹ کا بندوبست کردے تاکہ وہ دوبارہ ایسی کوئی حرکت نہ کرسکیں۔

Nosto mania

یہ جنون خطرناک تو نہیں لیکن پریشان کن ضرور ہے۔

اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اپنی جانی پہچانی جگہوں پر واپس جانے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ یہ لوگ شہر، ملک یا محلے سے باہر نہیں رہ سکتے۔

کہیں بھی چلے جائیں وہ اکھڑے اکھڑے اور اجنبی اجنبی سے رہتے ہیں۔

یہ لوگ اپنی جانی پہچانی جگہوں پر واپس آکر بے پناہ سکون محسوس کرتے ہیں۔ انہیں ایسا لگتا ہے جیسے وہ اب تک قیدی تھے اور اب انہیں آزاد کردیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں کو اپنا گھر، اپنا علاقہ بری طرح یاد آتا ہے اور وہ ہر قسم کے چانس کو چھوڑ چھاڑ کر واپس آجاتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے اس جنون کو ناسٹو مانیا کا نام دیا ہے اور اس کا باقاعدہ علاج بھی کیا جاتا ہے۔

Onio mania

اس مرض میں خواتین کی بہت بڑی تعداد مبتلا ہے۔

یہ تقریباً ہر گھر کی پرابلم ہے۔ چند ہی ایسی ہوتی ہیں جو حالات سے مجبور ہوتی ہیں یا کفایت شعار ہوتی ہیں۔ یہ ہے خواہ مخواہ کی شاپنگ کا جنون۔

ستر فی صد خواتین اس جنون میں مبتلا ہوتی ہیں۔ کچھ

آج سے کوئی ایک صدی پہلے کی بات ہے بمبئی کے ایک پارسی سیٹھ جمشید جی مدن نے کلکتہ میں مدن تھیٹرز قائم کرکے بنگال میں فلم سازی کی ابتدا کی تھی۔ انہوں نے 1917ء میں پہلی خاموش فلم ”ستیہ وادی ہریش چندر“ بنائی پھر دھیرن گنگولی ان کے ساتھ شامل ہوئے جنہوں نے رابندرناتھ ٹیگور سے فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دور میں انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ذہین فلمساز بی این سرکار نے کلکتہ میں پہلا سنیما ”چترا“ تعمیر کروایا اور 1920ء میں ٹالی گنج میں اعلیٰ سازوسامان سے آراستہ فلم اسٹوڈیو ”نیو تھیٹرز“ قائم کی۔ اور فلمسازی شروع کی تو بنگالی زبان کے نامور ادیبوں ٹیگور، شرت چندر چٹرجی اور بنکم بابو کی بنگلہ کہانیوں اور ناولوں کو پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کی ریت ڈالی۔ ”دیوداس“ بھی اسی سلسلے کی ایک فلم ہے جس کے لیے شرت بابو کے ناول کو پہلی بار منتخب کیا گیا اور اس کے مرکزی کردار کے ایل سہگل اور خورشید سے ادا کرائے گئے۔ کولکتہ کی موجودہ فلم انڈسٹری میں آج بھی اس بات کی پیروی کی جارہی ہے اور بنگالی زبان کی مقبول کہانیوں، ناولوں پر مبنی فلمیں بنائی جارہی ہیں۔

لینا ہو یا نہ لینا ہو تو بھی مارکیٹ جا کر کچھ نہ کچھ لے ہی آتی ہیں چاہے گھر میں اس چیز کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ شاپنگ خواتین کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے لیکن یہ صرف مشغلہ نہیں بلکہ ایک مرض ہے اور اس مرض کو اونیو مانیا کہا جاتا ہے۔

ایسی مریض خواتین کے شوہر بہت بے چارے قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کی تقریباً ساری آمدنی اسی چکر میں خرچ ہو جاتی ہے۔

ان کا خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بیوی کا شوق ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ یہ شوق نہیں مانیا ہے۔ بیماری ہے اور اس کا علاج بہت ضروری ہے۔

Onomato mania

یہ وہ مرض ہے جو دوسروں کو بور کر کے رکھ دیتا ہے اور اس مرض میں مبتلا فرد کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے سامنے والے کو کس درجہ بور کر دیا ہے۔

یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایک ہی بات یا جملے کو دہراتے چلے جاتے ہیں۔ آپ دس دفعہ کوئی واقعہ سن چکے ہوتے ہیں لیکن گیارہویں بار بھی وہ آپ کو ضرور سنائیں گے۔

ایسے لوگ صرف ایک راستے پر محدود نہیں رہتے بلکہ جملے بھی دہراتے ہیں۔ سمجھے کہ نہیں سمجھے۔ اس کے بعد پھر وہی بات۔

یہ عادت ہے لیکن یہ محض ایک عادت نہیں ہے۔ بلکہ مرض ہے۔ نفسیاتی مرض اور اس مرض کو بھی ماہر نفسیات ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

Opso mania

جی ہاں یہ بھی ایک نفسیاتی مرض ہے۔

اعتدال پسند یا نارمل لوگ صرف اتنا کہتے ہیں کہ انہیں کھانے کی فلاں چیز پسند ہے اور جب مل جائے تو اعتدال کے ساتھ کھا بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس مرض میں مبتلا افراد کھانے کی کسی ایک چیز کے پیچھے ٹوٹ کر پڑ جاتے ہیں۔

ان کا یہ شوق جنون کی حد کو چھونے لگتا ہے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کھائے چلے جا رہے ہیں وہ ان کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ۔

انہیں بس کھاتے رہنے سے مطلب ہوتا ہے اور کسی بھی حال میں یہ ان کی خوش خوراکی نہیں بلکہ مرض ہے اور وہ بھی نفسیاتی مرض۔

Plano mania

یہ رجحان بھی بہت خطرناک ہے۔ اس جنون میں مبتلا

محض بغیر کسی وجہ کے معاشرے کے اصول اور قوانین کو توڑ کر خوش ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اگر زیادہ شدید ہو جائیں تو سول نافرمانی بھی شروع کر دیتے ہیں۔

سگنل توڑنے سے لے کر snatching تک کچھ بھی کر سکتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد پیسوں کا حصول بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ قوانین کی خلاف ورزی کر کے خوش اور سکون محسوس کرنے لگتے ہیں۔

بظاہر تو ہم انہیں مجرم گردان کر کوئی سزا دلوا دیتے ہیں لیکن ان کے اندر کے اس رجحان کو ختم نہیں کر پاتے۔

موقع ملنے پر وہ پھر اس قسم کی کوئی حرکت کر بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس رجحان کو ختم کرنے کے لیے ان کا نفسیاتی علاج کرایا جائے۔ کیوں کہ یہ ایک خطرناک جنون ہے۔

Pluto mania

یہ وہ جنون ہے جس میں آج کا ہر دوسرا یا تیسرا آدمی مبتلا ہے۔ یعنی دولت جمع کرنے کی خواہش۔ یہ ایک تباہ کن رجحان ہے۔

اس سے پورے معاشرے کا توازن بگڑ کر رہ جاتا ہے۔

ایسے لوگ دولت جمع کرنے کی ہوس میں بے رحم، سفاک اور اندھے ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک جائز اور ناجائز کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔

وہ ہر حال میں دولت چاہتے ہیں۔ چاہے دوسرے کی لاش کا سودا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اپنی عزت کا جنازہ کیوں نہ نکالنا پڑے۔ انہیں تو بس دولت چاہیے۔

خرچ کرنے کے لیے نہیں بلکہ جمع کرنے کے لیے اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہونے کے لیے کہ ان کے پاس کتنے پیسے ہیں۔

ذرا اپنے اردگرد تو دیکھیں ایسے کتنے لوگ دکھائی دیے جائیں گے یہ سب نفسیاتی مریض ہیں اور ان کے مرض کا نام ہے پلوٹو مانیا۔

یہ مختلف ذہنی بیماریوں کا بہت مختصر سا جائزہ ہے۔ ہم نے خاص خاص واہموں کا ذکر کیا ہے ورنہ یہ واہم اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو بیان کرنے کے لیے پوری کتاب چاہیے۔

کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے ہر انسان اپنے ایک مختلف واہم کے ساتھ زندہ ہے۔ جدید دور نے ان واہموں کو شدید سے شدید تر کر دیا ہے۔

رہنمائے سیاست

شکیل صدیقی

امریکی سیاست کی بساط پر کئی ایسے کھلاڑی سامنے آئے جنھوں نے اس بساط پر مہرے پوری دنیا سے جمع کرلیے اور ان کی چالوں نے مختلف ممالک کی سیاست کو زیر و زبر کیا۔ انہی چالاک ترین امریکی صدور میں سے ایک صدر کا احوالِ زندگی۔

اس نے صدارت عظمیٰ کا عہدہ پانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تھی

کسی دانشور نے کہا تھا کہ بعض شخصیات تاریخ میں جگہ بنا لیتی ہیں، مگر کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود اپنی تاریخ بناتی ہیں۔ ان میں امریکی صدر رچرڈ نکسن بھی ہے۔ وہ انتھک محنت اور مسلسل جدوجہد کرکے اس منصب اعلا پر فائز ہوا تھا۔ ایک دو برس نہیں اس نے صبر استقامت سے پورے پچیس برس تک اپنا سیاسی سفر جاری رکھا اور بالآخر اپنی منزل کو پالیا۔

وہ ایک متنازعہ شخص تھا۔ ایک طبقہ ایسا تھا جو اسے سر پر

بٹھاتا لیکن دوسرا طبقہ اس سے نفرت کرتا تھا اور ہمہ وقت دشنام طرازی پر آمادہ رہتا تھا۔

ماہرین سیاست اسے اوسط درجے کا سیاست داں کہتے ہیں لیکن یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ اس نے بعض نامساعد حالات اور پیچیدہ صورتِ حال میں نہایت دانشمندی کا مظاہر کیا اور امریکی قوم کو گرداب سے نکالا۔ نکسن خود کو دانشور اور اعلا پائے کا سیاست داں کہتا تھا، مگر دانشور اس سے متفق نہیں تھے اور مضحکہ اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ عقل و دانش اسے چھو کر بھی نہیں گزری۔ اس کی سیاسی زندگی نشیب وفراز سے بھری پڑی ہے اس لیے وہ حیرت انگیز شخصیت کے طور پر بھی یاد رکھا جاتا ہے۔ مبصر اسے رہنمائے سیاست بھی کہتے ہیں۔

وہ دو بار امریکا کا نائب صدر منتخب ہوا۔ قائم مقام صدر بھی بنا۔ مگر تعجب خیز بات ہے کہ صدارتی انتخاب میں ایک ایسے شخص سے ہار گیا جو سیاست میں بالکل نووارد تھا۔ اپنے مخالف جان۔ ایف کینیڈی کی مقبولیت کم کرنے اور سطح سے گرانے کے لیے اس نے جو بھی حربہ استعمال کیا وہ خود اس کے لیے نقصان دہ اور مہلک ثابت ہوا۔ کچھ عرصے بعد اس نے کیلیفورنیا کی گورنری کے لیے انتخاب لڑا، لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی۔ سیاسی پنڈتوں نے پیش گوئی کر دی کہ یہ اس کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہے اور اب اسے اپنے گھر جا کر بیٹھ جانا چاہیے۔ سیاست اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ریپبلکن پارٹی نے اسے نائب صدارت کا اہل بھی نہ سمجھا۔ مگر چار برس کے بعد اسی پارٹی نے نکسن کو اپنی بقا کے لیے آخری امید قرار دیا۔ نکسن نے انتخاب جیت کر اپنی پارٹی کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔

رچرڈ نکسن امور خارجہ کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ کسی صدر اور نائب صدر نے اتنے غیر ملکی دورے نہیں کیے جتنے اس نے کیے تھے۔ انہی دوروں میں جب وہ وینزویلا گیا تو اس پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بال بال بچ گیا۔ خروشچیف سے اس کے مذاکرات کو تاریخی قرار دیا گیا۔ اس نے کیوبا کے فیڈل کاسترو سے بھی ملاقات کی اور اس کے بارے میں ایسی رپورٹ تیار کی جو آنے والے وقت میں سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ پھر چین گیا اور ماؤزے تنگ اور چو این لائی سے بھی ملاقات کی۔ امریکا اور چین کے مابین جو سرد مہری پائی جاتی تھی اسے دور کیا۔ یاد رہے کہ ویت نام کی جنگ میں اسلحہ روس کا اور افرادی قوت چین کی استعمال ہوئی تھی۔ اس لیے امریکا اور چین کے مابین ایک وسیع اور گہری کھائی پیدا ہو گئی تھی لیکن بیس برس بعد نکسن نے اسے پاٹ دیا۔

☆☆☆

رچرڈ نکسن لاس اینجلس سے تیس میل واقع یوربالنڈا نامی زرعی قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے پانچ بچوں میں دوسرا بچہ تھا۔ ہیرلڈ (1909)، ڈونالڈ (1914)، آرتھر (1918) اور ایڈورڈ (1930)۔ اس کا باپ بڑھئی تھا اور اس نے اپنے خاندان کے لیے الگ تھلگ ایک مکان بنایا جو اس کی مہارت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ وہ لکڑی کا مکان تھا جو ایک گول سی پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ چونکہ ماحول میں خنکی تھی چنانچہ یہ مکان بھی سرد رہتا تھا۔

نرس شا کئی کو آج بھی وہ دن یاد ہے جب نکسن پیدا ہوا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ نکسن کی آنکھیں اور سر کے بال بھورے تھے۔ آواز کڑک دار تھی، لہٰذا اس کی دادی نے پیش گوئی کر دی تھی کہ وہ بڑا ہو کر قانون داں بنے گا یا پھر کسی تبلیغی جماعت کا سربراہ۔ اس کی دادی کا کہنا ہے کہ وہ بچپن ہی سے کام کا جو تھا۔ وہ والدین کی مدد کیا کرتا تھا اور اکثر ایسے کام بھی کرتا جو بچے نہیں کر سکتے تاہم وہ ایسے کام نہیں کرتا تھا جو لڑکیاں کرتی تھیں مثلاً برتن صاف کرنا، فرش صاف کرنا یا کپڑے دھونا۔ وہ اپنے طور پر شرمندہ ہوتا تھا تو آنکھیں بند کر لیا کرتا تھا۔ کلاس کے بچوں سے وہ اس حد تک مختلف تھا کہ جب وہ رنگین کہانیوں کی کتابیں پڑھ رہے ہوتے تو وہ اخبار پڑھ رہا ہوتا تھا۔ گویا اسے حقیقی علم سے محبت تھی اور وہ دیومالایت سے دور رہتا تھا۔

نکسن نے اپنے بارے میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ قانون داں بنے گا، تاہم اس وقت تک اس نے کوئی حقیقی قانون داں نہیں دیکھا تھا۔ البتہ اخبار پڑھتے ہوئے وہ ان کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا اور اپنے طور پر سوچا کرتا تھا کہ قانون داں حکومت کے ہر کام میں شریک رہتے ہیں اور ان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اسے تقریر کرنے کا بھی شوق تھا اور یہ شوق وہ اسکول کے مقابلوں میں حصہ لے کر پورا کیا کرتا تھا۔ کلاس کے لڑکے اس کی تقریری صلاحیت کا اعتراف کرتے تھے۔

اس کے چھوٹے بھائی ڈونلڈ نے بتایا: ”وہ کلاس کے سارے لڑکوں سے محنتی اور بیدار مغز تھا۔ جب دوسرے لڑکے کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے تو وہ کوئی نہ کوئی کتاب

پڑھ رہا ہوتا تھا۔ طالب علمی کے دور میں اس نے اٹھارہ بار مختلف انتخابات میں حصہ لیا اور ایک بار بھی ناکام نہیں ہوا۔''

نکسن جب قدرے بڑا ہوگیا تو کھیتوں میں جز وقتی طور پر کام کرنے لگا۔ اس طرح سے وہ اپنی کفالت خود کرنے پر قادر ہوگیا۔ جب وہ دس بارہ برس کا تھا تو اس نے کھیتوں میں سیم کی پھلیاں توڑنے میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس کے باپ نے لیموں کی تجارت شروع کردی۔ مگر اس میں اسے ناکامی ہوئی تو اس نے ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ اب نکسن کا زیادہ وقت وہاں گزرنے لگا۔ وہ دکان پر آنے والی گاڑیوں کے پہیوں میں ہوا بھرتا، گلے سڑے آلو، ٹماٹر اور پیاز کو علیحدہ کرتا اور پھلوں کو سلیقے سے شیلف پر رکھتا۔ اس کے علاوہ پرچون کی چیزیں لوگوں کے گھروں تک پہنچایا کرتا تھا۔ یہ اضافی کام وہ بلاقیمت کردیا کرتا تھا۔

جب اس نے اسکول کی پڑھائی ختم کرلی تو اسے کالج میں داخل کرایا گیا۔ وہ اب سبزیوں کے شعبے کا مینیجر اور منشی بن چکا تھا۔ وہ ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے کام کرلیا کرتا تھا جس سے اسے زائد آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔ اس کے والدین اس سے خوش اور اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔

اس کا خاندان 1753ء میں آئرلینڈ سے ڈیلاویئر کے ساحلی علاقے میں آکر آباد ہوا۔ اس کے بعد اس کے خاندان کی شاخیں پھیلتی چلی گئیں۔ نکسن کے آباؤاجداد میں سے ایک صاحب نے جنرل واشنگٹن کے ساتھ ڈیلاویئر کو عبور کیا اور دورِ انقلاب کی بارہ جنگوں میں حصہ لیا۔

نکسن کے آباؤاجداد بہت محنتی اور مشقت کے عادی تھے۔ وہ بائبل پر صدقِ دل سے ایمان رکھتے تھے۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ میتھاڈسٹ تھے۔ نکسن کے والد کیلیفورنیا میں گزشتہ صدی کی ابتدا میں آئے تھے۔ انہیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں دوسری جگہوں کی نسبت گرمی ہو اور سورج پوری تمازت سے چمکتا اور حرارت فراہم کرتا ہو۔ اس لیے کہ ان کی ٹانگ میں درد اٹھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ٹرالی دھکیلتے تھے۔ انہوں نے اپنے قیام کے لیے جو جگہ منتخب کی وہاں دھوپ کی فراوانی تھی اس لیے یہ شکایت بتدریج دور ہوگئی۔

رچرڈ نکسن اپنی ابتدائی زندگی میں جن افراد سے متاثر تھا ان میں ساتویں جماعت کے ایک استاد ہوسکاس تھے۔ انہوں نے نکسن کو درس دیا تھا کہ اگر وہ زندگی میں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ سخت محنت کرے اور اس سے جان نہ چھڑائے۔ وہ ان کے خاندان سے واقف تھے اور ان کا خیال تھا کہ نکسن اپنے والدین کے علاوہ اپنی دادی کی شخصیت کا نچوڑ ہے۔ اس میں جو سنجیدگی اور بردباری پیدا ہوئی ہے وہ انہی لوگوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

نکسن کو یاد تھا کہ ان کی دادی کا سڑک کے کنارے کشادہ سا مکان تھا۔ ہر سال کرسمس کے موقع پر اور خاص طور پر گرمیوں میں سارا خاندان وہاں جمع ہوا کرتا تھا۔ دادی نے اس طرح سارے خاندان کو باہم مربوط رکھا ہوا تھا۔ وہ باقاعدگی سے اور بڑے پیمانے پر سب کو خط لکھا کرتی تھیں۔ وہ کہتا ہے۔ ''میری دادی کا ایک معیار تھا اور وہ خاندان کے سارے افراد کو تلقین کیا کرتی تھیں کہ ان کی پیروی کریں۔ ان کا مقولہ تھا کہ دیانت داری اور محنت سے کام کرو۔ کام بہترین طریقے سے انجام دو۔'' غرض اس انداز کی اچھی اچھی باتیں کرتی تھیں جو آگے چل کر ہماری تربیت میں کام آئیں۔

''مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ ان کے گھر میں کوئی ملازم میز پر بیٹھ کر تنہا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ وہ گھر کے افراد کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ حالانکہ ملازموں میں نیگرو، انڈین اور میکسیکو کے رہنے والے افراد بھی شامل تھے لیکن وہ سب کو اپنے ساتھ بٹھالیا کرتی تھیں۔ ان کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ امارت اور مفلسی کی سطح ان کے نزدیک مساوی تھی۔ اونچ اور نیچ کی ان کے ہاں کوئی تفریق نہیں تھی۔''

نکسن کی ماں نے اپنے چھوٹے سے خاندان کی مفلسی ختم کرنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ وہ شب و روز مشغول رہا کرتی تھیں۔ علی الصباح بیدار ہوجایا کرتی تھیں اور ناشتا بنانے کے علاوہ اسٹور پر کھانے پینے کی چیزیں تیار کرتی تھیں۔ ناشتا سب مل کر کیا کرتے تھے اور پھر سب مل کر عبادت کرتے اور بائبل پڑھا کرتے تھے۔

بڑے بھائی فرینک نکسن نے پرچون کی دکان کھول لی جس سے ملحق ایک پیٹرول پمپ بھی تھا۔ صرف رچرڈ نکسن ہی نہیں بلکہ خاندان کے سارے افراد وہاں کام کرتے تھے۔ جب اس کا بھائی فرینک بیمار پڑ گیا تو رچرڈ نکسن نے اسٹور کو سنبھال لیا۔ وہ صبح چار بجے اٹھ جایا کرتا اور منڈی جاکر سبزیاں لے آتا۔ انہیں دھو کر دکان میں لگانے کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دکان پر بٹھا دیا کرتا اور اسکول چلا جاتا۔

نکسن کی عمر جب سترہ برس کی ہوگئی تو وہ ایک کالج میں داخل ہوگیا، جو وائیٹر میں تھا۔ پھر ایک ماہ بعد وہ طالب علموں کی تنظیم آرتھا گونیئرز میں شامل ہوگیا۔ اس کی کارکردگی اور صلاحیتوں کو دیکھ کر اسے اس تنظیم کا صدر بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ اسے متفقہ طور پر کالج کی ابتدائی کلاس کا صدر اور کالج کو کنٹرول کرنے والی مشترکہ کونسل کا ممبر بھی منتخب کر لیا گیا۔ دل چسپ بات ہے کہ نکسن نے یہ اعزاز کالج میں داخل ہونے کے صرف ایک ماہ میں حاصل کر لیا تھا۔

دوسرے برس میں نکسن نے کالج کے پچاس سے زیادہ مباحثوں میں حصہ لیا اور کئی بار انعامات حاصل کیے۔ ان میں قومی چیمپین کا مقابلہ قابلِ ذکر ہے، جس کا موضوع تھا ''آزاد تجارت۔'' نکسن اس کے حق میں بولا اور چیمپین قرار دیا گیا۔ خطابت اور مباحثے کا فن اس کی شخصیت کا جزو بن چکا تھا۔ ڈاکٹر پال اسمتھ جو تاریخ اور سیاست پڑھایا کرتے تھے وہ بتایا کرتے تھے کہ رچرڈ نکسن کو مطالعے کا بہت شوق تھا اور اسی شوق کے حوالے سے اس نے تاریخ امریکا کی دس جلدوں کا مطالعہ کر ڈالا۔ تاریخ امریکا کی ایک جلد کے صفحات ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ اسی دوران نکسن نے فرانسیسی سیکھ لی اور کلاسیکی فرانسیسی فلاسفروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔

نکسن نے 1932ء میں اسی کالج سے گریجویشن کر لیا۔ 207 طالب علموں میں اس نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس شہر میں ابھی تک روزگار کی سہولیات عام نہیں ہوئی تھیں۔ نکسن کا کہنا تھا کہ مجھے روزگار کی ضرورت نہیں تھی مجھے تو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی ایسی یونی ورسٹی کی تلاش تھی جہاں میں رقم خرچ کیے بغیر قانون کی تعلیم مکمل کر سکوں۔ انھی دنوں شمالی کیرولینا کے شہر ڈرہام کی ڈیوک یونی ورسٹی کو ایسے کسی طالب علم کی تلاش تھی جس نے اعزاز کے ساتھ ڈگری لی ہو۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ ایسے طالب علم کو قانون کی تعلیم وظیفے کے طور پر دی جائے گی۔ چنانچہ نکسن نے بھی وظیفے کے لیے درخواست دے دی۔

وائیٹر کالج کے صدر نے نکسن کو ایک سفارشی خط دیا اور لکھا۔ ''نکسن امریکا کا عظیم لیڈر نہ بھی بن سکا تو ایک اہم لیڈر ضرور بنے گا۔'' نکسن کو نہ صرف یہ کہ یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا بلکہ نیشنل یوتھ ایڈمنسٹریشن میں 35 سینٹ فی گھنٹے کے حساب سے کام بھی مل گیا۔

ڈیوک یونی ورسٹی نے سال دوم اور سال سوم کے لیے وظائف کی تعداد سال اوّل کے وظائف سے بہت کم رکھی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ سال اوّل کے طالب علموں میں سخت مقابلہ ہوتا تھا۔ اسکول کے منتظم کا کہنا تھا کہ معاشی کساد بازاری کے ان دنوں میں بہت کم خاندان ٹیوشن فیس ادا کر پاتے تھے۔ رچرڈ نکسن نے پورے تین برس تک اپنے وظیفے کو برقرار رکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ اس میں قانون کی اعلا صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ یونی ورسٹی کے طالب علموں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ سیاست میں حصہ لے گا۔ اس لیے کہ نکسن شرمیلا اور محتاط لڑکا تھا۔ اس کا رویہ دوسروں کے ساتھ دوستانہ ہوتا لیکن اس میں گرمجوشی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ چپکانے کا قائل نہیں تھا۔ اس کا انداز روکھا تھا۔

نکسن دوسرے طالب علموں کی طرح یہ چاہتا تھا کہ کسی بڑی فرم میں اچھی سی ملازمت حاصل کرے۔ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ اور اس کے دو ساتھی نیویارک میں ملازمت کی تلاش میں گئے۔ وہاں انہوں نے ہر بڑی فرم میں درخواست دی۔ جب کہ نکسن کی دلی خواہش یہ تھی کہ اسے ''سلی وان اینڈ کرومویل'' میں ملازمت مل جائے .... جہاں پڑھے لکھے اور اعلا تعلیم یافتہ افراد کام کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کام کر کے اس کی استعداد میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ نکسن نے کہا۔ ''قدرت جو کچھ کرتی ہے بہتر کرتی ہے۔ اگر مجھے وہاں کام مل جاتا تو میں صدر امریکا کی بجائے محض ایک کارپوریشن کا قانون داں ہوتا۔ چونکہ مجھے قدرت بہت آگے بھیجنا چاہتی تھی، اس لیے وہاں میرا بندوبست نہ ہوا۔''

امتحان کے بعد نکسن نے وفاقی ادارہ تحقیق (ایف بی آئی) میں ملازمت کے لیے درخواست دی۔ ان دنوں نوجوان اور بے روزگار قانون داں ایف بی آئی میں ملازمت کرنے کو اپنے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ یونی ورسٹی کے ڈین نے ایف بی آئی کے سربراہ کو خط لکھا۔ ''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میری نظر میں کوئی غیر معمولی صلاحیت والا نوجوان ہو تو میں آپ کو اطلاع دوں میری نظر میں ایسا ایک نوجوان ہے جس کا نام رچرڈ نکسن ہے اور وہ جون کے مہینے میں گریجویشن مکمل کر لے گا۔ وہ کردار اور صلاحیت دونوں اعتبار سے شاندار ہے۔ اگر اس کے سپرد کوئی کام کیا جائے تو وہ پوری صلاحیتوں کے ساتھ اسے مکمل کرنے کی کوشش کرتا

ہے۔ دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں اس کی پوزیشن کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس برس یونی ورسٹی کی بار ایسوسی ایشن کا صدر منتخب ہوا ہے۔''

اس سفارشی خط کے باوجود جون میں نکسن کو ایف بی آئی میں ملازمت نہ مل سکی۔ ناچار اس نے اپنے شہر میں ملازمت کی تلاش کی شروع کر دی۔ یہاں اسے کیلیفورنیا کے پانچ مہینے کے تفصیلی قوانین کا مطالعہ صرف دو مہینے میں کرنا پڑا۔ یہ کام اس نے عمدگی اور مہارت سے کیا۔

وائیٹر لاس اینجلس کے مضافات میں ایک اہم قصبے کی حیثیت سے مشہور ہو چکا تھا۔ نکسن جب وہاں 1937ء میں قانون کی پریکٹس کرنے واپس آیا تو اس قصبے کی آبادی پچیس ہزار افراد تک ہو چکی تھی۔ جب وہ پہلے دن قانون دانوں کی قدیم ترین فرم ''ونگرٹ اینڈ بیولے'' میں ممبر کی حیثیت سے داخل ہوا تو اس کے جسم پر سرج کا سوٹ تھا۔ اپنا کام شروع کرنے سے پیشتر اس نے فرم کی لائبریری کا جائزہ لیا۔ کتابوں کے سارے شیلف اور کتابیں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔ کتابوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے خوف آتا تھا کہ کہیں کوئی فنگس ناخنوں میں داخل ہو کر نقصان نہ پہنچا دے۔

مسز ڈرون فرم کی سیکرٹری تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نکسن نے لائبریری کے شیلفوں سے کتابیں نکال کر صاف کیں پھر شیلفوں میں رنگ و روغن کروا کے ان میں کتابیں سلیقے سے رکھ دیں۔ حالانکہ ان کی تعداد کئی سو سے زیادہ تھی۔ مگر کتابوں سے محبت کی بنا پر وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گرد آلود اور کوڑے کچرے کے انداز سے پڑی رہیں اور کوئی انہیں ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کرے۔

نکسن کو جب کیس ملنے لگے تو اس نے مزید محنت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں فرم کو طلاق کے جو کیس ملتے تھے وہ اس کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ ان مقدمات میں فرم کو نقصان پہنچنے لگا اس لیے کہ نکسن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کیس کا آخری فیصلہ طلاق کی صورت میں نہ ہو بلکہ فریقین میں سمجھوتا ہو جائے اور ان کا گھرانہ تباہ نہ ہو۔ فرم کو بہر حال اس کی صلاحیتوں کا علم ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اسے جرح کرنے والا قانون داں مقرر کر دیا۔ انہوں نے اسے جایداد اور وفاقی ٹیکس کے مقدمات بھی دینا شروع کر دیے۔ جب اس کا کام چل نکلا تو اس نے ایک قریبی قصبے لا ہبرا میں ایک برانچ آفس کھول لیا۔ وہاں کوئی قانون داں نہیں تھا۔ لا ہبرا میں اسے زیادہ تر جایداد کے مقدمات ہی ملتے تھے۔ لیکن اس نے اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ قصبے کا اٹارنی بن سکتا ہے۔ فرم کے ایک پرانے شریک کارٹام بیولے نے جو وائیٹر کے اٹارنی بھی تھے نکسن کو اپنا معاون مقرر کر دیا۔

جب نکسن کی وکالت ترقی کرنے لگی تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ تجارت بھی کی جائے۔ اس علاقے میں سنگتروں کی پیداوار مطلوبہ ضرورت سے زیادہ تھی، لہٰذا اس نے کچھ مقامی تاجروں کے ساتھ مل کر منجمد آرنج جوس تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی کمپنی کا نام اس نے ''سٹرافراسٹ'' رکھا۔ تاجروں نے نکسن کو اس کمپنی کا صدر اور قانونی مشیر بنایا۔ کمپنی کے لیے دس ہزار کا سرمایہ بینک میں جمع کرایا گیا۔ نتیجہ حوصلہ افزا نکلا اور بڑی جہاز راں کمپنیوں نے اس میں دل چسپی لینا شروع کر دی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اگر جوس کو تسلی بخش طریقے پر محفوظ کرنے کا انتظام کر دیا جائے تو وہ ٹنوں کے حساب سے جوس خرید لیں گے۔

نکسن کی کمپنی اور نج جوس کو محفوظ کرنے کا اہتمام کر رہی تھی۔ آج کل کے طریقے پر ان دنوں جوس کو گاڑھا کر کے عرق نہیں نکالا جاتا تھا۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جوس کو کس چیز میں بند کیا جائے کہ وہ زیادہ وقت کے لیے محفوظ ہو سکے۔ سیلوفین، گتے کے ڈبوں اور ٹین کے ڈبوں کو آزمایا گیا مگر کوئی چیز کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ یہ کاروبار اس وقت تک نہیں چل سکتا تھا جب تک کہ جوس کو محفوظ کرنے اور پیک کرنے کا مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ نکسن اور اس کے ساتھیوں نے سنگترے کا جوس خود اپنے ہاتھوں سے نکالنا شروع کر دیا۔ اتنی محنت و مشقت کے بعد بھی اس کاروبار کو ڈیڑھ برس کے بعد بند کر دینا پڑا۔ اس لیے کہ محنت بہت ہو رہی تھی اور اس کا معاوضہ بے حد کم تھا۔

وائیٹر کالج، جہاں سے وہ تعلیم حاصل کر چکا تھا اس کے سابقہ طالب علموں نے اسے اپنی تنظیم کا صدر بنا دیا۔ اگلے برس جب کہ اس کی عمر 26 برس تھی، اسے کالج کا ٹرسٹی بنا دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کالج کا سب سے کم عمر رکن تھا۔ کالج میں وہ عملی قانون کا کورس پڑھانے لگا۔ جب اس کی عمر 29 برس کی ہوئی تو اسے کالج کا صدر بنا دیا گیا۔

لڑکیوں سے خوش گپیوں اور ملاپ کی نکسن کے پاس فرصت نہیں تھی اور نہ اس کی جیب میں اتنی رقم تھی کہ وہ ان کی ناز برداریاں سہہ سکتا۔ چنانچہ وہ ان سے دور ہی رہتا

تھا۔لڑکیوں کی اس کے بارے میں رائے تھی کہ وہ اس قدر ذہین اور سنجیدہ ہے کہ اس سے دل لگی نہیں کی جاسکتی۔اس کے گرامر اسکول کے ساتھی لڑکوں کا کہنا ہے کہ ہمیں تو ایسا لگتا تھا جیسے اسے لڑکیوں سے نفرت تھی۔وہ لڑکیوں کے موضوع کی بجائے یونان، اٹلی اور ایران کی ریاستوں کے بارے میں گفتگو کرنا پسند کرتا تھا۔وہاں کے لوگ کیسے ہیں اور ان کی زندگی کے طور طریق کیسے ہیں۔وہ ذرا گرم دماغ تھا اور بحث ومباحثہ زیادہ کیا کرتا تھا۔

قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے اسے مقامی پولیس کی بیٹی اولا فلورنس ویلش کے ساتھ گھومتے پھرتے دیکھا گیا تھا،اس کے علاوہ وہ کلبوں میں لڑکیوں کے ساتھ رقص بھی کرنے لگا تھا۔چنانچہ یہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ مردم بیزار تھا اور لڑکیوں کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔پھول جیسے چہرے اسے بھی پسند تھے۔

فلورنس اپسرا کی مانند تھی۔کتابی چہرہ، شرابی آنکھیں اور گلابی نقوش۔اس کے رخساروں کی ہڈیاں اٹھی ہوئی تھیں۔وہ مقناطیسی صلاحیت رکھتی تھی۔اپنے سراپا کی بنا پر وہ مردوں کے دل اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی۔''اینڈرڈ'' نامی ڈراما جو ہیٹر ہائی اسکول کی جانب سے پیش کیا گیا تھا، اس میں وہ نکسن کے ساتھ ہیروئن کے طور پر آئی۔ان کی اداکاری ناظرین کو پسند آئی۔ڈرامے کے آخری دن انہوں نے تالیاں بجا کر ان دونوں کی حوصلہ افزائی کی۔پھر نکسن نے اسے اپنے گھر چلنے اور اہلِ خانہ سے ملاقات کرنے کی دعوت دی۔فلورنس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنا میک اپ ختم کرپاتی۔بہرحال نکسن کے گھر والوں کو وہ اس انداز بھی پسند آگئی۔نکسن اسے پسند کرچکا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس نے سنجیدگی سے یہ پہلی محبت کی تھی۔

چار برس تک ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے کے بعد انہوں نے اپنے تعلقات کو استحکام بخشنے کے لیے 10 جون 1933ء کو منگنی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔فلورنس کو وہ باتیں اب تک یاد ہیں وہ کہتی ہے۔''اس رات کی ہر بات حسین اور دل کش تھی۔پھول، موسیقی اور در و دیوار سے برسنے والی غنایت۔نکسن تو جیسے میری آنکھوں میں بس گیا تھا۔مجھے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔''

نکسن کی مفلسی ان کے تعلقات کی راہ میں آڑے آرہی تھی۔فلورنس شک و شبہے میں مبتلا تھی کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے کہیں ویسا نہ ہوجائے۔بالآخر جو بے نامی لڑکا اسے بھا گیا۔نکسن کو بھی یہ خبر ہوچکی تھی کہ جو بے، فلورنس کے گھر گیا تھا۔وہ ذہنی پژمردگی اور افسردگی کا شکار ہوگیا۔اس نے فون کرکے فلورنس سے کہا کہ اب وہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔

اسی اثنا میں نکسن کو ڈیوک یونی ورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ان کے تعلقات ریت کی دیوار ثابت نہیں ہوئے۔ملاقاتیں جاری رہیں۔فلورنس نے ایک دل چسپ انکشاف کیا کہ جو بے اس سے زیادہ اس کی ماں کو پسند ہے۔اس لیے کہ وہ ملازمت کرتا ہے جب کہ نکسن کے پاس آلو، پیاز اور مٹر کی دکان ہے اور وہ اس سے سارے گھر کے اخراجات پورے کررہا ہے۔نکسن ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ڈیوک یونی ورسٹی میں پہلا مرحلہ مکمل کرنے تک وہ کلب جاتے رہے اور ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ساتھ نبھانے کی قسمیں بھی کھاتے رہے۔

وہ یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے گیا ہوا تھا، جب واپس آیا تو اس نے فلورنس کو اس کی اطلاع دینی چاہی۔اس نے فون کیا کہ وہ فوراً چلی آئے۔اسے خوش خبری سنانا چاہتا ہے۔مگر فلورنس نے معذرت کرلی اس لیے کہ جو بے اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔جب نکسن نے کہا کہ وہ خود آرہا ہے تو فلورنس نے اس سے بھی منع کیا۔نکسن نے اپنے گھر والوں کو بتایا اور کہا کہ وہ چھت پر جارہا ہے اور وہاں سے چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔گھر میں کھلبلی مچ گئی اور اسے بڑی دشواری سے اس اقدام سے باز رکھا گیا۔

ان کی منگنی دسمبر 1935ء میں ٹوٹ گئی اس لیے کہ نکسن نے فلورنس کو دوسرے لڑکوں میں بھی دل چسپی لیتے دیکھ لیا تھا۔تاہم اپنے دل میں دبی ہوئی چنگاریوں کے سبب وہ اس کے بعد بھی فلورنس کو خطوط لکھتا رہا۔ایک مرحلے پر آکر فلورنس نے کہہ دیا کہ جب ان کے درمیان کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ خاموش ہوکر بیٹھ جائے۔اس سے خط و کتابت نہ کرے۔کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ فلورنس نے جو بے سے شادی کرلی ہے۔آخری خط میں اس نے لکھا تھا کہ یہ شادی اس نے اپنی ماں کے اصرار پر کی ہے۔دل چسپ بات ہے کہ فلورنس 101 برس تک اور جو بے 103 برس تک زندہ رہا۔وہ ایک مثالی جوڑے کی طرح رہے۔ان کے تین بچے ہوئے۔جنہیں انہوں نے اچھی تعلیم دلائی اور دیہاتی زندگی سے نکال کر شہر کی طرف جانے کو مائل کیا۔

جب ان سے اتنی لمبی رفاقت کا راز پوچھا گیا تو جوبے نے بتایا۔ ”یہ رشتہ کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر قائم رہا۔ وہ غصہ کرتی تو میں اپنے میں جذب کر لیتا اور جب میں غصہ کرتا تو وہ مسکراتی رہتی۔ مجبوراً مجھے نارمل ہونا پڑتا۔ ویسے بھی میں بنیادی طور پر کسان ہوں اور کسانوں کو غصہ کم ہی آتا ہے۔“

☆☆☆

نکسن جب رائیٹر میں قانون داں بن کر واپس آیا تو اس کی ملاقات تھلیما ریان سے ہوگئی، جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے دل میں سماگئی۔ تاہم نکسن نے اس کا فوری اظہار نہیں کیا۔

تھلیما ریان سے اس کی ملاقات ایک تھیٹر کے ڈرامے میں ہوئی تھی۔ وہ کہتی ہے۔ ”میں ان دنوں وائیٹر میں اسکول کی استانی کی حیثیت سے آئی تھی۔ اسکول کی انتظامیہ چاہتی تھی کہ اساتذہ مقامی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا کریں۔ مجھے ڈراموں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی البتہ میری سہیلیاں زور دیتی تھیں کہ میں فلمی ہیروئنوں کی طرح دکھائی دیتی ہوں، لہٰذا مجھے ڈراموں میں بھی کام کرنا چاہیے۔ چھوٹے موٹے رول ادا کرنے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ میں اس کے کہنے پر چلی گئی۔ میری ایک سہیلی نے نکسن کو بھی بتا دیا کہ میں تھیٹر جاؤں گی۔ نکسن بھی تھیٹر چلا آیا حالانکہ وہ ان دنوں مصروف تھا اور اپنے کیسوں میں الجھا رہتا تھا۔ ہماری وہاں ملاقات ہوئی، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ میری اسی سہیلی نے کرائی۔ میں نے اور نکسن نے طے کیا کہ ہمیں بھی ڈراموں میں کام کرنا چاہیے۔“

یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اسی رات رچرڈ نکسن نے مجھ سے شادی کی درخواست کر دی۔ میرے حیران ہونے کی وجہ یہ تھی کہ میری اس سے کوئی خاص جان پہچان نہ تھی۔ اس نے شادی کی درخواست اتنی جلدی کیسے کر دی؟ اتنا تو میں نے جان لیا تھا کہ وہ عام نوجوانوں سے مختلف ہے اور لیے دیے رہتا ہے۔ میں اس کی معترف تھی۔ میرا وقت اچھا گزر رہا تھا اور میرا ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے بہت کچھ کرنے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔ میں دنیا کی سیاحت کرنا چاہتی تھی۔

تھلیما ریان شہر نویدا میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ نکسن سے دو برس چھوٹی تھی۔ اس کا باپ ولیم ریان اور ماں کیٹ ہالبرسٹ تھی۔ تھلیما کے دو بھائی اور تھے۔ اس کا باپ ایک کان میں کام کیا کرتا تھا، تھلیما نے بتایا۔ ”کانوں میں جان لیوا حادثات ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم کیلیفورنیا آگئے۔ میرے ڈیڈی نے یہاں کچھ زمین خرید لی۔ ہم سب مل کر اس زمین پر کام کرتے تھے۔ ہم زمین کھود کر آلو نکالتے، ٹماٹر توڑتے، گوبھی کے پھول جمع کرتے اور ہری مرچیں توڑتے۔ مسرت اور شادمانی اس لیے ہوتی تھی کہ یہ کام فطرت سے قریب تھا۔“

جب میں چھوٹی تھی تو دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی، پھر بعد میں، میں تنہا گھوڑوں کو سنبھالنے لگی۔ جب ہم اپنی پیداوار کو ویگن میں لاد کر ساحل تک لے جاتے اور بحری جہازوں میں لادتے تھے تو بڑا مزہ آتا تھا۔ زندگی سہولت سے گزر رہی تھی۔ سکون ہی سکون تھا۔

مجھے سب سے زیادہ ماں کی بیماری نے پریشان کیا۔ وہ سرطان میں مبتلا تھی۔ اس لیے اس کی خدمت کرنے میں دن کا بڑا حصہ گزر جاتا تھا۔ اس کی موت پر مجھے بہت صدمہ ہوا۔ مجھ سے بولا تک نہیں جا رہا تھا۔ میری عمر اس وقت صرف تیرہ برس تھی۔ زندگی جیسے تیسے گزرنے لگی۔ پھر دوسرا صدمہ اس وقت برداشت کرنا پڑا جب ڈیڈی انتقال کر گئے۔ ماں کی موت کے ٹھیک چار برس بعد۔ گھبراہٹ ہونے لگی کہ اب خاندان کو کیسے سنبھالوں گی۔

جب تھلیما نے ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر لی تو نیویارک چلی گئی۔ وہ ایک فرم میں سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور پارٹ ٹائم میں ایکس رے ٹیکنیشن۔ یہ ملازمت وہ اس لیے کر رہی تھی کہ رقم جمع کر کے یونی ورسٹی میں داخلہ لے سکے۔ گریجویشن کرنے کے بعد اس نے معلمہ بننا پسند کیا۔

تھلیما ریان نے جنوبی کیلیفورنیا کی یونی ورسٹی سے جس سال گریجویشن کیا اسی سال نکسن نے قانون تعلیم مکمل کی۔ دونوں آنرز کے طالب علم تھے۔ تھلیما کو تجارت اور زراعت سے دل چسپی تھی مگر اسے تدریسی کام مل گیا۔ اس کی تنخواہ 190 ڈالر ماہانہ طے ہوئی۔ 1937ء کے لحاظ سے یہ معقول تنخواہ تھی، لہٰذا تھلیما نے منظور کر لی۔ وہ جانتی تھی کہ کسی اور جگہ اسے اتنی رقم نہیں ملے گی۔ وہ کسی منصوبے کے بغیر وائیٹر آگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھے تدریس اس لحاظ سے دل چسپ لگی کہ اس میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوا کریں گی اور میں خوب گھوموں پھروں گی۔ سو باتوں کی ایک بات کہ قسمت مجھے اس جگہ کھینچ کر لے آئی تھی جہاں رچرڈ نکسن تھا۔

☆☆☆

تھلیما ریان نے نکسن سے شادی کرنا قبول کرلی۔ دونوں نے طے کیا کہ وہ 1941ء کے موسم بہار میں شادی کریں گے۔ جب وہ دن آیا تو نکسن نے شادی کی انگوٹھی خریدی اور 21 جون 1941 کو ریور سائڈ کیلیفورنیا کے چرچ میں شادی کر لی۔ تھلیما ریان کہتی ہے۔ ”شادی میں میرے اور نکسن کے خاندان والے سب ہی شریک تھے۔ بڑا مزہ آیا۔ پھر ہم اپنی کار میں بیٹھ کر میکسیکو کی طرف چل پڑے۔ ہماری کوئی خاص منزل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی سے پیشتر ہم نے اس بارے میں کچھ طے نہیں کیا تھا کہ کہاں جانا ہے اور ہنی مون کہاں منانا ہے۔ منہ اٹھایا اور چل دیے کے مصداق ہم ایک دم سے چل پڑے۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی، بے پایاں مسرت طاری تھی۔ وہ انداز ہمیں اتنا اچھا لگا کہ ہم شادی کے کافی عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسی طرح کار میں بیٹھ جاتے ہیں اور بغیر منزل کا تعین کیے چل پڑتے ہیں۔“

جب شادی ہوگئی اور زندگی کا ایک ساتھی مل گیا تو اس کے ساتھ رہائش کا مسئلہ بھی پیدا ہوگیا، وہ یوں حل ہوا کہ نکسن نے ایک گیراج کی اوپری منزل کرائے پر لے لی۔ تھلیما شادی کے بعد بھی معلمی کے پیشے سے وابستہ رہی۔ نکسن اب کسی بڑے شہر جاکر قانون کی پریکٹس کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کا اظہار اپنے دوستوں سے بھی کیا۔ اسی اثنا میں وہ کیوبا ہو آیا اور وہاں بھی یہی سوچتا رہا۔ ہوانا میں پریکٹس کرنے یا تجارت کرنے پر بھی اس نے غوروخوض کیا۔

اسی اثنا میں جاپانیوں نے پرل ہاربر پر حملہ کردیا اور دنیا کا جغرافیہ تبدیل ہونے لگا۔ اس خطے سے دھواں اٹھنے لگا اور فضا میں بارود کی ناگوار بو پھیل گئی۔ نکسن بھی جذبۂ حب الوطنی کے تحت فوج میں شامل ہوکر اپنی صلاحیتیں آزمانا چاہتا تھا۔ وہ 1942ء میں واشنگٹن گیا اور اس نے قیمتوں کو کنٹرول کرنے والے ایک آفس میں راشننگ سیکشن میں ملازمت کی درخواست دے دی۔ اسے یہ ملازمت مل گئی۔ اس کی تنخواہ 61 ڈالر فی ہفتہ مقرر ہوئی۔

اگست میں جب وہ نیوی میں شامل ہوا تو اس کا عہدہ لیفٹیننٹ تھا۔ جلد ہی اسے دو ترقیاں مل گئیں کیونکہ اس کی کارکردگی دوسروں سے بہتر تھی۔ آپریشن افسر کی حیثیت سے اس کی ڈیوٹی بحر اوقیانوس میں لگائی گئی۔ اس کی تنخواہ 90 ڈالر ہوچکی تھی۔ نکسن نے چھ مہینے تک ایک معمولی حکومتی افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس نے دو سبق حاصل کیے۔ ایک تو یہ کہ اس کے خیالات میں پختگی آگئی اور اس کی سیاسی سوچ میں بھی تبدیلی آگئی۔

1938ء میں نکسن کا نام ووٹر کی حیثیت سے لسٹ میں درج کیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر 25 برس ہوچکی تھی۔ اس کے چار انتخابی سال ضائع ہوگئے۔ مگر وائیٹر کے نائب اٹارنی کی حیثیت سے کام کرنا سیاسی نوعیت کا تھا، اس لیے عملاً وہ سیاست میں داخل ہوچکا تھا۔ تاہم باقاعدہ طور پر اس نے 1945ء میں حصہ لینا شروع کیا۔ دسمبر 1945ء میں نکسن کیلیفورنیا پہنچ گیا اور ریپبلکن پارٹی کا ضلعی چیئرمین بن گیا۔ وہ اپنی فوجی وردی اتار کر اب سیاسی طور پر ملک و قوم کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

جنوری 1946ء میں نکسن کو نیوی سے چھٹی مل گئی۔ وہ نئے خیالات لے کر پرانی جگہ پر واپس آگیا۔ یہاں آکر اس نے حقیقت میں سیاسی شعور حاصل کیا۔ وہ یہ کہ بااثر افراد وردی والے امیدواروں کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ تصاویر ضائع کردی گئیں اور انتخابی پوسٹروں .... پر جہاں لیفٹیننٹ کمانڈر رچرڈ ایم نکسن لکھا تھا وہاں صرف رچرڈ نکسن لکھا گیا۔ نکسن نے سیاست کے میدان میں آتے ہی زور و شور سے مہم چلانی شروع کردی۔ چند مہینوں کے بعد نکسن کی پہلی بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام انہوں نے پیٹریشیا رکھا۔ تین ہفتوں بعد نومولود کو انہوں نے دادی کے سپرد کیا اور تھلیما بھی انتخابی مہم میں شامل ہوگئی۔ نکسن کے لیے پارٹی نے پانچ سو ڈالر کے عوض ایک پبلسٹی منیجر کا انتظام بھی کردیا۔ اسی اثنا میں ڈورہس نامی ایک سیاست داں کو ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنا امیدوار مقرر کردیا۔ مگر نکسن نے اسے انتخاب کے پہلے مرحلے میں شکست سے دوچار کردیا اور سینیٹر ہوگیا۔

سینیٹر ہونے کے بعد اس کے لیے اگلا مرحلہ نائب صدارت کا تھا۔ اسے آئزن ہاور نے انتخاب لڑنے کے لیے ٹکٹ دیا تھا۔ اس سلسلے میں اسے ان کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ نکسن نے پورے ملک کا ایک طوفانی دورہ کیا، اس سے اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے۔ اس کے بارے میں گرماگرم بحثیں ہونے لگیں۔ وہ اس لحاظ سے بھی امریکی تاریخ کا سب سے خوش قسمت نائب صدارتی امیدوار ثابت ہوا کہ کیلیفورنیا میں اس کے سیاسی دوستوں کے تعاون سے اس کی مہم کے لیے

اٹھارہ ہزار ڈالر کی رقم جمع کی گئی۔ اس فنڈ کا نام اس کے دوستوں نے ''نکسن فنڈ'' رکھا۔ انہوں نے تمام امکانی خدشات کا اچھی طرح سے جائزہ لیا تھا کہ اس پر کوئی تنقید نہ کرسکے۔ مگر اخبارات نے اس کا اسکینڈل بنالیا اور یہ کہنے لگے کہ اسے سرمایہ داروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔

ایک اخبار نے یہ خبر بھی جمادی کہ نکسن کو کیلیفورنیا کے ایک سو تاجر مبلغ بیس ہزار ڈالر سالانہ اضافی تنخواہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر تاجر دو سو ڈالر ادا کرتا ہے، تاکہ بعد میں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرسکے۔ ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں بھی براہِ راست نکسن سے اس کی تصدیق چاہی گئی تو اس نے جواب دیا کہ یہ سب غلط ہے۔

نکسن نے جب اپنی سیاسی مہم کا آغاز کیا تو لوگوں نے والہانہ انداز میں اس کا ساتھ دیا۔ وہ ہر جگہ جوش و ولولے کے ساتھ جمع ہوجاتے تھے۔ لیکن جب اخبارات میں اس کے فنڈ کے بارے میں الٹی سیدھی خبریں چھپنے لگیں تو سیاسی افق پر سناٹا طاری ہوگیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے مطالبہ کیا جانے لگا کہ نکسن کو دیا جانے والا ٹکٹ فوراً ہی واپس لے لیا جائے ورنہ عوام پر اس کا برا اثر پڑے گا۔

فنڈ کے قصے نے پوری قوم کو ہیجان میں مبتلا کر دیا، مبصرین اس پر رائے زنی کر رہے تھے اور اپنے تجزیوں میں مصروف تھے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام روک کر باقاعدہ بلیٹن نشر کیے جاتے تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ اس معاملے کو خوب اچھالتی۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ اس لیے اس کے پاس کوئی واضح ثبوت تو تھا نہیں، اگر وہ کچھ کہتی تو محض لفظوں کا پٹارہ ہوتا۔ پھر ریپبلکن اسے عدالت میں گھسیٹ لیتی۔

صدر آئزن ہاور نے چپ سادھ رکھی تھی۔ جب اخبارات نے انہیں بیان دینے پر مجبور کیا تو انہوں نے کہا کہ نکسن ایک دیانت دار شخص ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے تمام حقیقت پوری طرح سے بیان کردے گا۔

ریپبلکن پارٹی کے بعض عہدے داروں نے یہ بیانات دینا شروع کردیے کہ آئزن ہاور اپنا امیدوار تبدیل کردیں ورنہ انہیں بدنامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک تنظیم نے الزام لگایا کہ نکسن کو امراء نے اپنے مفادات کے لیے خرید لیا ہے۔ اسے رقومات دینے سے بہتر کوئی اور سرمایہ کاری نہیں ہوسکتی۔

ایک ماہ بعد رچرڈ نکسن نے کہا کہ وہ فنڈز کے بارے اپنی پوزیشن واضح کرے گا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو نکسن اس تقریر پر ایک ماہ محنت کرتا، لیکن اس موضوع پر اس نے دو روز پیشتر اپنے پوائنٹس ایک کاغذ پر لکھے اور تقریر تیار کرلی۔ اس تقریر کو اس نے اپنے عملے سے بھی چھپا کر رکھا اور انہیں علم نہیں ہوسکا کہ وہ اپنی صفائی میں کیا کچھ کہنے والا ہے۔ نکسن نے سوچ لیا تھا کہ وہ پورا معاملہ عوام کے سامنے رکھ دے گا اور کوئی بات نہیں چھپائے گا۔ نشری تقریر میں اس نے کہا:

میرے عزیز ہم وطنو!

میں آپ کے سامنے نائب صدارت کے ایک امیدوار کی حیثیت سے اور ایک ایسے انسان کی حیثیت سے آیا ہوں جس کی ایمانداری اور خلوص کو چیلنج کیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ پر لگائے گئے الزامات سے واقف ہیں۔ آپ کو بتایا گیا ہے کہ سینیٹر نکسن نے اپنے ایک حامیوں کی ایک جماعت سے اٹھارہ ہزار ڈالر لیے ہیں۔ کیا یہ اقدام غلط ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر سینیٹر نکسن کو ملی ہوئی یہ رقم میرے ذاتی استعمال میں آئی ہے تو یہ بدترین اخلاقی جرم ہے اور میں پھر کہتا ہوں کہ اگر رقم دینے والے کسی فرد کو اس کی وجہ سے مخصوص مراعات ملی ہیں تو بھی یہ بدترین اخلاقی جرم ہے۔ لیکن ان سب سوالات کا جواب دینے کے لیے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ یہ سب الزامات غلط ہیں۔ ان اٹھارہ ہزار ڈالروں کی اور مجھے دی جانے والی اس طرح کی دوسری کی ایک کوڑی بھی میرے ذاتی استعمال میں نہیں آئی۔

ان کا ایک ایک سینٹ سیاسی اخراجات کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جن کا بار ٹیکس دینے والوں پر ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے واضح طور پر یہ بھی کہنے دیجیے کہ یہ رقم دینے والوں کو یا میری مہم کے لیے کوئی اور رقم دینے والوں کو ایسی کوئی رعایت نہیں ملی ہے جو عام فرد کی حیثیت سے انہیں نہ مل سکتی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ اب میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں ایک امیدوار کی حیثیت سے جو کچھ کرنے والا ہوں اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، لہٰذا میں ریڈیو سننے والے اور ٹیلی ویژن دیکھنے والے سارے افراد کے سامنے ایک مالیاتی تاریخ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے کتنا کمایا، کتنا خرچ کیا اور یہ بھی کہ اس وقت میرے پاس کیا کچھ ہے۔ میں بالکل ابتدا سے بتاتا ہوں۔ میں 1913ء میں

پیدا ہوا تھا اور۔

اپنی تاریخ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ میرا سرمایہ کتنا ہے۔ بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن میں اور بیوی تھلیما کو ہمیشہ یہ اطمینان رہا ہے کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا وہ حقیقت میں ہمارا ہی ہے۔ میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ تھلیما کے پاس منک کوٹ نہیں ہے۔ میں اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہتا ہوں وہ جو لباس پہنے گی اچھی لگے گی، لہٰذا منک کوٹ کے بارے میں ہمہ وقت سوچنے اور دماغ کو ہلکان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

میرا خیال ہے کہ میں ایک بات اور بھی بتا دوں کہ مجھے ایک چیز بہرحال ملی ہے جو میرے ذاتی استعمال میں ہے۔ یہ ایک تحفہ ہے جو انتخاب کے بعد ملا تھا۔ میری بیوی نے ریڈیو پر کہا تھا کہ میری بیٹی ایک کتا پالنا چاہتی ہے۔ اس پر ٹیکساس کے ایک شخص نے مجھے اسپینئل کتا بھیج دیا۔ میری بیٹی نے اس کا نام "چیکرس" رکھ دیا اور اب وہ اس سے بے حد مانوس ہے۔ میں اسے واپس نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

میں ریپبلکن امیدوار کی حیثیت سے نائب صدارت کا انتخاب لڑوں گا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ قومی کمیٹی کے سپرد کر رہا ہوں۔ یہ کام ان کا ہے کہ وہ جو جی چاہیں فیصلہ کریں۔ امریکا کے عوام سے درخواست ہے کہ انہیں فیصلہ کرنے میں مدد دیں۔ انہیں خط بھیجیں، تار بھیجیں، ٹیلی ویژن پر بتائیں کہ مجھے انتخاب میں کھڑا ہونا چاہیے یا ایک طرف ہٹ جانا چاہیے۔ آپ کا فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا مجھے منظور ہے۔

"آخر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آئزن ہاور نہایت عظیم ہیں اور میرے لیے قابلِ احترام۔"

جب وہ تقریر کر کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے نکلا تو اسے اور اس کی بیوی کو دیکھ کر لوگوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجائیں۔ ہوٹل میں بھی جوش خروش تھا۔ شام تک اس کی پارٹی کے بہت سے افراد نے مبارک باد دی جس سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔

آئزن ہاور نے نکسن کی تقریر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سنی۔ پھر اسے تار دیا۔ "نکسن! تمہاری تقریر بہترین تھی۔" وہ کلیولینڈ میں تھے۔ جہاں ہزاروں افراد نکسن کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ عوام نے اپنی رائے دے دی کہ نکسن کو انتخاب لڑنے دیا جائے۔ وہ ایک بہترین امیدوار ہے۔

نکسن کو قومی شخصیت تسلیم کر لیا گیا اور اسے امریکا کی تاریخ میں نائب صدارت کے لیے سب سے زیادہ مقبول امیدوار قرار دے دیا گیا۔

☆☆☆

1956ء کا سال ریپبلکن کے لیے نہایت پُرسکون تھا۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور نے ایک بار پھر صدارتی انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے نکسن کو نائب صدر بننے کی پیشکش کرنے کی بجائے وزارت کی پیشکش کی۔ نکسن اس سے دل گرفتہ اور دل گیر ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب اسے سیاست چھوڑ دینا اور دوبارہ آلو پیاز فروخت کرنا چاہیے۔

آئزن ہاور ان دنوں بیمار تھا اس لیے اس پر گومگو کی کیفیت بھی طاری تھی۔ ایک طویل ملاقات میں اس نے نکسن کو وزارت دفاع کی پیشکش کی۔ پریس کانفرنس میں اس نے کہا میں نے نکسن پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ دوسری طرف نکسن نے کیلیفورنیا کی ایک قانونی فرم میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ اس قانونی فرم سے اسے تقریباً ایک لاکھ ڈالر ماہانہ کی آمدنی ضرور ہوتی۔ پھر ایک روز اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ کل ایک پریس کانفرنس بلائے گا اور اس میں سیاست سے علیحدگی کا اعلان کرے گا۔

اس کے ایک دوست نے سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے ورنہ اسے بھگوڑا کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ صدر آئزن ہاور کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔ وہ اپنا فیصلہ ملتوی کر دے۔ نکسن نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور پریس کانفرنس مؤخر کر دی۔

بالآخر آئزن ہاور نے یہ سوچ کر کہ اگر وہ دوران صدارت بیمار پڑ گئے تو اس عہدے کو کون سنبھالے گا، نکسن کو پیشکش کی کہ وہ آئندہ کے لیے نائب صدارت کے عہدے پر ہی انتخاب لڑ سکتا ہے۔ ایک کانفرنس بلا کر وہ خود اس کا اعلان بھی کر دے۔ پھر میرا پریس سیکرٹری اس کی توثیق کر دے گا۔ وہ کہے گا کہ مجھے اس فیصلے سے مسرت ہوئی ہے۔

9 جون کو آئزن ہاور پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گیا۔ اس بنا پر فوراً ہی اس کا آپریشن کیا گیا۔ اس کی صحت کا سوال ایک بار پھر موضوع بحث بن گیا۔ اس سے پیشتر جناب صدر پر دل کا دورہ بھی پڑا تھا تو نکسن نے عارضی طور پر ان کی جگہ کام کیا تھا اور حسن خوبی سے معاملات کو چلایا تھا۔ جس سے

انتظامیہ کا وقار بلند ہوا تھا۔ صدر نے اس کا اعتراف کیا کہ اس میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ صدارتی ذمے داریاں سنبھال سکے۔

نکسن اور اس کی بیوی تھلیما نے اپنے ایک اسٹینو گرافر کی شادی میں شرکت کی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد نکسن نے اخبار اٹھا کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ صدر کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ نکسن نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لیے کہ یہ تو عام سی شکایت تھی۔ مگر بعد میں صدر کے سیکرٹری کا فون آیا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نکسن کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ایک اخباری نمائندہ تھا جو اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ نکسن نے سوچ لیا تھا کہ وہ تردید یا تصدیق بالکل نہیں کرے گا، اس لیے کہ جو بیان بھی آنا تھا، وہ وہائٹ ہاؤس سے آنا چاہیے تھا۔ جب ہیجان بڑھ گیا تو نکسن نے صدر کے سیکرٹری راجرز کو فون کیا کہ وہ اس کے گھر پر آنا چاہتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ طریقہ کیا ہوگا، اس لیے اگر خبر عام ہوگئی تو پھر لوگ اس کے گھر کے گرد جمع ہوجائیں گے۔ نکسن نے کہا کہ وہ کار لے کر وہائٹ کے قریب آجائے۔ جب وہ آگیا تو نکسن ایک بغلی دروازے سے نکل کر تیزی سے ایک گلی میں چلا گیا پھر جاکر کار میں بیٹھ گیا۔ وہ راجرز کے گھر پہنچ گئے تو جنرل وٹھن بھی آگیا۔ وہ ان دنوں وہائٹ ہاؤس میں افسر اعلا کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ تینوں نے بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیا۔

انہوں نے ان کاموں کی فہرست بنائی جنہیں ملتوی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فوری نوعیت کا کوئی کام نہیں ہے۔ پھر انہوں نے سارے اعلیٰ حکام کو فون کیا کہ سارے کام اسی طرح سے ہوتے رہیں گے جیسے کہ جناب صدر نے طے کیے تھے۔ انتظامیہ اپنی کارروائیاں جہاں تک ممکن ہوگا روزمرہ کے معمول تک محدود رکھے گی۔ مگر ان تدابیر پرعمل کرنے کے باوجود سیاسی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

آئزن ہاور آکسیجن ٹینٹ میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو یقین تھا کہ صدارت کے لیے کسی نئے امیدوار کو منتخب کرنا پڑے گا۔ نکسن صدر کے فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔ وہ ایسے اقدامات سے گریز کررہا تھا جس سے اس پر الزام لگ جائے کہ وہ سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس لیے وہ انتظامیہ کی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں شریک ہونے کے لیے وقت سے پہلے ہی پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ صدر کی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اپنی ہی کرسی پر بیٹھ کر اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔

سارے فرائض کی انجام دہی وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ جب وزراء اس سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے تو وہ انہیں اپنے کمرے میں بلانے کی بجائے خود ان کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ چار دن بعد کابینہ کا اجلاس ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ نکسن نے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے جناب صدر کے لیے دعا مانگی۔ پھر اسپتال سے آنے والا بلیٹن پڑھ کر سنایا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ صدر نے گزشتہ رات آکسیجن ٹینٹ سے باہر گزاری ہے اور پُرسکون انداز میں نو گھنٹے کی نیند لی ہے۔ سب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ اجلاس حسب معمول جاری رہا۔

نو مہینے کے بعد صدر کی طبیعت سنبھل گئی اور جب ڈاکٹروں نے انہیں اپنے وزرا سے ملنے کی اجازت دی تو انہوں نے سب سے پہلے نکسن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نکسن سے مل کر انہوں نے حالات سے آگاہی حاصل کی۔

25 نومبر 1957ء کو جناب صدر پر بیماری کا تیسرا حملہ ہوا۔ اس وقت صدر صاحب نے ایک ایسا طریقہ وضع کیا جس کی امریکی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے آیندہ علالت کی صورت میں نائب صدر کو قائم مقام صدر کی حیثیت سے حکومت سنبھالنے کا اختیار دے دیا۔ اس بار ان پر حملہ شدید نہیں تھا، انہوں نے صحت یابی کے بعد اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ بہرحال نکسن نے اس بار زیادہ خود اعتمادی کا اظہار کیا۔ صدر کو قائم مقام صدر کا عہدہ اس لیے متعارف کرانا پڑا کہ کانگریس اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہی تھی کہ اس آئینی سقم کو دور کیا جائے جس کی بنا پر صدر کی علالت کے دوران نائب صدر کی حیثیت غیرواضح ہوگئی تھی۔

صدر نے اٹارنی جنرل سے ملاقات کے بعد اس مسئلے کا یہ حل نکالا۔ چنانچہ معاملہ اس طرح سے طے پایا: اگر آئزن ہاور یہ خیال کریں کہ وہ بیماری کے باعث اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کرپارہے تو وہ نکسن کو اس کی اطلاع دے دیں گے اور نکسن ذمے داری کے ساتھ سارے اختیارات سنبھال لیں گے۔ صدر اگر کسی وجہ سے انہیں اطلاع نہ دے سکیں تو نکسن ازخود صدر کا عہدہ سنبھال لیں گے اور اس وقت تک سنبھالے رہیں گے جب تک کہ آئزن ہاور دوبارہ

پیدا ہوا تھا اور۔

اپنی تاریخ بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرا سرمایہ کتنا ہے۔ بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن میں اور بیوی تھلیما کو ہمیشہ یہ اطمینان رہا ہے کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا وہ حقیقت میں ہمارا ہی ہے۔ میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ تھلیما کے پاس منک کوٹ نہیں ہے۔ میں اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہتا ہوں وہ جو لباس پہنے گی اچھی لگے گی، لہٰذا منک کوٹ کے بارے میں ہمہ وقت سوچنے اور دماغ کو ہلکان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

میرا خیال ہے کہ میں ایک بات اور بھی بتا دوں کہ مجھے ایک چیز بہرحال ملی ہے جو میرے ذاتی استعمال میں ہے۔ یہ ایک تحفہ ہے جو انتخاب کے بعد ملا تھا۔ میری بیوی نے ریڈیو پر کہا تھا کہ میری بیٹی ایک کتا پالنا چاہتی ہے۔ اس پر ٹیکساس کے ایک شخص نے مجھے اسپینئل کتا بھیج دیا۔ میری بیٹی نے اس کا نام ''چیکرس'' رکھ دیا اور اب وہ اس سے بے حد مانوس ہے۔ میں اسے واپس نہیں کروں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

میں ریپبلکن امیدوار کی حیثیت سے نائب صدارت کا انتخاب لڑوں گا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ قومی کمیٹی کے سپرد کر رہا ہوں۔ یہ کام ان کا ہے کہ وہ جو جی چاہیں فیصلہ کریں۔ امریکا کے عوام سے درخواست ہے کہ انہیں فیصلہ کرنے میں مدد دیں۔ انہیں خط بھیجیں، تار بھیجیں، ٹیلی ویژن پر بتائیں کہ مجھے انتخاب میں کھڑا ہونا چاہیے یا ایک طرف ہٹ جانا چاہیے۔ آپ کا فیصلہ جو کچھ بھی ہو گا مجھے منظور ہے۔

''آخر میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آئزن ہاور نہایت عظیم ہیں اور میرے لیے قابلِ احترام۔''

جب وہ تقریر کر کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے نکلا تو اسے اور اس کی بیوی کو دیکھ کر لوگوں نے پُرجوش انداز میں تالیاں بجائیں۔ ہوٹل میں بھی جوش خروش تھا۔ شام تک اس کی پارٹی کے بہت سے افراد نے مبارک باد دی جس سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا۔

آئزن ہاور نے نکسن کی تقریر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سنی۔ پھر اسے تار دیا۔ ''نکسن! تمہاری تقریر بہترین تھی۔'' وہ کلیولینڈ میں تھے۔ جہاں ہزاروں افراد نکسن کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ عوام نے اپنی رائے دے دی کہ نکسن کو انتخاب لڑنے دیا جائے۔ وہ ایک بہترین امیدوار ہے۔

نکسن کو قومی شخصیت تسلیم کر لیا گیا اور اسے امریکا کی تاریخ میں نائب صدارت کے لیے سب سے زیادہ مقبول امیدوار قرار دے دیا گیا۔

☆☆☆

1956ء کا سال ریپبلکن کے لیے نہایت پُرسکون تھا۔ چنانچہ صدر آئزن ہاور نے ایک بار پھر صدارتی انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے نکسن کو نائب صدر بننے کی پیشکش کرنے کی بجائے وزارت کی پیشکش کی۔ نکسن اس سے دل گرفتہ اور دل گیر ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب اسے سیاست چھوڑ دینا اور دوبارہ آلو پیاز فروخت کرنا چاہیے۔

آئزن ہاور ان دنوں بیمار تھا اس لیے اس پر گومگو کی کیفیت بھی طاری تھی۔ ایک طویل ملاقات میں اس نے نکسن کو وزارت دفاع کی پیشکش کی۔ پریس کانفرنس میں اس نے کہا میں نے نکسن پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ دوسری طرف نکسن نے کیلیفورنیا کی ایک قانونی فرم میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ اس قانونی فرم سے اسے تقریباً ایک لاکھ ڈالر ماہانہ کی آمدنی ضرور ہوتی۔ پھر ایک روز اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ کل ایک پریس کانفرنس بلائے گا اور اس میں سیاست سے علیحدگی کا اعلان کرے گا۔

اس کے ایک دوست نے سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے ورنہ اسے بھگوڑا کہا جائے گا۔ اس کے علاوہ صدر آئزن ہاور کی کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔ وہ اپنا فیصلہ ملتوی کر دے۔ نکسن نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور پریس کانفرنس مؤخر کر دی۔

بالآخر آئزن ہاور نے یہ سوچ کر کہ اگر وہ دوران صدارت بیمار پڑ گئے تو اس عہدے کو کون سنبھالے گا، نکسن کو پیشکش کی کہ وہ آئندہ کے لیے نائب صدارت کے عہدے پر ہی انتخاب لڑ سکتا ہے۔ ایک کانفرنس بلا کر وہ خود اس کا اعلان بھی کر دے۔ پھر میرا پریس سیکرٹری اس کی توثیق کر دے گا۔ وہ کہے گا کہ مجھے اس فیصلے سے مسرت ہوئی ہے۔

9 جون کو آئزن ہاور پیٹ کے درد میں مبتلا ہو گیا۔ اس بنا پر فوراً ہی اس کا آپریشن کیا گیا۔ اس کی صحت کا سوال ایک بار پھر موضوع بحث بن گیا۔ اس سے پیشتر جناب صدر پر دل کا دورہ بھی پڑا تھا تو نکسن نے عارضی طور پر ان کی جگہ کام کیا تھا اور حسن خوبی سے معاملات کو چلایا تھا۔ جس سے

انتظامیہ کا وقار بلند ہوا تھا۔ صدر نے اس کا اعتراف کیا کہ اس میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ صدارتی ذمے داریاں سنبھال سکے۔

نکسن اور اس کی بیوی تھلیما نے اپنے ایک اسٹینو گرافر کی شادی میں شرکت کی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد نکسن نے اخبار اٹھا کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ صدر کے پیٹ میں گڑبڑ ہے۔ نکسن نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس لیے کہ یہ تو عام سی شکایت تھی۔ مگر بعد میں صدر کے سیکرٹری کا فون آیا کہ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔

تھوڑی دیر بعد نکسن کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ایک اخباری نمائندہ تھا جو اس کی تصدیق چاہتا تھا۔ نکسن نے سوچ لیا تھا کہ وہ تردید یا تصدیق بالکل نہیں کرے گا، اس لیے کہ جو بیان بھی آنا تھا، وہ وہائٹ ہاؤس سے آنا چاہیے تھا۔ جب ہیجان بڑھ گیا تو نکسن نے صدر کے سیکرٹری راجرز کو فون کیا کہ وہ اس کے گھر پر آنا چاہتا ہے۔ اس نے پوچھا کہ طریقہ کیا ہوگا، اس لیے اگر خبر عام ہوگئی تو پھر لوگ اس کے گھر کے گرد جمع ہوجائیں گے۔ نکسن نے کہا کہ وہ کار لے کر وہائٹ کے قریب آجائے۔ جب وہ آگیا تو نکسن ایک بغلی دروازے سے نکل کر تیزی سے ایک گلی میں چلا گیا پھر جا کر کار میں بیٹھ گیا۔ وہ راجرز کے گھر پہنچ گئے تو جنرل وٹھن بھی آگیا۔ وہ ان دنوں وہائٹ ہاؤس میں افسر اعلا کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔ تینوں نے بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیا۔

انہوں نے ان کاموں کی فہرست بنائی جنہیں ملتوی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ فوری نوعیت کا کوئی کام نہیں ہے۔ پھر انہوں نے سارے اعلیٰ حکام کو فون کیا کہ سارے کام اسی طرح سے ہوتے رہیں گے جیسے کہ جناب صدر نے طے کیے تھے۔ انتظامیہ اپنی کارروائیاں جہاں تک ممکن ہوگا روزمرہ کے معمول تک محدود رکھے گی۔ مگر ان تدابیر پر عمل کرنے کے باوجود سیاسی فضا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

آئزن ہاور آکسیجن ٹینٹ میں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس لیے ہر شخص کو یقین تھا کہ صدارت کے لیے کسی نئے امیدوار کو منتخب کرنا پڑے گا۔ نکسن صدر کے فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔ وہ ایسے اقدامات سے گریز کررہا تھا جس سے اس پر الزام لگ جائے کہ وہ سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لیے وہ انتظامیہ کی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں شریک ہونے کے لیے وقت سے پہلے ہی پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ صدر کی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے اپنی ہی کرسی پر بیٹھ کر اجلاسوں کی صدارت کرتا تھا۔

سارے فرائض کی انجام دہی وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتا تھا۔ جب وزراء اس سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے تو وہ انہیں اپنے کمرے میں بلانے کی بجائے خود ان کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ چار دن بعد کابینہ کا اجلاس ڈھائی گھنٹے تک جاری رہا۔ نکسن نے اجلاس کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے جناب صدر کے لیے دعا مانگی۔ پھر اسپتال سے آنے والا بلیٹن پڑھ کر سنایا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ صدر نے گزشتہ رات آکسیجن ٹینٹ سے باہر گزاری ہے اور پُرسکون انداز میں نو گھنٹے کی نیند لی ہے۔ سب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ اجلاس حسبِ معمول جاری رہا۔

نو مہینے کے بعد صدر کی طبیعت سنبھل گئی اور جب ڈاکٹروں نے انہیں اپنے وزرا سے ملنے کی اجازت دی تو انہوں نے سب سے پہلے نکسن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نکسن سے مل کر انہوں نے حالات سے آگاہی حاصل کی۔

25 نومبر 1957ء کو جناب صدر پر بیماری کا تیسرا حملہ ہوا۔ اس وقت صدر صاحب نے ایک ایسا طریقہ وضع کیا جس کی امریکی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے آئندہ علالت کی صورت میں نائب صدر کو قائم مقام صدر کی حیثیت سے حکومت سنبھالنے کا اختیار دے دیا۔ اس بار ان پر حملہ شدید نہیں تھا، انہوں نے صحت یابی کے بعد اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں۔ بہرحال نکسن نے اس بار زیادہ خود اعتمادی کا اظہار کیا۔ صدر کو قائم مقام صدر کا عہدہ اس لیے متعارف کرانا پڑا کہ کانگریس اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہی تھی کہ اس آئینی سقم کو دور کیا جائے جس کی بنا پر صدر کی علالت کے دوران نائب صدر کی حیثیت غیر واضح ہوگئی تھی۔

صدر نے اٹارنی جنرل سے ملاقات کے بعد اس مسئلے کا یہ حل نکالا۔ چنانچہ معاملہ اس طرح سے طے پایا: اگر آئزن ہاور یہ خیال کریں کہ وہ بیماری کے باعث اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر پا رہے ہیں تو وہ نکسن کو اس کی اطلاع دے دیں گے اور نکسن ذمے داری کے ساتھ سارے اختیارات سنبھال لیں گے۔ صدر اگر کسی وجہ سے انہیں اطلاع نہ دے سکیں تو نکسن از خود صدر کا عہدہ سنبھال لیں گے اور اس وقت تک سنبھالے رہیں گے جب تک کہ آئزن ہاور دوبارہ

کام شروع کرنے کا فیصلہ نہ کرلیں۔

☆☆☆

آئزن ہاور نے صحت یاب ہونے کے بعد نکسن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اسے اب غیر ملکی دورے کرنا چاہیے۔ 1953ء میں جب کہ آئزن ہاور کو حکومت سنبھالے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ قومی سلامتی کونسل کے ایک اجلاس کے بعد آئزن ہاور نے نکسن سے پوچھا۔ ''اس سال موسم گرما میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

نکسن نے جواب دیا۔ ''آپ جو فرمائیں؟''

''میری تجویز ہے کہ آپ اپنی کابینہ کے ہمراہ مشرق بعید کے دورے پر چلے جائیں۔''

چنانچہ نکسن کی سفارتی ذمے داریوں میں اضافہ ہوگیا۔ وہ بین الاقوامی امور میں خاص طور پر دل چسپی لیتا تھا۔ اس نے اپنے دورے کی ابتدا عالمی سطح سے کی۔ جس میں تینوں براعظموں کے انیس ممالک شامل تھے۔ پہلے دورے میں ستر دن میں پینتالیس ہزار میل کی مسافت طے کی جس میں آسٹریلیا کے دارالحکومت میلبورن میں چوبیس گھنٹوں کا قیام شامل تھا۔ اس کے بعد وہ ایک مہینے تک وسطی امریکا کا دورہ کرتا رہا۔ افریقا کے تین ہفتے کے دورے سے پہلے پوپ، اٹلی کے صدر، وزیر اعظم اور دوسری ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کی۔

اس طرح سے روم میں ان کا قیام سارے دورے کا مصروف ترین پروگرام بن گیا۔ لاطینی امریکا اور پھر برطانیہ کے دورے میں اسے آرام کے لیے تھوڑا سا بھی وقت نہیں ملا۔ اس عالمی دورے میں نکسن ایک بار لفٹ میں پھنس گیا تھا۔ برما میں اس کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا۔ کاسابلانکا میں اسے ''کتے کا بچہ'' کہہ کر پکارا گیا۔ ایتھوپیا، انڈونیشیا اور افغانستان میں اسے خراب اور غیر معیاری کھانوں سے پیچش کی شکایت ہوگئی۔ اس کے علاوہ دوسری بیماریاں بھی جان کو لگ گئیں۔ مگر وینزویلا میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے بھیانک کہنا چاہیے۔ ایسا کسی صدر کے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔

اس دورے کے دوران گوریلا جنگ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بیدار نہ ہوتا تو کیراکاس میں جو اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اس میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اس نے حال و مستقبل پر یکساں نگاہ رکھنے والے فوجی کی طرح صورت حال کا ٹھنڈے دماغ سے مقابلہ کیا۔ لاطینی امریکا کے آٹھ ملکوں میں کیراکاس آخری ملک تھا اور یہ سب سے اہم تھا۔

وینزویلا کی کمیونسٹ پارٹی اتنی سخت جان تھی کہ ملک میں آمریت قائم ہونے کے باوجود اپنا وجود قائم رکھنے میں کامیاب ہوگئی۔ 1958ء میں وہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ چونکہ حکمراں ناتجربے کار تھا اس لیے اس کا اثر و رسوخ پھیلتا چلا گیا۔ لاطینی امریکا کی کسی بھی ریاست میں اگر کمیونزم پارٹی کی داغ بیل پڑ جائے تو امریکا کی حساسیت بڑھ جایا کرتی تھی۔ نکسن کے دورے کا مقصد یہ تھا کہ فوجی حکومت کے وقار اور استحکام کو طاقت بخشی جائے اور نئے حکمرانوں کو سمجھایا جائے کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ان کے نرم رویے سے وینزویلا اور دونوں امریکی براعظموں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

وینزویلا کے وزیر خارجہ کو امریکا کے ایک سفارت کار نے آگاہ کیا کہ اگر نکسن کو مدعو کیا جائے تو وہ مئی میں آپ کے ملک کا دورہ کر سکتے ہیں۔ کچھ ہفتوں بعد نکسن کو وہاں آنے کی دعوت دے دی گئی۔ لارزبل جو اس وقت صدر تھا اس نے اعلان کیا کہ وینزویلا میں نکسن کا پُرجوش استقبال کیا جائے گا۔ مگر کمیونسٹوں پر اس کا الٹ ردِعمل ہوا۔

انہوں نے اخبارات میں امریکا کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ امریکا سے سابق ڈکٹیٹر کے گہرے تعلقات کا الزام لگایا گیا۔ سابق آمر کے لیے آئزن ہاور کا تحفہ، ان کو وزیر خارجہ کا خراج تحسین اور جلاوطنی کے بعد میامی میں ہر قسم کی سہولت کی فراہمی کو الزام کے طور پر پیش کیا گیا۔ دورے کے اعلان کے دوسرے ہی روز خفیہ پولیس کا ایک جاسوس نائب صدر کے پروگرام، سفر کے راستوں، احتیاطی تدابیر اور دوسری تفصیلات طے کرنے کے لیے کیراکاس پہنچ گیا۔

کیراکاس کے تجربے کار پولیس افسر انقلاب کے دوران ہلاک ہو چکے تھے اس لیے نئے پولیس افسران جوان کی جگہ متعین ہوئے وہ ناتجربے کار تھے۔ کمیونسٹوں نے نئی پولیس کو ہنگامہ پسندوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کی تلقین کی بہرحال فوجی افسر ہر یونٹ کی خود نگرانی کرتے تھے اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ امریکی خفیہ پولیس کے عملے نے نکسن کے لیے وینزویلا اور امریکی سفارت خانے کے تیار کردہ پروگرام میں خامیوں سے آگاہ کیا۔ اسی اثنا میں وینزویلا کی دو مشہور شخصیتوں کی درخواست پر یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طالب علموں نے نکسن سے ملاقات کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ ان کا

کہتا تھا کہ طلبہ احتجاج کی تیاری کر رہے ہیں جس سے نکسن کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن وینز ویلا کی بدنامی ضرور ہوگی۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ اخبارات نے امریکا کے خلاف پروپیگنڈا تیز کر دیا۔ ایک روزنامے نے ایک ایسی تصویر شائع کر دی جس میں ایک سفید فام کو نیگرو کو ذبح کرتے دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کا عنوان تھا ''امریکی درندگی۔'' ایسی تصویر شائع ہوتے ہی ایک ہیجان برپا ہوگیا۔

ایک اور اخبار نے نکسن کی کارٹون نما تصویر شائع کی تھی جس میں اس کے دانت بڑے بڑے تھے اور وہ کسی درندے کی طرح لوگوں کی طرف دانت نکالتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ تصویر کے نیچے کیپشن تھا ''عیار اور خوں خوار نکسن۔'' 12 مئی کے قریب دیواروں پر لوگوں نے پوسٹر لگانا شروع کر دیے۔ جن پر نکسن مردہ باد لکھا تھا۔ دارالحکومت کے مضافات اور یونی ورسٹی کے قریب طلبہ مخالفانہ نعرے لگانے لگے۔ اگر بزرگ انہیں نصیحت کرتے تو انہیں خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کیرا کاس کی آبادی بارہ لاکھ تھی جس میں دولت مند اور مفلس سب ہی شامل تھے۔ چنانچہ وہاں بلند و بالا عمارات تھیں اور جھونپڑیاں بھی۔ ہائی اسکول کے لڑکے بھی مظاہرین میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے سڑکوں کی بتیاں اور عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے۔

نکسن کے حفاظتی عملے نے ان کے دورے کا راستہ تبدیل کر دیا اور کوشش کی کہ راستے میں یونی ورسٹی نہ آئے۔ انہوں نے دورے کی طوالت کو کم کر کے اسے مختصر کر دیا۔ کونسلروں نے معذرت کی کہ اگر نکسن نے عام جلسے میں شرکت کی اور لوگوں نے احتجاج کیا تو وہ ذمے دار نہ ہوں گے، لہٰذا حفاظتی دستے نے نکسن کا ایک عوامی جلسہ ملتوی کر دیا۔ نکسن کی آمد میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے کہ لوگ ائیرپورٹ کی عمارت کے اندر اور باہر جمع ہونا شروع ہوگئے۔ ان کے لبوں سے کف اور اشتعال انگیز نعرے برآمد ہو رہے تھے۔

امریکی سفارت خانے کے حکام نے نائب صدر کے لیے 9 کاریں حاصل کی تھیں۔ اس کے علاوہ اخباری نمائندے اور رسائل کے مدیر ایک چارٹر طیارے میں آئے تھے۔

وینز ویلا کے پریس کے نمائندے جوں ہی ائیرپورٹ کی عمارت کے قریب پہنچے اور انہوں نے لوگوں کی طرف اپنے کیمرے گھمائے، نوجوان طلبہ نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے جھنڈے لہرانا شروع کر دیے۔ ان پر امریکا اور نکسن کے خلاف نعرے درج تھے۔ وہاں ایک ہزار فوجی جوان آئے تھے، انہوں نے سنگینیں تان لیں اور پوزیشن سنبھال لی۔ پولیس نے عمارت کے اندر اور باہر مورچے بنا لیے مگر ہنگامہ آرائی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ جب فوٹوگرافر وہاں سے دور ہٹ گئے تو احتجاج کرنے والوں کے پاگلانہ جوش و خروش میں کچھ کمی آگئی۔ انہوں نے نعرے بازی بند کر دی۔

نکسن کا طیارہ رن وے پر اتر گیا پھر دوڑتا ہوا ہوائی اڈے کے نزدیک آ گیا۔ سیڑھی لگائی گئی تو نکسن اور اس کی اہلیہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ انہیں 19 توپوں کی سلامی دی گئی اور فوج نے قومی بینڈ بجایا مگر اس کی آواز نعروں میں دب گئی۔ لوگوں نے قومی ترانے کی بھی پروا نہ کی اور اس کی توہین کے مرتکب ہوئے۔

نکسن کا کہنا تھا۔ ''میرا قیاس تھا کہ ممکن ہے کچھ لوگ مخالفانہ بینر لیے کھڑے ہوں گے لیکن وہاں تو نظارہ ہی کچھ اور تھا۔ انتظامیہ نے کمیونسٹوں کو اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ سارے ائیرپورٹ پر قبضہ کرلیں۔ طیارے سے اترنے کے بعد گارڈ آف آنر لیا گیا اور اس کے بعد میں نے سارے ائیرپورٹ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں یہی کرتا ہوں۔ میں اندازہ لگانا چاہتا ہوں کہ کہاں دو گھڑی کے لیے رکنا ہے، کہاں سے بچ کر نکلنا ہے اور کن لوگوں سے مصافحہ کرنا ہے۔ میں فوراً ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں کی صورتِ حال مختلف ہے۔ مجھے واضح نظر آرہا تھا کہ لوگ بری طرح سے مشتعل ہیں۔ وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ گارڈ آف آنر کے بعد میں نے مجمع کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانا ملتوی کردیا۔ اس لیے یہ لوگ مجھے کیا گھاس ڈالتے جب کہ انہوں نے اپنے پرچم اور قومی ترانے کی توہین کی تھی۔''

طیارے کے ٹیکنیشنوں کا ایک مختصر سا گروپ گارڈ آف آنر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا اور میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''امریکا زندہ باد۔ نکسن زندہ باد۔'' نکسن کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے ان لوگوں سے مصافحہ کیا۔ پھر وہ اعلا حکام کی طرف مڑا اور ان لوگوں سے ہاتھ ملانے لگا۔

وینزویلا کی پولیس اور جاسوسی کا محکمہ ناکارہ تھا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ لوگوں سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ جب ایک اتاشی نے پولیس سے کہا کہ وہ نائب صدر کی گاڑی کے نکلنے کے لیے راستہ صاف کردے تو اس نے انکار کردیا اور یہ کہہ کر دور چلا گیا کہ یہ لوگ بے ضرر ہیں اور انہیں مظاہرہ کرنے کا پورا حق ہے۔

سیکیورٹی کا عملہ ناقص تھا اور اس کی کارکردگی بے حد مجہول اور ناکارہ تھی۔ ان کے چیف نے مشورہ دیا کہ نکسن کی کاروں کا جلوس ہوائی اڈے کے اندر سے نکلنے کی بجائے سڑک پر ترتیب دیا جائے۔ اس طرح سے نکسن کو ہزاروں کے احتجاجی مجمع کے درمیان سے گزر کر جانا پڑا۔ حالانکہ ہوائی اڈے کے اندر انہیں نہایت حفاظت سے کاروں میں سوار کرایا جاسکتا تھا۔ جب نکسن اپنے عملے کے ساتھ رن وے سے ہوائی اڈے کی بالکونی تک طرف بڑھا تو لوگوں نے ان پر گندگی اور غلاظت کی بارش کردی۔ نکسن شامیانے کی طرف جانا چاہتا تھا، لیکن بینڈ نے وینزویلا کا قومی ترانہ بجانا شروع کردیا، لہٰذا نکسن جہاں تھا وہیں احتراماً کھڑا ہوگیا۔ اس پر مجمع نے گندگی اچھالی اور تھوکنا شروع کردیا۔

اپنے سرغنہ کے اشارے پر مجمع بالکونی سے ہٹ کر سڑک پر جمع ہوگیا۔ جب امریکی حکام آگے بڑھے تو ان کا راستہ مسدود ہوچکا تھا۔ وینزویلا کے حکام یہ تماشہ خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ فوجی دستے کے جوانوں نے اپنی بندوقوں کا رخ آسمان کی طرف کیا ہوا تھا اور پوری طرح سے الرٹ تھے۔ البتہ پولیس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ امریکا کے سفارت خانے کے افسران اور سراغرساں عملے نے مشتعل ہجوم سے نائب صدر اور ان کی اہلیہ کو کاروں تک پہنچایا۔

اس اثنا میں دو افراد ایک بچی کو لے کر آئے جس نے مسز نکسن کو گلدستہ پیش کیا۔ اتنی توہین آمیز فضا میں یہ پہلا خیر سگالی اقدام تھا۔ مسز نکسن نے بچی کے رخساروں کو تھپتھپایا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی، اس لیے اسے جھک کر اس کے ہونٹوں کے نزدیک کان لے جانا پڑا۔ کاروں کا جلوس تیار ہوا تو مسز نکسن اور میزبان وزیر خارجہ کی اہلیہ کو دوسری کار میں جگہ ملی۔ مسز نکسن اپنی سیٹ پر بیٹھنے لگیں تو اس پر تھوک پڑا ہوا تھا، جو انہوں نے اپنے رومال سے صاف کیا۔ یہ دیکھ کر وزیر خارجہ کی بیوی کا شرم سے سر جھک گیا۔ سیکرٹ سروس کے دو ایجنٹ ان خواتین کے ساتھ کار میں سوار ہوئے۔ لڑکوں نے کار پر لاتیں مارنا شروع کردیں۔ وہ نکسن کی کار کا گھیراؤ کرنا چاہتے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اس وقت کیا کرنا چاہتے تھے۔

ہوائی اڈے سے شہر کیراکاس کا فاصلہ بارہ میل ہے۔ جب کاریں ائیرپورٹ سے روانہ ہوئیں تو مشتعل نوجوانوں کے ٹرک اور اسکوٹروں کا جلوس بھی ساتھ ہی روانہ ہوگیا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ نکسن کی کار کو ٹکر مار دیں۔ نکسن کی کار میں سیکرٹ سروس کے ایجنٹ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کار کے شیشے چڑھا دیے تھے، تاکہ ہجوم کی طرف سے پھینکی جانے والی کوئی شے اندر نہ آگرے۔

نکسن نے کار روانہ ہوتے ہی وزیر خارجہ سے گفتگو شروع کردی۔ اس نے اپنے رومال سے نکسن کا کوٹ صاف کیا اور معذرت چاہنے لگا۔ اس نے کہا کہ عوام چونکہ بہت عرصے سے آزادی سے محروم رہے ہیں، اس لیے جذباتی اور حساس ہوچکے ہیں۔ جب کہ نئی حکومت ان کی آزادی کو ٹھوکر نہیں مارنا چاہتی۔ نکسن نے جواب دیا کہ اگر

آپ کی حکومت نے ان جذباتی لوگوں پر قابو نہ پایا تب پھر کچھ باقی نہ بچے گا۔ یہ آزادی ختم ہوجائے گی۔ نکسن کا جواب خاصا ترش تھا، اس لیے وزیر خارجہ کسمسا کر رہ گیا۔

نکسن نے کہا۔ ”یہ لوگ کیمونسٹ ہیں۔ میں نے لاطینی امریکا میں ایسے پرچم دیکھے ہیں۔ یہ وینزویلا کے عوام کو اس آزادی سے محروم کردیں گے جس کے وہ بلاشبہ مستحق ہیں۔“

اس پر وزیر خارجہ نے اعتراف کیا کہ یہ لوگ واقعی کیمونسٹ ہیں۔ پھر اس نے دوستانہ انداز میں نکسن سے کہا۔ ”اگر اخباری نامہ نگار اس بارے میں آپ کے خیالات سے آگاہ ہونا چاہیں تو وہ انہیں کیمونسٹ نہ بتائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آزادی کا تصور آپ کے ہاں سے مختلف ہے۔“

نکسن حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا، اس لیے وہ اب بے سروپا گفتگو کررہا تھا، جس کا کوئی مفہوم نہیں نکل سکتا تھا۔ بہرحال اس نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ ان کی حکومت کیمونسٹوں سے بہتر تعلقات رکھنا چاہتی ہے، اس لیے انہوں نے موجودہ انقلابی حکومت کی حمایت کی تھی۔ وزیر خارجہ اس لیے پریشان تھا کہ اگر نکسن نے ان لوگوں کو کیمونسٹ قرار دیا تو حکومت پریشانی کا شکار ہوجائے گی۔

کاریں جب شہر کی حدود میں داخل ہوئیں تو ہر طرف سناٹے نے ان کا استقبال کیا۔ کہیں بھی ہار پھول پھینکنے والے نہیں تھے۔ ساری دکانیں بند تھیں۔ جوں ہی کاریں آگے بڑھیں ان پر پتھر برسنے لگے۔ مشتعل ہجوم اس جگہ پر نکسن کا منتظر تھا جہاں چھ سڑکیں آکر ملتی تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں انقلابیوں نے پولیس کے ایک دستے کو گھیر کر زدوکوب کیا تھا۔ پھر ایک پولیس والا ان کے ہتھے چڑھ گیا تو اسے زندہ جلا دیا گیا۔ وہاں نکسن کا استقبال ایسے جھنڈوں سے کیا گیا جن پر سواستیکا کا نشان بنا ہوا تھا۔ گالیاں اور فحش نعرے بھی گاہے گاہے ساعت سے ٹکرا رہے تھے۔ سب سے نرم گالی ”کتے کا بچہ“ تھی۔

حالانکہ اس چوراہے پر ایک گھنٹا پیشتر ہر قسم کی ٹریفک روک دی گئی تھی اور جلوس کے لیے راستہ بالکل صاف تھا۔ مگر وہاں پہنچ کر جلوس ٹرکوں اور اسکوٹروں کے ہجوم میں پھنس گیا۔ لڑکے چیخ چلا رہے تھے۔ وہ سب ان نو کاروں کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ چند افراد نے کاروں پر لگے وینزویلا اور امریکا کے

لنڈن بینس جانسن

(1908ء-1973ء)

امریکا کے 36 ویں صدر، ریاست ٹیکساس کے ایک قصبے سٹون وال میں پیدا ہوئے۔ سان مرکلس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہوسٹن میں دو سال معلم رہے۔ پھر جارج ٹاؤن یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ 1937ء میں ایوان نمائندگان کے رکن منتخب ہوئے اور اس کے بعد مسلسل پانچ مرتبہ اس ایوان کے رکن منتخب ہوتے رہے۔ 1949ء میں سینٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ نومبر 1963ء میں صدر کینیڈی کے قتل کے بعد صدر بنے۔ 1969ء میں سیاسی زندگی سے ریٹائر ہوگئے۔

مرسلہ: آصف محمد۔ اسکاٹ لینڈ

پرچم پھاڑ ڈالے۔ ایک لحیم شحیم شخص نے کار کا راستہ مسدود کر دیا۔ خفیہ پولیس کے جوانوں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا۔ صورت حال ناگفتہ بہ دیکھ کر پچھلی کاروں سے خفیہ پولیس کا ایک دستہ وہاں آگیا اور اس نے نکسن کی کار کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ حفاظتی پولیس کا عملہ وہاں سے غائب ہوگیا تھا۔ کچھ پولیس والے موٹر سائیکلوں پر سوار تھے اور مجمع میں راستہ بنا رہے تھے۔ بڑی دشواری سے راستہ بنا اور جلوس پھر چلنے لگا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد سڑک پھر بلاک ہوگئی۔ کاروں کا جلوس رک گیا۔

کسی نے بہ آواز بلند کہا۔ ”کمینے امریکی آگئے۔“ یہ یقیناً کوئی اشارہ تھا، اس لیے کہ یہ سنتے ہی سیکڑوں کی تعداد میں عورتیں اور بچے جنہوں نے ہاتھوں میں ڈنڈے تھامے ہوئے تھے سیل رواں کی طرح آئے اور جناب نائب صدر کی کار پر پل پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کار کو چکنا چور کر کے رکھ دیں گے۔ وینزویلا کی پولیس اتنی خوفزدہ ہوگئی کہ یہ منظر دیکھ کر رفو چکر ہوگئی۔ اب نکسن اپنے حفاظتی عملے کے رحم وکرم پر تھا۔

اس تربیت یافتہ عملے نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے مجمع مشتعل ہوجاتا۔ بس وہ کاروں کے لیے راستہ بنا رہے تھے اور لوگوں کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ وہ اس طرح کام کر رہے تھے کہ ان کے ایک ہی دھکے سے درجنوں افراد پیچھے جا کر گر جاتے تھے۔ بلوائیوں کا نکتہ مرکز نکسن کی کار کا دروازہ تھا۔ جیسے وہ اسے کھینچ کر کار سے باہر نکالیں گے اور

اس کی تکا بوٹی کرڈالیں گے۔

جب بے ہودگیاں حد سے سوا ہو گئیں تو نکسن کو اپنی اہلیہ کا خیال آیا، جو پچھلی کار میں سوار تھیں۔ مڑ کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بلوائیوں نے دوسری کاروں کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور ان کا مرکز نکسن کی ہی کار ہے۔ نکسن کو اطمینان ہوا کہ اگر وہ محفوظ نہیں ہے تو کم از کم اس کی اہلیہ ضرور محفوظ ہے یا قدرت نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں اس کی کار کو جلا نہ دیں۔ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے کہ پولیس بالکل غائب ہو چکی تھی۔ اگر کچھ جوان تھے بھی تو مجمع کے سامنے بے بس تھے۔

ایک شخص جو ڈنڈے سے مسلسل کار کے شیشے پر وار کر رہا تھا اس کا شیشہ توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ نکسن کو اس کے چہرے پر نفرت کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس نفرت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ سب کمیونسٹوں کی حرکات و سکنات تھیں۔ انہوں نے لوگوں کو اس حد تک بھڑکا دیا تھا کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بس جو کچھ دماغ میں آرہا تھا کر رہے تھے۔

جیسے ہی شیشہ ٹوٹا نکسن کی سیکرٹ سروس کے عملے نے اپنے ریوالور نکال لیے اور انہیں یوں ہلانا شروع کر دیا جیسے مجمع کو خوفزدہ کرنا چاہتے ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر حملہ ہوا تو وہ کم از کم بارہ افراد کو تو ہلاک ہی کر ڈالیں گے۔ وہ منظر آنے والا تھا کہ لاشیں گرنا شروع ہو جاتیں کہ فوجی جوانوں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور اس نے مجمع کو پیچھے دھکیل کر نکسن کی کار کے لیے راستہ بنا دیا۔

کاریں ایک بار پھر چل پڑیں۔ وہ سب نامعلوم شہدا کی قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانے کے لیے جا رہے تھے۔ نکسن نے کہا کہ وہ اس پروگرام کو ملتوی کرنا چاہتا ہے۔ اب ایسی جگہ چلنا چاہیے جو فسادیوں کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو۔ اس کے اس فیصلے سے ان سب کی جانیں محفوظ رہیں۔ اس لیے کہ لفنگوں نے باقاعدہ منظم حملے کے لیے تیاریاں کر لی تھیں۔ وہ کاروں کے جلوس پر دستی بموں سے حملہ آور ہونے والے تھے۔ ایک نزدیکی مکان میں چھوٹی چھوٹی شیشے کی بوتلیں رکھی تھیں جو ان پر پھینک کر ماری جاتیں۔ ان کے بچ جانے کے امکانات بے حد کم تھے۔

کاروں کا جلوس منتشر ہو گیا۔ اگلی دونوں کاریں ایک ساتھ رہیں۔ راستے میں ایک اسپتال پڑتا تھا۔ وہاں ان کا چیک اپ کیا گیا۔ سب کی حالت بہتر تھی۔ سوائے چند اشخاص کے انہیں خراشیں آئی تھیں۔ سڑک بالکل صاف تھی۔ چنانچہ نکسن اپنی بیوی کو لے کر وہاں سے سیدھا امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر چلا گیا، جو ایک پہاڑی پر واقع تھی۔ دفاعی لحاظ سے وہ ایک عمدہ جگہ تھی۔

جب اخباری نمائندوں کو معلوم ہوا کہ نکسن وہاں ہے تو وہ بھی تھوڑی دیر بعد پہنچنا شروع ہو گئے۔ یونی ورسٹی کے طلبہ کا ایک گروپ بھی معافی مانگنے کے لیے آیا۔ نکسن نے کہا کہ امریکا اور وینزویلا کے تعلقات پہلے سے بہتر ہو جائیں گے۔ یہ چیزیں اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

پروگرام کے تحت نکسن اور ان کی بیوی کو فوجی کلب میں ٹھہرنا تھا، جو حکمراں نے اپنے فوجی افسران کے لیے ساڑھے تین کروڑ ڈالر سے تیار کروایا تھا۔ مسز نکسن کا پروگرام تھا کہ وہ یتیم خانوں، اسپتالوں اور خواتین کی تنظیموں کا دورہ کریں گی۔ مگر نکسن نے یہ سارے پروگرام منسوخ کر دیے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ امریکی سفارت خانے سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ گویا وہ "امریکی سرزمین" میں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے وینزویلا میں قیام کے لیے ایک بالکل نیا پروگرام تشکیل دیا۔ وہ تھکا ہوا تھا، اس لیے بستر پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔ وہ اپنی بارہ سالہ سیاسی زندگی میں دوپہر کو کبھی نہیں سویا تھا۔

اس اثنا میں سیکیورٹی کے عملے نے سفیر کی رہائش گاہ کو ایک قلعے میں تبدیل کر دیا۔ اس نے دوسرے روز کیراکاس سے واپسی کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

جب واشنگٹن میں یہ خبریں پہنچیں تو وہاں سراسیمگی پھیل گئی۔ امریکی وزارت خارجہ میں یہ اطلاع پہنچی کہ شہر میں ابھی تک ہنگامہ ہو رہا ہے، امن تباہ ہو کر رہ گیا ہے اور پولیس کا حفاظتی نظام مفلوج ہو چکا ہے۔ وہ حالات پر قابو پانے میں ناکام ہو چکی ہے۔ حالانکہ کوئی امریکی شدید زخمی نہیں ہوا ہے۔ مگر صورت حال غیر واضح ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ ہونے والا ہے۔ وزارت خارجہ نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نائب صدر نے خود کو امریکی سفارت خانے میں مقید کر لیا ہے۔

اس نے مسلح افواج کے چیف افسران کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہائٹ ہاؤس میں صدر آئزن ہاور سخت پریشان تھے۔ اس سے پیشتر انہیں ایسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا کہ امریکا کی کسی ممتاز و معروف شخصیت پر قاتلانہ حملہ ہوا ہو۔ ان کے حکم کے مطابق کیراکاس کے تین

بج کر بیس منٹ پر انہوں نے وزارت دفاع کو کارروائی کا حکم دے دیا۔ شام تک مسلح امریکی فوج ایک ایسے مشن کے لیے حرکت میں آچکی تھی، جس کا تعلق ان کی عزت نفس سے تھا۔

چھ تباہ کن گائیڈڈ میزائل سے مسلح ایک کروزر اور ایک طیارہ بردار جہاز میں ہیلی کوپٹر سے اترنے والی بحری فوج سوار تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے کیراکاس روانہ ہوگئے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ وینزویلا کے ساحل سے کچھ فاصلے پر رہیں اور صدر کے حکم کے منتظر رہیں۔ فضائیہ نے بھی اپنے جیٹ بمبار فائٹر یونٹوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ ایک ہزار فوج، چھاتہ برداروں کی دو کمپنیاں اور بحری فوج کی دو کمپنیاں پورٹیکوریکو اور کیوبا کے اڈوں پر بھیج دی گئیں۔ انہیں جب بھی حکم ملتا وہ وینزویلا پر حملہ کرسکتی تھیں۔

شام کو وزارت دفاع نے ایک اعلان کیا جس میں بحری فوج اور چھاتہ برداروں کی نقل وحرکت کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ ان فوجوں کا مقصد حکومت وینزویلا کی طرف سے درخواست کی صورت میں اس کی مدد کرنا ہوگا۔ یہ ایک طرح کی احتیاطی کارروائی ہے۔ ابھی تک وینزویلا کی طرف سے اس قسم کی درخواست کی کوئی علامت نظر نہیں آئی ہے۔

بحریہ اور فضائیہ کے جنگی جہازوں کی سرگرمیاں ابھی پوشیدہ رکھی گئی تھیں۔

کمیونسٹ ہنگامہ پروروں نے اب تک شہریوں کی زندگی اجیرن کررکھی تھی۔ نکسن کو یقین تھا کہ حکومت ان کے وفد کو تحفظ دینے میں ناکام رہے گی۔ انہیں یہ بھی ادراک تھا کہ صورت حال کی خرابی کی بنا پر اگر امریکی فوج کو کارروائی کرنا پڑی تو ان کے وفد کا کوئی ساتھی زندہ نہیں بچے گا۔ یہ بات بھی واضح تھی کہ امریکا کی فوجی کارروائی کے نتیجے میں وینزویلا کے کمیونسٹوں کو پروپیگنڈا کا موقع مل جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ انقلاب برپا کر کے حکومت پر قبضہ کرلیں۔

حکومت وینزویلا کی درخواست پر نکسن اور امریکی سفیر نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا، جس میں انہوں نے امن کی صورت حال کو برقرار رکھنے سے متعلق حکومت وینزویلا کی صلاحیت پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اور ساتھ ہی واضح کیا گیا تھا کہ امریکی فوج کی کارروائی امریکی اڈوں کی نگرانی کے سوا کچھ نہیں۔ جب تک وینزویلا درخواست نہیں کرے گا، امریکی فوج وینزویلا میں نہیں اترے گی۔

نکسن نے مورچہ بند سفارت خانے میں مصروف دن گزارا۔ غیر کمیونسٹ رہنما ان سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ سب نے اس سے معافی مانگی۔ پھر صدر وینزویلا اور ان کی کابینہ کے افراد ملنے کے لیے آئے۔

نکسن کی روانگی کا پروگرام کسی کو نہیں بتایا گیا تھا۔ سہ پہر کو نکسن اور ان کے ساتھیوں کو فوجی کلب میں مدعو کیا گیا۔ نکسن نے فوجی جنتا کے ساتھ لنچ کرنا قبول کرلیا، لیکن امریکی سفارت خانے کے ایک سیاسی کارکن نے نکسن سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ حکومت کی توہین ہوگی۔ چنانچہ نکسن نے حکومت کا دعوت نامہ قبول کرلیا۔ ان کی رضامندی پر نکسن کو ایک کار میں شہر لایا گیا جسے فوجیوں سے بھری کاروں اور ٹرکوں نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ راستے میں کوئی تشویش ناک واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس لنچ میں شریک ہونے والوں کی تعداد بہت بڑی تھی۔ اسے ایک دل چسپ اجتماع بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وینزویلا کے افسران کی بیگمات کو عجلت میں میک اپ کرا کے وہاں پہنچایا گیا تھا۔

یہ بات لنچ کے دوران واضح ہوگئی کہ حکومت کاروں کا جلوس کیوں نکالنا چاہتی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ مہمانوں کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام کرسکتی ہے۔ لنچ کے بعد ایڈمرل لارزبل نے نکسن کو وسیع وعریض فوجی کلب کے معائنے کی دعوت دی۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد ایک کرنل نے اطلاع دی کہ "سب ٹھیک ہے۔" گویا یہ سگنل تھا کہ جلوس کی تیاریاں مکمل ہیں۔

نکسن وہاں سے سیدھا کاروں کے جلوس کی طرف گیا۔ جلوس بکتر بند دستے کی طرح تیار کیا گیا تھا۔ سیکڑوں فوجی جوان گاڑیوں میں بھرے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے لیے پانچ بلٹ پروف کاروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ نکسن کو صدر کے ساتھ پہلی کار میں بٹھایا گیا تھا جب کہ ان کی بیوی تھلیما دوسری کار میں تھی۔ ان کی کار میں ایک سب مشین گن اور کچھ اسلحہ رکھا تھا اور آنسو گیس شیل بھی تھے۔

حفاظتی پولیس کے سربراہ نے نکسن کو بتایا کہ شہر کی صورت حال قابو میں کی جاچکی ہے۔ مگر جوں ہی کاروں نے چلنا شروع کیا اس نے ایک ہاتھ میں ریوالور تھام لیا اور دوسرے ہاتھ میں آنسو گیس پھینکنے والی گن سنبھال لی۔ ہوائی اڈے تک وہ اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ فوج کو پورے راستے

پر پھیلا دیا گیا تھا۔ سارے اہم ناکوں پر ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں مستعدی سے کھڑی تھیں۔ جہاں کہیں بھی ہجوم نے منتشر ہونے سے انکار کیا تھا ان پر آنسو گیس پھینکی گئی تھی۔

ہوائی اڈے کی عمارت سنسان تھی۔ سلامی دینے دستے اور بینڈ اور ایک توپ خانے کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ پھر اسے 19 توپوں کی سلامی دی گئی۔ بینڈ نے دونوں ملکوں کا ترانہ بجایا۔ پھر گولے پھینکے گئے۔ وینز ویلا کی حدود سے نکلنے کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا۔

اگلی صبح واشنگٹن میں ان کا والہانہ استقبال ہوا۔ اس سے پیشتر کسی نائب صدر کا ایسا استقبال نہیں ہوا تھا۔ صدر آئزن ہاور اپنے وزیروں اور مشیروں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر لنڈن بی جانسن کا ایک گروپ بھی وہاں موجود تھا۔ ہزاروں طلبہ نے جن میں لاطینی امریکا کے جوان بھی شامل تھے، نکسن کی حمایت میں نعرے لگائے۔

جناب صدر نے اپنی تقریر میں کہا۔

"نائب صدر نے اپنے دورے میں بڑے تدبر اور وقار سے اپنی اعلا صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہیں اپنے دورے میں سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ان کی جانیں بھی خطرے سے دوچار تھیں۔ بہرحال اس کے باوجود جنوبی ریاستوں سے ہمارے تعلقات پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔"

☆☆☆

جولائی 1959ء میں امریکا نے سویت روس میں ایک نمائش منعقد کی۔ اس نے نکسن کو وہاں بھیجا کہ وہ امریکا کی نمائندگی کرے تاکہ دونوں ملکوں کے مابین سرد مہری کم ہونے میں آسانی پیدا ہو۔ نمائش کا افتتاح روس کے دارالحکومت ماسکو میں ہونا تھا۔ نکسن وہاں پہنچ گیا۔ نکیتا خروشچیف نے مذاکرات کیے جس میں اس نے گرما گرمی کا مظاہرہ کیا اور امریکی پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی۔ مگر نکسن نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھا اور ان پالیسیوں کی وضاحت کی۔ پریس کو اس کا رویہ پسند آیا۔ گویا اخلاقی طور پر اس نے اپنے حریف پر فتح پالی تھی۔ پھر دونوں نمائش کے لیے نکلے۔ گھومتے ہوئے وہ دونوں ایسی جگہ کھڑے ہو گئے جہاں امریکی طرزِ زندگی ظاہر کرنے کے لیے ایک کچن بنا ہوا تھا، جو ایک ماڈل تھا۔ خروشچیف نے امریکی طرز زندگی پر تنقید کرنا شروع کر دی۔ نکسن نے اس کا بھی نہایت بردباری اور سکون سے جواب دیا اور بتایا کہ امریکی افراد کی اوسط آمدنی زیادہ ہے اس لیے معیار زندگی بھی بلند ہے۔ وہ فوجی لحاظ سے دوسروں سے برتر ہے اس لیے جہاں کہیں بھی ابتری اور انتشار دکھائی دیتا ہے وہ کمزور کی مدد کرتا ہے۔

بعد میں یہ کم مدتی مذاکرات "کچن ڈیبیٹ" کے طور پر مشہور ہوئے اور سیاست کی تاریخ میں نکسن کو ایک حلیم اور مدبر رہنما کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ اس وقت دانشوروں نے اسے خراج تحسین پیش کیا جب اس نے روس سے اسلحے کی تخفیف کے ایک معاہدے پر دستخط کرائے۔

نکسن نے بعد میں اپنی کتاب میں نکیتا خروشچیف کے بارے میں لکھا: "خروشچیف گنوار اور سخت مزاج ہے۔ اس کی گرامر درست نہیں ہے اور وہ شراب کا رسیا ہے۔ اسی بنا پر مغرب کے بہت سے صحافی اس کی کوئی عزت نہیں کرتے۔ مگر اس کے سخت رویے سے قطع نظر وہ گہری سوچ رکھتا ہے اور پاور پالیٹکس پر اس کی گہری نظر ہے۔ وہ مغرب کی اس پیشکش کو نظر انداز کر رہا ہے کہ اسلحے کے پھیلاؤ کو روکا جائے۔ وہ اتحادی ممالک میں اسلحے کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ جب کہ زیادہ تر کا خیال ہے کہ وہ انہیں استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا کیونکہ جوہری جنگ اسے بھی پسند نہیں ہے۔"

☆☆☆

1960ء کے صدارتی انتخابات کے لیے رچرڈ نکسن ریپبلکن کا... ایک مضبوط امیدوار تھا۔ اس کا حریف ڈیموکریٹک پارٹی کا جان۔ ایف کینیڈی تھا۔ ریپبلکن کونشن کے بعد پہلی رائے شماری ہوئی تو نکسن نے اپنے حریف کینیڈی کو 49 کے مقابلے میں 51 ووٹوں سے شکست دے دی۔ وہ جیت تو بہرحال گیا تھا، لیکن بے حد معمولی فرق سے۔

اس کے بعد اس نے اپنی انتخابی مہم شروع کی اور ریاستوں کا دورہ کر کے عوام کو اپنا ہموا بنانا شروع کر دیا۔ ریاست نارتھ کیرولینا میں اس کے گھٹنے میں چوٹ لگنے کی وجہ سے وہ وقت پر اپنا دورہ مکمل نہ کر سکا۔ اسے گیارہ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔

جب وہ صحت یاب ہو گیا تو اس نے طوفانی دورہ کیا اور ہر ریاست میں رائے دہندگان سے خطاب کیا۔ سیاسی تبصرہ نگار اس کے عزم و حوصلے کے معترف تھے۔ تاہم جب وہ ٹیلی وژن پر آتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ نکسن کچھ تھکا ہوا نظر آرہا ہے۔ کچھ نے تجزیہ کر کے کہا کہ اس نے ریاستوں کے

طوفانی دورے کیے۔ اس کے جواب میں پرنسٹن یونی ورسٹی کے ایک پروفیسر نے حساب کتاب کر کے بتایا کہ نکسن اور کینیڈی نے 24 غیر اہم ریاستوں میں اپنی انتخابی مہم کے مجموعی وقت کا برابر حصہ صرف کیا تھا۔ آخری تین ہفتوں میں ان دونوں نے ریاستوں میں برابر کا وقت گزارا تھا۔

نکسن کی ہر تقریر میں یہ فقرہ ضرور شامل ہوتا تھا۔ ''پارٹی کو نہیں بلکہ فرد کو ووٹ دیجیے۔'' اسے انتخاب جیتنے کے لیے پچاس سے ساٹھ لاکھ ووٹ حاصل کرنا تھے۔ اس نے پورٹ لینڈ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میں اپنی تقریر کی ابتدا میں یہ درخواست نہیں کروں گا کہ میں ریپبلکن ہوں اس لیے مجھے ووٹ ملنا چاہییں۔ آپ بھی ریپبلکن ہیں اس لیے مجھے ووٹ دیجیے۔ میرا ایمان ہے جہاں تک صدارتی انتخاب کا تعلق ہے ہماری تاریخ بتاتی ہے کہ امریکی عوام صرف پارٹی لیبل کو نہیں دیکھتے بلکہ پارٹی کے پیچھے کھڑی شخصیت کو دیکھتے ہیں۔ وہ صدارتی امیدوار کے نظریات کو پرکھتے ہیں اور یہ جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ امریکا کو اس وقت کس قسم کی قیادت کی ضرورت ہے۔''

مخالف امیدوار کینیڈی کچھ اس قسم کی تقریر کرتا:

''صدارت کے لیے ڈیموکریٹک پارٹی کے کسی بھی امیدوار نے آج تک یہ نہیں کہا کہ پارٹیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، کیونکہ ہم اپنے کارناموں اور خدمات پر فخر کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں پارٹی کے نام سے پہچانا جائے۔ ہم اس کی رہنمائی میں کام کرنا چاہتے ہیں۔''

نکسن اپنی تقریروں میں تجربے پر زور دیتا تھا۔ گویا وہ کہنا چاہتا ہو کہ اپنے امیدوار کی نسبت وہ زیادہ تجربے کار ہے اور اسے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ سیاست کیا چیز ہوتی ہے۔

کینیڈی نے جوابی حملے کے طور پر کہا:

ریپبلکن کے امیدوار کہتے ہیں کہ خارجہ امور میں تجربہ اس انتخابی مہم میں بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے، مگر اصل میں صدارتی امیدوار ہی نہیں بلکہ پوری قوم ہی اس تجربے سے گزر رہی ہے ہمیں اپنے دشمنوں کی طرف سے اتنے درشت اور جارحانہ رویے کا کبھی تجربہ نہیں ہوا۔ ہمیں اپنے بین الاقوامی وقار میں اتنی کمی، دوستوں کے غیر جانبدار ہو جانے اور غیر جانبدار قوتوں کے دشمنی پر اتر آنے کا کبھی ایسا تلخ تجربہ کبھی نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔

ستمبر میں انتخابی موازنے سے معلوم ہوا کہ نکسن اور کینیڈی کے ووٹ برابر ہیں۔ دونوں نے 49 ووٹ حاصل کیے تھے۔ گویا کینیڈی نے چند ماہ پہلے جو فرق تھا وہ ختم کر دیا تھا۔ چند ہفتوں پر ان کا پہلا ٹیلی وژن مباحثہ پیش کیا گیا۔ یہ مباحثہ چار گھنٹے تک جاری رہا۔ ایک مباحثہ داخلی امور اور دوسرا خارجہ پالیسی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ لوگوں نے پہلے مباحثے کو زیادہ دیکھا۔ گویا نکسن نے اپنے حریف کو یہ موقع دے دیا کہ وہ کروڑوں امریکیوں کو متاثر کر سکے۔ بہر حال ٹیلی وژن کے متن کے بغور جائزے کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں امیدواروں میں سے کسی نے بھی دوسرے پر برتری حاصل نہیں کی۔ بہر حال دونوں امیدواروں کے خطاب میں فرق تھا جو واضح طور پر محسوس کر لیا گیا۔ نکسن، کینیڈی سے اس طرح گفتگو کر رہے تھا جیسے ججوں کا کوئی بورڈ بیٹھا سامنے بیٹھا نمبر دے رہا ہو۔ وہ کینیڈی کی غلطیاں گنوا رہے تھا اور براہ راست اس سے مخاطب تھا۔ جب کہ کینیڈی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پوری قوم سے مخاطب ہو۔ اس کے علاوہ کینیڈی بالکل تازہ دم، صحت مند اور خوبرو دکھائی دے رہا تھا مگر نکسن لکڑی کا مجسمہ جسے پبلک تک آنے کے لیے کئی بار پالش کرنا پڑی ہو۔

نکسن کی باری آنے پر ٹیلی وژن کی لائٹوں کا رخ تبدیل ہو گیا تو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس نے کئی دنوں سے شیو نہ کیا ہو۔ ممکن ہے اس کی داڑھی تیزی سے بڑھتی ہو۔ انتخابی مہم کے دوران اس کا وزن کچھ کم ہو گیا تھا۔ اگلے مباحثوں میں اس کی صورت کچھ غنیمت لگی اس لیے کہ اس نے دل کھول کر میک اپ کرایا تھا۔

کینیڈی اب ہیرو لگنے لگا تھا۔ اس نے خود کو بہت اچھی طرح سے پیش کیا تھا اور نکسن کی ہر بات کا منہ توڑ جواب دیا تھا۔ اس کی ہر دلیل کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ بہر حال نکسن کو ابھی کینیڈی پر فوقیت حاصل تھی۔ ریپبلکن کے جلسوں میں لوگ جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ کینیڈی نے ابھی زور نہیں پکڑا تھا۔

کیڈلک اسکوائر میں مزدوروں کا سالانہ جلسہ ہوا، جس میں کینیڈی نے شرکت کی۔ مگر مزدور لیڈر والٹر یوتھر کی کوششوں کے باوجود مزدوروں کی بڑی تعداد جمع نہ ہو سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈیموکریٹک امیدواروں کو اپنے لیڈر سے کوئی خاص دل چسپی نہ ہو۔

ٹیلی وژن پر پہلا انٹرویو ہوا جس کے بعد صورت حال تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ کینیڈی کیمپ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب کہ نکسن کے کیمپ میں گھبراہٹ کے آثار تھے۔ اس لیے کہ سب نے متفقہ طور پر یہ کہہ دیا تھا کہ کینیڈی ایک خوبرو نوجوان ہے۔ اسے جلسوں میں دیکھنے والوں کا ہجوم بڑھنا شروع ہوگیا۔ نکسن کچھ بیمار سا نظر آرہا تھا۔ اس کے سیکریٹری کو بیان جاری کرنا پڑا کہ وہ صحت مند اور خوش و خرم ہے۔

چوتھے مباحثے کے بعد نکسن کے مشیر روبنسن نے رپورٹ پیش کی کہ نکسن نے چوتھے مباحثے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مباحثے سے پیشتر لوگ کینیڈی سے واقف نہیں تھے۔ اس کی ذہنی پختگی پر بھی لوگوں کو شبہ تھا لیکن ٹیلی وژن انٹرویو میں اس نے اپنی پختگی ظاہر کردی۔

اسی دوران جارجیا میں ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر ایک نوجوان گرفتار ہوگیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ انتخابی مہم پر اثر انداز ہوجاتی مگر ... وہ حیرت انگیز طور پر اس مہم پر اثر انداز ہوئی۔ معمولی سی غلطی پر جیل جانے والا نوجوان مشہور سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر تھا۔ کینیڈی نے شہری حقوق کے اس علمبردار کی اہلیہ سے مل کر ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی نے اس کی رہائی کے لیے دوڑ دھوپ شروع کردی۔

کینیڈی کے حامیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر نیگرو علاقوں میں خوب پروپیگنڈا کیا۔ کنگ کے باپ نے جو اٹلانٹا کا پادری تھا، کینیڈی کی حمایت کا اعلان کردیا اور سیاہ فاموں سے اپیل کی کہ وہ ریپبلکن پارٹی کو ووٹ دیں۔ اس واقعہ سے بہت سی ریاستوں میں سیاست کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ خاص طور پر شمالی کیرولینا میں سارے نیگرو ووٹ دہندگان نے کینیڈی کو ووٹ ڈال دیے۔ چنانچہ کینیڈی کو نکسن کے مقابلے میں کوئی ساڑھے نو ہزار ووٹوں کی سبقت حاصل ہوگئی۔ بہرحال صدارتی انتخاب سے ایک ہفتہ پیشتر آئزن ہاور کے اس اعلان سے انتخابی مہم میں جان پڑگئی کہ وہ نکسن کی حمایت کرتے ہیں۔ انتخاب سے صرف ایک روز پہلے انہوں نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی آپ کی طرح سے کل اپنا حق رائے دہی استعمال کروں گا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں رچرڈ ایم نکسن کو ووٹ دوں گا۔ اُمید ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں گے۔

دوسرے دن چھ کروڑ اٹھاسی لاکھ ووٹروں نے انتخاب میں حصہ لیا۔ امریکا میں اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے کبھی ووٹ نہیں ڈالے تھے۔ رچرڈ نکسن کو انچاس اعشاریہ پچپن اور جان ایف کینیڈی کو انچاس اعشاریہ اکہتر فی صد ووٹ ملے۔ نکسن صدارتی انتخاب میں بہت کم ووٹوں سے انتخاب ہار گئے۔ کل ووٹ جو دہندگان نے ڈالے تھے وہ چھ کروڑ اسی لاکھ تھے۔ جب کہ نکسن کو صرف ایک لاکھ ووٹ کم ملے تھے!

☆☆☆

انتخاب کے بعد نکسن عام افراد کی سطح پر آگیا۔ اب اس کے پاس نہ کوئی عہدہ تھا اور نہ کوئی ذمے داری۔ اس کے چاروں طرف پھرنے والے گارڈز بھی غائب ہوچکے تھے۔ صدارتی تقریب میں شرکت کے بعد نکسن اپنی اہلیہ کے ساتھ تعطیلات منانے بہاماز چلا گیا۔ وہ کافی عرصے سے تفریح پر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ دو ہفتے بعد نکسن کو واپس آنا پڑا اس لیے کہ وہ کوئی کام نہ ہونے کی بنا پر پڑے پڑے اکتاہٹ کا شکار ہوگیا تھا۔

نکسن بے روزگار ہوچکا تھا، اس لیے اس کے پیشِ نظر یہ تھا کہ روزی روٹی کس طرح کمائی جائے۔ اس کے لیے روزگار کی کمی نہیں تھی۔ سیکڑوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں، تجارتی اداروں اور فلاح و بہبود کی تنظیموں نے اسے پیشگی پیشکش کر رکھی تھی کہ وہ ان کی سربراہی قبول کرلے۔ ایک ادارے نے تو اسے پانچ لاکھ ڈالر کی طلائی ضمانت کا لالچ بھی دیا تھا۔ سیاست اس کے خون میں شامل ہوچکی تھی، نکسن نے سوچا کہ اگر اب بھی وہ اس سے منسلک رہنا چاہتا ہے تو اسے کسی وکالت کی کمپنی سے منسلک ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ لاس اینجلس کی فرم "ڈیوک اینڈ ہیزلٹن" میں شامل ہوگیا۔ فرم میں نکسن کی حیثیت حصے دار کی سی نہیں تھی، بلکہ وہ مشیر تھا۔

اب وہ اپنے خاندان سے بھی قریب رہ سکتا تھا۔ اس کے دوست جانتے تھے کہ اس کے اہلِ خانہ کو بھی اس کے ہارنے کا صدمہ تھا۔ بچے خاص طور پر کامپلیکس میں مبتلا ہوگئے تھے۔

کینیڈی حکومت کے ابتدائی سو دنوں میں نکسن نے خاموشی اختیار کر رکھی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ یہ وقفہ ختم ہوتے ہی اس نے چھ ریاستوں کا دورہ کیا اور کینیڈی خروشچیف ملاقات پر زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کینیڈی نے کیوبا سے ٹریکٹروں کا معاہدہ کرکے غلطی کی ہے۔ ہمیں اس

تھرڈ کلاس آمر کے سامنے اتنا نہیں جھکنا چاہیے۔ وہ کسی وقت پر اپنے سیاسی قیدیوں کے بدلے تاوان کا مطالبہ کر کے امریکا کو ہلا ڈالے گا۔

شکاگو میں اس نے کہا کہ میں ایک عام شہری کی حیثیت سے تقریریں کر رہا ہوں۔ اس ملک نے مجھ پر بہت بڑی رقم خرچ کی ہے۔ میرے تجربے پر جو حکومت کا سرمایہ خرچ ہوا ہے مجھے اس کے بدلے اس کی خدمت کرنا چاہیے۔ گویا وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ پارٹی میں کوئی بامعنی عہدہ سنبھالے بغیر بھی ملک کی خدمت کی جا سکتی ہے۔

نکسن کے ان دوروں میں بھی لوگوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ بہرحال فرق اتنا تھا کہ وہ اب فضائیہ کے خصوصی طیاروں میں سفر کرنے کی بجائے کمرشل فلائٹ سے سفر کرتا تھا۔ استقبالیہ ہجوم میں کوئی اس کے لیے راستہ نہیں بناتا تھا، کوئی آٹوگراف کے لیے آگے نہیں بڑھتا تھا اور سیکرٹ ایجنٹس اس کے گرد گھیرا نہیں ڈالے رہتے تھے۔ نکسن کو اپنی حفاظت خود ہی کرنا پڑتی تھی۔

نکسن اپنے حریف پر صرف یک پہلوئی حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ رائے عامہ کو اپنی علمی حیثیت سے بھی متاثر کرنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے ایک اخبار میں کالم لکھنے کا معاہدہ بھی کر لیا۔ ان کالموں میں اس کے سیاسی نظریات ہی نہیں تھے، بلکہ سیاست میں رہتے ہوئے اس کے ساتھ جو دل چسپ باتیں پیش آئی تھیں ان کی یادداشتیں بھی تھیں اور کینیڈی کی پالیسیوں پر تبصرے بھی تھے۔ اسے جو پالیسی غلط لگتی تھی وہ اس پر کینیڈی کو ٹوکتا بھی تھا۔ مجموعی طور پر اس کے کالم بین الاقوامی امور پر ہوتے تھے۔

1961ء میں مشہور ناول نگار اڈیلا راجرز سینٹ جان نے اسے ایک کتاب لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ وہ نکسن کی مداح تھی اور نکسن کو اس وقت سے جانتی تھی جب وہ اپنے باپ کی دکان پر آلو، پیاز اور ٹماٹر فروخت کرتا تھا۔ یہ کتاب سوانح حیات نہیں تھی۔ بلکہ ان چھ بحرانوں پر ایک جامع کتاب تھی جن میں نکسن کسی طور شامل رہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح سے تھے:

1952ء کے انتخابات کے دوران فنڈ اسکینڈل، آئزن ہاور کی علالت، لاطینی امریکا میں مشتعل ہجوم کے حملے، ماسکو میں خروشیف کے ساتھ کچن ڈبیٹ اور موجودہ انتخاب میں اس کی شکست۔ اس نے اپنی کتاب کا نام ہی ''چھ بحرانات'' رکھا تھا۔ جب یہ کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو گرم کیک کی طرح سے فروخت ہو گئی۔ لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے مشورہ کرنے کے بعد نکسن نے اعلان کیا کہ میں 1963ء میں کیلیفورنیا کے گورنر کا انتخاب لڑوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ کسی لالچ کی بنا پر یہ عہدہ حاصل نہیں کرنا چاہتا، اس لیے کہ اس کی آمدنی نائب صدر سے بھی زیادہ ہے۔ مگر میں عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ''میری کوشش یہ ہوگی کہ آئندہ چار برس میں جرائم کے خاتمے، وسائل کو ضائع نہ ہونے دینے، کم سے کم ٹیکس اور ملازمت کی سہولت کے معاملے میں کیلیفورنیا کو بہترین ریاست بنا دیا جائے۔

موجودہ گورنر پر سیاسی حملے اس نے اس طرح سے کیے کہ جرائم کی شرح کیلیفورنیا میں پہلے سے بڑھ چکی ہے، ٹیکسوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ چار برس میں ایک ارب ڈالر کا اضافہ ہوا ہے، بے روزگاروں کی تعداد میں 44.08 فی صد اضافہ ہوا ہے۔

اس نے یک طرفہ ٹریفک، فلم سازی کی ترقی، ترقیاتی امور میں 27 لاکھ سالانہ کی بچت، اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تربیت کے لیے فوجیوں کی خدمات، زراعت، نشہ آور ادویہ اور ٹریفک کے حادثات کی روک تھام تک ہر منصوبے پر اسکیمیں پیش کر دیں۔

اس نے کہا کہ کیلیفورنیا بحرالکاہل کے کنارے باقی دنیا سے کٹی ہوئی ریاست نہیں ہے۔ واشنگٹن، پیرس، لندن اور ماسکو میں ہونے والے فیصلوں کا کیلیفورنیا کے عوام پر بھی اثر پڑتا ہے۔ کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ۔ میرا خیال ہے کہ کیلیفورنیا کے عوام کے لیے ایسا گورنر ہونا چاہیے کہ جو جانتا ہو کہ ہماری سرحدوں کے آگے باقی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

اسی زمانے میں روس نے کیوبا کے ساحلوں پر میزائل لگا دیے۔ کینیڈی نے اس معاملے کو خوب اچھالا اور اسے ملکی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیا۔ لوگوں نے اس کی حمایت کی اور جب انتخابات ہوئے تو نکسن گورنر کی حیثیت سے انتخاب ہار گیا۔ بہرحال اس نے ہمت نہیں ہاری۔

☆☆☆

انتخابات اور سیاست سے نکسن کی طبیعت اب اکتا چکی تھی۔ اس نے پہلی پریس کانفرنس میں کہا کہ میں نیویارک اس لیے آیا ہوں کہ یہ شہر وکیلوں کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر میں اسے امریکا ہی نہیں بلکہ ساری

دنیا میں سب سے زیادہ پیشہ ورانہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ چھ ماہ بعد اس نے ایک فرم میں ملازمت کرلی۔

لک میگزین کے فیچر رائٹر نے نکسن کے انکم ٹیکس گوشواروں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ 1964ء سے لے کر 1969ء تک اس کی اوسط آمدنی دو لاکھ ڈالر تھی جس میں سے چوتھائی اسے اپنی فرم سے اور باقی رائلٹی، سرمایہ کاری، جائیداد کی فروخت، تقریروں اور تحریری مضامین سے حاصل ہوئی تھی۔ وہ وفاقی حکومت کو ساٹھ ہزار ڈالر سالانہ ٹیکس ادا کرتا تھا اور مختلف اداروں کو بارہ ہزار ڈالر امداد دیتا تھا۔ نکسن کی آمدنی اب کیلیفورنیا کے مقابلے میں بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

نکسن کو اپنی فرم کے کسی کام سے ڈیلاس جانا پڑا تو پریس کانفرنس میں اخباری نمائندوں نے پوچھا کہ کیا وہ صدر کینیڈی کے خلاف مظاہرہ کریں گے؟ نکسن نے کہا کہ صرف اختلاف کی وجہ سے میں صدر امریکا کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔

جب وہ نیویارک گیا تو اس نے ایک راہ گیر کو کہتے سنا کہ جناب صدر جان ایف کینیڈی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر سن کر نکسن کو از حد صدمہ ہوگیا۔ چند گھنٹوں بعد اس نے ایک اخبار نویس سے کہا۔ ”یہ ایک عظیم سانحہ ہے۔ بڑھاپے کی موت کی اور بات ہوتی ہے لیکن ایک نوجوان کی موت جس کی زندگی ایسی مثالی اور پُرجوش ہو سب کو دل گیر و دل گرفتہ کر دیتی ہے۔ میرے اور ان کے تعلقات اتنے ہی اچھے تھے جتنے کسی ریپبلکن اور ڈیموکریٹک کے ہو سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ انہیں صدر کہتے تھے، کچھ لوگوں کے دوست اور باقی سب کے لیے صرف ایک نوجوان لیکن میرے لیے وہ سب کچھ تھے۔ امریکا کی تاریخ کی ایک عظیم شخصیت ایک المناک حادثے سے دوچار ہو چکی ہے۔“

اخباری کالم نگار آئندہ چار مہینے تک نکسن کو ایک مضبوط صدارتی امیدوار قرار دے چکے تھے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی شخصیت میں کوئی بڑی دلکشی پیدا ہوگئی تھی، بلکہ راک فیلر کی نجی زندگی کی وجہ سے اسے نوجوان پسند نہیں کرتے تھے۔ جب کہ دوسری بڑی شخصیت گولڈ واٹر کی تھی جس کے نظریات اعتدال پسندوں کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ اب لے دے کے نکسن رہ گیا تھا۔ وہی سب سے اہم تھا۔ اس کی صدر کی حیثیت سے نامزدگی کے امکان نے ہی اس کے بیانات کو صفحۂ آخر سے صفحۂ اوّل تک پہنچا دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اسے پارٹی کے دونوں بازوؤں کی پوری حمایت حاصل تھی۔

کینیڈی کے قتل کے بعد نائب صدر لنڈن بی جانسن صدارت کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ اس کی پالیسیوں پر نکسن نکتہ چینی کرتا رہا۔ جب وہ ویت نام کے سوال پر حلیف قوتوں سے مذاکرات کے لیے منیلا جا رہا تھا تو نکسن نے اعلان کیا کہ میں جانسن کی واپسی تک جنگ ویت نام پر کوئی اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ پھر جانسن کی واپسی پر اس نے ایک تفصیلی بیان جاری کیا اور سوال اٹھایا تھا کہ چھیالیس ہزار افواج کے تازہ ترین اضافے کے بعد ہمیں مزید کتنی فوج ویت نام بھیجنا پڑے گی؟ کیا ہمیں ویت نام کے سلسلے میں بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فوجی بھرتی کا کوٹہ بڑھانا پڑے؟

ایسے دانشور جو اس جنگ کو فضولیات سے تعبیر کرتے تھے وہ اس معاملے میں نکسن کے ساتھ ہوگئے۔ اس کے علاوہ یونی ورسٹی کے طلبہ نے بھی تحریک چلانا شروع کر دی کہ امریکا ویت نام سے اپنی فوج واپس بلا لے۔ اس طرح سے نکسن راتوں رات ریپبلکن کا سب سے بڑا لیڈر بن گیا۔

چھ ماہ تک نکسن نے غیر ملکی دورے کیے اور بڑے بڑے سیاست دانوں سے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد جب وہ امریکا لوٹ کر آیا تو اس کی مقبولیت دیکھ کر ریپبلکن کے دو امیدوار جن میں جارج رامنے اور راک فیلر شامل تھے، انتخاب نہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ یوں نکسن تن تنہا میدان میں رہ گیا۔

اسے ہر ریاست میں اتنے ووٹ ملے جتنے کہ نائب صدارت کے لیے کھڑے ہونے پر نہیں ملے تھے۔ اس نے ستر فی صد ووٹ حاصل کیے تھے۔ یوں وہ دو بار نائب صدر بننے کے بعد 20 جنوری 1969ء کو امریکا کا 37 واں صدر بن گیا اور اس نے اپنی زندگی میں بڑے فیصلے کیے۔ جن میں جنوبی ویت نام سے امریکی افواج کو واپس بلانا شامل ہے۔

ویت نام کی جنگ کیسے اور کس کے درمیان لڑی گئی؟

امریکا اور اس کے اتحادی کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ایک ریاست یا علاقہ کمیونسٹوں کے دائرے میں آ گیا تو رفتہ رفتہ سب علاقے ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور وہ کمیونسٹوں کے تسلط میں چلے جائیں گے۔ جان ایف

کینیڈی جب سینیٹر تھا اس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا۔ ”برما، تھائی لینڈ، انڈیا، جاپان، فلپائین، لاؤس اور کمبوڈیا ایسے ممالک ہیں کہ اگر سرخ کمیونسٹ ویت نام پر قابض ہوگئے تو یہ خود بخود کمیونسٹوں کے زیرِ تسلط چلے جائیں گے، لہٰذا ہمیں جنوبی ویت نام کی مدد کرنا چاہیے۔“ چنانچہ امریکا جنوبی ویت نام کا ساتھ دے رہا تھا اور روس چین دوسرے کمیونسٹ ممالک شمالی ویت نام کے ساتھ تھے۔ اس جنگ میں افرادی قوت چین کی تھی جب کہ روس اسلحہ سپلائی کررہا تھا۔

فرانس اس لڑائی میں فرنٹ لائن پر تھا جب کہ اس کی پشت پناہی امریکا کررہا تھا۔ کینیڈی کے دورِ حکومت میں ویت نام میں سولہ ہزار امریکی جنگ میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ ویت کانگ بھی کیمونسٹوں کے خلاف گوریلا جنگ کررہے تھے۔

امریکا کو اس جنگ میں فضائی برتری حاصل تھی۔ اس لیے کہ وہ جنگ میں ایسے طیارے استعمال کررہے تھا جو دشمن کے اہم ٹھکانوں پر بھاری بمباری کرتے تھے۔ امریکا کا موقف تھا ”تلاش کرو اور نیست و نابود کردو۔“ اس جنگ میں امریکا کی بری فوج اور آرٹلری بھی شامل تھی۔ امریکا نے 1965ء میں دوبدو جنگ کا آغاز کیا۔ اس نے بین الاقوامی سرحدوں کی بھی پروا نہیں کی اور لاؤس اور کمبوڈیا کی سرحدوں پر بھی بمباری کرڈالی۔

جنوری 1973ء میں پیرس میں امن معاہدہ ہوا جس کی رو سے سارے ممالک کو اپنی افواج جنوبی ویت نام سے واپس بلالینا تھیں اور انہیں اتنا مضبوط بنادینا تھا کہ وہ خود کیمونسٹوں سے جنگ کرسکیں۔ اس معاہدے میں امریکا، روس، چین، شمالی ویت نام اور جنوبی ویت نام کے نمائندے شامل تھے۔

ویت نام میں جنگ جاری تھی۔ کینیڈی کے قتل کے بعد نائب صدر لنڈن بی جانسن نے اقتدار سنبھالا تو اس نے کہا۔ ”کمیونزم کے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔“

جب نکسن نے صدارت کی کرسی سنبھالی تو اس وقت تقریباً 300 امریکی ہر ہفتے ویت نام میں لقمۂ اجل بن رہے تھے اس نے اعلان کیا ہے۔ ”اب میں ڈیڑھ لاکھ امریکیوں کو واپس بلا رہا ہوں۔ یہ واپسی ایک برس کے دوران مکمل ہوجائے گی۔ اسے ملا کر ہمارے 265500 فوجی واپس امریکا پہنچ جائیں گے۔ یہ واپسی عملی طور پر اس وقت شروع ہوگئی تھی جب میں ڈیڑھ برس پہلے صدارت کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔“ اس نے اندازہ لگالیا تھا کہ امریکا یہ جنگ نہیں جیت سکتا۔ چنانچہ حفاظت سے اپنے فوجیوں کو واپس بلالینا بہتر ہوگا۔

1970ء میں امریکا نے اپنی افواج کو ویت نام کی سرحد سے ہٹا کر اندرونی اور ساحلی علاقوں میں تعین کردیا۔ مگر جنوبی ویت نام سے نکلتے وقت شمالی ویت نام پر امریکا نے تقریباً ایک لاکھ بم گرائے۔ ان بموں کی تباہ کاری ہیروشیما پر ایٹم بم گرانے سے پانچ گنا زیادہ ہوئی تھی۔

مجموعی طور پر 1970ء میں امریکی فوجیوں کے ہلاک ہونے کی تعداد 1969ء میں ہلاک ہونے والوں سے نصف رہ گئی۔ جنوبی ویت نام سے مذاکرات کرنے اور انہیں سمجھانے بجھانے میں نکسن کا وزیر خارجہ ہنری کیسنگر پیش پیش تھا۔ اس کی امن پسندانہ کوششوں کی بنا پر اسے اگلے برس نوبیل امن انعام سے نوازا گیا۔

امریکا عملی طور پر 15 اگست 1973ء کو اس جنگ سے دستبردار ہوگیا۔ نکسن کو واٹر گیٹ اسکینڈل کی بنا پر اپنے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ انتخاب میں جیرالڈ فورڈ صدر منتخب ہوا۔ اس کے عہد میں کانگریس نے جنوبی ویت نام کو دی جانے والی امداد جو ایک کھرب ڈالر تھی، گھٹا کر سات کروڑ ڈالر کردی۔ اپریل 1975ء میں جب شمالی ویت نام نے سائگان پر قبضہ کرلیا تو جنگ کا خاتمہ ہوگیا اور ویت نام کے دونوں حصے متحد ہوگئے۔ اس جنگ میں ویت نام کے فوجی اور شہری ملا کر تیس لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ بیس لاکھ کمبوڈین جب کہ امریکا کے اٹھاون ہزار دو سو بیس فوجی ہلاک ہونے کا ریکارڈ ہے۔

اس بے معنی جنگ کو ختم کرانے اور جنوبی ویت نام سے امریکی فوج کو واپس بلانے کا سہرا بہرحال رچرڈ نکسن کے سر باندھا جانا چاہیے۔ ویت نام کی جنگ ختم ہونے پر امریکا میں بہت بڑی دیوار بنائی گئی جس پر ان تمام فوجیوں کے نام لکھے گئے جنہوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے مثبت کارناموں میں اسرائیل، مصر اور شام کے درمیان تنازعات کو ختم کرانا بھی شامل ہے، جس کے لیے سیکرٹری آف اسٹیٹ ہنری کیسنگر نے ان تینوں ملکوں کے متعدد دورے کیے۔

1973ء میں رچرڈ نکسن نے پریذیڈنٹ ایکسپورٹ کونسل قائم کی جس کا مقصد تھا کہ ملکی درآمدات کو بڑھایا

جائے۔ صدر جمی کارٹر نے 1979ء میں اس کو باقاعدہ قانونی شکل دی اور اس کونسل کا دائرہ کار بڑھا دیا۔ اس وقت یہ کونسل پوری تندہی سے کام کر رہی ہے اور صدر اوباما نے ہدف بنایا ہوا ہے کہ 2014ء میں برآمدات کو پہلے کے مقابلے میں دگنا کردیا جائے۔

اس کے اقتدار میں آنے سے پہلے امریکا نے خلائی پروگرام کے تحت اپالو سیارے چاند پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا لیکن نکسن حکومت نے برسراقتدار آنے کے بعد اس پروگرام کو محدود کر دیا۔ اس کے دور حکومت میں اپالو 11 چاند پر اترا اور اس نے وہائٹ ہاؤس سے براہ راست نیل آرمسٹرانگ اور بز آلڈرن سے ٹیلے فون پر گفتگو کی۔ یہ وہائٹ ہاؤس کی تاریخ میں ایک یادگار گفتگو تھی۔

ناسا نے اس کے بعد چاند اور مریخ کے لیے مزید پروگرام بنائے تھے، لیکن نکسن نے بھاری بجٹ کی بنا پر انہیں مسترد کر دیا۔ اسکائی لیب فضا میں بھیجنے پر بھی اس نے انکار کر دیا۔ البتہ اس نے اسپیس شٹل بنانے کی منظوری دے دی۔

☆☆☆

روس کی طرح نکسن چین سے بھی بہتر اور خوشگوار تعلقات استوار کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس نے خفیہ طور پر یہ پیغام چین کے چیئرمین ماؤزے تنگ کو بھیجا۔ ماؤزے تنگ نے اس کا جواب 1971ء میں یوں دیا کہ ٹینس کی ایک ٹیم کو چین آ کر کھیلنے کی دعوت دی، لہٰذا ایک امریکی ٹیم کو چین بھیجا گیا۔

اس کے بعد نکسن نے ہنری کیسنگر کو چین جانے کی ہدایت کی تاکہ وہ چینی حکام سے مذاکرات کر سکے اور ملاقات کی راہ ہموار کر سکے۔ کیسنگر نے اپنے طور پر چند افراد کو ساتھ لیا اور ایشیا کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ پاکستان آیا۔ جہاں جنرل یحییٰ کی حکومت تھی۔ ڈنر کے دوران اس نے شکایت کی کہ اس کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ وہاں ایک شخص نے اس کی جگہ لے لی۔ اسی رات کو کیسنگر کو ائیرپورٹ لے جایا گیا۔ جنرل یحییٰ نے اس سیکرٹ پلان کا نام مارکو پولو رکھا۔ ساری دنیا کے پریس، امریکی سفارت خانے کے اسٹاف اور کیسنگر کے ساتھ آنے والے کیبنٹ ممبران تک سے یہ پلان خفیہ رکھا گیا۔ پلان مارکو پولو کی اڑتالیس گھنٹوں میں تکمیل ہو جانا تھا۔

طیارے میں چار افراد کو چینی لباس پہنے دیکھ کر گارڈ کو گمان ہوا کہ انہیں اغوا کیا جا رہا ہے۔ صبح کے چار بجے ہنری کیسنگر کو احساس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ دوسری قمیص لانا بھول گیا ہے۔ چنانچہ جب کیسنگر چین کے ہوائی اڈے پر اترا تو استقبال کرنے والا اعلیٰ اسے دیکھ کر حیران ہو گیا اس لیے کہ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی قمیص پہنے تھا جو اس کے سائز سے کافی بڑی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں آیا کہ وہ امریکا کا وزیر خارجہ ہو سکتا ہے۔ ہنری کیسنگر نے چینیوں کو یقین دہانی کرائی کہ امریکا تائیوان کے مسئلے پر کچھ نہیں بولے گا۔ جہاں تک ویت نام کا تعلق ہے تو چین کو وہاں سے نکلنا پڑے گا، اس لیے کہ امریکا بھی وہاں سے اپنا بوریا بستر لپیٹنا چاہتا ہے۔ اب ویت نامیوں کو فیصلہ کرنے دیا جائے کہ وہ کیسے رہنا چاہتے ہیں۔

جب کیسنگر نے یہ کام بخوبی انجام دے دیا تو 15 جولائی 1971ء کو بیجنگ اور واشنگٹن ڈی سی سے بیک وقت اعلان کیا گیا کہ صدر امریکا رچرڈ نکسن اگلے سال فروری میں چین کا دورہ کریں گے۔ ساری دنیا اس اعلان کو سن کر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئی۔ اس دوران میں ہنری کیسنگر نے چین کے کئی دورے کیے اور چینی حکام کے ساتھ مل کر دورے کی تمام تفصیلات طے کیں۔

چین کا دورہ کرنے سے پیشتر ہنری کیسنگر نے مسٹر اور مسز نکسن کو چالیس گھنٹے تک دورے کی تفصیلات سمجھائیں۔ صدر اور فرسٹ لیڈی تھلیما نے ائیرفورس ون سے سفر کیا اور چین کے ائیرپورٹ پر اترنے کے بعد چینی وزیراعظم چواین لائی سے مصافحہ کیا۔ نکسن نے بھی گرم جوشی دکھائی، حالانکہ جینوا میں امریکا کے سیکرٹری آف اسٹیٹ جان فوسٹر ڈولیز نے 1954ء میں ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جناب صدر امریکا کے ساتھ تقریباً ایک سو ٹیلے وژن کمپنیوں کے صحافی تھے۔ نکسن کے حکم پر ٹیلے وژن کے نمائندوں کو پریس کے رپورٹروں پر ترجیح دی گئی تھی۔ اس لیے کہ وہ سمجھتا تھا کہ پرنٹ میڈیا کی نسبت الیکٹرونک میڈیا زیادہ سرعت اندازی سے اس تاریخی واقعہ کو ساری دنیا میں پھیلا دے گا۔

نکسن اور ہنری کیسنگر نے چواین لائی کے ساتھ ماؤزے تنگ سے اس کی ذاتی قیام گاہ پر ملاقات کی جو ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ ماؤزے تنگ نے بعد میں اپنے ڈاکٹر کو بتایا کہ وہ نکسن کی گفتگو سے متاثر ہوا۔

اس شام گریٹ ہال آف پیپلز میں نکسن کو عشائیہ دیا

گیا۔ دوسرے دن نکسن کی ملاقات چو این لائی سے ہوئی۔ اس میٹنگ کے بعد نکسن نے اعلان کیا کہ امریکا، تائیوان کو چین کا حصہ سمجھتا ہے۔ اس میٹنگ کے بعد نکسن کو تاریخی مقامات کی سیر کرائی گئی جن میں منگ کا مقبرہ اور دیوارِ چین شامل تھا۔

فرسٹ لیڈی آف امریکا نے پریس کے نمائندوں کے ساتھ چین کی نجی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ وہ کیمونوں، اسکولوں، فیکٹریوں اور اسپتالوں میں گئی۔

نکسن کے اس دورے سے چین اور امریکا کو ایک دوسرے سے قریب آنے کا موقع ملا۔

نکسن کو اپنا دورِ صدارت پورا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس لیے کہ وہ واٹر گیٹ اسکینڈل میں ملوث ہوگیا تھا۔ اس نے واٹر گیٹ نامی بلڈنگ میں جہاں ڈیموکریٹک پارٹی کا آفس تھا، خفیہ طریقے سے ایسے آلات نصب... کردیے تھے جن سے پارٹی کے ممبران کی آوازیں ٹیپ ہوتی رہیں۔ اس کی یہ حرکت پکڑی گئی۔ واشنگٹن پوسٹ میگزین کے رپورٹر باب ووڈ ورڈ اور کارل برنسٹن نے نکسن کے افسران پر الزامات عائد کیے کہ وہ بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ نکسن بدستور اس سے منکر تھا کہ اس نے خفیہ آلات لگانے والوں کو ناجائز طور پر رقم دی ہے یا وہ اس کیس میں ذاتی طور پر ملوث ہے۔

نکسن کے زور دینے پر اس کے دو مشیروں ایچ آر ہیلڈ مین اور جان اہرلکمین کو استعفیٰ دینا پڑا۔ نکسن کے نائب صدر اسپرو ایگنیو کو بھی جانا پڑا۔ نائب صدارت کے لیے نکسن نے جیرالڈ فورڈ کا نام پیش کیا جسے کانگریس نے منظور کرلیا۔

25 جون 1973ء کو جب نکسن کے تیسرے مشیر جان ڈین کو سینیٹ کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے نکسن پر واشگاف الزام عائد کردیا کہ نکسن اس سارے معاملے میں ملوث ہے اور اس نے ڈیموکریٹک پارٹی کے آفس میں ٹیپ لگوائے ہیں۔ نکسن نے اس سے انکار کیا کہ وہ ذاتی طور اس میں ملوث ہے۔ مگر عدالت نے اس پر اصرار کیا کہ وہ ٹیپ عدالت کے حوالے کیے جائیں۔ نکسن نے جب ٹیپ عدالت کے حوالے کردیے تو اس میں سے بہت سے حصے حذف کردیے گئے تھے۔ عدالت نے انہیں سنا اور اس پر اصرار کیا کہ حذف شدہ حصے بھی پیش کیے جائیں۔ طوعاً و کرہاً نکسن نے انہیں بھی عدالت میں پیش کیا تو یہ ظاہر ہوگیا کہ وہ اس معاملے میں پوری طرح سے ملوث ہے۔ اس نے ایک شخص کو رقم کا لالچ دے کر ڈیموکریٹک ممبران کی آوازیں ٹیپ کرنے کی پیشکش کی تھی۔

امریکی سینیٹ نے مطالبہ کیا کہ نکسن پر مقدمہ چلایا جائے۔

چنانچہ نکسن کے لیے اس کے سوا اب اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اوول آفس، وہائٹ ہاؤس کو چھوڑ دے۔ نکسن نے 8 اگست 1974ء کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے پہلے اس نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنی استعداد کے مطابق دنیا اور بالخصوص امریکا کو بنایا اور سنوارا ہے۔ اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا اب نہ صرف امریکیوں بلکہ دوسری اقوام کے لیے ایک محفوظ مقام بن چکی ہے، اب ہم اس اندیشے اور وسوسے کے بغیر گہری نیند سو سکتے ہیں کہ ہمارے بچے اندھا دھند جنگ کا ایندھن بننے سے بچ گئے ہیں اور اب ہمیشہ کے لیے امن و سکون کی زندگی بسر کریں گے۔“

وہ پہلا امریکی صدر تھا جس نے ایسا کیا۔ (یا جو ایسا کرنے پر مجبور ہوا)۔ نائب صدر جیرالڈ فورڈ‘ 8 ستمبر 1974ء کو جب صدارتی عہدے پر فائز ہوگیا تو اس نے نکسن سے معافی مانگی۔ اس نے کہا۔ ”یہ معافی میری طرف سے ہی نہیں بلکہ پورے امریکا کی طرف سے ہے۔“ اس معافی پر نکسن پر لگائے گئے وہ سارے الزامات دھل کر صاف ہوئے جو اس پر لگے ہوئے تھے۔ تاہم اس کے دونوں مشیروں کو قید کی سزا دی گئی۔

جیک برنان جو 1977ء میں نکسن کا چیف آف اسٹاف تھا اس نے میڈیا کو اطلاع دی کہ نکسن اپنے دورِ صدارت پر انٹرویو دینا چاہتا ہے۔ مگر وہ واٹر گیٹ اسکینڈل پر نہیں بولے گا۔ میڈیا نے اسے چار لاکھ ڈالر ادا کرنے کی پیشکش کی۔ جب کہ انٹرویو ڈیوڈ فراسٹ کو لینا تھا جسے چھ لاکھ ڈالر کی پیشکش کی گئی تھی۔ (جو اس وقت کے تقریباً بیس لاکھ ڈالر کے مساوی ہوتے ہیں) یہ انٹرویو بارہ دن تک جاری رہا۔ ڈیوڈ فراسٹ نے واٹر گیٹ کا نام لیے بغیر آخری دن اسی موضوع پر ایسے آڑے ترچھے سوالات کیے کہ نکسن کو جواب دیتے ہی بنی۔ وہ اس سے دامن نہ چھڑا سکا۔ 4 مئی 1977ء کو واٹر گیٹ والا حصہ دکھایا گیا جسے ساڑھے چار کروڑ افراد نے دیکھا۔ اس کے بعد مشہور ادارے گیلپ نے اعداد و شمار کی روشنی میں بتایا کہ 69 فی صد افراد نے اس شبے کا

اظہار کیا کہ نکسن نے ابھی پوری کہانی نہیں سنائی ہے وہ اصل بات کو چھپا گیا ہے۔ 72 فی صد نے کہا کہ وہ عدالت کی توہین کا مرتکب ہوا ہے۔ جب کہ 75 فی صد کا کہنا تھا کہ اب اسے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے اور عوام کا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ اس سے اکتا چکے ہیں۔

1978ء میں ''نکسن کی یادداشتیں'' نامی کتاب شائع ہوئی جو نکسن نے لکھی تھی۔ یہ کتاب بیسٹ سیلرز کی حیثیت سے فروخت ہوئی۔ 1979ء میں اسے وہائٹ ہاؤس بلایا گیا۔ جہاں چین کا نائب وزیر اعظم ڈینگ زیاؤ پینگ مدعو تھا۔ جمی کارٹر اسے بلانے کے حق میں نہیں تھا، لیکن ڈینگ نے اصرار کیا اور کہا کہ اگر کارٹر اسے وہائٹ ہاؤس نہیں بلائے گا تو وہ نکسن سے ملاقات کرنے کے لیے کیلیفورنیا جائے گا۔ اس کی روانگی کا اہتمام کیا جائے۔ جب نکسن کی ملاقات ڈینگ سے وہائٹ ہاؤس میں ہوئی اور انہوں نے کافی دیر تک تنہائی میں بھی گفتگو کی۔ ڈینگ نے نکسن کو بیجنگ آنے کی دعوت دی تو نکسن 1979ء میں بیجنگ گیا، جہاں اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ پتا چلا کہ سیاسی قائد نہ ہونے کے باوجود وہ عوام میں مقبول ہے۔

1980ء میں نکسن خاموش اور ساکت نہیں بیٹھا۔ وہ لکھنے میں مصروف تھا، سفر کرتا تھا اور غیر ملکی رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ اپنی موت سے پیشتر اس نے سیاست پر متعدد کتابیں لکھیں، جن میں اس نے اپنے تجربات اور خارجہ پالیسیوں کو اپنا موضوع بنایا۔ اس نے خاص طور پر تیسری دنیا کے رہنماؤں سے کافی ملاقاتیں کیں۔ مصری صدر انور السادات کی موت کے موقع پر اس نے امریکا کے جمی کارٹر اور ہنری فورڈ کے ساتھ اس کے جنازے میں شرکت کی۔

1986ء میں وہ سوویت روس گیا۔ وہاں سے واپسی پر اس نے اپنی یادداشتیں صدر رونالڈ ریگن کو پیش کیں اور میخائل گورباچیف کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس سے اگلے مہینے گیلپ نے جب رائے شماری کی تو نکسن کو دس بڑے قابلِ تحسین افراد میں شامل کیا۔

19 جولائی 1990ء میں نکسن لائبریری اور اس کی جائے پیدائش یوربا لنڈا میں نکسن نے ذاتی انسٹی ٹیوٹ کھولا جس میں اس نے لیکچر دینے کا اعلان کیا تھا۔ مقررہ وقت پر وہاں جمِ غفیر ہو گیا۔ اس لیے کہ لیکچر میں شریک ہونے کے لیے صدر فورڈ، ریگن اور جارج ڈبلیو بش اور ان کی بیویاں بھی شامل تھیں۔ چند ماہ بعد اس مقام کو نکسن سینٹر کہا جانے لگا۔

پھیپھڑوں کے سرطان کی بنا پر اس کی بیوی تھلیما 22 جون 1993ء کو انتقال کر گئی۔ اس کے جنازے کی تقریبات رچرڈ نکسن کی لائبریری میں ہوئیں۔

18 اپریل 1994ء کو نکسن اپنے پارک ریج والے مکان میں ناشتا کر رہا تھا کہ اس پر فالج کا اثر ہو گیا۔ خون کا ایک لوتھڑا اس کے دل کے اوپری حصے سے علیحدہ ہوا، پھٹا اور پھر دماغ کی طرف چلا گیا۔ وہ مین ہٹن کے کورنل میڈیل سینٹر میں لے جایا گیا۔ وہ بظاہر صحت مند تھا لیکن اپنے دائیں ہاتھ اور ٹانگ کو جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ دماغ میں زخم ہونے کی بنا پر جسم میں سوجن آ گئی تھی۔ چند گھنٹوں بعد ہی نکسن کوما میں چلا گیا۔

اس کی موت 22 اپریل 1994ء رات 9 بج کر 8 منٹ پر ہوئی۔ وہ اس وقت 81 برس کی عمر کا ہو چکا تھا۔ موت کے وقت اس کے سرہانے اس کی دونوں بیٹیاں تھیں۔ جنازے میں امریکا کے چار صدور جیرالڈ فورڈ، جمی کارٹر، رونالڈ ریگن اور بل کلنٹن نے شرکت کی۔ جنازے کو یوربا لنڈا، کیلیفورنیا میں واقع اس کی لائبریری اور میوزیم پر لے جایا گیا جہاں... وہ پیدا بھی ہوا تھا اور اسے اس کی بیوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

اس سانحے پر ڈاکٹر ہنری کیسنگر نے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ صدر بل کلنٹن نے بھی تعزیتی کلمات ادا کیے۔ سینیٹر بوب ڈول جو نکسن کے عہد صدارت میں ریپبلکن پارٹی کا چیئرمین تھا، نے پُرجوش خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تدفین سے پیشتر اس سے محبت کرنے والے اسے دیکھنے وہاں سخت سردی میں آئے اور تین میل لمبی لائن میں کھڑے رہے۔ ایک اندازے کے مطابق 42 ہزار افراد موت کے وقت اس کی زیارت کرنے آئے تھے۔

اس کی موت پر امریکا کے سارے بڑے اخبارات اور میگزین نے اداریے لکھے، جس میں اس کی دانش مندی اور فہم و فراست کو سراہا گیا تھا۔ ڈیلاس مارننگ نیوز نے لکھا۔ ''مؤرخ کو بالآخر لکھنا پڑے گا کہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ ایک دور اندیش حکمراں تھا۔ وہ بحیثیت ایک انسان اور اسٹیٹس مین کامیاب تھا۔ اس نے امریکا کی نامساعد حالات میں مدد کی اور اسے بحرانات سے نکالا۔ اسے بلاشبہ ایک دانشور رہنما کہا جا سکتا ہے۔''

سدابہار

انور فرہاد

برصغیر کی فلمی دنیا میں بے شمار آوازیں مقبولیت کی معراج پر پہنچیں۔ کے ایل سہگل سے ملکہ ترنم نور جہاں تک سب نے اپنے اپنے طور پر گلوکاری کا نیا منظرنامہ تخلیق کیا۔ ہر ایک کے فن کو پذیرائی بھی ملی مگر شمشاد بیگم کی آواز میں جو لوچ تھا جو اُتار چڑھائو جو شگفتگی تھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ستر سال پرانے گانے بھی تازہ لگتے ہیں۔ کانوں میں رس گھولتے محسوس ہوتے ہیں۔

ایک پرانی گلوکارہ کی پیچ در پیچ زندگی کا احوال

میرے حلقۂ احباب میں زیادہ تر بلکہ تمام تر احباب میرے موڈ مزاج کے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں، آپ نے سنا ہوگا

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

تو اگر ادب اور صحافت سے تعلق کی بنا پر میرے دوست لکھاری ہیں۔ ادیب، شاعر اور صحافی ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ میرے ایسے ہی دوستوں میں ایک سید

صاحب بھی ہیں۔ بڑے مخلص، بڑے چاہنے والے۔ جب بھی ملاقات ہوتی ہے چائے ضرور پلاتے ہیں مگر ان کا مسئلہ یہ ہے کہ پریس کلب کی چائے انہیں زہر لگتی ہے اور دیگر ہوٹل یا ریسٹورنٹ جا کر بقول ان کے اشک بلبل جیسی چائے پی کر کھال اتروانے کے روادار بھی نہیں۔ اس لیے اکثر اصرار کرتے ہیں چلئے گھر چل کر چائے پیتے ہیں مگر میں حیلے بہانے کر کے انہیں ٹال دیتا ہوں۔ محض چائے کے لیے ان کے گھر تک جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ان کا مرغوب مشروب چائے ہے اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے گھر میں خاص چائے بنواتے ہوں گے۔

ایک دن انہوں نے پھر اصرار کیا اور ساتھ ہی بولے۔ ''دیکھئے انکار کر کے میرا دل نہ توڑیئے گا۔'' لہٰذا میں نے ان کے دل کو سلامت رکھنے کے لیے ان کے گھر جانے کی ہامی بھرلی۔

ان کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا جس میں انہوں نے مجھے بٹھایا اور بولے۔ ''میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔'' وہ ایک دروازے سے اندر چلے گئے تبھی مجھے ایک کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میرے پیا گئے رنگون
وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون
تمہاری یاد ستاتی ہے
تمہاری یاد ستاتی ہے

اب جو میں نے اس آواز کی طرف توجہ دی کہ کہاں سے آرہی ہے تو معلوم ہوا ڈرائنگ روم سے متصل دروازے کے پیچھے سے آرہی ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اتنی پرانی آواز کون سن رہا ہے کہ اسی دوران میں سید صاحب آگئے۔ مجھے گانے کی طرف کان لگائے ہوئے دیکھا تو مسکرائے اور کچھ ٹچل انداز میں بولے۔ ''یہ ہمارے دادا جی ہیں۔ اپنی جوانی کے دنوں کے پسندیدہ گانے سنتے رہتے ہیں۔''

''دادا جی!'' میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں، چلئے آپ کو ملواتے ہیں۔ ہمارے گھر کے اس عجوبے سے مل کر شاید آپ کو کوئی لطف آئے اور اگر منہ کا ذائقہ کرکرا ہو جائے تو ہماری چائے پی کر ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ میں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

''آ جاؤ، یہاں کوئی پردے والا نہیں۔''

ہم دونوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ ''دادا ابو! ہمارے دوست آپ سے ملنے آئے ہیں۔ انہیں بھی آپ کی طرح پرانے گانے سننے کا بڑا شوق ہے۔''

میں اس بحث میں دلچسپی لینے کی بجائے حیرت بھری نظروں سے دیوار پر آویزاں فوٹو فریموں کو دیکھ رہا تھا جس میں خوبرو نوجوان 41-1940ء کے دور کی بڑی بڑی فلمی ہستیوں کے ساتھ نظر آرہا تھا۔ سید صاحب میری دلچسپی کو بھانپ کر سرگوشی میں بولے۔ ''یہ دادا جی کی جوانی ہے۔ ان دنوں یہ بڑے شوقین مزاج تھے۔ فلمی دنیا میں اچھا خاصا وقت گزار چکے ہیں۔

میں نے دادا جی کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''باذوق آدمی لگتے ہیں۔'' پھر سید صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تم کیا جانو پرانی آوازوں کے بھید بھاؤ۔''

''آپ تو جانتے ہیں، مجھے گانے بجانے کا کوئی شوق نہیں۔''

''جانتا ہوں، جانتا ہوں تمہیں سر سنگیت سے محبت نہیں مگر تم شاید نہیں جانتے سر سے جس کو پیار نہیں ہے، وہ مورکھ انسان نہیں۔''

اور پھر اس کی تصدیق کے لیے انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیوں میاں...... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

میرے ہاں یا ناں کہنے سے پہلے سید صاحب بول پڑے۔ ''مجھے تو یہ بتایئے، اس گانے میں جو ابھی آپ سن رہے تھے میرے پیا گئے رنگون اس میں ایسی کیا بات تھی جو آپ اتنے شوق سے سن رہے تھے؟ عام سی بات ہے۔ پیا رنگون گیا ہے، وہاں اس کا دل گھبرا رہا ہے اپنی پیاری کی یاد ستا رہی ہے اس لیے وہاں سے ٹیلی فون کر رہا ہے۔''

''ہونا بدذوق، اس لیے اس گیت کے بول میں الجھ کر رہ گئے۔ گانے والی کی آواز کی تہہ تک نہیں پہنچے۔ اس آواز میں جو کھنک اور چمک ہے الہڑ جھرنوں کی بدمست لہروں کی روانی اور زندگی کی جو سچ بیانی کا رچاؤ ہے اس پر تم نے دھیان نہیں دیا۔ اس پر غور نہیں کیا کہ دور مندر میں بجنے والی گھنٹی جیسی یہ آواز سماعت کو کس قدر سکون پہنچاتی ہے۔ کانوں میں جیسے شہد ٹپکاتی ہے۔ غیر تراشیدہ ہیرے کی مانند چاروں سمت روشنی کے جھماکے کی طرح بکھر جاتی ہے۔''

سید صاحب سے شاید کوئی جواب نہ بن پڑا اس لیے

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں چائے لے کر آتا ہوں جب تک آپ دادا ابو سے اس آواز کے مزید بھید بھاؤ معلوم کرتے رہیے۔''

ان کی بات پر ہم دونوں مسکرا دیے۔ وہ چلے گئے تو میں نے کہا۔ ''دادا جی! لگتا ہے آپ شمشاد بیگم کے بہت بڑے فین ہیں؟''

''ہاں میاں! شمشاد بیگم کی آواز میں کچھ ایسا جادو ہے کہ میں اس کے سحر سے کبھی نکل نہ سکا۔ آپ نے غالب کا وہ شعر تو سنا ہوگا۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

کچھ ایسی ہی بات میرے ساتھ بھی ہے۔ بہت سی گانے والیوں نے بہت اچھا گایا ہے۔ جیسے نور جہاں، ثریا، مبارک بیگم، سُدھا ملہوترا، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے اور گیتا دت وغیرہ لیکن شمشاد بیگم کی آواز کا کچھ ایسا انداز ہے کہ میں اس کا اسیر ہو کر رہ گیا ہوں۔''

سید صاحب چائے لے کر آگئے تھے۔ چائے واقعی بہت اچھی تھی۔ دودھ پتی سے بھی کچھ آگے کی چیز۔ دادا جی نے ایک گھونٹ لینے کے بعد برا سا منہ بنایا۔ ''یہ چائے ہے؟''

ہم دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

''اس میں چائے کہاں ہے بس زبان کا چٹخارا ہے۔ اس کی مثال تو آج کل کے فلمی گانوں جیسی ہے۔ جن میں نہ اچھے بول ہوتے ہیں نہ آواز کا جادو۔ ارے بھئی یہ بھی کوئی گیت ہے۔

چکنی کلائیاں
تیرے عشق میں ہم کو کیا ملا...... بابا جی کا ٹلو

اس گیت میں حد کر دی گیت نگار نے کتے اور الو تک کو شامل کر لیا۔ بلبل، کوئل، پپیہا کی جگہ اگر کتوں اور الوؤں کو گانوں کی زینت بنایا جائے گا تو انہیں گیت کہا جائے گا؟''

ہم کیا کہتے، ہم چپ رہے، ہم ہنس دیے۔ ہمیں خاموش دیکھ کر وہ بولے۔ ''آج کے گیت سننے کے لیے نہیں ہوتے بس دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ فلموں میں کچھ کم بے ہودگی ہوتی ہے کیا جو اس کے باوجود گانوں میں بے حیائی کی حد کر دی جاتی ہے۔''

''بجا فرما رہے ہیں آپ۔'' اب میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''اسی موضوع پر میں نے ایک کالم لکھا تھا۔

جو بچا تھا وہ دکھانے کے لیے آئے ہیں
آئٹم سونگ سنانے کے لیے آئے ہیں

''واہ بہت خوب۔'' دادا جی برجستہ بولے۔ ''تم نے تو میاں میری بات کی بھرپور عکاسی کر دی۔''

سید صاحب کے گھر سے واپس آنے کے بعد میں کئی دنوں تک دادا جی اور ان کی پسندیدہ گلوکارہ شمشاد بیگم کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعی اتنے سالوں کے بعد بھی، ان کی آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہے۔ محض ایک دو گانے کی بات نہیں متعدد گیت ہیں جن کو سننے کے بعد ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

☆ دنیا کا مزہ لے لو دنیا تمہاری ہے...... فلم بہار، موسیقار ایس ڈی برمن۔

☆ سیاں دل میں آنا رے، آ کے پھر نہ جانا رے...... فلم بہار، موسیقار ایس ڈی برمن۔

☆ لے کے پہلا پہلا پیار بھر کے آنکھوں میں خمار...... فلم سی آئی ڈی...... موسیقار او پی نیر۔

☆ کاہے جادو کیا، مجھ کو اتنا بتا، جادوگر بالما...... فلم نغمہ...... موسیقار نوشاد۔

بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا...... فلم نغمہ...... موسیقار نوشاد۔

☆ کبھی آر کبھی پار لاگا تیرِ نظر...... فلم آر پار...... موسیقار او پی نیر۔

☆ ریشمی شلوار کرتہ جالی کا...... فلم نیا دور...... موسیقار او پی نیر۔

☆ اس دنیا میں اے دل والو دل کا لگانا اچھا ہے پر کبھی کبھی...... فلم پتنگا...... موسیقار رام چندر۔

☆ اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں پر تیرے ہاتھ نہ آؤں...... فلم پتنگا۔ موسیقار نوشاد۔

☆ چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا...... فلم بابل...... موسیقار نوشاد۔

☆ ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا...... فلم بابل...... موسیقار نوشاد۔

☆ کسی کے دل میں رہنا تھا تو میرے دل میں کیوں آئے...... فلم بابل...... موسیقار نوشاد۔

☆ بچپن کے دن بھلا نہ دینا...... فلم دیدار......

موسیقار نوشاد۔

☆ چمن میں رہ کے دیوانہ میرا دل ہوتا جاتا ہے..... فلم دیدار..... موسیقار نوشاد

ڈر نہ محبت کر لے ڈر نہ محبت کر لے..... فلم انداز..... موسیقار نوشاد۔

میں رانی ہوں راجا کی راجا میرا پیا..... فلم آن..... موسیقار نوشاد۔

یہ اور ایسے بہت سے اپنے دور کے سپرہٹ گانے ہیں جو آج بھی شمشاد بیگم کی مقبولیت میں کمی نہیں آنے دیتے۔ دادا جی جیسے بے شمار شمشاد کی آواز کے دیوانے آج بھی موجود ہیں۔

سید صاحب سے اگلی ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔

''ارے بھئی، آپ کہاں ہیں؟''

''کیوں کیا بات ہے؟''

''بات یہ ہے کہ ہمیں آپ اور آپ کی چائے بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی۔''

ان کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''آپ کو ہماری چائے پسند آئی؟''

''بہت۔''

''مگر دادا ابو نے تو اسے چائے ہی تسلیم نہیں کیا۔''

''وہ دراصل مولانا ابوالکلام آزاد کے پیروکار ہیں۔ جو چائے میں دودھ تو کیا شکر کے بھی روادار نہیں تھے۔ چائے کو بس چائے کے رنگ میں پینے کے قائل تھے۔''

آج ہم ان کے گھر گئے تو سید صاحب بولے۔

''آج ہم چائے یہاں ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔ چائے کی تذلیل کروانے کے لیے ان کے ساتھ نہیں پئیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں دادا جی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ سلام کیا تو دعا دیتے ہوئے بولے۔

''ذرا پہلے آ جاتے تو اس بلبل ہزار داستان کو چہکتے ہوئے سنتے۔'' میں نے جیب سے انہیں ایک سی ڈی نکال کر دیا۔

''یہ کیا ہے.....؟'' انہوں نے اسے ہاتھ میں لے کر الٹتے پلٹتے کہا۔

''یہ سی ڈی ہے جس میں اسی بلبل ہزار داستان کی کچھ داستانیں ہیں۔ آپ کے لیے میری طرف سے ایک نذرانہ..... ایک تحفہ۔''

''میاں! اللہ آپ کو خوش رکھے مگر میں اس کا کیا کروں گا؟ میرے لیے تو آج کے دور کے باجے گاجے بیکار ہیں۔ سید کی بیوی، خدا اسے ہمیشہ آباد رکھے میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔ اس نے ایک بار آڈیو کیسٹ اور ایک ٹرانزسٹر لا کر دیا تھا مگر مجھ سے وہ بھی ہینڈل نہیں ہوتا تھا۔ اس کے فیتے الجھ جاتے تھے اور گانے سننے کا مزہ کرکرا ہو جاتا تھا۔ سو میرے لیے تو جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے۔ آپ سمجھ گئے ناں؟ میرے لیے تو یہ ریڈیو ہی بہت ہے۔''

ان کے سامنے جانے کس زمانے کا ایک ریڈیو رکھا تھا جس سے وہ دل بہلاتے تھے۔ دادا جی کی عمر کسی طرح بھی اسی نوتے کے کم نہیں ہوگی۔ چہرے پر بالشت بھر لمبی داڑھی، پیشانی پر محراب مگر دل شمشاد بیگم کی آواز کا دیوانہ۔

تھوڑی دیر تک سی ڈی سے کھیلتے رہے پھر بولے۔

''اس میں کون کون سے گانے ہیں؟'' میں نے ان کی تفصیل بتائی۔

''سارے ہی گانے اچھے ہیں۔ تمہاری چوائس اچھی ہے۔'' پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ شمشاد بیگم کے بارے میں تمہیں شاید نہ معلوم ہو کہ شمشاد بیگم نے چودہ برس کی عمر میں گیت گانا شروع کیا۔ یہ 1933ء کا سال تھا۔ انہوں نے گلوکاری کی تربیت کسی سے حاصل نہیں کی تھی۔ ان کے اندر گلوکاری کی فطری صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گئیں۔ انہوں نے گلوکاری کا کیریئر باضابطہ طور پر لاہور میں قائم ریڈیو اسٹیشن پشاور سے شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ ریڈیو ہی واحد ادارہ تھا جو تشہیر کا ذریعہ تھا لہٰذا ریڈیو سے ان کے گانے نشر ہونا شروع ہوئے تو فلم والوں نے ان کی آواز سے فائدہ اٹھانے کا سوچا، وہ جو کہتے ہیں

قدر گوہر شاہ داند

یا بداند جوہری

تو فلم انڈسٹری کے جوہری شعلہ سی لپکتی ہوئی اس آواز سے کیسے فیض حاصل نہ کرتے۔ اس سلسلے میں ماسٹر غلام حیدر پہلے موسیقار تھے جنہوں نے شمشاد بیگم کو اپنی پہلی پنجابی فلم یملا جٹ میں گانے کا موقع دیا۔ یہ فلم 1940ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس کے بعد اردو زبان میں دو فلموں، خزانچی اور خاندان، میں گانے کا موقع دیا۔

''دادا جی! یہ کس زمانے کی بات ہے؟'' میں ایک دم پوچھ بیٹھا۔ ''کچھ یاد ہے آپ کو؟''

شمشاد بیگم کے کچھ سدا بہار گیت جن کی تروتازگی کل کی طرح آج بھی برقرار ہے

فلم کا نام	بول	موسیقار	نغمہ نگار
پتنگا (1949ء)	اس دنیا میں اے دل والوں دل کا لگانا اچھا ہے پر	سی رام چندر	راجندر کرشن
پتنگا (1949ء)	میرے پیا گئے رنگون وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون	سی رام چندر	
بابل (1950ء)	ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا	نوشاد	شکیل بدایونی
بابل (1950ء)	چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا	نوشاد	شکیل بدایونی
بابل (1950ء)	کسی کے دل میں رہنا تھا تو میرے دل میں کیوں آئے	نوشاد	شکیل بدایونی
بابل (1950ء)	ندی کنارے ساتھ تمہارے شام سہانی آئے	نوشاد	شکیل بدایونی
بابل (1950ء)	نہ سوچا تھا یہ دل لگانے سے پہلے	نوشاد	شکیل بدایونی
آن (1952ء)	آگ لگی تن من میں دل کو پڑا تھامنا	نوشاد	شکیل بدایونی
آن (1952ء)	میں رانی ہوں راجا کی راجا میرا پیا	نوشاد	شکیل بدایونی
بہار (1954ء)	سیاں دل میں آنا رے، آ کے پھر نہ جانا رے	ایس ڈی برمن	راجندر کرشن
بہار (1951ء)	دنیا کا مزہ لے لو دنیا تمہاری ہے	ایس ڈی برمن	راجندر کرشن
نیا دور (1957ء)	ریشمی شلوار کرتہ جالی کا	او پی نیر	ساحر لدھیانوی
آر پار (1954ء)	کبھی آر کبھی پار لاگا تیر نظر	او پی نیر	مجروح سلطان پوری
سی آئی ڈی (1955ء)	لے کے پہلا پہلا پیار بھر کے آنکھوں میں خمار	او پی نیر	مجروح سلطان پوری
سی آئی ڈی (1955ء)	کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ	او پی نیر	مجروح سلطان پوری

"ہاں میاں! اچھی طرح یاد ہے خزانچی 1941ء اور خاندان 1942ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ لاہور میں بننے والی ان فلموں کے بعد شمشاد بیگم کے لیے فلم انڈسٹری کے دروازے وا ہو گئے تھے۔ دیگر فلمساز و ہدایت کار اپنے موسیقاروں کے اصرار پر شمشاد بیگم کی آواز میں گیت ریکارڈ کروانے لگے۔ انہیں بہتر مواقع ملتے رہے اور خوش قسمتی سے ان کے زیادہ تر گانے ہٹ ہونے لگے۔"

وہ ذرا رکے اور میری طرف دیکھا کہ میں ان کی بات توجہ سے سن رہا ہوں یا نہیں۔ مجھے ہمہ تن گوش دیکھ کر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ "شمشاد بیگم کے ابتدائی دور میں انہیں ایک گانے کا معاوضہ پندرہ روپے ملا کرتا تھا۔"

"صرف پندرہ روپے......" علی سید نے حیرت کا اظہار کیا۔

ارے میاں یہ پندرہ روپے آج کے دور کے نہیں تھے۔ چالیس کی دہائی کے تھے۔ اس وقت کے لحاظ سے ایسے کم بھی نہیں تھے مگر اس بات کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس وقت کی ایک مشہور فلم کمپنی زینتا فون نے کانٹریکٹ کی تکمیل کے بعد یعنی شمشاد بیگم کے تمام گانوں کی ریکارڈنگ کرنے کے بعد ان کی کارکردگی سے اس قدر خوش ہوئی کہ انہیں انعام کے طور پر پانچ ہزار روپے دیے۔ یہ نہ سمجھنا کہ نئی گلوکارہ ہونے کے باوجود شمشاد بیگم اس لیے جلد ہی مقبول ہوگئیں کہ ان کے مقابلے میں کوئی اور گلوکارہ نہیں تھی۔ ایک نہیں کئی تھیں۔ دراصل شمشاد بیگم کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی جو دلوں پر اثر کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے وقت کے مشہور موسیقاروں نے انہیں گانے کے بہتر مواقع دیے۔

یوں تو شمشاد بیگم نے اپنے کیریئر میں انڈسٹری میں موجود سارے ہی موسیقاروں کے لیے گانے ریکارڈ کروائے جبکہ ہم تمہیں چند نامور موسیقاروں کے بارے میں یہ بتائیں گے کہ کس نے ان سے کتنے گیت گوائے۔

فلم	نغمہ	موسیقار	نغمہ نگار
نغمہ	کاہے جادو کیا موہے اتنا بتا جادو گر بالما	نوشاد	نخشب جارچوی
نغمہ	بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا	نوشاد	نخشب جارچوی
زندگی یا طوفان	انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ	نوشاد	نخشب جارچوی
پگڑی	مستی بھری بہار نے دیوانہ کردیا	غلام محمد	شکیل بدایونی
انمول گھڑی	اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں تیرے ہاتھ نہ آؤں	نوشاد	تنویر نقوی
درد	ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے	نوشاد	شکیل بدایونی
چاندنی رات	چھایا مری امید کی قسمت میں اندھیرا	نوشاد	شکیل بدایونی
دلاری	نہ بول پی پی مورے انگنا	نوشاد	شکیل بدایونی
میلہ	تقدیر بنی بن کے بگڑی دنیا نے ہمیں برباد کیا	نوشاد	شکیل بدایونی
میلہ	مرا دل توڑنے والے مرے دل کی دعا لینا	نوشاد	شکیل بدایونی
میلہ	تو بھنورا میں ہوں پھول یہ مت بھول	نوشاد	شکیل بدایونی
میلہ	دھرتی کو آکاش پکارے آجا پیارے پریم دوارے	نوشاد	شکیل بدایونی
میلہ	موہن کی مرلیا باجے	نوشاد	شکیل بدایونی
دیدار	بچپن کے دن بھلا نہ دینا	نوشاد	شکیل بدایونی
دیدار	چمن میں رہ کے دیوانہ مرا دل ہوتا جاتا ہے	نوشاد	شکیل بدایونی
انداز	ڈرنہ محبت کرلے ڈرنہ محبت کرلے	نوشاد	شکیل بدایونی
مغل اعظم	تری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے	نوشاد	شکیل بدایونی
سی آئی ڈی	بوجھ میرا کیا ناؤں رے ندی کنارے گاؤں رے	او پی نیر	مجروح سلطان پوری
قسمت	کجرا محبت والا انکھیوں میں ایسا ڈالا		

موسیقار سی رام چندر نے شمشاد بیگم سے اپنی پچیس فلموں کے لیے 61 گانے ریکارڈ کروائے۔ جن میں کئی بے حد مقبول ہوئے۔

موسیقار اعظم نوشاد کے لیے بھی شمشاد نے 61 نغمے گائے۔ جن میں مقبول گانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ نوشاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لتا ان کی اوّلین پسند تھی۔ اس کے بعد ان کی پسندیدہ گلوکارہ شمشاد بیگم تھی۔

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرتا کہ موسیقار او پی نیر کے ذکر کے بغیر شمشاد بیگم کے فلمی سفر کی کہانی ادھوری ہے۔ اگرچہ انہوں نے سی رام چندر اور نوشاد کے مقابلے میں شمشاد سے کم گانے گوائے ہیں یعنی صرف چالیس نغمے مگر ان میں مقبول نغموں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔

موسیقار مدن موہن نے شمشاد بیگم کی آواز میں صرف تیس نغمے ریکارڈ کیے۔ ان کی فلم ''آنکھیں'' میں گانے سے جب لتا منگیشکر نے انکار کردیا تو وہ شمشاد بیگم کے پاس گئے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ آنکھیں ہٹ ہو گئی اور بحیثیت موسیقار مدن موہن بھی ہٹ ہو گئے لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے شمشاد بیگم سے زیادہ گانے صدابند نہیں کروائے جبکہ فلم والوں کا وتیرہ ہے کہ وہ کامیاب فنکاروں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

''قصہ مختصر یہ کہ شمشاد بیگم نے تقریباً اپنے تیس سالہ فلمی کیرئر میں ماسٹر غلام حیدر، چکن دیو برمن، نوشاد، سی رام چندر، مدن موہن، او پی نیر سمیت اپنے وقت کے تمام بڑے موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور پندرہ سو سے زیادہ فلمی گیت ریکارڈ کروائے۔ چالیس کی دہائی ان کے لیے معروفیت سے بھرا دور تھا۔''

ابھی وہ یہیں تک کہہ پائے تھے کہ ان کی نظر دیوار گیر گھڑی پر پڑی اور وہ ہماری طرف دیکھ کر بولے۔ ''بس، اب آپ لوگ جائیں ایک اسٹیشن سے سنہری آوازوں کا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔ جس میں شمشاد بیگم کا کوئی ن

کوئی گانا ضرور شامل ہوتا ہے۔''

ہم دونوں اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ یہاں بیٹھ کر جب ہم خالد علی سید کی مخصوص چائے کے چٹخارے لے رہے تھے تو دادا جی کے کمرے سے آتی ہوئی شمشاد بیگم کی کھنکتی ہوئی آواز ہماری سماعت میں شہد ٹپکا رہی تھی۔

دنیا کا مزہ لے لو دنیا تمہاری ہے
دنیا تمہاری ہے جی دنیا تمہاری ہے
دنیا کو لات مارو دنیا سلام کرے
جھک جھک سلام کرے
رک رک سلام کرے
دنیا تمہاری ہے جی دنیا تمہاری ہے

اس آواز نے چائے کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ سید صاحب بھی اس گانے کے سحر میں گرفتار نظر آئے۔

''یار واقعی اس آواز میں بڑی کشش ہے۔ ایک طلسمی کیفیت ہے جو سامع کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے۔ ویسے گانا بھی بڑے مزے کا ہے۔ کس فلم کا ہے؟''

''فلم کا نام بہار ہے۔ موسیقی کی دھنیں ایس ڈی برمن کی کمپوز کی ہوئی ہیں۔ بول راجندر کرشن کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ گانا بڑے مزے کا ہے جبکہ گانے والی کی آواز اور انداز نے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ اس میں چار چاند لگا دیے ہیں۔''

سید صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''دادا ابو تو مجھے بدذوق سمجھ کر کبھی گھاس نہیں ڈالتے۔ سُر سنگیت کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتے۔ تم ہی کبھی کبھی آ جایا کرو کہ تم سے بہت گھل مل گئے ہیں اور کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح مجھے بھی کچھ جاننے کچھ معلوم کرنے کا موقع ملے گا۔ اب دیکھو نا، مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ماضی میں کوئی شمشاد بیگم بھی تھی جس کی آواز آج بھی گانوں میں رس گھولتی ہے۔''

سید صاحب کی خواہش کے مطابق کوئی ایک ہفتے بعد میں ان کے ساتھ دادا جی کی باتیں سننے کے اشتیاق میں ان کے گھر جا دھمکا۔

''ارے میاں! تم جو جاتے ہو تو پھر لوٹ کر آنے کا خیال ہی نہیں رہتا۔'' دادا جی نے ہمیں دیکھتے ہی شکایت کی۔ ''ارے بھئی اس دن میں نے تم دونوں کو اپنے کمرے سے بھگا دیا تھا، اس بات پر تم برا تو نہیں مان گئے؟''

''نہیں دادا جی! برا مانتا تو اس وقت آپ کے پاس کیسے ہوتا؟ آج ذرا فرصت ملی تو سوچا چلو دادا جی سے ان کی پسندیدہ آواز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں۔''

''ارے میاں! میں کیا اور میری بساط کیا۔ شمشاد بیگم کو چاہنے اور پسند کرنے والے بہت بڑے اور مہان لوگ تھے۔ محبوب خان کا نام سنا ہے نا؟''

''جی ہاں، انہیں کون نہیں جانتا ان کے ذکر کے بغیر تو انڈیا کی فلمی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوتی۔''

''تو آپ کے اور ہم سب کے مہان فلمساز و ہدایت کار محبوب خان بھی شمشاد بیگم کو پسند کرتے تھے اور انہیں اپنی فلم میں بطور گلوکار پیش کرنے کے لیے بمبئی سے لاہور جا پہنچے تھے۔''

''اچھا...... کیا قصہ ہے یہ؟ ذرا تفصیل سے تو بتائیے؟'' سید صاحب پوچھ بیٹھے۔ ان کی دلچسپی دیکھ کر دادا جی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''یہ قصہ یوں ہے کہ......'' دادا جی بولے۔ ''شمشاد بیگم کی دھوم جب بمبئی پہنچی تو محبوب خان ان دنوں نرگس کو لے کر فلم تقدیر کی پلاننگ میں مصروف تھے۔ انہوں نے اس فلم کے گانے شمشاد بیگم سے ریکارڈ کروانے کا فیصلہ کیا لہٰذا انہوں نے شمشاد بیگم کو بمبئی آنے کی دعوت دی مگر شمشاد کے سخت گیر والد میاں حسین بخش نے صاف انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ بمبئی بہت بڑا بہت جدید اور مایہ پرست شہر ہے۔ اس شہر میں ان کی سادہ لوح بیٹی گم ہو کر رہ جائے گی۔ شمشاد بیگم کے والد کے صاف انکار کے بعد بھی محبوب صاحب نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور میاں حسین بخش سے ملنے خود لاہور چلے گئے اور میاں صاحب کو سمجھایا۔ ان دنوں میں بھی لاہور آیا ہوا تھا۔''

''میاں صاحب! ایک بہتر مستقبل شمشاد بیگم کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اس لیے آپ کو ان کا راستہ نہیں روکنا چاہیے۔'' محبوب خان نے میاں صاحب کو کچھ ایسے انداز میں سمجھایا کہ بالآخر وہ مان گئے۔ یہ ہے وہ قصہ۔''

''تو محبوب صاحب کے سمجھانے کے بعد شمشاد بیگم بمبئی گئیں؟''

''ہاں گئیں...... بمبئی میں محبوب خان کی ''تقدیر'' سے شمشاد بیگم کے کیریئر کا آغاز ہوا یہ فلم 1943ء میں ریلیز ہوئی۔ یاد رہے کہ بطور ہیروئن نرگس کی یہ پہلی فلم تھی۔''

دادا جی ذرا رک کے پھر گویا ہوئے۔ ''اس زمانے میں کلکتہ، مدراس اور لاہور میں بھی فلمیں بنا کرتی تھیں اور

پورے متحدہ ہندوستان میں ریلیز ہوتی تھیں مگر بمبئی جو سب سے بڑا فلمی مرکز تھا۔ وہاں کی فلموں میں کام کیے بغیر کسی کو مقبولیت اور کامیابی نصیب نہیں ہوتی تھی۔“

”جی ہاں، یہ حال تو آج بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

”کولکتہ اور مدراس میں علاقائی زبانوں کی فلمیں بنتی ہیں اور بہت اچھی فلمیں بنتی ہیں مگر بمبئی کی فلموں میں کام کرنے کے بعد ہی کسی کو شہرت عام حاصل ہوتی ہے۔“

”بالکل درست، بولی ووڈ کا ہمیشہ بول بالا رہا ہے۔“

”دادا ابو! ہم لوگ اپنے اصل موضوع سے بھٹک نہیں گئے؟“ خالد علی سید نے ٹوکا۔ ”بات ہو رہی تھی شمشاد بیگم کی آپ اس عظیم گلوکارہ کی بابت مزید معلومات سے آگاہ کیجیے۔“

دادا جی ایک بار پھر مسکرائے اور میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”میاں! تمہاری صحبت نے اس کافر کو بھی مسلمان کر دیا۔ خیر......“ وہ ذرا رکے اور توقف کے بعد بولے۔

”میرا خیال ہے کہ تمہیں محترمہ کے بارے میں ابتدا سے بتاؤں۔ شمشاد بیگم 14 اپریل 1919ء کو امرتسر میں میاں حسین بخش کے گھر پیدا ہوئیں۔ میاں صاحب مکانوں کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ ان کے آٹھ بیٹوں، بیٹیوں میں شمشاد بیگم پانچویں نمبر پر تھیں۔ انہوں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کبھی نہیں حاصل کی۔ انہیں تو یہ بھی یاد نہیں کہ کب گانا شروع کر دیا البتہ انہیں یہ یاد تھا کہ اسکول کے زمانے میں جب سب بچوں کے درمیان میز پر کھڑی ہو کر دعا پڑھتی تھیں تو ان کی میڈم کہتی تھیں۔ تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔“ انہیں یہ بھی یاد ہے کہ رمضان کے دنوں میں ان کے رشتے دار ان سے نعتیں سننے آیا کرتے تھے۔ جب وہ بارہ سال کی ہوئیں تو ان کے چاچا انہیں ریکارڈ بنانے والی کمپنی لے گئے۔ وہاں مشہور موسیقار مسٹر غلام حیدر کام کیا کرتے تھے۔ انہیں چاچا نے کہا کہ ان کو (غلام حیدر) اپنی آواز سناؤ۔ وہ بیچاری گھر سے تیار ہو کر تو نہیں آئی تھیں نہ ہی چاچا نے کچھ بتایا تھا اس لیے کچھ سنانے کی بات پر کم سن گلوکار ایک دم گھبرا گئیں۔ اس پر چاچا بولے۔ ”چلو بہادر شاہ ظفر کی غزل سنا دو۔“ غزل انہیں یاد تھی اس لیے ماسٹر جی کے سامنے اس کے دو چار شعر سنا دیے۔ ماسٹر جی نے بہت سراہا اور کہا۔ ”یہ لڑکی بہت آگے جائے گی۔“ یہ ماسٹر غلام حیدر ہی تھے جنہوں نے شمشاد بیگم کی آواز کو تراش خراش کر فلمی سنگیت کے اتار چڑھاؤ سے واقف کروایا۔ فلمی گانوں سے پہلے شمشاد بیگم کے کچھ گائے ہوئے گانے پرائیویٹ البمز کی صورت میں بازار میں آئے تو کافی پسند کیے گئے۔ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ 1935ء میں ان کا گایا ہوا بھجن ”اوم جے جگدیش ہرے۔“ کے ریکارڈ بازار میں آئے تو اس کی زبردست فروخت ہوئی مگر اس ہندو دھارمک سنگیت پر مسلمان ہونے کے ناتے ان کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ اس لیے ریکارڈز خریدنے والے کو پتا ہی نہیں چلا کہ یہ بھجن ایک مسلمان لڑکی نے گایا ہے۔ یہ ان کا پہلا سپر ہٹ البم تھا جس کے بعد ان کی معروفیت اتنی بڑھی کہ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد انہیں پڑھائی چھوڑ دینا پڑی۔ فلمی دنیا سے آفرز آنے لگیں، گلوکاری کے ساتھ ساتھ اداکاری کی بھی۔ ان کے سامنے بڑے اچھے مواقع تھے۔ کئی تجاویز ایسی تھیں کہ فلموں

شمشاد بیگم نے اپنی گلوکاری کے کیریئر میں جہاں پندرہ سو فلمی گانے گائے وہاں بے شمار غیر فلمی اور پرائیویٹ گیت اور نغمے بھی صدا بند کیے۔ اردو یا ہندی کے علاوہ پنجابی اور راجستھانی گیت بھی گائے۔ جہاں مسلم سانگز۔ مومنو رمضان کا ماہ مبارک آ گیا..... اور پیغام صبا لائی ہے گلزار نبیؐ سے، پڑھ کر عام مسلمانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا وہاں اوم جے جگدیش ہرے اور تری پوجن کو بھگوان بنا مندر جیسے بھجن گا کر بے شمار ہندوؤں کو بھی اپنے پرستاروں میں شامل کر لیا۔ غیر فلمی گانوں میں غزلیں بھی گائیں اور شادی بیاہ کے گیت بھی۔ فلمی گیتوں کو جہاں مشرقی موسیقی میں کامیابی کے ساتھ گایا وہاں مغربی طرز پر مبنی گیت گا کر بھی اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ گلوکاری کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات کے صلے کے طور پر 2009ء میں انہیں او پی نیر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی سال بھارتی سرکار نے پدما بھوشن کا تمغہ پزیرائی عطا کیا۔ آج کے دور میں بھی شمشاد بیگم کے گیتوں کا جادو کم نہیں ہوا ہے۔ نئے گلوکاروں اور موسیقاروں نے ان کے کئی گانوں کو ری مکس کر کے پیش کرنا شروع کر دیے ہیں یعنی نئی بوتل میں پرانی شراب کی طرح شمشاد بیگم کے گیت سنائی دے رہے ہیں۔ جس کے نشے میں نئی نسل تھرکتی نظر آتی ہے۔

میں کام کریں اور سارے گانے گائیں مگر ان کی سخت گیر اماں باوا کو یہ منظور نہیں تھا۔ دونوں بہت زیادہ محتاط تھے۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ابھی وہ صرف سولہ برس کی ہی ہوئی تھیں کہ ان کی شادی کردی گئی۔ والدین کی جانب سے برتی گئی سختی اور ہمیشہ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک جھجک شامل ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عام طور پر لوگوں سے ملنے، میڈیا پر انٹرویو دینے اور تصاویر بنوانے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔

1937ء میں ریڈیو پر گانے کا موقع ملا تو پشاور ریڈیو، لاہور ریڈیو کے ساتھ دہلی اور لکھنو ریڈیو اسٹیشنز کے لیے پروگرام کیے۔ تیس کی دہائی ختم ہوتے ہوتے وہ فلموں میں پوری طرح پلے بیک شروع کرچکی تھیں۔ لاہور کے مشہور فلم میکر پنچولی صاحب نے اپنے ادارے پنچولی آرٹس کے لیے بنائی جانے والی پنجابی فلم یملا جٹ کے گانوں کے لیے بلوایا۔ اس فلم کا پہلا سولو گانا آ سجناں وو دیں دل کے، چلیے پرلے پار کا میوزک ماسٹر غلام حیدر نے کمپوز کیا تھا۔ فلم کے باقی گانے بھی انہوں نے ہی گائے۔ یہ فلم 1940ء میں ریلیز ہوئی اور سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئی۔ 1941ء میں بنی خزانچی شمشاد بیگم کی پہلی ہندی (اردو) فلم تھی۔ یہ فلم پنچولی آرٹس کے بینر تلے لاہور ہی میں بنی تھی۔ ایک کلی نازوں کی پلی اور ساون کے نظارے ہیں سمیت فلم کے تمام نو گانے شمشاد بیگم نے گائے۔ جو بے حد مقبول ہوئے۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر اور نغمہ نگار ولی صاحب تھے۔ لاہور میں رہتے ہوئے شمشاد بیگم نے پنچولی آرٹس کی مشہور فلموں خاندان، زمیندار (ریلیز 1942ء) سرمایہ (ریلیز 1943ء) کے علاوہ شوری پکچرز کی نشانی (1942ء کے لیے گیت گائے۔ ان فلموں کے ساتھ ساتھ شمشاد بیگم کے گائے گانے بھی بہت مقبول ہوئے۔ بمبئی منتقل ہونے کے بعد ان کی فلمی مصروفیات دیکھتے ہی دیکھتے عروج پر پہنچ گئیں۔

آج کی طرح اس دور میں اتنی زیادہ گروپ بندی نہیں تھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بمبئی کی فلم انڈسٹری میں بھی دھڑے بندیاں پروان چڑھنے لگیں۔ نئی اور پرانی گانے والیوں کی سیاست کے نتیجے میں شمشاد بیگم کی ڈیمانڈ میں کمی آنے لگی۔ یہ سب کچھ وہ دیکھ رہی تھیں اور محسوس کررہی تھیں مگر اس کے خلاف انہوں نے کوئی عملی اقدام نہیں کیا۔ نہ اپنے جذبات کا اظہار کیا نہ شکوہ شکایت کی۔ نہ ہی کسی فلمساز، ہدایت کار یا موسیقار سے مدد اور تعاون کی درخواست کی۔ 1968ء میں ریلیز ہونے والی فلم قسمت میں او پی نیر کی موسیقی میں ترتیب دیا گیا گانا کجرا محبت والی ان کے کیریئر کا آخری گیت ہے۔ تاہم اس کے بعد پہلے کے گائے ہوئے کافی گیت ریلیز ہوئے۔ اس ضمن میں 1981ء میں ریلیز ہونے والا آخری فلمی گیت تھا۔ گنگا مانگ رہی ہے قربانی۔

جہاں شمشاد بیگم نے بہت کم عرصے میں بہت زیادہ خوشیاں سمیٹیں وہاں انہیں بڑے صدموں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ابھی ان کی عمر صرف 36 برس ہی تھی کہ 1955ء میں بیوہ ہوگئیں۔ ان کے شوہر گنپت لال بٹو پاکستان کے ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے تھے اور پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ شوہر کی موت سے وہ نڈھال ضرور ہوئیں لیکن ٹوٹ کر بکھری نہیں۔ انہوں نے گلوکاری جاری رکھی۔ ایسا کرنا ان کے اپنے لیے بھی فائدہ رساں ہوا اور فلم انڈسٹری کے لیے بھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو اپنی زندگی کو گھن لگا لیتیں جبکہ فلمی دنیا کو اس عرصے میں گائے گئے یادگار نغمے نہ ملتے۔ شوہر کے گزرنے کے بعد سے وہ اپنی بیٹی اوشا رترا کے ساتھ رہتی رہیں۔ 1971ء میں جب ان کے داماد لیفٹیننٹ کرنل یوگیش رترا کا ٹرانسفر بمبئی سے باہر ہوا تو تقریباً سات برسوں تک وہ بھی بیٹی داماد کے ساتھ جالندھر اور دور دراز کے کچھ فوجی علاقوں میں رہیں۔ بمبئی لوٹنے تک فلموں سے ان کا رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا تھا پھر آہستہ آہستہ وہ گھر کی چار دیواری تک سمٹ کر رہ گئیں۔

”فلم انڈسٹری میں ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس لیے کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کہ شمشاد بیگم کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟ شمشاد بیگم جو خود بھی میڈیا سے الگ تھلگ رہنے کی عادی تھیں انہوں نے بھی کسی کو بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں البتہ جب 23 اپریل 2013ء کو یہ خبر چھپی اور نشر ہوئی کہ بے شمار یادگار گیتوں کی گلوکارہ شمشاد بیگم 94 سال کی عمر میں بمبئی شہر میں انتقال کرگئی ہیں تو پوری دنیا میں ان کی سنہری آواز کے شیدائی غم سے نڈھال ہوگئے۔“

یہاں تک کہہ کر دادا جی خاموش ہوئے تو ان کے کمرے کا ماحول بھی بہت سوگوار تھا۔ دادا جی نے ہم دونوں کے چہروں پر اداسی کی پرچھائیاں دیکھیں تو بولے۔ ”ارے بھئی! اس دنیا میں جو آیا ہے اسے بہر حال یہاں سے جانا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج تم کل ہماری باری ہے

''اور پھر وہ لوگ جو یہاں سے کچھ کر کے کوئی کارنامہ انجام دے کر جاتے ہیں وہ تو مر کر بھی نہیں مرتے کیا شمشاد بیگم بھی مر سکتی ہیں؟ جب تک ان کی سنہری آواز فضا میں گونجتی رہے گی وہ اپنے لاکھوں کروڑوں چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ و تابندہ رہیں گی۔''

''بے شک۔'' ہم دونوں بیک وقت بولے تھے۔

''انشاءاللہ آئندہ نشست میں، میں ان کی مزید دلچسپ باتیں بتاؤں گا۔''

شمشاد بیگم کی موت کے ذکر نے ہم پر جو مردنی سی طاری کردی تھی سید صاحب کی مزے دار چائے سے اس کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہوا۔

غالباً میری طرح سید صاحب بھی شمشاد بیگم کے بارے میں مزید باتیں جاننے کے لیے بے تاب تھے اس لیے کئی روز بعد ہی مجھے آلیا اور بولے۔'' دادا ابو سے ملنے نہیں چلوگے؟''

''چلو چلتے ہیں۔''

جاتے ہوئے وہ گنگنا رہے تھے۔'' ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

''کاش تم سرنگیت سے اتنے دور نہ ہوتے اور شمشاد بیگم جیسی دلوں کو دیوانہ کردینے والی آوازوں سے پہلے ہی مل چکے ہوتے۔''

دادا جی نے ہمیں دیکھ کر کہا۔'' مجھے اندازہ تھا کہ تم لوگ جلد ہی واپس آؤ گے۔ اس لیے میں نے بھی اس کی تیاری وقت سے پہلے کرلی تھی۔''

''کیسی تیاری؟''

''ارے بھئی میں جو کچھ تم لوگوں کو بتاتا ہوں وہ یونہی تو نہیں ہانک دیتا۔ اس کے لیے مجھے پڑھنا پڑتا ہے۔'' وہ چند لمحوں کے لیے رکے پھر بولے۔'' بندہ جسے پیار کرتا ہے اس کے بارے میں مکمل جانکاری بھی تو ضروری ہوتی ہے۔ اپنی پسندیدہ گلوکارہ شمشاد بیگم کے متعلق میں نے بہت سا معلوماتی میٹر جمع کر رکھا ہے۔''

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پرستاری بشرط استواری کہ دادا جی بول پڑے۔''اس روز گفتگو شمشاد بیگم کی موت کے ذکر پر ختم ہوئی تھی نا؟''

''جی ہاں۔''

یوں تو شمشاد بیگم کے زیادہ تر مقبول نغمے موسیقار نوشاد، او پی نیر، ایس ڈی برمن اور ماسٹر غلام حیدر کی کمپوزیشن میں ریکارڈ ہوئے جن کے بول شکیل بدایونی، راجندر کرشن اور مجروح سلطان پوری نے لکھے جبکہ دیگر گیت نگاروں میں احسن رضوی (فلم شمع)، شیون رضوی (فلم شبنم)، عزیز کاشمیری (فلم بھنگڑہ)، بہزاد لکھنوی (فلم آگ) اور قمر جلال آبادی (فلم شبنم) کے نام نظر آتے ہیں۔

اسی طرح موسیقاروں میں جی ایم درانی (فلم شبنم)، نوشاد (فلم نغمہ اور زندگی یا طوفان)، ہنس راج بہل (فلم بھنگڑہ)، غلام محمد (فلم پگڑی)، رام گنگولی (فلم آگ) کے نام بھی شمشاد بیگم کے گانوں کی دھنیں تیار کرنے والے موسیقاروں میں شامل ہیں۔

ان کے پندرہ سو فلمی نغموں کی موسیقی ترتیب دینے والے موسیقار اور گیت لکھنے والے گیت نگار یقیناً اور بھی ہوں گے جن کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

''تو تمہیں یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ محترمہ اس سے پہلے بھی ایک بار مر چکی تھیں۔''

''جی......!'' ہمیں واقعی عجیب لگی یہ بات۔

''قصہ یوں ہے کہ اگست 1998ء میں ایک اخبار میں خبر چھپی کہ گلوکارہ شمشاد بیگم اللہ کو پیاری ہوگئی ہیں۔ یہ خبر کوئی معمولی خبر نہیں تھی۔ میڈیا میں گویا بھونچال آگیا۔ یہ وہ دور تھا جب شمشاد بیگم گمنامی کی دھند میں گم تھیں۔ خاصے عرصے سے کسی کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لہٰذا انہیں اپنے چاہنے والوں کی تسلی اور تشفی کے لیے منظر عام پر آکر بتانا پڑا کہ وہ مری نہیں زندہ ہیں۔ ایک پریس کانفرنس میں انہوں نے میڈیا سے شکوہ کیا کہ بغیر تحقیق و تصدیق کیے ایسی خبر چھاپنی نہیں چاہیے۔ میڈیا والوں نے بھی اپنی مجبوری ظاہر کی۔

''ہم کیا کریں...... کس سے تصدیق کریں آپ کا اتا پتا تو کسی کو معلوم نہیں کہ آپ کہاں ہیں۔''

تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ شائع ہونے والی خبر غلط نہیں تھی۔ کسی اخبار کے نمائندے کو خبر ملی تھی کہ شمشاد بیگم کا انتقال ہوگیا۔ دراصل یہ شمشاد بیگم دہلی کی مشہور مغنیہ تھیں۔ دلیپ کمار کی نانی ساس یعنی سائرہ بانو کی نانی اور نسیم بانو کی

والدہ تھیں۔ ہم نام ہونے کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔"

"اوہ۔" ہم دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

چند لمحوں کے بعد جب اس پُرلطف بات کا اثر کم ہوا تو سید نے دادا جی کو مخاطب کیا۔

"دادا ابو آپ سے ایک سوال پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

وہ کچھ شرماتے لجاتے ہوئے بولے۔"یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ شمشاد بیگم گپت لال بٹو کی بیگم کیسے بن گئیں؟"

"بہت اچھا سوال کیا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ تم لوگوں نے اس بارے میں کسی حیرت کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ اس کا سیدھا سادا سا جواب تو یہ ہے کہ دل لگا دیوار سے تو پری کیا کرے؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب بندہ یا بندی زیادہ روشن خیال ہو جائے تو مذہب کے حدود وقیود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا نام سنا ہے ناں؟"

"جی ہاں، انہیں کون نہیں جانتا۔"

"وہ ہندو تھیں یا مسلمان؟"

"مسلمان۔"

"درست...... ان کے شوہر شاہد لطیف بھی مسلمان تھے مگر ان دونوں کی دو بیٹیوں نے دو ہندو نوجوانوں سے بیاہ رچایا۔ یوں بھی فن اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے لوگ عشق ومحبت کے معاملے میں آزاد خیال ہوتے ہیں۔"

"تو شمشاد اور بٹو صاحب کے درمیان میں کوئی عشق وشق کا معاملہ تھا؟"

"بٹو صاحب نے جانے کب اور کہاں شمشاد بیگم کو دیکھا اور ان پر لٹو ہو گئے۔ شمشاد ان دنوں کم سن تھیں۔ صرف 15 سال کی، شکل وصورت بھی اچھی تھی جبھی فلم والے بھی انہیں اداکارہ بنانا چاہتے تھے۔ ہزار جان سے ان پر عاشق ہو گئے۔ وکیل تھے اس لیے اپنی چرب زبانی سے اس بھولی بھالی لڑکی کو 1937ء میں اپنی محبت کے جال میں جکڑ لیا۔"

"ان کے والدین بڑے سخت گیر اور مذہبی روایتوں پر چلنے والے تھے کیا انہوں نے اس موقع پر بیٹی کو روکا ٹوکا نہیں مخالفت نہیں کی؟"

"ماں باپ نے ہی نہیں خاندان بھر نے مخالفت کی مگر عشق کا بھوت جب سر پر سوار ہو تو کون کس کی سنتا ہے۔ بیٹی کے آگے انہیں اس لیے بھی ہتھیار ڈالنے پڑے کہ کماؤ پوت تھی۔ ان دنوں اس کی وجہ سے گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ ٹھیکے دار صاحب سال بھر میں اتنا نہیں کماتے تھے جتنا ان کی یہ بیٹی ایک کانٹریکٹ میں گھر لے آتی تھی۔"

بس شادی سے پہلے اس کڑی نے بٹو صاحب سے کچھ باتوں کا ایک معاہدہ کروالیا۔ جو یہ تھیں کہ وہ شادی کے بعد گانے سے منع نہیں کریں گے۔ نہ ہی یہ پابندی لگائیں گے کہ اپنے مسلمان گھر والوں سے نہ ملو اور نہ ہی اس بات پر مجبور کریں گے کہ اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارا دھرم اختیار کرلو۔ عاشق کے لیے ایسی باتیں، ایسی پابندیاں فضول ہوتی ہیں لہٰذا شمشاد پر لٹو ہونے والے بٹو صاحب نے صدق دل سے ساری باتیں قبول کرلیں اور 1934 میں ازدواجی بندھن میں بندھ گئیں۔

دونوں بڑی کامیاب ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن فلک کج رفتار سے ان کی خوشیاں زیادہ دیر تک دیکھی نہیں جاسکیں۔ ابھی ان کی عمر صرف 36 سال تھی کہ انہیں ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر گپت لال بٹو ایک خوف ناک حادثے کے نتیجے میں موت کا شکار ہو گیا۔

شوہر کی موت کا ان پر بہت اثر ہوا تھا۔ انہوں نے گانے کا سلسلہ ترک کردیا۔ گھر میں خاموشی کی زندگی گزارنے لگی تھیں کہ ایک دن محبوب خان آئے اور ان کو بہت سمجھایا کہ اس طرح تمہارا گھر میں بیٹھ جانا نہ تمہارے لیے بہتر ہے نہ ہمارے لیے۔ یعنی ہم فلم والوں کے لیے۔ خان صاحب نے جس محبت اور شفقت سے سمجھایا تھا اس کا اثر ان پر ہوا اور انہوں نے خود ساختہ ریٹائرمنٹ ختم کردیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب محبوب صاحب مدر انڈیا کی پلاننگ کر رہے تھے۔ نرگس کی شخصیت اور کردار کی ضرورت کے تحت انہیں کھلی آواز چاہیے تھی اور وہ جانتے تھے کہ شمشاد کے مقابلے میں کوئی دوسری گلوکارہ مدر انڈیا کے گانوں سے انصاف نہیں کرسکتی۔

شوہر کے انتقال کے بعد ان کا پہلا گانا مدر انڈیا کا ہی تھا۔ پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی جس کی ریکارڈنگ کے دوران میں بھی سازندے اور موسیقار رو رہے تھے مگر شمشاد بیگم کی آنکھوں میں نمی نہیں تھی۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں، رونے کے لیے سارا دن ساری رات پڑی ہے۔ گاتے وقت کیوں روؤں؟

ان کی بیٹی اوشا کا کہنا ہے کہ "جب میری شادی ہوئی تو ماں کا یہ گانا بجایا گیا۔ اس گانے پر میں پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔"

دادا جی ذرار کے اور ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''دیکھو مدر انڈیا کو بنے کتنے سال بیت گئے مگر اس گانے کی تر و تازگی آج بھی پہلے کی طرح موجود ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر آج بھی جب یہ گانا بجتا ہے تو دلہن والوں کے لیے اپنے دل کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شکیل بدایونی کے بول، نوشاد کی موسیقی اور شمشاد بیگم کی آواز نے اسے ایک امر، ایک ہمیشہ زندہ رہنے والا نغمہ بنا دیا ہے۔''

دادا جی ذرار کے تھے کہ میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ وہ محض ایک گلوکارہ تھیں اس کے باوجود فلم انڈسٹری والے ان کی بہت عزت کرتے تھے؟''

''صدفی صد درست ہے میاں۔'' دادا جی بولے۔ ''اس بات سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ فلم انڈسٹری میں جگت آپا کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کی عزت اور تکریم کے طور پر کوئی ان کے سامنے سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ لوگ اس کی عزت کرتے ہیں جو اپنی عزت کروانا جانتے ہیں۔ شمشاد بیگم خود بھی بہت ریزرو رہتی تھیں۔ وہ فلمی تقریبات میں شرکت کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ کسی فلم والے کو بھی محض ملنے ملانے کی غرض سے ان کے گھر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ وہ خود خوشامدی تھیں نہ دوسروں کی خوشامد پسند کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ نہ مجھے مکا مارو نہ میں کبھی کسی کو مکا لگاؤں گی۔'' ان باتوں کے باوجود وہ جونیئرز اور نئے آنے والوں کی رہنمائی کرتی تھیں۔ ایک وقت تھا جب موسیقار مدن موہن اور گلوکار کشور کمار ان کے کورس میں شامل ہوا کرتے تھے۔ مدن جی تو ان کے لیے کرسی اور چائے لاتے تھے اور کہتے تھے اگر کبھی میں میوزک ڈائریکٹر بن گیا تو آپ میرے گانے گائیے گا۔''

کشور کمار کے بارے میں ان دنوں وہ کہتی تھیں۔ ''تم ایک دن اپنے دونوں بھائیوں سے بڑے آرٹسٹ بنو گے۔''

اور پھر ایک وقت آیا کہ ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ کشور کمار نے انہیں یاد دلایا۔ ''آپا! آپ نے جو کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔''

او پی نیر جب لاہور میں تھے اور ان کا جب ابتدائی دور تھا تو شمشاد بیگم اور ان کے ساتھی آرٹسٹ انہیں چائے اور کیک وغیرہ لانے کے لیے کینٹین بھیجا کرتے تھے پھر یوں ہوا کہ نیر شمشاد سے پہلے بمبئی چلے گئے اور غربت میں آ کے چمکا، گمنام تھا وطن میں، کے مصداق یہاں ان کی قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور وہ ایک بڑے موسیقار بن گئے۔ انہوں نے اپنی فلم آر پار کے لیے اپنی شمشاد آپا کو یاد کیا اور ''میرا پہلا پہلا پیار'' ان سے ریکارڈ کروایا۔ اگرچہ یہ گانا پہلے آشا بھوسلے نے گایا تھا مگر نیر صاحب کو بھلا نہیں لگا اس لیے اسے نئے انداز سے شمشاد بیگم سے گوایا۔''

''شمشاد آپا بڑی خوش قسمت مغنیہ تھیں کہ ان کے کروڑوں پرستار کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔'' سید صاحب نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''میاں! اپنے آپ کو منوانا بڑا مشکل کام ہے۔ کوئی کسی کو یونہی نہیں چاہتا اس کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے بڑا پاپڑ بیلنا پڑتا ہے تب کہیں کوئی اپنے فن کو عروج تک پہنچاتا ہے۔'' کہہ کر وہ رکے ہم دونوں کی طرف مسکرا کر دیکھا پھر بولے۔ ''شمشاد بیگم جن کے بے شمار پرستار تھے وہ خود بھی کسی کی پرستار تھیں اور وہ خوش قسمت شخص تھا گلوکار و اداکار کندن لال سہگل۔ سہگل کی اداکاری اور گلوکاری سے سجی فلم دیوداس ریلیز ہوئی تو شمشاد کو یہ فلم اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے ایک دو بار نہیں چودہ بار یہ فلم دیکھی۔ سینما گھر جا کر اور ٹکٹ خرید کر دیکھی پھر ان کی زندگی میں ایسا وقت بھی آیا جب انہیں سہگل کی فلم میں بھی گانے کا موقع ملا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ جن فنکاروں کا کوئی پرستار ہوتا ہے اسے اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملے۔''

''دادا جی!'' میں نے انہیں مخاطب کیا۔ ''وہ کتنی خوش قسمت تھیں اور ہیں کہ آج دنیا میں موجود نہ ہونے کے باوجود آپ ان کی ایسی تعریف کر رہے ہیں۔''

''ارے میاں مجھ پر ہی کیا منحصر سنگیت سے پیار کرنے والے اور اس کے بھید بھاؤ جاننے والے بے شمار لوگ ان کی زندگی میں بھی ان کے گن گاتے تھے اور رہتی دنیا تک ان کی تعریفوں کے پل باندھتے رہیں گے۔ تم نے مبارک بیگم کا نام سنا ہے ناں؟''

''جی ہاں، وہ بھی آپا کے دور کی ایک گلوکارہ تھیں۔''

''بہت اچھی اور بڑی گلوکارہ۔'' دادا جی نے تائید کی پھر بولے۔ وہ شمشاد بیگم کے بارے میں کیا کہتی ہیں، سنو۔

''چاند کی کرنوں سی دودھیا اور چاندی کے سکوں جیسی کھنک سے لبریز آواز تھی شمشاد آپا کی۔ وہ اس دور کی گلوکارہ تھیں جب گانے کا مطلب پیسا اور شہرت نہیں تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی ہی دھن میں مست ہو کر اپنی اندرونی خوشی کو باہر نکالنے کے لیے گایا کرتی تھیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ان کے گائے ہوئے گیتوں کی مٹھاس

آج تک سامعین کے کانوں میں شہد گھول رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں آپا کے ساتھ 1955ء میں فلم اولاد کا گیت

آج گھر والے گھر میں نہیں بھیا

تا تھیا، تا تھیا

کی ریکارڈنگ کر رہی تھی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ آپا نے اس وقت مجھے پریشانی میں دیکھ کر ماحول کو اتنا خوشگوار اور پُرمزاح بنا دیا کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ ریکارڈنگ کب شروع ہوئی اور کب ختم ہوئی۔

''مبارک بیگم کا کہنا ہے شمشاد آپا کی گلوکاری کو جو مقام حاصل ہوا ہے اس کا صرف ایک راز ہے کہ وہ اپنے لیے گاتی تھیں۔ اس زمانے میں بھی فنکاروں میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ تھی لیکن انہوں نے اپنی مکمل توجہ صرف گلوکاری پر مرکوز رکھی جس کی چھاپ ان کے گیتوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی گلوکاری کا ایک الگ ہی انداز تھا۔ کجرا محبت والا آنکھوں میں ایسا ڈالا۔ جب وہ گاتیں تو ایسا لگتا تھا جیسے گیت کے بول میں ایک نمک آگئی ہو۔ وہ نہ تو خود کبھی نروس ہوتی تھیں نہ ہی اپنے سے چھوٹوں کو مایوس ہونے دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے مغل اعظم کی قوالی ''تری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے'' کی ریکارڈنگ کے لیے جب میں سیٹ پر بوسکی کا شلوار کرتہ پہن کر پہنچی تو شمشاد آپا نے بڑے پیار سے مجھے سوہنی کڑی کہا تھا۔ شمشاد آپا سے میں نے گلوکاری تو سیکھی ہی تھی لیکن اس سے بھی بڑی چیز جو سیکھنے کو ملی وہ تھی زندگی میں خوشیوں کو سمیٹنے کا فن۔''

''دادا جی دوسروں کی زبانی کہی ہوئی ان کی باتیں تو آپ نے بہت سنائیں۔'' سید صاحب بولے۔ ''خود ان کی زبانی کہی ہوئی کچھ باتیں بھی بتایئے۔''

''بیٹا دوسروں کے مقابلے میں وہ اپنی تشہیر سے بہت بھاگتی تھیں۔ طویل عرصے تک تو انہوں نے کسی فوٹوگرافر کو اپنی تصویر کھینچنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ ہی کسی صحافی کو انٹرویو دیا۔ آخری عمر میں جب وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ایک دو انٹرویوز دیے۔ ان میں بھی اپنے فن کے بارے میں بات نہیں کی۔ اپنے ابتدائی ایام کا ذکر کیا یا موجودہ دور کے متعلق کچھ ناپسندیدگی کی بات کی۔'' ایسے ہی ایک انٹرویو کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

''جب میں نے گانے کا کیرئر ختم کیا تب ماحول میں بہت گند ہو گئی تھی۔ جس سے میں دل برداشتہ تھی کیونکہ مجھ جیسے سینئرز کے مقابلے میں جونیئر سنگرز کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ کئی موسیقاروں نے میری آواز استعمال کر کے کامیابی حاصل کی لیکن بعد میں مجھے نظرانداز کر دیا مگر خدا مجھ پر مہربان رہا پورے کیرئر میں، میں نے کبھی کسی میوزک ڈائریکٹر سے کام یا مدد نہیں مانگی۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ ہیروئن پر فلمبند ہونے والا گانا ہی گاؤں گی۔ کسی معاملے میں شاعر، موسیقار یا ساتھی گلوکار سے لڑائی نہیں کی جب کبھی میں یہ سنتی ہوں کہ آج کی گلوکارائیں چھوٹے چھوٹے معاملے پر لڑ جھگڑ پڑتی ہیں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ ہمارے دور میں تو ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ سب مل جل کر کام کرتے تھے۔''

اپنے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ ''میں اگرچہ بہت کم پڑھی لکھی تھی مگر فلموں کے لیے اپنے گانوں اور گیتوں کو ہر طرح درست رکھنے کے لیے میں نے اردو تلفظ پر بہت توجہ دی۔'' اس کے لیے ایک قاضی کو استاد بنایا۔ اپنے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اس انٹرویو میں کہا۔ ''میں برقع پہن کر ریکارڈنگ کے لیے اسٹوڈیو جایا کرتی تھی۔ ان دنوں پشاور کی ہندو لڑکیاں گھونگھٹ نکالا کرتی تھیں جبکہ مسلم لڑکیاں برقع پہنتی تھیں۔''

1944ء میں جب وہ بمبئی منتقل ہو گئی تھیں تب اس دور کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں میں ''ہوم ٹاؤن لاہور، رمضان اور محرم کے مہینوں میں جایا کرتی تھی اور ان دو مہینوں میں فلمی گانوں کی ریکارڈنگ نہیں کرتی تھی۔ ماہ محرم کے دوران مجالس میں شرکت کرتی اور مرثیے پڑھتی۔ اس دوران میں قریبی رشتے دار اور جاننے والے اس کوشش میں رہتے کہ میں زیادہ سے زیادہ ان کے گھر رہوں۔ میرے لاہور آنے پر سبھی رشتے دار خوش ہو جاتے تھے۔''

اتنا کہہ کر دادا جی خاموش ہوئے تو میں نے کہا۔ ''اتنی مہان گائک تھیں، اس کے باوجود اپنی تعریف و توصیف کے بارے میں اشارتاً کنایتاً بھی کچھ نہیں کہا بس پرانے زمانے کی باتیں دہرا دیں یا نئے دور کی کچھ ناپسندیدہ باتوں کا ذکر کر دیا۔''

''یہی تو ان کی بڑائی بزرگی اور عظمت کی نشانی ہے۔ ان کے بارے میں تو جو دوسروں نے کہا ہے وہی بہت ہے۔ ان جیسوں کے لیے ہی سرور بارہ بنکوی نے کہا ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ

آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں''

معزول عثمانی حکمراں سلطان عبدالعزیز کی موت ایک ایسا راز ہے جو آج تک آشکار نہ ہوسکا۔ ذرا تصور کیجیے..... ایک محفوظ کمرے میں تنہا اور کئی پہرے داروں کی زیرِ نگرانی میں، جو کسی بھی دوسرے انسان کی دسترس سے دور ہو کسی کا قتل ہوجانا سوالات ضرور اٹھاتا ہے کہ آخر وہ کس طرح ہلاک ہوا.....؟ یا کیا گیا...؟ اسی سوال نے سب کو حیران کر رکھا تھا۔ محض مفروضے تھے اور قیاس آرائیاں، گویا ہر ایک کی اپنی رائے تھی مگر زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ایک قتل ہی

ایک پراسرار قتل جس نے سیاست کا رخ بدل دیا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تاریخ میں بے شمار بادشاہوں کے قتل کا ذکر ہے مگر وہ ایک ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کے قتل میں ملوث کئی افراد پکڑے گئے پھر بھی یہ مسئلہ حل طلب رہا کہ اسے قتل کس طرح کیا گیا کیوں کہ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند تھے۔

واردات ہے جسے انتہائی پیچیدگی اور مہارت سے عملی جامہ پہنایا گیا۔

سلطنت عثمانیہ کی بنیاد 699ھ میں عثمان خان اوّل کے ہاتھوں دولت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی۔ سلیم اول نے 699ھ میں مصر فتح کیا اور خلفائے عباسیہ کی بچی کھچی حکومت کا خاتمہ کر کے خلافت آل عثمان کی طرف منتقل کر لی اور پھر 1342ھ میں مصطفیٰ کمال نے آخری عثمانی فرمارواں عبدالمجید ثانی کی معزولی سے خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا۔

643 برس کی اس طویل مدت میں 37 فرماں رواں ہوئے، ان میں بایزید ثانی اور حکمراں سلاطین کہلائے لیکن سلطان سلیم اول سے عبدالمجید ثانی تک عثمانی تاجدار خلیفہ کہلاتے رہے۔

سلطنت عثمانیہ کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے ایشیا، افریقا اور یورپ تین براعظموں کا احاطہ کر رکھا تھا اور اس کی حیثیت زبان جیسی تھی جو بتیس دانتوں میں گھری ہوئی ہے۔

روس، برطانیہ، آسٹریلیا اور فرانس اس زبان پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ یہ ممالک اپنے مفادات کے لیے سیاسی و فوجی اشتراک کا مظاہرہ بھی کرتے۔

قسطنطنیہ میں تعینات ان کے سفیر سلطان وقت کے مزاج میں دخیل ہونے کی تگ ودو کرتے رہتے۔ وہ اکثر کوئی نہ کوئی فتنہ بیدار کر کے یا نیا ہنگامہ کھڑا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ترکی کی تاریخ میں سیاسی عجائب کی بہتات نظر آتی ہے۔

بعض مؤرخین اجنبی عورتوں سے عثمانی فرماں رواؤں کی شادیوں کو اس عظیم سلطنت کے عروج و زوال کا بنیادی سبب قرار دیتے ہیں۔

سلیمان اعظم کا عہد (975تا926) دولت عثمانیہ کا انتہائی عروج کا دور تھا۔ سلیمان تین براعظموں اور سات سمندروں پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی فوج اس قدر مضبوط تھی کہ یورپ کی متحدہ حکومتوں کو بری و بحری جنگوں میں بیک وقت شکست فاش دے سکتی تھی۔ اس کے باوجود سلیمان اعظم کے فوراً بعد سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو گیا۔

ترکی کی مشہور اہل قلم خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں کہ اس انحطاط کا سبب سلیمان اعظم کے آخری دور میں خود اس کی روسی نژاد بیوی خرم سلطان تھیں جسے اہل مغرب ”روکسیلانہ“ کہتے ہیں۔

سلیمان کے دل و دماغ پر اس روکسیلانہ کا ہی سکہ چل رہا تھا۔

اسی روسی بیوی کے بطن سے سلیمان اعظم کا ایک لڑکا سلیم تھا۔ انتہائی آوارہ، بدچلن اور شراب کا رسیا۔ اس کی ماں کی خواہش تھی کہ سلیم ہی ولی عہد قرار پائے۔ لیکن سلیمان کی دوسری بیوی سے مصطفیٰ نامی ایک بیٹا تھا جو سلیم سے بڑا ہونے اور بہتر فوجی و انتظامی قابلیت رکھنے کی بنا پر ولی عہد قرار پا چکا تھا۔ سلیمان نے روسی نژاد بیگم کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔

چنانچہ اس نے ایک سازش کے ذریعے سلیمان کو مصطفیٰ کی طرف سے بدگمان کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ خلیفہ کو یہ باور کرا دیا کہ مصطفیٰ اس کی زندگی میں ہی تخت و تاج پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

1553ء میں جب مصطفیٰ ایران کے خلاف جنگ کی تیاری کر چکا تو سلیمان نے اسے اپنے خیمے میں طلب کیا۔ اس بہادر بیٹے کو اس کے حکم سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

مصطفیٰ کا ایک چھوٹا بھائی بایزید تھا، بڑے بھائی کا یہ حشر دیکھ کر بایزید کو یقین ہو گیا کہ اس مکروہ سازش کا دوسرا شکار وہ خود ہوگا، لہٰذا اس نے مقابلے کی ٹھانی اور ایران میں پناہ لی، جہاں بالآخر 1561ء میں عثمانی کارندوں نے اسے قتل کر دیا۔ اب سلیم کے لیے تمام راہیں کھلی تھیں۔ چنانچہ سلیمان کے بعد 975ھ میں سلیم ثانی کے نام سے تخت پر بیٹھا اور اس کی انتہائی نالائقی اور عیش کوشی کے سبب سلطنت عثمانیہ میں انحطاط و زوال کا آغاز ہوا۔ اس مسئلے کو خالصتاً سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سلیمان اعظم جیسے مضبوط حکمران اور سیاست دان نے پہلی بیوی اور اولاد رکھنے کے باوجود اگر ایک روسی خاتون سے شادی کی تو اس کا مدعا یقیناً یہ تھا کہ اس رشتے سے روس کی وہ ریشہ دوانیاں کم ہو جائیں جو وہ عرصے سے کرتا چلا آ رہا تھا۔

دولت عثمانیہ کے دور عروج (...975ھ_1342ء) میں بہت کم حاکم ایسے تھے جو طبعی موت سے ہمکنار ہوئے۔ آئے دن فوجیں بغاوت کرتیں اور فرماں روا معزول کیے جاتے۔ ان میں اکثر کا انجام قتل ہوتا۔ مقتول یا معزول ہونے والے سلاطین کی فہرست میں سلطان عبدالعزیز کا نام بھی شامل ہے، جسے ارکان پارلیمنٹ نے معزول کیا تھا مگر وہ اپنے محل کے اندر مقتول پایا گیا۔ یہ قتل اس قدر پر اسرار تھا کہ تاریخ آج تک فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ خلیفہ نے خودکشی کی تھی یا انہیں قتل کیا گیا تھا۔

خلیفہ عبدالعزیز کے دور میں ترک وزرا نے یہ اندازہ کر

لیا تھا کہ وہ پوری طرح روس کے زیر اثر آچکا ہے اور سلطنت کا مفاد اس امر کا متقاضی ہے کہ موجودہ پالیسی میں اچانک اور فیصلہ کن تغیر لایا جائے۔ محبّ وطن ترک دیکھ رہے تھے کہ امور سلطنت روسی سفیر جنرل اغناتیف کے صلاح مشورے سے طے پانے لگے ہیں۔ جنرل اغناتیف سلطان اور وزیر اعظم محمود پاشا کو فضول خرچیوں اور رعایا پر بے جا سختی پر آمادہ کرتا اور دوسری طرف عیسائی رعایا کو حکومت کے خلاف اکساتا، اسی کی انگیخت پر بلغاریہ اور ہرزی گوینا میں فسادات برپا ہوئے کہ وزیر اعظم محمود پاشا نے سلطان کے مزاج میں دخل حاصل کرلیا تھا اور وہ خود اغناتیف کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا۔ غرض اس وقت جو تاریں باسفورس کے کنارے کٹھ پتلیوں کو حرکت میں لاتی تھیں، وہ درحقیقت سینٹ پیٹرز برگ سے کھینچی جاتی تھیں۔

محبّ وطن گروہ، وزرا، ارکان پارلیمنٹ نے خلیفہ پر دباؤ ڈال کر محمود پاشا کو برطرف کروادیا لیکن یہ کارروائی چنداں سود مند ثابت نہ ہوئی۔ روسی سفیر کی کارروائیاں زیر زمین منتقل ہوگئیں اور محمود پاشا اپنی برطرفی کے باوجود سلطان سے خفیہ رابطہ قائم رکھے رہا۔ یوں روسی سفیر کے "مشورے" برابر سلطان کو پہنچتے رہے۔

آخر کار وزرا نے اس امر پر اتفاق کیا کہ سلطان عبدالعزیز کے دماغی اور جسمانی قویٰ اس قدر کمزور ہیں کہ وہ خارجی سیاسی دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہوچکا ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ ان کا ملک ایک روسی صوبے کی حیثیت اختیار کرلے، بلاتاخیر کوئی قدم اُٹھانا انتہائی ضروری ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ سلطان کے ذاتی اخراجات ناقابلِ برداشت حد تک بڑھ چکے تھے۔ وزرا نے شیخ الاسلام سے رجوع کیا اور ان امور پر فتویٰ دینے کی خواہش کی۔

"اگر امیر المومنین میں، خبط، جنون اور امور مملکت سے ناواقفیت کے آثار ظاہر ہوں اور وہ اپنے ذاتی مصارف اس قدر بڑھادیں جس کی قوم متحمل نہ ہوسکے تو کیا امیر المومنین کی ذات قوم و سلطنت کو مصائب میں مبتلا کرنے کا باعث نہ ہوگی؟ اور ان وجوہات کی بناء پر انہیں معزول کیا جاسکتا ہے؟"

شیخ الاسلام نے ان دونوں امور کے حق میں فتویٰ صادر کردیا۔ یوں خلیفہ عبدالعزیز کسی فساد، مزاحمت اور خوں ریزی کے معزول کردیئے گئے۔

20 مئی 1876ء کو انہوں نے وہ محل چھوڑ دیا جہاں وہ خلیفہ کی حیثیت سے مقیم تھے اور اس محل میں منتقل ہوگئے جس میں وفات پائی۔ منتقلی کے پندرہ دن بعد وہ پُراسرار واقع پیش آیا جسے "لاینحل" یعنی قتل یا خودکشی کا نام دیا گیا۔

4 جون 1876ء کا دن ہے۔ معزول سلطان عبدالعزیز اپنے خاص کمرے میں ایک بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہے۔ چہرے پہ اُداسی اور مایوسی کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوب صورت چمکدار قینچی ہے جس سے بظاہر وہ اپنی چھوٹی گھنی داڑھی کی تراش خراش میں مصروف ہے۔ اس کی نظریں سامنے والی کھڑکی سے آبنائے باسفورس کے دلفریب نظارے میں سکون و طمانیت کی تلاش میں گم ہوجاتی ہیں جہاں ممالک غیر کے دیوہیکل جہاز لنگر انداز ہیں اور جن کے درمیان چھوٹی کشتیاں سطح آب پر رواں دواں نظر آرہی ہیں چند لمحے اس کیفیت میں گزرتے ہیں اور پھر وہ اپنی داڑھی کی اصلاح میں لگ جاتا ہے، اسی دوران میں اچانک دائیں جانب کے دروازے پر ایک ہلکی سی آہٹ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلیتی ہے۔ وہ اپنا سر دائیں طرف گھماتا ہے۔ دروازے کے شیشے سے حرم کی ایک عورت کو اندر جھانکتے ہوئے پاتا ہے۔ اس کی سہمی ہوئی متجسس نظریں معزول خلیفہ کے سراپے کا جائزہ لے رہی ہیں۔

سلطان گھبرا جاتا ہے اور اضطراب کی حالت میں قدم دروازے کی طرف بڑھاتا ہے۔ وہ چمکدار آنکھیں دروازے کے شیشے سے اچانک غائب ہوجاتی ہیں، وہ بڑھ کر دروازہ اندر سے بند کرلیتا ہے۔ پھر اپنی جگہ آہستہ آہستہ واپس آتا ہے اور اپنا کام کرنے لگتا ہے مگر اب یہ مصروفیت دراصل ایک اضطراری سی کیفیت ہے۔ اس کی پریشان اور متوحش سی نظریں بار بار دروازے کی طرف اُٹھتی ہیں۔ وہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ اب کوئی اس کی نگرانی تو نہیں کررہا۔ ایک گھنٹا گزر جاتا ہے۔ وہی آنکھیں دروازے کے شیشے پر نمودار ہوتی ہیں لیکن اب آئینے کے سامنے سلطان موجود نہیں ہے۔ دیکھنے میں اب کمرے کی فضا بوجھل محسوس ہوتی ہے اور ایک خوف ناک سا سکوت طاری ہے۔ محافظ آنکھ کمرے کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے گردن اُونچی کرکے اپنی پیشانی شیشے سے پیوست کردیتی ہے اور پھر وہ ایک ایسا تاب نہ لانے والا منظر دیکھتی ہے کہ اس کا پورا جسم خوف سے شل ہوجاتا ہے۔ اس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلتی ہے، جس سے محل کے در و بام لرز اٹھتے ہیں۔ غلام گردشوں سے ہوتی ہوئی یہ چیخ حرم سرائے سلطانی تک جا پہنچتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے خواتین حرم روتی چلاتی آتی ہیں کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ دروازہ توڑ دیا جاتا ہے۔

گریاں و ترساں عورتیں اندر داخل ہوتی ہیں۔ معزول سلطان عبدالعزیز کوچ پر پڑا ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ جیسے ابدی سکون کی نیند سو رہا ہو۔ ایک بازو عریاں حالت میں ایک جانب لٹک رہا ہے، قینچی ابھی تک اس کی انگلیوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ چند عورتیں بے تابانہ لاش پر گرتی ہیں مگر فوراً ہی خوف سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ ان کے ہاتھ اور لباس خون سے تر ہو جاتے ہیں۔ تمام کوچ پر خون پھیلا ہوا ہے، لیکن جسم پر بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آتا۔ خواتین کے نالہ و آہ بلند تر ہونے لگتی ہیں لیکن انہی میں ایک ضعیف عورت ایسی بھی ہے جو صبر و ضبط کا پیکر بھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں مگر دل اندر سے پاش پاش ہو چکا ہے۔ یہ باوقار خاتون متوفی سلطان کی ماں ہے۔ وہ بے ہنگم، بے مقصد شور و غوغا پسند نہیں کرتی اور آگے بڑھ کر تمام عورتوں کو کمرے سے باہر چلے جانے کا حکم دیتی ہے۔ پھر اپنے بیٹے کی موت کا سبب معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ وہ تمام جسم کو بہ غور دیکھتی ہے۔ کوئی زخم دکھائی نہیں دیتا۔ ایک بازو عریاں اور لٹکا ہوا ہے اور زخمی ہے، دوسرا بازو بھی بہ غور دیکھا جاتا ہے۔ اس بازو میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہے جو قینچی سے بنایا گیا معلوم ہوتا ہے۔ سر کہنی کے اندر کی طرف عین اس مقام پر ہے جہاں بڑی رگ ابھری ہوتی ہے۔ اسی رگ کے کٹنے اور خون بہہ جانے سے موت واقع ہوئی ہے۔

محل کے خواجہ سراء طلب کیے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں سلطان عبدالعزیز کا مردہ جسم ایک گرد آلود چھوٹے سے کمرے میں لے جاکر موٹے سے کمبل پر رکھ دیا گیا۔ ایک سپاہی وہاں پہرا دینے لگا۔

افسوس! جو شخص چند روز پہلے دنیا کی ایک عظیم سلطنت کا خود مختیار حاکم اور دین اسلام کا خلیفہ تھا، مشرق کی کنجیاں جس کی جیب میں پڑی رہتی تھیں اور جس کے ایک معمولی اشارے پر دس لاکھ دلیران جنگ آزما، مغربی دنیا پر خوفناک تباہی مچا سکتے تھے، آج وہ اس کسمپرسی اور عبرت کے عالم میں پڑا تھا۔

سلطان عبدالعزیز کی موت کے بارے میں دو خیالات گشت کرنے لگے۔ ایک تو یہ کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ یہ خیال باغی گروہ کی جانب سے ظاہر کیا جانے لگا۔ دوسرے یہ کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔

اس خیال کے حامی عوام تھے۔ قتل کا شبہ مدحت پاشا پر کیا گیا، جو باغی گروہ کا لیڈر تھا۔ بعد میں ایک باقاعدہ عدالت لگی۔ اس نے گواہوں کے بیانات کی روشنی میں سب ملزموں کو مختلف درجے مجرم قرار دے کر انہیں سزائیں دیں، سلطان عبدالعزیز کی زندگی کے آخری چند گھنٹوں میں جو کچھ اس کمرے کے اندر حقیقت میں پیش آیا وہ ہمیشہ کے لیے ایک سربستہ راز اور بحث طلب مسئلہ بن کر رہ گیا۔

عبدالعزیز کی معزولی کے بعد مراد کو خلیفہ تسلیم کیا گیا، مگر جلد ہی یہ بات ظاہر ہوگئی کہ نیا سلطان کمزور اور ناتجربے کار تھا وہ دائمی مریض بھی تھا۔ اس کا وہ مرض جو آرام و سکون کی زندگی میں چھپا رہا تھا، امور حکومت کی انجام دہی سے چند ہی روز میں ظاہر ہونے لگا۔

چنانچہ دو ماہ بعد اگست 1876ء میں اسے معزول کرکے اس کے چھوٹے بھائی عبدالحمید کو خلیفہ بنا گیا، سلطان عبدالحمید ایک بیدار مغز، انصاف پسند اور امور مملکت کی ”نزاکتوں“ کو سمجھنے والا حکمران تھا۔ انہیں ابتدائی اُلجھنوں سے فراغت ملی تو متوفی عبدالعزیز کا بیٹا یوسف عزالدین خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے خود کو سلطان کے قدموں میں گرا دیا اور زار و قطار روتے ہوئے اپنے مظلوم باپ کے قاتلوں سے قصاص لینے کی درخواست کی۔ چنانچہ خلیفہ نے تحقیقات کا حکم دے دیا۔

تحقیقاتی جماعت کے فرائض کی تکمیل میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ ارتکاب جرم کو مدت گزر چکی تھی۔ مجرم اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ گواہ دوسرے مقامات میں منتقل ہو چکے تھے۔ حرم کی عورتیں محل سے چلی گئی تھیں، ایک دو کنیزوں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ ان میں سے کئی نئے شوہروں کے ساتھ دوسرے شہروں میں قیام پزیر تھیں۔ نشانات جرم بالکل معدوم ہو چکے تھے۔ مقتول کے پوسٹ مارٹم کی کوئی رپورٹ فائل میں موجود نہیں تھی۔ تحقیقاتی ٹیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی تحقیقات کا آغاز کہاں سے اور کیسے کرے؟ حتیٰ کہ وہ فیصلہ بھی نہیں کرسکی کہ تفتیش کی ابتداء قتل کے نقطہ نظر سے کی جائے یا خودکشی کے شواہد تلاش کیے جائیں؟ جبکہ خود متوفی کے بیٹے کو اس گھناؤنی سازش کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ صرف افواہیں تھیں۔ یا پھر عوام الناس کے مختلف النوع خیالات۔ ثبوت کسی کے پاس نہ تھے۔

بہر طور۔ سب سے پہلے وہ عورت ڈھونڈی گئی جس نے حرم کو اس حادثے کی اطلاع دی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ بیان کردیا۔ اس سے جرم کا سراغ لگتا تھا نہ مجرموں کی نشاندہی ہوتی تھی۔ تحقیقاتی ٹیم جب اس کمرے میں پہنچی جہاں متوفی عبدالعزیز حفاظتی پہرے میں رہائش پزیر تھا تو کوئی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ یہ وہی کمرا ہے جس میں معزول

خلیفہ نے جان دی تھی۔ وہاں کا ایک ایک ذرہ تبدیل کیا جا چکا تھا۔ قریب تھا کہ تحقیقات کا سلسلہ تعطل کا شکار اور مقتول کا خون ناحق رائگاں جائے مگر اس کائنات میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کی لاٹھی بے آواز ہوتی اور وہ ایسے اسباب پیدا کر دیتی ہے کہ جس سے بھٹکے ہوئے انسان کو صحیح راہ نظر آنے لگتی ہے۔

چنانچہ انہی دنوں اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے نہ صرف تحقیقات کی صحیح راہ متعین ہو گئی بلکہ اس ڈرامے کے مرکزی کردار پوری طرح گرفت میں بھی آ گئے۔

سلطان عبدالعزیز اور سلطان مراد کو جب معزول کیا گیا تھا تو معزولی کی ایک بڑی وجہ محل کے اخراجات میں بے انتہا زیادتی بتائی گئی تھی۔ سلطان عبدالحمید تخت پر بیٹھے تو انہوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دی اور غیر ضروری اخراجات کم کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی کہ وہ اس سلسلے میں سفارشات پیش کرے۔

کمیٹی کو تحقیقات کے دوران تین ایسے اشخاص کا پتا چلا جو انتہائی معمولی کاموں پر معمور تھے اور ہر ماہ ایک ایک سو پاؤنڈ تنخواہ لیتے تھے، جب یہ بات قتل کی تحقیقاتی ٹیم کے علم میں آئی تو ان تین آدمیوں پر شبہ کرنا لازمی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان مراد کے تخت نشین ہوتے ہی بلاضرورت تین اشخاص کا غیر اہم امور اور اس قدر مشاہرے پر ملازمت پانا بلا سبب نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہ کسی خفیہ مد میں ادائیگی کی صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک یا تینوں کا تعلق واردات قتل سے ہو سکتا ہے، چنانچہ ان تینوں کو بھی تفتیش میں شامل کر لیا گیا۔ غیر ضروری عہدوں پر تعیناتی اور اس قدر خطیر رقم تنخواہ پانے کا وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکے تھے۔ ان میں سے مصطفیٰ پہلوان نے اقرار کیا کہ۔

”یہ تنخواہیں دراصل انہیں اس خدمت کے عوض مل رہی تھیں جو انہوں نے عبدالعزیز کے قتل میں انجام دی تھیں“۔

دوسرے ملازم حاجی محمد آغا نے اس کی تصدیق کی۔ پھر تینوں نے کھلے الفاظ میں بیان دیا کہ۔

”ہم تینوں سے نوری پاشا نے حلف لیا تھا جو وزرا کی ایک کونسل کا رکن ہے، اس وزارتی کونسل نے سلطان کو قتل کرنے کے بعد کئی شہزادے بھی موت کے گھاٹ اُتارنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس غرض کے لیے ان سب کو ایک مشترکہ دعوت میں مدعو بھی کیا گیا تھا لیکن شہزادوں نے سازش کے شبہے کی بنا پر وہاں جانے سے احتراز کیا۔“

مصطفیٰ پہلوان نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ محمد جلال نے اقرار بھی کیا تھا کہ وہ مجھے اور دو اشخاص کو ایک ایک سو پاؤنڈ ماہوار دلائے گا۔ بشرطیکہ ہم اس چاقو سے جو جلال ہمیں دے گا عبدالعزیز کی رگ کاٹ کر ہلاک کر دیں۔ پھر نوری پاشا نے اس کی تصدیق کی اور ہمیں یقین دلایا کہ اگر تم ایسا کر گزرو تو وہ وعدہ پورا کیا جائے گا۔ پھر ہم سے رازداری کا حلف لیا، اور تینوں کو تیس تیس پاؤنڈ نقد بہ طور انعام اسی وقت ادا کیے گئے تھے۔

جب اس سے واردات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے بتایا۔

”قتل کی واردات کرنے کے لیے ہمیں گارڈ روم میں لے جایا گیا۔ ہم نے رات وہاں بسر کی۔ صبح ہمیں گارڈ روم کے افسروں نجیب بے اور علی بے نے متوفی سلطان کے محل میں داخل کیا اور خود دروازے پر نگرانی کرتے رہے، نوری بھی واردات کی نگرانی کرنے کے لیے ہمارے ساتھ تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق قتل عمل میں آیا۔ خود نوری نے سلطان کو شانوں سے پکڑ رکھا تھا۔ محمد جلال اور حاجی محمد آغا نے سلطان کی ٹانگیں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھیں اور میں نے سلطان کے دونوں بازوؤں کی رگیں کاٹ ڈالیں۔“

اس لرزہ خیز انکشاف بہیمانہ سے تحقیقاتی ٹیم اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ واردات خودکشی کی نہیں بلکہ سربہ سر قتل ہے۔ ان تینوں ملازموں کے بیانات سے کچھ مشتبہ افراد کی فہرست بن گئی۔ اور بعض ایسے افراد بھی نظر میں آ گئے جن سے وقوعہ کے متعلق امور یا افراد کی تصدیق کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ان لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ابراہیم آفندی سلطانی محل کا افسر تھا۔ سلطان مراد نے اس افسر کے ذریعے معزول سلطان عبدالعزیز تک ایک پیغام اسی وقت بھیجا تھا جب وہ معزولی کے بعد اس محل میں مقیم تھا جہاں اسے قتل کیا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں ابراہیم آفندی نے اس ظلم کی تصدیق کی جو عبدالعزیز، علی بے کے ہاتھوں برداشت کر رہا تھا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وزارتی کونسل کی اجازت کے بغیر کھانا تک معزول سلطان کو نہیں ملتا تھا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ قتل کے تینوں مرتکب وزارتی کونسل سے خفیہ طور پر ملے تھے۔

میجر احمد آفندی اور جنرل عثمان پاشا نے حلفیہ کہا کہ قتل کی صبح پچھلی رات علی بے، سلطان کے محل سکوت میں دیکھا گیا تھا۔ مارتیل آفندی نے جو ان اطباء میں سے تھا، جنہوں نے بعد مرگ عبدالعزیز کے جسم کا معائنہ کیا تھا، حلفیہ طور پر بیان دیا

کہ میں اور میرے ساتھیوں نے متوفی سلطان کے صرف بازوؤں، ہاتھوں اور سر اور چہرے کا معائنہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں سرکاری طور پر کسی قسم کی تحقیقات ہوئی نہ پوسٹ مارٹم کیا گیا۔

تحقیقاتی ٹیم نے شکوک و شبہات ختم کرنے کے لیے اطباء سے یہ سوال کیا۔

''ایک شخص اگر اپنے بازو کی ایک رگ کاٹ ڈالے تو کیا وہ اس زخمی ہاتھ سے اپنے دوسرے بازو کی رگ کاٹ سکتا ہے؟''

اطباء نے متفقہ طور پر کہا کہ یہ ممکن ہی نہیں کیوں کہ زخمی بازو بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔

مدحت پاشا روسیوں کے خلاف انگریزوں اور ان کی حکمت عملی کا بڑا مدح تھا۔ اس پر انگریز سفیر کا اثر غالب تھا۔

مدحت پاشا اس وزارتی کونسل کا سرغنہ تھا جو اسی مقصد کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ کونسل کی پشت پناہی باغی کر رہے تھے اور اسی کے حکم سے تمام امور انجام پاتے تھے۔ اس کونسل نے عبدالعزیز کے قتل کا منصوبہ بنایا اور اس ''واردات'' کو خودکشی کا رنگ دیا۔ سب سے آخر میں جب مدحت پاشا کو جرح کے لیے بلایا گیا تو اس نے کابینہ کے اندر کسی بھی ایسی کونسل کے وجود سے صاف انکار کر دیا جس کے حکم سے یہ کام انجام پایا تھا۔ اس نے اس سے بھی انکار کیا کہ معزول خلیفہ کے قتل کا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا۔ البتہ اتنا اقرار کیا کہ سلطان کے قبضے سے ہر قسم کا اسلحہ واپس لینے کا حکم ضرور صادر ہوا تھا۔

اب صرف یہ معما حل طلب تھا کہ قاتل، متوفی عبدالعزیز کے اس خاص کمرے میں پہنچے کس طرح تھے جس کے گرد ہمیشہ حفاظتی پہرہ لگا رہتا تھا؟ یہ معما ایک اور واقعہ نے حل کر دیا جو سلطان کی ہلاکت کے دس روز بعد پیش آیا تھا۔

مجلس وزرا کا اجلاس جاری تھا کہ ایک نوجوان سرکاش جو افسر چوکی تھا، اچانک اندر داخل ہوا اور اس نے حسین عونی نامی فوجی افسر کو، جو سلطان کی موت کے وقت محل کے محافظ دستے کا انچارج تھا، گولی کا نشانہ بنا دیا، پھر اس کے ساتھی رشید پاشا کو قتل کیا۔ اس کے بعد اس نے بحریہ کے وزیر کو نشانہ بنانا چاہا مگر کچھ لوگ آڑے آئے اور اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

وزیر بحریہ اور اسے بچانے والے زخمی ہوئے۔ تفتیش سے اس حملے کی وجہ معلوم ہوئی کہ حملہ آور متوفی عبدالعزیز کا سالا تھا۔ اور اپنے بہنوئی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس نوجوان کو حسین عونی کے شریکِ جرم ہونے کا یقین تھا۔

تحقیقات سے پتا چلا کہ حسین عونی نے قتل کی رات محل کے پرانے گارڈ ہٹا کر نئے گارڈ تعینات کر دیئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ باغیوں نے اُجرتی قاتلوں سے ''معاملہ'' طے کرنے کے بعد حسین عونی سے رابطہ کر کے اسے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ قاتلوں کو محل تک لے جانے کی راہ دے گا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

27 جون 1881ء کو قسطنطنیہ میں ایک خاص عدالت نے (جس کا صدر ایک عیسائی تھا) اس مقدمے کی سماعت کا آغاز کیا۔ ترکی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ جب کسی اہم سیاسی مقدمے کی کارروائی کھلی عدالت میں انجام پائی۔ ہر خاص و عام کو شرکت کی اجازت تھی حتیٰ کہ غیر ملکی صحافی بھی کارروائی دیکھنے کے مجاز تھے۔ عدالت میں بیشتر غیر ملکی سفیر اور ان کے نائب بھی موجود ہوتے تھے۔

فردِ جرم اور اس کی تفصیل بے حد طویل تھی۔ اسے پڑھنے میں پورے ڈھائی گھنٹے صرف ہوئے، استغاثہ کے تمام گواہ بالترتیب عدالت کے سامنے پیش کیے گئے۔ اُنھوں نے اپنے بیانات میں وہی کچھ کہا جو تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے کہہ چکے تھے۔ ایک مصطفیٰ پہلوان ہی ایسا گواہ تھا جس نے کمیٹی کے سامنے قتل یا معاون ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود عدالت میں اپنے سابقہ بیان سے انحراف کیا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے یہ بیان دیا تھا کہ نوری پاشا نے مجھ سے اور میرے دوستوں سے حلف لے کر ہمیں سلطان کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور ہم نے ایسا ہی کیا لیکن بدقسمتی سے خلیفہ نے دوسرے روز ہی خودکشی کر لی۔''

عدالت نے سوال کیا۔ ''کیا تم سلطان کے قتل میں شامل تھے؟''

مصطفیٰ نے کہا ''نہیں۔ میں نیچے تھا مگر شور سنتے ہی میں دوڑتا ہوا اوپر گیا اور اس شور کا سبب معلوم کیا۔''

''مگر تم اس کے عین برعکس اقبالِ جرم کر چکے ہو۔''

''مجھ سے غلطی ہوئی تھی۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ مگر میرے خیال میں وہ بالکل مر چکا تھا۔''

آخر میں عدالت نے مدحت پاشا کو طلب کیا۔ اس کے عدالت کے کمرے میں داخل ہوتے ہی حاضرین میں ایک ہیجان سا برپا ہوا۔

وہ بڑی متانت سے جرح کے جواب دیتا رہا۔ اس نے عدالت سے کہا کہ مکمل تحقیقات سے قبل مجھے مجرم گردان کر زیادتی کی گئی ہے مگر ساتھ ہی سلطان وقت کی اس انصاف کی تعریف بھی کی کہ جلالت مآب نے میرے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم دیا ہے۔

اس نے مجلس وزرا کے اندر ایک خاص کونسل کی موجودگی اور سلطان کے قتل کا حکم دیئے جانے سے صاف انکار کیا۔ جب اس سے پوچھا گیا۔ ”کیا ہر قسم کا حفاظتی اسلحہ سلطان کے قبضے سے لیے جانے کا کوئی حکم کونسل نے دیا تھا؟“ تو اس نے اس کا اقرار کیا۔

مدحت پاشا نے مزید کہا کہ جونہی سلطان کے خودکشی کرنے کی خبر میں نے سنی مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ مجھ پر قتل کا شبہ کیا جائے گا۔

عدالت نے ایک آخری چبھتا ہوا سوال کیا۔ ”تم نے با ضابطہ تحقیقات کا اور لاش کے پوسٹ مارٹم کا حکم کیوں نہیں دیا؟“

تو اس کے جواب میں اس نے کہا۔ ”یہ میرا ہی کام نہ تھا، اور وزیر بھی تو تھے۔ اگر مجھ پر یہ الزام عائد ہو سکتا ہے تو دوسرے وزراء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔“

آخر میں وکلائے صفائی نے جو کچھ کہا وہ مقدمے کا اصل رخ نمایاں کرنے کے لیے کافی تھا۔ مثلاً مصطفیٰ پہلوان کے وکیل رفیع آفندی نے خودکشی کے امکان سے پہلوتہی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا مؤکل عملاً مجرم ہے لیکن قانوناً مجرم نہیں کیوں کہ اس نے صرف دیئے گئے احکامات کی تعمیل کی ہے۔ وہ ایک ایسا عامل تھا جسے کوئی ظالمانہ حکم بجالانے پر مجبور کردیا گیا ہو۔“

اقبالی ملزم کے وکیل نے کہا۔ ”اگرچہ میرا مؤکل اقبال جرم کرنے کی وجہ سے قتل کا مجرم ٹھہرتا ہے تو بریت کا مستحق بھی ہے، کیوں کہ وہ ادنیٰ حیثیت میں اعلیٰ حکام کی تعمیل بھی کر رہا تھا۔“

اس نے یہ نکتہ بھی اُٹھایا کہ گواہوں کے بیان کی رو سے قتل ہوا ہی نہیں۔ اس کی دلیل اس نے یہ پیش کی کہ اقبالی ملزم بیان کرتے ہیں قتل ایک چاقو کے ذریعے ہوا۔ جو نوری پاشا نے مہیا کیا تھا مگر اطبا کا بیان ہے کہ زخم قینچی کی نوک سے لگائے گئے تھے۔

عدالت نے ملزمان کو مختلف دفعات کے تحت مجرم قرار دیا اور اسی مناسبت سے انہیں سزائیں سنائیں۔

عدالتی فیصلے کے بعد قتل اور خودکشی کی ”بحث“ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانی چاہیے تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک فریق ہنوز اس واردات کو خودکشی کا واقعہ باور کرانے پر تُلا ہوا تھا۔ مجرموں کی کھلی عدالت میں سزا پانے سے روسی لابی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ لابی اپنے زخم چاٹنے اور خفت مٹانے پر مجبور تھی۔ برطانوی پریس اور اہل قلم نے مقدمے کی کارروائی کو ایک ڈراما ثابت کرنے کی کوشش جاری رکھی اور ان میں سر ہنری رالیٹ کا نام سرفہرست ہے۔

وہ قسطنطنیہ میں سفیر رہ چکا تھا۔ اس نے سلطان عبدالعزیز کے قتل کو خودکشی ثابت کرنے پر اپنا تمام زورِ قلم صرف کر ڈالا۔

اس نے خودکشی کی نفسیاتی وجوہ تلاش کرتے ہوئے مقتول سلطان کی ذات میں دیوانگی کے اثرات کھوج نکالے۔

برطانوی خاتون این ڈی لوسکنان نے سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت پر ایک جامع کتاب لکھی اور اس مقدمے پر بحث کرتے ہوئے اسے قتل کی واردات قرار دیا۔

موصوفہ نے دس برس مشرق میں گزارے سلطنت عثمانیہ کے سرکردہ منتظمین سے رشتہ مودت رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے لکھا۔ ”میں آج تک کسی ایسے ترک سے نہیں ملی جسے خلیفہ عبدالعزیز کے قتل ہونے پر ذرا سا بھی شبہ ہو۔“ اس نے یہ بھی تحریر کیا۔

”تھوڑا ہی عرصہ گزرا ہے کہ عبدالعزیز کی ایک بیوہ نے جواب ایک بڑے عہدے دار سے شادی کر چکی ہے۔ مجھ سے بیان کیا کہ اس تمام بحث و مباحثے اور مغز ماری سے کیا فائدہ؟ جبکہ ہم سب ہی اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔“

ہنری ایلیٹ نے سلطان میں پاگل پن کے آثار ثابت کرنے کے لیے مبینہ طور پر اس کی عجیب عادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔

”وہ اس سرکاری کاغذ پر دستخط نہیں کرتا تھا جو سرخ روشنائی سے نہ لکھا گیا ہو۔ بعض اوقات سلطان کسی ایسے کاغذ پر جو سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہو، نظر تک نہ ڈالتا تھا۔ اس لئے ہر کاغذ اس کے سامنے پیش کیے جانے سے پہلے سرخ روشنائی سے نقل کیا جاتا تھا۔ اس طرح غیر ممالک میں تعینات ہونے والے عثمانی سفیر بروقت اپنے مقام تک نہیں پہنچ سکتے اور انہیں تا دیر انتظار کرنا پڑتا۔ کیوں کہ غیر ملکی حکمرانوں کے نزدیک سرخ روشنائی سے مندرجات و مراسلات کرنا بے قاعدہ تھے۔“

شہزادی این ڈی لوسکنان نے بعد میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا۔ ”حیرت ہے کہ سر ہنری۔ جو قسطنطنیہ میں

عرصہ دراز تک معتبر ایلچی رہا، اس امر سے ناواقف تھا کہ ترک سفراء کے نامزد سفارت پر سلطان کبھی دستخط نہیں کرتا تھا بلکہ یہ اسناد باب عالی کی جانب سے جاری کی جاتی ہیں۔ پھر مختلف سلطنتوں کے سرکاری کاغذات پر سرخ روشنائی ہی استعمال کی جاتی رہی ہے۔"

اس کی تائید میں اس نے بازنطینی شہنشاہیت کے دور میں مخصوص لال رنگ کا ذکر کیا، اس نے مزید لکھا۔" اگر بادشاہوں ....کی ذرا سی احتیاط سنجیدہ بحث میں ان کے پاگل پن پر محمول کی جانے لگے تو پھر دیکھنا ہوگا کہ خود یورپ کے تاجداروں میں سے کتنے پاگل خانوں کی دیواروں سے باہر رہ سکیں گے"۔

سرہنری ایلیٹ نے خودکشی کے ثبوت میں دوسری دلیل یہ دی کہ سلطان وزارتی کونسل کی جانب سے معمولی سی رعایت ملنے سے بھی مایوس ہو چکا تھا، اور اسی مایوسی نے اُسے خودکشی پہ مجبور کیا تھا۔

اس کی تردید میں شہزادی مذکورہ نے لکھا۔

"سرہنری ایلیٹ نے جس پیہم اور مایوسی کا ذکر کیا ہے، اس کا وجود ترک قوم کے کسی ایک معمولی فرد میں بھی نہیں پایا جاتا۔ ترک اجتماعی طور پر تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور جب بھی ان پر کوئی آفات ناگہانی آتی ہے تو وہ تن بہ تقدیر آنے والے امور کا سنجیدگی سے سکون سے انتظار کرتے ہیں۔"

ترکوں کی اس صفت کا ذکر لیفٹیننٹ ولیم ہربرٹ نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے جو بذاتِ خود ترکی، روسی جنگ میں ترکوں کے ساتھ شریک رہا تھا۔

شہزادی لوسکنان نے مزید تحریر کیا۔" سلطان اپنے سے پہلے سلاطین کی تاریخ سے بے خبر نہ تھا۔ وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ اگر کوئی سلطان آج معزول کیا جاتا تو کل وہی سلطان دوبارہ تخت پر بٹھا دیا جاتا، یا اسے اپنی بقیہ زندگی آرام سے گزارنے کی اجازت مل جاتی۔ مصطفیٰ اوّل، ابراہیم اوّل، محمد چہارم، مصطفیٰ ثانی اور سلیم ثانی کے واقعات سامنے ہوتے ہوئے نہ مایوسی وجود میں آسکتی ہے نہ انجام کا خوف لاحق ہوسکتا ہے۔ وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ روسی سفیر بہر حال اس کے معاون تھے۔ نیز فوج کا بڑا حصہ اس کا دلی خیر خواہ تھا۔ اس لیے اسے اُمید تھی کہ اس کی معزولی چند ہفتوں سے زیادہ نہ رہے گی۔ ایسی حالت میں سلطان احکام شرعی کا پابند تھا۔

سرہنری نے نوجوان سرکاش کے حسین عونی پر قاتلانہ حملے کو وزیر جنگ سے ذاتی پرخاش ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ حرکت اپنے بہنوئی کے قتل کا انتقام تھی۔

شہزادی نے تردید میں لکھا۔" اگر کسی نوجوان کو حسین عونی سے ذاتی عداوت تھی تو اس نے اس کے بعد وزیر خارجہ کو کیوں قتل کیا؟ اور پھر وزیر بحریہ پر کیوں حملہ آور ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ سرہنری نے علم ہونے کے باوجود یہ امر چھپانے کی کوشش کی ہے کہ نوجوان کا اقدام قتل دراصل اپنے بہنوئی کا انتقام تھا۔ اس سے قتل تو ثابت ہوتا ہے مگر اقدام خودکشی کا گمان پیدا نہیں ہوتا۔"

کمیٹی کی تفتیش، عدالتی کارروائی اور شہزادی این ڈی لوسکنان کی پُر زور تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ واردات صریحاً قتل کی تھی۔ لیکن دو ایسے اہم سوال بھی پیدا ہوتے ہیں جو اسے خودکشی کی واردات ماننے پر بھی مجبور کرتے ہیں اور ان سوالات کی کوئی وضاحت ریکارڈ پر نظر نہیں آتی۔

یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچا ہوا تھا کہ جب سلطان کے انتقال کی خبر زنانہ حرم تک پہنچی تو انہوں نے بلاتاخیر سلطان کی جائے رہائش پر یلغار کی مگر اندر سے دروازہ بند تھا۔ چنانچہ دروازہ توڑا گیا اور سلطان اندر مردہ حالت میں پایا گیا۔ اگر قاتلوں کے محل میں داخلے کا ذریعہ حسین عونی بنا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ اندر سے دروازہ بند ہونے کی صورت میں خاص کمرے کے اندر کیوں کر داخل ہوئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ داخلے کے وقت دروازہ مقفل نہیں تھا تو بھی سوال اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ قتل وقوع پذیر ہونے کے بعد دروازہ کس نے بند کیا، جبکہ اندر مقتول سلطان کے سوا اور کوئی متنفس موجود ہی نہیں تھا۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متوفی سلطان کی دونوں بازوؤں کی رگیں اس چاقو سے کٹی ہوئی نہیں پائی گئیں جو محمد جلال نے اس مقصد کے لیے مصطفیٰ پہلوان کو مہیا کیا تھا۔ اس کے برعکس دونوں بازوؤں میں ایسے سوراخ پائے گئے جو قینچی کی نوک سے کیے گئے تھے اور قینچی مردہ سلطان کی انگلیوں میں پھنسی پائی گئی تھی۔ اس کی تصدیق ان اطبا کے بیان سے ہوں ہے، جنہوں نے سلطان کی لاش کا معائنہ کیا تھا۔

اقراری ملزموں کے وکیل صفائی نے عدالت کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کروائی تھی لیکن عدالت نے اگر اسے قابل اعتنا نہیں گردانا تو یقیناً اس کی کوئی معقول وجہ اس کے علم میں ہوگی جس کی وضاحت ریکارڈ میں موجود نہیں۔

اس پس منظر میں ہم حتمی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہیں اور یہ سوال اپنی جگہ اب بھی قائم ہے کہ یہ واردات قتل کی تھی یا خودکشی کی؟

محمد ساجد

قرآن پاک میں جس جادو گر کا نام خصوصی طور پر آیا ہے یہ کون تھا۔ کس لیے اس سے کراہیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کیوں وہ قابل لعنت ٹھہرا۔

اس ساحر کا تذکرہ بدنامی جس کا مقدر ٹھہری

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خدا کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو شریعت دی جائے گی۔ اب وہ وقت آ گیا تھا۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی سربراہی میں بنی اسرائیل سلامتی کے ساتھ بحر قلزم کو پار کر گئے اور اپنی آنکھوں سے فرعون اور اس کی فوج کو غرق ہوتے دیکھ لیا اور پھر موسیٰ اپنی قوم کو ساتھ لے کر بیابان شور سے ہوتے ہوئے وادی سینا تک آ گئے تو وحی الٰہی نے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کو جبل طور پر بلایا۔
حضرت موسیٰ جب طور پر تشریف لے جانے لگے تو آپ نے اپنی قوم کو جمع کیا اور انہیں تسلی دی۔
"میرے اعتکاف کی مدت ایک ماہ ہے۔ مدت پوری ہونے پر فوراً تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ ہارونؑ تمہارے پاس موجود ہیں۔ یہ تمہارے احوال کے نگراں رہیں گے۔ ان کی ہر بات اسی طرح ماننا جس طرح میری باتوں پر عمل کرتے ہو اور دیکھو میرے بعد شرک میں نہ پڑ جانا۔"
شرک میں نہ پڑ جانے کی تاکید آپؑ نے اس لیے ضروری سمجھی کہ بنی اسرائیل کی یہ عادت تھی کہ بار بار شرک و بت پرستی کی طرف مائل ہوتے تھے۔ مصر سے وادی سینا تک حضرت موسیٰ علیہ السلام بار بار اس کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ وادی سینا میں قدم رکھتے ہی بت کدوں اور پرستاران صنم کو دیکھ کر بنی اسرائیل کی نیت ڈانوا ڈول ہو گئی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا موسیٰ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح ان کی پرستش کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی زبانی یہ مشرکانہ مطالبہ سنا تو برہم ہو گئے۔
"خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پوجا پر مائل ہو اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے جن کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔"
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خدشہ تھا کہ ان کے پیٹھ موڑتے ہی یہ قوم شرک کی طرف مائل ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ غلط بھی نہیں تھا۔ کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں وہ مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم ان کی پرستش کریں تو اس وقت تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے ایک مہینے کے لیے ان سے الگ ہو رہے تھے۔
اس انتظام اور نصیحت کے بعد آپؑ نے عصا سنبھالا اور طور کی طرف چل دیے۔
ان کی قوم ہجوم کی شکل میں بڑی دور تک ان کے پیچھے آئی اور انہیں رخصت کرنے لگی۔ ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو اسرائیلی نہیں تھا بلکہ سامری تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا اس لیے جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ لگا چلا آیا۔
سامری اس شخص کا نام یا لقب نہیں تھا بلکہ قومیت تھی۔
مولانا آزاد فرماتے ہیں۔
"جس قوم کو ہم نے سمیری کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے عربی میں اس کا نام زمانہ قدیم سے سامری آ رہا ہے۔"
یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے ان عیسائیوں میں ایک مسلمان بھی تھا۔ قرآن کا سامری کہہ کر پکارنا صاف کہہ رہا ہے کہ یہ نام نہیں ہے اس کی قومیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ شخص اسرائیلی نہ تھا سامری تھا۔
سمیری قبائل کا اصل وطن عراق تھا مگر یہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مصر کے ان سے تعلقات کا سراغ ایک ہزار سال قبل مسیح تک روشنی میں آ چکا ہے۔ پس معلوم ہوا اسی قوم کا ایک فرد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی معتقد ہو گیا اور جب بنی اسرائیل نکلے تو یہ بھی ان کے ساتھ نکل آیا۔
یہ شخص بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن کفر و شرک سے دور نہ ہو سکا تھا۔ ایک مرتبہ پہلے بھی بنی اسرائیل کو بھڑکا چکا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سے پتھر کے معبود بنانے کا مطالبہ کریں۔ اس کے علاوہ بھی جب موقع ملتا تھا وہ بنی اسرائیل کو بت پرستی کی طرف مائل کرتا رہتا تھا۔
اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام ایک دو دن کے لیے نہیں پورے ایک مہینے کے لیے قوم سے دور چلے گئے ہیں تو اس کی باچھیں کھل گئیں کہ اتنے عرصے میں وہ اسرائیلیوں کو ضرور سامریوں کے دین کی طرف راغب کرے گا۔ اس نے اسرائیلیوں کو بہکانا شروع کر دیا۔
"موسیٰ تو خدا کے پاس چلے گئے۔ اس سے باتیں کر رہے ہوں گے اس کی پرستش کر رہے ہوں گے۔ تمہیں یہاں بغیر خدا کے چھوڑ گئے۔ تم کہو تو میں تمہارے لیے یہاں ایک خدا بنا دوں۔ جس سے تم باتیں کرو جس کی پرستش کرو۔"
اسرائیلیوں پر حضرت ہارونؑ کا خوف طاری تھا جو موسیٰ علیہ السلام کے نائب تھے اور قوم کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس لیے وہ سامری کی باتوں میں نہیں آ رہے تھے لیکن دل ہی دل میں اس کی پیش کش کو قبول بھی کرتے جا رہے تھے بس انہیں ایک خوف تھا کہ موسیٰ جب ایک مہینے بعد واپس آئیں گے تو سخت برہم ہوں گے۔
اُدھر طور پر یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک ماہ کا اعتکاف ختم ہو گیا تو انہوں نے خدائے تعالیٰ سے ہم کلامی کی تیاری شروع کی چونکہ مکمل ایک ماہ روزے میں بسر کیے تھے اس لیے منہ میں "بو" محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ رب العالمین سے اس حالت میں ہم کلام ہوں۔ انہوں نے ایک خوشبودار بوٹی کو چبایا اور کھا لیا۔ تو اُدھر وحی الٰہی

نے ٹوکا۔ ''موسیٰ تم نے ہم کلامی سے پہلے روزہ کیوں افطار کرلیا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی وجہ بیان کردی۔ تب حکم ہوا کہ موسیٰ اس مدت کو دس دن سے بڑھا کر چالیس دن کردو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہمیں ایک روزہ دار کے منہ کی ''بو'' مشک کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے۔

قرآن نے صرف اسی قدر ذکر کیا ہے کہ یہ مدت اوّل تیس دن تھی (اسی لیے آپ اپنی قوم سے تیس دن کی مہلت لے کر آئے تھے) اور پھر بڑھا کر چالیس دن کردی گئی۔ وجہ بیان نہیں کی۔

''اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتیں بڑھا کر اسے پورا (چلہ) کردیا۔ اس طرح پروردگار کے حضور آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی پوری میعاد ہوگئی۔

بس یہی موقع تھا جب سامری کا داؤ چل گیا۔ وہ اسرائیلیوں سے کہنے لگا، موسیٰ نے تم سے بے وفائی کی۔ تیس دن گزر گئے اور وہ واپس نہیں آئے۔ وہ واپس آئیں گے بھی نہیں۔ تم اب بھی میری بات مان لو۔ میں تمہارے لیے ایک معبود بنا کے دیتا ہوں۔ تم اس کی پرستش کرو تا کہ وہ تم سے خوش ہو۔''

اسرائیلی، سامری کے پاس آکر جمع ہونے لگے۔ وہ سب کے سب حضرت موسیٰ کی تاخیر سے مضطرب ہو رہے تھے۔ سب کی زبانوں پر تھا۔

''موسیٰ جو ہمیں مصر سے نکال لایا خدا جانے کہاں غائب ہوگیا اور ہمیں اس وادی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ گیا۔ جب اس نے ہم سے بے وفائی کی تو ہم بھی اس کے وفادار نہیں۔ اے سامری! تو ہمارے لیے ایک دیوتا بنا دے تا کہ وہ ہمیں اس بیابان سے نکالے اور ارض مقدس تک پہنچائے جیسا کہ خدا کا وعدہ تھا۔''

سامری نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ ایک بلند جگہ پر کھڑا ہوگیا اور اسرائیلیوں سے مخاطب ہوا۔

''تم اپنے وہ تمام زیورات میرے پاس لے آؤ جو تم نے مصریوں سے مستعار لیے تھے اور پھر واپس نہ کرسکے تو میں تمہارے فائدے کی ایک بات کردوں۔''

زیورات دینے کے معاملے میں بعض لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ بھاگتے ہوئے حضرت ہارونؑ کے پاس پہنچے اور اس تمام کارروائی سے مطلع کیا۔

حضرت ہارونؑ نے بھی اسرائیلیوں کو جمع کیا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ تم کس شخص کی باتوں میں آرہے ہو۔ اس کی باتوں میں جو ہماری قوم کا بھی نہیں۔ وہ کب چاہے گا کہ بنی اسرائیل خدا کی نظروں میں سرخرو ہو۔ وہ تمہیں دیوتاؤں کی پرستش کی طرف راغب کررہا ہے تا کہ تم خدا کے ہاتھوں دھتکارے جاؤ۔ خبردار! اس کی باتوں میں مت آؤ۔ موسیٰ (علیہ السلام) کا انتظار کرو۔ وہ تمہارے لیے شریعت لینے گئے ہیں۔ تم اس پر عمل کرنا تا کہ خدا تم سے خوش ہو اور تمہیں ارض مقدس تک پہنچا دے۔''

اس سے قبل کہ آپ کی نصیحت کا کوئی اثر ہوتا لوگوں نے آپ کے خلاف نعرے لگانے شروع کردیے۔ آپ ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں تھا۔ آپ نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب لوگوں نے آپس میں مشورے شروع کردیے۔

''ہارون نہیں چاہتے کہ ہمارا بھی کوئی خدا ہو۔ موسیٰ تو خدا کے پاس رہ گئے اب دیکھنا ہارون بھی کسی دن چپکے سے چلے جائیں گے۔''

''ہارون کو مجبور کردو کہ وہ ہمارے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔''

''وہ ہماری بات ماننے والے نہیں۔ موسیٰ کی طرح وہ بھی نہیں چاہتے کہ ہم کسی کی پرستش کریں۔''

''وہ اگر نہ مانیں تو انہیں قتل کردیا جائے۔''

''تو پھر کیا کہتے ہو۔ ان سے ایک مرتبہ پھر بات کرلی جائے؟''

''ہم سب ان کے پاس چلتے ہیں اور ان سے آخری مرتبہ بات کیے لیتے ہیں۔''

''سب کے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم میں سے کچھ لوگ جائیں اور بات کرلیں۔''

اس ملاقات کے لیے انہوں نے رات کے وقت کا انتخاب کیا۔ منشا یہ تھی کہ اگر وہ دیوتا بنانے کی اجازت نہ دیں تو انہیں رات کے اندھیرے میں قتل کردیا جائے۔

ان کے اس ارادے کی خبر حضرت ہارونؑ کو ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے یہ خبر آپ تک پہنچادی کہ اسرائیلی آپ کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔ یہ مشورہ بھی دیا کہ آپ کہیں بھاگ جائیں لیکن آپ نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا اور اپنی جگہ جمے بیٹھے رہے۔

رات آئی تو آپ اپنے خیمے سے نکل کر باہر بیٹھ گئے تاکہ اسرائیلیوں کو یہ گمان نہ ہو کہ وہ خوف زدہ ہو کر کہیں چھپ گئے ہیں۔ اسرائیلیوں کی ایک تھوڑی سی تعداد آپ سے ملنے کے لیے آئی تو آپ خیمے کے باہر ہی بیٹھے تھے۔ ان لوگوں نے اپنا مطلب پھر بیان کیا۔ آپ نے پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ بضد رہے اور غصے میں کہہ اٹھے کہ اگر تم نے اسرائیلیوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

حضرت ہارونؑ دیکھ رہے تھے کہ قوم دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ کچھ لوگ سامری سے کام لینا چاہتے ہیں کچھ لوگ اس کے خلاف ہیں۔ اگر انہوں نے ایک گروہ کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کی تو دونوں آپس میں لڑ پڑیں گے۔ اس لیے ان کے درمیان سے ہٹ جانا ہی اچھا ہے۔ حضرت موسیٰ آج نہیں تو کل آجائیں گے۔ ان کے آجانے کے بعد قوم خود ہی راہِ راست پر آجائے گی۔ انہوں نے اپنی مخالفت واپس لے لی۔

''دیکھو جو تم کر رہے ہو وہ موسیٰ کو ہرگز پسند نہیں آئے گا۔ پھر تم جانو اور موسیٰ۔ میں درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔ جو تمہارا جی چاہے کرو۔''

''بس ہم یہی چاہتے تھے اب ہم جانیں اور موسیٰ۔''

وہ لوگ دف بجاتے، شور مچاتے، نعرے لگاتے واپس لوٹ گئے۔

تمام لوگوں نے سونے کے زیورات لا لا کر سامری کے سامنے ڈھیر کر دیے۔ اس نے یہ تمام زیورات بھٹی میں پگھلائے .... اور اس سونے سے ایک بچھڑا (گائے کا بچہ) تیار کر دیا۔ پھر اپنے پاس سے ایک مٹھی مٹی کی اس کے اندر ڈال دی۔ اس مٹی کی تاثیر کچھ ایسی تھی کہ بچھڑے میں آثار حیات پیدا ہو گئے اور وہ بچھڑے کی آواز ''بھائیں بھائیں'' بولنے لگا۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس بچھڑے کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ ہوا اس کے پچھلے حصے سے داخل ہو کر منہ سے نکلتی تھی تو بھائیں بھائیں کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

صدیوں تک مصر کی غلامی نے بنی اسرائیل میں مشرکانہ رسوم و عقائد کو پھیلا دیا تھا۔ گوسالہ کی پرستش مصر کا قدیم عقیدہ تھا اور ان کے مذہب میں اس کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ کرۂ زمین گائے کے سر پر قائم ہے۔ یہی عقیدہ سامریوں کا بھی تھا۔ اسی لیے سامری نے گائے کے بچھڑے کو دیوتا کا روپ دیا لہٰذا جب سامری نے بنی اسرائیل کو ترغیب دی کہ وہ اس کے بنائے ہوئے گوسالہ کو اپنا دیوتا سمجھیں اور اس کی پوجا کریں تو انہوں نے اسے آسانی سے قبول کر لیا کیوں کہ جب وہ مصر میں تھے تو اس کے مظاہر دیکھ چکے تھے۔

سامری اب کہتا پھر رہا تھا۔ ''موسیٰ سے غلطی اور بھول ہو گئی جو وہ خدا کی تلاش میں طور پر گیا۔ تمہارا معبود تو یہ موجود ہے۔ یہی تمہارا دیوتا ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا۔''

سامری نے اس کے آگے قربان گاہ بنائی اور اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لیے عید ہو گی۔ دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر انہوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کے لیے قربانیاں دیں۔ پھر وہیں بیٹھ کر کھایا پیا اور کھیل کود میں لگ گئے۔

جب بچھڑا بن گیا اور سب نے معبود تسلیم کر لیا تو وہ لوگ پرستش کو آگئے جنہوں نے ابتداء میں مخالفت کی تھی۔ اس بچھڑے سے آوازیں آرہی تھیں اس پر سب حیران تھے۔

حضرت ہارونؑ اپنی کٹیا میں الگ تھلگ بیٹھے حضرت موسیٰ کا انتظار کر رہے تھے۔

''اور پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ سچائی کی روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آیا لیکن جب چالیس دن کے لیے تم سے الگ ہو گیا تو تم بچھڑے کے پیچھے پڑ گئے۔'' (سورۂ بقرہ)

یہاں تو یہ ہو رہا تھا اور وہاں اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا ہوا کہ حضرت موسیٰ کو اس واقعے سے مطلع کر دے۔ اس لیے حضرت موسیٰ سے پوچھا۔

''موسیٰ! تم نے قوم کو چھوڑ کر یہاں آنے میں اس قدر جلدی کیوں کی؟''

''خدایا اس لیے کہ تیرے پاس جلد حاضر ہو کر قوم کے لیے ہدایت حاصل کروں۔ میری قوم میرے نقش قدم پر ہے اور اے میرے پروردگار میں نے تیرے حضور آنے میں جلدی کی کہ تو خوش ہو۔''

تب خدا نے فرمایا۔ ''مگر ہم نے تیرے پیچھے تیری قوم کی آزمائش کی اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا تو جس کے لیے مضطرب ہے وہ گمراہی میں مبتلا ہے۔''

حضرت موسیٰ کفِ افسوس ملنے لگے۔ یوں بھی مزاجاً غصے کے تیز تھے۔ بپھرے ہوئے طوفان کی طرح پہاڑ سے اترے اور قوم کے سامنے پہنچ گئے۔

''میری قوم کے لوگو! یہ تم نے کیا کیا۔ کیا تم سے

تمہارے پروردگار نے ایک بڑی بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر کون سی ایسی بڑی مدت گزر گئی تھی کہ نری گمراہی میں پڑ گئے۔"

آپ کو ایسا غصہ تھا کہ غصے سے کانپ رہے تھے۔ حتیٰ کہ ہاتھ سے وہ تختیاں بھی گر گئیں جن پر تورات لکھی تھی۔

قوم نے جو غصے کا یہ رنگ دیکھا تو لگے معذرت کرنے۔ "ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہم نے تو مصریوں کے بوجھ ہلکے کیے تھے اور انہیں سامری کے حوالے کیا تھا۔ سامری نے اس سے بچھڑا بنالیا۔ وہ آواز بھی نکالتا تھا۔ پس لوگ بھول میں پڑ گئے اور گمراہ ہو گئے۔"

"تمہاری موٹی عقل میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ بچھڑا آواز تو نکالتا ہے لیکن تمہاری بات کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"ہماری سمجھ پر افسوس۔"

حضرت موسیٰ نے ان کی اس معذرت کو غور سے سنا۔ اب انہیں سارا قصور اپنے بھائی حضرت ہارون کا نظر آرہا تھا کہ جب وہ انہیں اپنا نائب بنا کر گئے تھے تو انہوں نے قوم کو کیوں نہیں روکا۔ واقعہ بھی ناقابلِ برداشت تھا اور آپ تھے بھی گرم مزاج۔ انہوں نے اپنے بھائی ہارون کی گردن پکڑ لی اور داڑھی کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

"اے ہارون! جب تم نے دیکھا یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں تو کیا بات ہوئی کہ انہیں روکا نہیں۔ کیا تو نے پسند کیا کہ یہ میرے حکم سے باہر ہو جائیں؟"

"اے میرے عزیز بھائی۔" حضرت ہارونؑ نے فرمایا۔ "میری داڑھی اور سر کے بال نہ نوچ۔ میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ دیکھو میری پیروی کرو اور میرے کہے سے باہر نہ ہو مگر یہ اس کی پرستش پر جمے ہی رہے۔ یہ میرے قتل تک کے درپے ہو گئے تھے۔ میں نے اس لیے سختی نہیں کی کہ تم واپس آکر یہ نہ کہو کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میرے حکم کی راہ نہ دیکھی۔"

حضرت ہارونؑ کی دلیل سن کر حضرت موسیٰؑ کا غصہ ان کی جانب سے فرو ہو گیا۔ اب انہیں سامری کا خیال آیا کہ اصل قصوروار تو وہی تھا۔ حضرت موسیٰ کے لیے یہ بات تعجب خیز تھی کہ بچھڑا بولتا کیونکر ہے۔ انہوں نے حکم دیا کہ کوئی سامری کو لے کر آؤ۔

سامری کسی جگہ بیٹھا یہ تمام معاملات دیکھ رہا تھا۔ اس نے جو سنا کہ اسرائیلی اپنے قصور کا انکار کررہے ہیں اور سارا قصور اس کا نکل آیا ہے تو اس نے وہاں سے فرار کی سوچی۔

وہ ابھی نکلنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ہارون علیہ السلام اس کے سر پر پہنچ گئے اور اسے پکڑ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے آئے۔

"سامری! تو نے یہ کیا سوانگ بنایا ہے۔ تو کیا جادوگر ہے کہ تیرا بنایا ہوا بچھڑا بولتا ہے۔"

"میں نے ایسی بات دیکھی ہے جو ان اسرائیلیوں نے نہیں دیکھی۔ فرعون کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑے پر سوار اسرائیلیوں میں اور فرعون کے درمیان حائل تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے گھوڑے کے سم کی خاک میں اثرِ حیات پیدا ہو جاتا ہے اور خشک زمین پر سبزہ اگ آتا ہے تو میں نے جبریل علیہ السلام کے گھوڑے کے قدموں کی خاک سے ایک مٹھی بھر لی۔ وہ مٹی میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ جب میں نے بچھڑا بنایا تو اس خاک کو اس بچھڑے میں ڈال دیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے اور یہ "بھاں بھاں" کرنے لگا۔"

"بدبخت تو نے حق کی مٹی باطل کے لیے استعمال کی۔ اب تیری سزا یہ ہے کہ تو پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرے گا۔ تو اچھوت کی طرح ہو جائے گا۔ جب کوئی انسان تیرے قریب آئے گا تو اس سے دور بھاگے گا اور کہتا جائے گا۔ "مجھ کو ہاتھ نہ لگا مجھ کو ہاتھ نہ لگا۔" آخرت میں جو عذاب ملے گا وہ اس کے علاوہ ہوگا اور دیکھ تیرے گھڑے ہوئے معبود کا اب کیا حال ہوتا ہے۔ ہم اسے جلا کر راکھ کر دیں گے۔"

نبی کا کہا کبھی ضائع نہیں جاتا۔ ادھر زبان سے نکلا ادھر قبول ہوا۔ سامری اپنے بال نوچنے لگا۔ کپڑے پھاڑ دیے۔ اس کے کچھ ہمدرد اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے تو وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ "مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میرا مرض تمہیں بھی لگ جائے گا۔ مجھے ہاتھ مت لگانا۔"

پھر وہ صحرا میں دور تک دوڑتا چلا گیا۔ شاید آخرت کے عذاب کی اسے بہت جلدی تھی۔

حضرت موسیٰؑ کو اب اپنی قوم کی فکر ہوئی جس سے بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ آپ نے خدائے تعالیٰ کی جناب میں رجوع کیا کہ اب ان کے یعنی قوم کے ارتداد اور بے دینی کی سزا کیا ہے۔ جواب ملا کہ جن لوگوں نے یہ شرک کیا ان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

"ایک ایسی سزا کا اعلان ہو رہا تھا کہ پوری قوم ہی فنا ہو جاتی کیوں کہ پوری قوم ہی اس جرم میں شریک تھی۔ آپ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے۔

"اب ان پر رحم فرما اور ان کی خطاؤں کو بخش دے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "ہم نے ان کے قصور معاف کیے۔تم ان کو سمجھاؤ کہ آیندہ شرک کے قریب بھی نہ جائیں۔"

بنی اسرائیل عجیب لوگ تھے۔ایک جرم پر نادم ہوتے تھے اور فوراً کوئی دوسرا جرم کر بیٹھتے تھے۔ابھی ایک جرم سے گلو خلاصی ہوئی تھی کہ دوسری بات پر اڑ گئے۔

حضرت موسیٰ نے تورات کی تختیاں ان کے سامنے رکھ دیں۔

"یہ کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لیے مجھ کو عطا فرمائی ہے۔یہ تورات ہے۔اب تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام کی تعمیل کرو۔"

انہوں نے بے تکا سا جواب دیا۔ "ہم کیسے یقین کرلیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ہم تو تب ایمان لائیں گے کہ جب خدا کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔"

حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا۔"تم ہزاروں کی تعداد میں میرے ساتھ طور پر کیسے جاؤ گے۔میں چند سردار چن کر اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔وہ اگر واپس آکر تصدیق کردیں تو تم بھی تسلیم کرلینا۔"

قوم اس پر راضی ہوگئی۔آپ نے ستر سرداروں کو چنا اور اپنے ساتھ لے کر ایک مرتبہ پھر طور پر پہنچ گئے۔طور پر پہنچتے ہی ایک سپید بادل نے حضرت موسیٰ کو گھیر لیا۔

"بار الٰہ میری قوم بڑی ضدی ہے۔وہ تجھے بے حجاب دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ انہیں تصدیق ہوجائے کہ جو کتاب دی ہوئی ہے وہ تیری ہی ہے۔"

"یہ مجھے بے حجاب نہیں دیکھ سکتے۔ان سے کہو تورات میں نے ہی موسیٰ کو دی ہے۔"

وہ سردار اس آواز کو سن رہے تھے۔انہیں تصدیق ہو جانی چاہیے تھی لیکن وہ برابر ضد کررہے تھے کہ جب تک ہم خدا کو بے حجاب نہ دیکھ لیں ہم ایمان لانے والے نہیں۔

اس احمقانہ اصرار پر انہیں یہ سزا دی گئی کہ ایک ہیبت ناک چمک، کڑک اور زلزلے نے ان کو آلیا اور سب کے سب ستر سردار وہیں جل کر خاک ہوگئے۔

اب تو حضرت موسیٰ بہت گھبرائے کہ اگر یہ ستر افراد واپس نہیں گئے تو تصدیق کیسے ہوگی۔کہیں قوم گمراہ کی گمراہ نہ رہ جائے اور عذاب کی مستحق ٹھہرے۔

آپ نے بارگاہ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعا مانگی۔

"الٰہی! یہ بے وقوف اگر بے وقوفی کر بیٹھے تو کیا تو سب کو ہلاک کردے گا۔اے خدا! اپنی رحمت سے تو ان کو معاف کردے۔"

رحمت خداوندی جوش میں آئی۔حضرت موسیٰ کی دعا قبول ہوئی۔ان سب کو دوبارہ حیات تازہ بخشی اور پھر جب وہ زندگی کا لباس پہن رہے تھے تو ایک دوسرے کی تازہ زندگی کو آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

قرآن نے حیات بعد الموت کا عام قانون تو یہ قرار دیا ہے کہ موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لیے دوبارہ زندگی ملے گی لیکن کبھی کبھی کسی مصلحت کے پیش نظر خدائے تعالیٰ اس قانون کو بدل بھی دیتا ہے اور اس دنیا ہی میں مردے کو زندگی بخش دیتا ہے۔

غرض خدا کی رحمت نے ترس کھایا اور ان ستر سرداروں کو زندگی بخش دی کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔انہیں واپس جا کر موسیٰ کی حقانیت کی تصدیق کرنی تھی۔

عذاب خدائے تعالیٰ کی صفت نہیں۔یہ تو خاص حالات کے ماتحت ہوتا ہے۔اس کی ابدی و ازلی صفت تو رحمت ہے۔عذاب تو ہمارے کردار وعمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور رحمت اس کی ذاتی صفت ہے۔

ان ستر سرداروں نے حضرت موسیٰ کی حقانیت کے دو دو مظاہرے دیکھ لیے تھے۔وہ جب قوم کے سامنے آئے تو پورا ماجرا کہہ سنایا اور پورے جوش سے موسیٰ اور تورات کی صداقت کی گواہی دی۔

بنی اسرائیل آخر بنی اسرائیل تھے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فوراً سر تسلیم خم کرتے لیکن دلوں میں کجی ابھی تک تھی۔آپس میں شکوک وشبہات کا اظہار کرنے لگے۔

"موسیٰ نے ہمارے سرداروں کو بہکا دیا ہے۔"

"ہم نے تو اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا نہیں۔ہمیں کیا خبر سرداروں نے کیا دیکھا اور ہمیں کیا آکر بتا رہے ہیں۔"

"موسیٰ جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں۔خدا نے تو ہمیں کوئی حکم نہیں دیا۔"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اتنے مظاہر دیکھنے کے بعد خدا تعالیٰ کا شکر بجا لاتے مگر انہوں نے تو تورات کو قبول کرنے ہی میں پس وپیش سے کام لینا شروع کردیا۔

حضرت موسیٰ کو قوم کی یہ نافرمانی دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔اتنا افسوس کہ غصے کے عالم میں کبھی خیمہ گاہ میں چلے جاتے تھے کبھی باہر نکل آتے تھے۔خدا سے آپ کی یہ بے بسی دیکھی نہیں گئی۔بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا۔"میں تجھ کو ایک جحت

(معجزہ) اور عطا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ جس پہاڑ پر تو مجھ سے ہم کلام ہوتا رہتا ہے اور جس پر تیری قوم کے منتخب سرداروں نے حق کا مشاہدہ کیا ہے اسی پہاڑ کو حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کرے اور سائبان کی طرح بنی اسرائیل کے سروں پر چھا جائے۔ ان سرکشوں کو اس وقت یقین آئے گا کہ موسیٰ خدا کا سچا پیغمبر ہے اور تورات بلاشبہ خدا کی سچی کتاب ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خیمہ اجتماع میں طلب کیا۔ جب سب لوگ آ چکے تو موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ پھر تورات کی تختیاں ان کے سامنے رکھیں۔

"خدا نے جو شریعت مجھے دی ہے وہ اس پر لکھ دی گئی۔ اب تمہارا فرض ہے کہ اس کتاب کو تسلیم کرو اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اس پر ایمان لاؤ۔"

"کیا ہم اس پر ایمان لائیں جو تو خود لکھ کر لے آیا ہے۔"

"تم اپنے سرداروں سے کیوں نہیں پوچھتے۔ اور کیا تم نے سامری کا حال نہیں دیکھا کہ اس پر کیا گزر گئی۔"

"وہ ہماری قوم کا نہیں تھا اس لیے اس کا یہ حال ہوا۔"

"تو کیا تم اس وقت یقین کرو گے جب طور کا پہاڑ تمہارے سروں پر سائبان کی طرح بلند ہو جائے۔"

"موسیٰ! کیا ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو کبھی پہاڑ نے بھی اپنی جگہ چھوڑی ہے۔ تم ہمیں خوانخواہ ڈرانا چاہتے ہو۔"

"خدا کی قدرت سے کچھ بعید نہیں اگر تم نے میری شریعت کو تسلیم نہیں کیا تو پھر وہی ہوگا جس کا حق تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔"

کسی اسرائیلی کی نظر غیر ارادی طور پر جبل طور کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑ کی چوٹی سے دھوئیں کے بادل بلند ہو کر آسمان کی طرف جا رہے ہیں۔ اس نے دوسرے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ سب کی نگاہیں اس طرف لگ گئیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے تاریک رات کی شکل اختیار کر لی یہ اندھیرا اسرائیلیوں کے سروں تک آ رہا تھا۔ دن میں اندھیرا ہو گیا۔ شمع دان روشن کر دیے گئے۔

یہ اندھیرا دوپہر تک رہا پھر یہ دھواں چمکتی ہوئی چاندنی کی طرح سپید ہو گیا۔ اسرائیلیوں کی نظریں طور پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ پہاڑ نے اپنی جڑ چھوڑ دی تھی اور ہوا میں بلند ہو رہا تھا۔ پھر یہ پہاڑ ہوا میں بلند ہوا اور اس نے چلنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسرائیلیوں کے سروں پر ہوا میں معلق ہو گیا۔

اسرائیلی تین میل لمبی اور تین میل چوڑی زمین پر ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اس پہاڑ نے ان سب کو ڈھانپ لیا تھا۔ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان کی طرح جھکا ہوا تھا۔ پھر یہ پہاڑ زبان حال سے کہنے لگا۔

"اے بنی اسرائیل! اگر تم میں عقل و ہوش باقی ہے اور حق و باطل کی تمیز موجود ہے تو سنو میں خدا کا نشان بن کر تم کو یقین دلاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ موسیٰ نے بارہا میری پیٹھ پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل کیا ہے اور تورات بھی میری پیٹھ پر ہی عطا ہوئی۔

دیکھو! میں پتھر کے ٹکڑوں کا مجموعہ ہو کر بھی خدا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اڑتا ہوا تمہارے پاس پہنچ گیا ہوں اور ایک تم ہو کہ پتھر نہیں لیکن تمہارے دل پتھر کے ہو گئے ہیں اور خدائی حکم ماننے کو تیار نہیں۔

بنی اسرائیل پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ فوراً سجدے میں گر گئے لیکن اس طرح کہ اپنے رخسار اور بائیں آنکھ کو زمین پر رکھا اور داہنی آنکھ سے پہاڑ کو دیکھتے رہے کہ کہیں یہ پہاڑ ہمارے اوپر گر تو نہیں رہا ہے چنانچہ یہودی آج بھی اسی طرح سجدہ کرتے ہیں۔

انہوں نے دیکھا کہ پہاڑ آہستہ آہستہ واپس جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی جگہ چلا گیا۔ اسے وہ نظر کا دھوکا نہیں کہہ سکتے تھے لہٰذا توبہ کی، تورات کی جانب متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰؑ کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ تب خدائے تعالیٰ کا فرمان ہوا۔

"اے بنی اسرائیل! ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس کو مضبوطی کے ساتھ لو اور جو احکام اس (تورات) میں درج ہیں ان کی تعمیل کرو تا کہ پرہیزگار اور متقی بن سکو۔"

افسوس کہ بنی اسرائیل کا یہ عہد بھی وقتی اور ہنگامی ثابت ہوا۔ وہ زیادہ عرصہ اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسبِ عادت پھر خلاف ورزی شروع کر دی۔

قرآن عزیز نے اسے یوں بیان کیا۔

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تمہارے سر پر طور کو اونچا کیا اور کہا، جو کچھ ہم نے تم کو دیا اس کو قوت سے پکڑ لو...... اس کے بعد تم نے اس (تورات) سے پیٹھ پھیر لی۔ پس اگر تم پر خدا کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ تم نقصان اٹھانے والوں میں ہوتے۔" (ماخوذ از قصص القرآن)

شیراز خان

اسرار کے پردے میں چھپی ایسی بہت سی باتیں ہیں جنہیں ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی چند اسرار کا تذکرہ جنہیں عام انسان کا ذہن کسی طور سمجھ نہیں پاتا۔

انسانی ذہن کو ماؤف کر دینے والے چند اسرار کا تذکرہ

اللہ نے یہ دنیا بہت عجیب بنائی ہے۔ اس میں ایسے ایسے بھید ہیں کہ عام انسان کی رسائی ناممکن ہے۔ ایسے ایسے طبقے بنائے گئے ہیں کہ صرف روایات میں ان کا پتا چلتا ہے۔

بعض تو میں یا طبقے ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن مجید اور احادیث میں بھی اشارے ملتے ہیں لیکن ہمیں ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔

جب تصوف کا ذکر ہوتا ہے اور ولیوں، قطبوں وغیرہ کی بات ہوتی ہے تو ایک لفظ بہت سننے میں آتا ہے اور وہ ہے ابدال۔ کہ فلاں اپنے وقت کے ابدال تھے۔

آئیں اسلامی نقطۂ نظر سے ابدالوں کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر ابدالوں کے بارے میں کچھ اور جاننے سے پہلے یہ جان لیں کہ طبقۂ صوفیہ کی کتنی اقسام ہیں اور ان سب کی ذمے داریاں کیا ہیں۔

سراۃ الاسراء میں لکھا ہے کہ طبقۂ صوفیہ کی سات نوع ہیں۔ (1) طالب (2) مرید (3) سالکہ (4) سائر (4) مائر (6) واصل (7) قطب۔ کا دل آپؐ کے علم لدنی کا وارث ہوتا ہے۔

اب مردانِ خدا کی تعریف میں یوں آیا ہے کہ مردانِ خدا یہ لوگ ہیں۔ اوتاب، غوث اماماں (قطب کے دو وزیر) اوتار، ابدال، اخیار، ابرار، نقبا، نجبا، محمدی، مکتومان، معلم دان یعنی مہربان۔

ان کی تعداد کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ نقبا کی تعداد 3 سو ہے اور سب کا نام علی ہے۔ نجبا تعداد میں ستر ہیں

ہر ایک کا نام حسن ہے۔ اخیار سات ہیں۔ ہر ایک کا نام حسنی ہے، محمدی چار ہیں اور ان کا نام محمد ہے۔ غوث ایک ہے اور اس کا نام عبداللہ ہے۔

جب غوث وفات پا جاتا ہے تو محمدی میں سے ایک شخص متعین ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ نقبا میں سے ایک شخص اور اس کی جگہ نجبا میں سے ایک شخص اور اس کی جگہ مخلوق میں سے ایک شخص مقرر ہو جاتا ہے۔

مزید وضاحت یوں آئی ہے کہ نقبا کا مسکن مغرب ہے۔ نجبا کا مصر ہے۔ اخیار ہمیشہ سیاحت کرتے رہتے ہیں۔ ان کو سکون اور قرار نہیں ہے۔

محمدی زمین کے گوشوں میں رہتے ہیں۔ غوث کا مسکن مکہ شریف ہے مگر یہ درست نہیں کیوں کہ حضرت عبدالقادر جیلانی کا مسکن جو کہ غوث اعظم تھے بغداد تھا (اسلامک انسائیکلوپیڈیا)۔ توضیح المذاہب میں لکھا ہے کہ مکتومان چار ہزار اشخاص ہیں۔ جو چھپے رہتے ہیں اور اہلِ تصوف ان ہی میں سے ہیں لیکن جو اشخاص اصل اہل عقید ہیں ان کو درجہ قرب حاصل ہے اور ان کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد تین سو ہے۔

ایک اور کتاب میں ان حضرات کے مقام کے بارے میں کچھ اور وضاحت کی گئی ہے۔ اس کتاب کا نام خلاصۃ الخصاتب ہے (اسلامک انسائیکلوپیڈیا)

اس کتاب کی روایت کے مطابق سات اشخاص ہیں۔ جن کو اخیار اور سیاح بھی کہتے ہیں اور ان کا مقام مصر میں ہے۔

اللہ نے ان کو سیاحت کا حکم دیا ہے تا کہ عابدہ اور

عابدوں کو ارشاد کریں۔ ستر اور ہیں جن کو نجبا کہتے ہیں اور وہ مغرب میں رہتے ہیں۔

چالیس اشخاص اور ہیں جن کو ابدال کہا جاتا ہے ان کا مقام ملک شام ہے۔ سات ابرار ہیں جو حجاز میں مقیم ہیں۔

پانچ محمدی ہیں جو عالم کے ستون ہیں اور دنیا کے ساتھ قائم ہیں۔ وہ دنیا کے اطراف میں رہتے ہیں۔ چار اوتار ہیں جن کے ساتھ عالم کا مدار مستحکم ہے۔ جس طرح رسی کا مدار میخ پر ہوتا ہے۔

تین نقبا ہیں جو اس امت کے نقیب کہلاتے ہیں اور ایک قطب اور غوث ہے جو تمام عالم کا فریاد رس ہے۔ جب قطب دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کی جگہ اور قائم ہو جاتا ہے۔

کشف اللصفات میں لکھا ہے کہ نجبا سات ہیں جن کو رجال الغیب کہتے ہیں اور نقبا سو ہیں جن کو براہ کہا جاتا ہے اولیا میں سب سے کم درجہ نقبا کا ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ''میری امت میں سے سات ابدال سات اقلیموں میں رہیں گے۔ پہلی اقلیم کا ابدال حضرت ابراہیمؑ کی طرز پر ہے۔ جس کا نام عبدالحی ہے۔''

دوسری اقلیم کا ابدال حضرت موسیٰؑ کی طرز پر ہے۔ جس کا نام عبدالعلیم ہے۔

تیسری کا حضرت ہارونؑ کی طرز پر ہے۔ جس کا نام عبدالمرید ہے۔

چوتھی اقلیم کے ابدال کا نام عبدالقادر ہے اور وہ حضرت ادریسؑ کی طرز پر ہے۔

پانچویں کا ابدال حضرت یوسفؑ کی طرز پر ہے اور نام عبدالقاہر ہے۔

چھٹے کا نام عبدالسمیع ہے اور وہ حضرت عیسیٰؑ کی طرز پر ہے۔

ساتویں اقلیم کے ابدال کا نام عبدالبصیر ہے اور وہ حضرت آدمؑ کی طرز پر ہے۔

یہ سارے ابدال اسرار الٰہیہ سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان میں سے عبدالقادر اور عبدالقاہر کے فرائض یہ ہیں کہ اگر کسی شہر یا ملک پر عذاب نازل ہو تو وہ اس کے مہتمم ہوتے ہیں۔

ان میں سے جب ایک مر جاتا ہے تو عالم ناسوت سے ایک اور شخص اس کا قائم مقام کیا جاتا ہے اور پہلے ابدال کے نام پر پکارا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ 350 اور ابدال ہیں۔ جو پہاڑوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ جن کی خوراک درختوں کے پتے اور میوے وغیرہ ہوتے ہیں۔

ان میں سے 300 حضرت آدمؑ کی طرز پر ہوتے ہیں۔ ایک حدیث میں پایا جاتا ہے کہ 300 ابدال حضرت آدمؑ کی طرز پر، چالیس حضرت موسیٰؑ کی طرز پر، سات حضرت ابراہیمؑ کی طرز پر، پانچ حضرت جبرئیلؑ کی طرز پر، تین حضرت میکائیلؑ کی طرز پر پیدا کیے گئے ہیں اور ایک آنحضرتؐ کی طرز پر پیدا کیا گیا ہے۔ (سراۃ الاسرا۔ انسائیکلو پیڈیا)

اب ایک اور بھید کی طرف آجائیں۔

اس روایت کے ساتھ ایک دل چسپ کہانی بھی منسوب ہے۔ یہ وہ بھید ہے جس کی طرف قرآن مجید میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

یہ بھید ہے اصحاب الاخدود کا۔ اس کا مطلب ہے خندقوں والے لوگ۔ قرآن مجید میں خندقوں والوں کا مختصر سا حال کچھ یوں ہے۔ (ترجمہ) کافر انجام کار ہلاک ہوں گے۔ جس طرح وہ خندق والے ہلاک ہوئے اور وہ خندقیں آگ کی تھیں۔ جن میں اس وقت کے مسلمانوں کو جلانے کے لیے انہوں نے بہت سا ایندھن جھونک رکھا تھا جب کہ وہ خندقوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو ظلم و ستم مسلمانوں پر ہو رہا تھا۔ اس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ (س۔ بروج:13)

اب سوال یہ ہے کہ یہ خندقوں والے کون تھے۔ کس ملک اور کس زمانے میں تھے اور ان کا مذہب کیا تھا۔ اس بارے میں علما کا اختلاف ہے۔

کچھ کا یہ خیال ہے کہ یہ واقعہ ایک جگہ نہیں بلکہ تین جگہوں پر ہوا تھا۔

ایک بار نجران میں جو یمن میں واقع ہے۔ ایک بار شام میں اور ایک بار فارس میں۔

یمن میں ذونواس نے کھائیاں کھود کر آگ سے بھر دی تھیں۔ ان میں ایمانداروں کو ایمان کے جرم میں ڈالتا تھا۔

شام میں ایسا ہی سلوک ابطاموس نے کیا تھا اور فارس میں بخت نصر نے جس کے عہد میں حضرت دانیال تھے۔

ابن المقدور اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ حبشہ میں بھی ایک بار ایسا واقعہ گزرا ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل میں گزرا ہے۔ جب کہ ان میں بت پرستی کا رواج تھا اور انہوں نے خدا پرستوں کو ایمان سے روکنا چاہا تو خندقیں کھدوادیں اور ان میں آگ جلا کر ایک بت کو کھڑا کر دیا اور حکم دیا کہ جو اس کو سجدہ نہ کرے اس کو آگ میں ڈال دیا جائے۔ مگر قرآن مجید میں جو آیات ہیں ان میں سے کس کی طرف اشارہ ہے؟ ایک نظر سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ زونواس کے دور میں جو یمن میں ہوا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ اس راستے کو عرب جانتے تھے اور اس کو دیکھنے والے بعض اشخاص آنحضرتؐ کے عہد تک باقی تھے اور قریش کو اس واقعے سے خبردار کیا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی خندقوں والوں کی طرح غریب ایمانداروں پر ظلم کرتے تھے۔

اس راستے کی طرف صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ترمذی میں تو اس حوالے سے پوری ایک کہانی بیان کی ہے۔ جو مختصراً کچھ یوں ہے۔

کوئی بادشاہ تھا۔ اس کے ہاں ایک بوڑھا کاہن تھا۔ کاہن نے ایک روز بادشاہ سے کہا۔ ”میری عمر آخیر ہوئی۔ آپ کسی ذہین لڑکے کو میرے حوالے فرمایے کہ میں اس کو اپنا یہ علم سکھا جاؤں۔“

تب بادشاہ نے ایک ہوشیار لڑکے کو متعین کیا۔ وہ اس کاہن کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ راستے میں ایک راہب رہا کرتا تھا۔ لڑکا راہب سے بھی ملنے لگا۔ راہب نے اس کو دین حق اور توحید کی تعلیم دینی شروع کر دی اور لڑکا ایمان لے آیا۔ لڑکا چونکہ راہب کے پاس بھی کچھ وقت گزارنے لگا تھا اس لیے کاہن کے پاس پہنچنے میں اسے دیر ہو جایا کرتی۔

کاہن نے اس کے گھر والوں سے شکایت کی۔ گھر والوں نے اس بات پر اس سے مارپیٹ شروع کر دی۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ راستے میں ایک بڑا سا سانپ ہے اور لوگ رکے کھڑے تھے۔ تب اس لڑکے نے ایک پتھر اٹھا کر کہا۔ ”یاالٰہی! اگر راہب کی بات حق ہے تو اس پتھر سے یہ موذی مر جائے۔“

یہ کہہ کر اس نے پتھر پھینکا جس سے وہ سانپ مر گیا اور لڑکے کی تعریف ہونے لگی۔

یہ شہرت سن کر ایک اندھا بھی لڑکے کے پاس آکر بولا۔ ”اگر تو میری آنکھیں اچھی کر دے تو میں تجھے انعام دوں گا۔“ وہ اندھا بادشاہ کا مصاحب تھا۔

”لڑکے نے کہا کہ مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہیے کہ جو خدا تیری بینائی لوٹائے گا اس خدا پر ایمان لے آ۔“

اندھے نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ایسا ہی کروں گا۔“

لڑکے نے دعا کی تو اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اندھا خدا پر ایمان لے آیا۔ یہ خبر جب بت پرست بادشاہ کے پاس پہنچی تو اس نے راہب اور اندھے دونوں کو آری سے چروا دیا اور لڑکے کے لیے حکم دیا کہ اس کو فلاں پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو۔

جب سپاہی لڑکے کو اوپر لے گئے تو وہ خود گر کر مر گئے اور لڑکا بچا رہا۔ پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو کشتی میں سوار کر کے دریا میں لے جا کر غرق کر دو۔ وہاں بھی سپاہی ڈوب گئے اور لڑکا سلامت نکل آیا۔

اب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ تم مجھے کبھی نہیں مار سکو گے کیوں کہ میرا خدا میرے ساتھ ہے۔ ہاں اگر خدا نے میری زندگی ہی اتنی لکھی ہے اور تم مجھے مارنا چاہتے ہو تو مجھے کسی تختے پر کھڑا کر کے یہ لکھو ”باسم رب هذا الغلام“ اور تیر مارو میں مر جاؤں گا۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور لڑکا مر گیا۔

یہ دیکھ کر ہزاروں افراد خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔

تب بادشاہ نے کہا کہ خندقیں کھودو اور ان میں لکڑیاں بھر کر آگ لگا دو اور آگ جب اچھی طرح بھڑک اٹھے تو جو ہمارے بتوں کو نہ مانے اس کو آگ میں ڈالتے جاؤ۔

اس طرح اس دن بیس ہزار آدمیوں کی شہادت ہو گئی اور آخر میں خود بادشاہ اور اس کے امیروں کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر ہلاک ہو گئے۔

قرآن مجید میں جو خندقوں والوں کی طرف اشارہ ہے تو ترمذی میں اس واقعے کے لیے لکھا ہے کہ قرآن کا

اشارہ اس واقعے کی طرف ہے۔

اس قسم کے واقعات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ جنت کی راہ آسان نہیں ہوتی۔ ہر قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر وہ منزل نصیب ہوتی ہے جو منزل ابدی سکون کی ہے۔

اب جس طرح اوتار، ابدال یا خندقوں والے لوگ اللہ کی نشانیوں کے ساتھ ساتھ اسراء الہیہ ہیں یعنی ہزاروں لاکھوں بھید میں سے ہیں اس طرح ایک بھید ہے تابوت سکینہ۔

اب تک ہزاروں بار اس کے بارے میں سنا ہوگا۔ لیکن یہ تابوت ابھی پوشیدہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ قیامت کے قیام سے پہلے ظاہر ہو جائے گا۔

آئیں ذرا تابوت سکینہ کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے پاس ایک تابوت تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ (س بقرہ۔ ع 32)

ترجمہ۔ ''اور ان کے پیغمبر نے ان سے کہا کہ طالوت کے من جانب اللہ ہونے کی یہ نشانی ہے کہ وہ صندوق میں تمہارے پروردگار کی بھیجی ہوئی نشانی (یعنی توراۃ) ہے اور (نیز) موسیٰ و ہارونؑ جو یادگار چھوڑ مرے ہیں ان میں کی بچی کچھی چیزیں بھی اس میں ہیں اور وہ بے لڑے تمہارے پاس آ جائے گا اور فرشتے اس کو اٹھا لائیں گے۔''

تابوت سکینہ کی حقیقت کے بارے میں جواہر التفسیر میں لکھا ہے کہ تابوت سکینہ ایک صندوق شمشاد یا صندل کا تین گز طویل اور دو گز کا عریض تھا۔ اس کو اللہ جل شانہ نے حضرت آدمؑ پر بھیجا تھا۔ اس میں ان پیغمبروں کی تصویریں تھیں جو اولادِ آدم سے پیدا ہونے والے تھے اور ہر پیغمبر کے واسطے اس میں ایک خانہ تھا اور سب سے پیچھے ایک خانہ سرخ یاقوت کا تھا۔ وہ آنحضرت کا تھا۔

یہ تابوت حضرت آدمؑ پر اس وقت نازل ہوا تھا جب حضرت شیثؑ سے نورِ احمد کی معاونت عہد و میثاق لیا گیا۔

فرشتوں کی گواہیاں ہوئیں اور یہ قرار پایا کہ جس پیغمبر کے پاس یہ صندوق ہوگا وہ اپنے آئندہ سن کے سپرد کر کے محافظتِ نورِ محمدی کا عہد کرے۔

اس طرح حضرت شیثؑ سے حضرت اسماعیلؑ تک یہی طریقہ رہا۔ اس کے بعد حضرت السیعؑ تک پہنچا۔ وہاں سے عمالقہ اسے چھین کر لے گئے جس پر بنی اسرائیل رویا کرتے تھے۔

عمالقہ نے وہ صندوق اپنے بت خانے میں لا کر رکھا تو تمام بت اس کے آگے گر پڑے۔ صرف ایک بت سونے کا جس میں جواہرات لگے ہوئے تھے باقی رہا۔

صبح کے وقت اس قوم کے سردار جب پوجا پاٹ کے لیے بت خانے میں داخل ہوئے تو یہ حال دیکھا۔ عمالقہ حیران ہو گئے اور تابوت سکینہ پر بتوں کو بیٹھا کر چلے گئے۔

اور دوسری صبح جب بت خانے میں گئے تو بت نیچے تھے اور تابوت اوپر۔ اس پر اور بھی حیران ہوئے۔ تب لوہے کی میخوں سے اس تابوت کو جڑ دیا۔ دوسری صبح آئے تو اس بڑے بت کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ تابوت اس پر رکھا ہوا تھا۔ پریشان ہوئے جب بنی اسرائیل سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ تابوت بنی اسرائیل کے خدا نے بھیجا ہے۔ بت کدہ اس کی جگہ نہیں ہے۔

اگر چند دن اور یہ تابوت وہاں رہ گیا تو تمہارا بت خانہ ہی فنا ہو جائے گا۔

تب عمالقہ نے اس تابوت کو ایک گاؤں کی حد میں دفن کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس گاؤں کے سب لوگ مر گئے۔

وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھا۔ وہاں کے لوگوں پر بھی آفت نازل ہوئی۔ غرض یہ کہ اس طرح پانچ شہر ویران ہو گئے۔

آخر کار لاچار ہو کر بیلوں پر لاد کر ہانک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتے بھیجے کہ وہ بیلوں کو حضرت شموئیل کے پاس ہانک لائے۔ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ سکینہ کا چہرہ آدمی کی طرح تھا اور اس کے دو بازو تھے۔ لڑائی کے وقت اس میں سے ایسی ہوا نکلتی تھی کہ دشمن بھاگ جاتے تھے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ سکینہ ایک طشت تھا جس میں انبیا علیہ السلام کے دل دھوئے گئے تھے۔

زاد المیر میں لکھا ہے کہ سکینہ خدا کی جانب سے ایک اوج ناطقہ تھا۔ جب بنی اسرائیل کسی بات میں اختلاف کرتے تو اس تابوت کے پاس آکر بیان کرتے اور وہ روح جواب دیتی اور ان کا شبہ دور ہو جاتا۔

تفاسیر میں لکھا ہے کہ اب وہ تابوت، عصائے موسیٰ سمندر میں ہے اور قیامت سے پہلے ظاہر ہوگا۔

انقلابی

مریم کے خان

وہ امریکن سی آئی اے کی نظروں میں دنیا کا سب سے خطرناک شخص ہے جب کہ دبے کچلے افراد اسے مسیحا قرار دیے رہے تھے۔ اس کے نظریات خواہ کچھ بھی ہوں مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دبے کچلے لوگوں کے لیے مسیحا ثابت ہو رہا تھا اور سرمایہ داروں کے لیے جلاد۔ اس جنگی معرکوں میں اس بے جگری سے حصہ لیا کہ دشمن بھی تھرا اٹھے مگر سی آئی اے کی حمایت یافتہ لڑکوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

دنیا بھر میں گوریلا تحریک کی علامت شخصیت کا تذکرہ
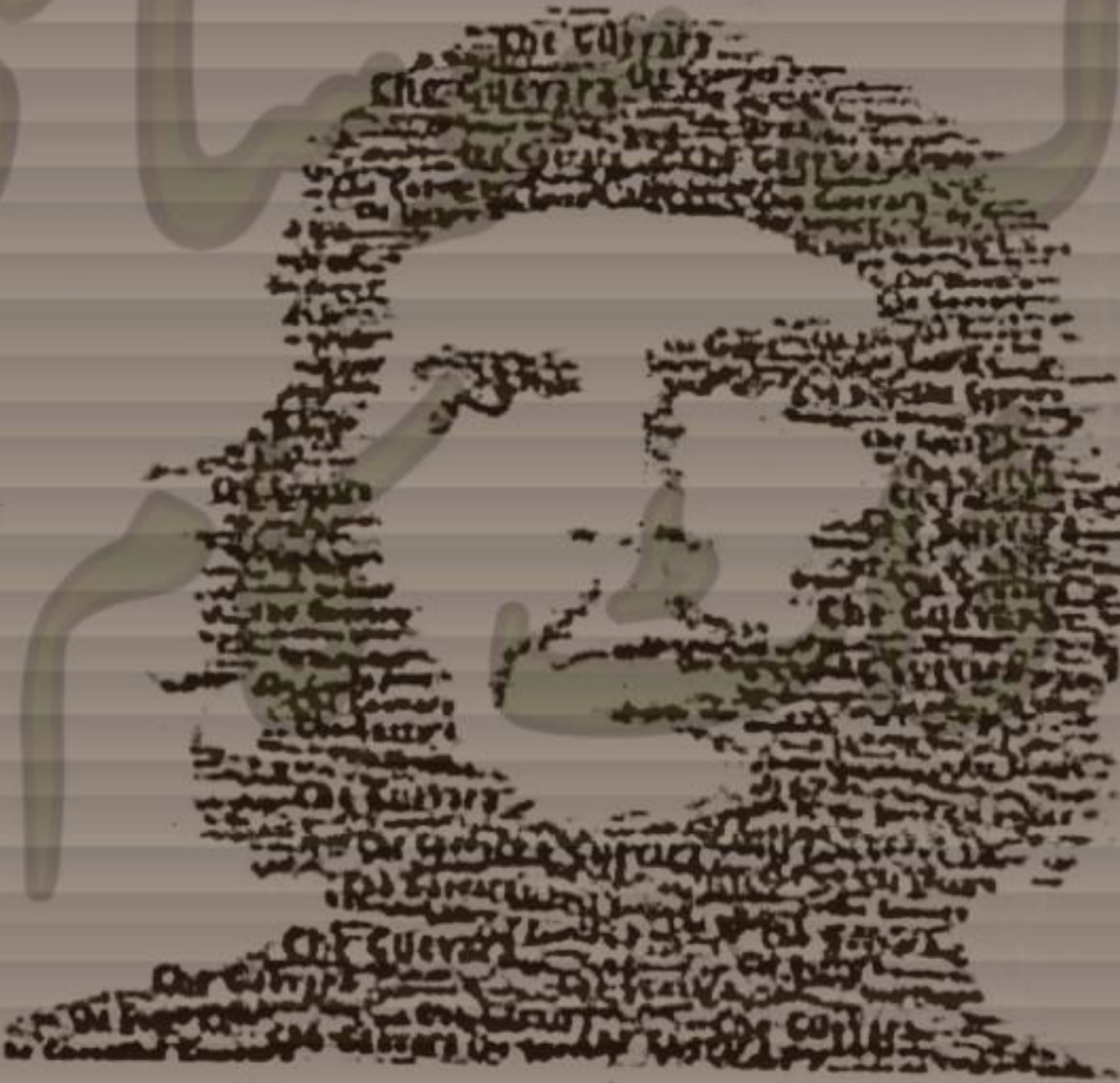
بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ اس لحاظ سے بہت ہنگامہ خیز تھا کہ ایک طرف تو سرمایہ داری کے متوازی سوشلزم کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی اور دوسری طرف یورپ میں شدید معاشی بحران نے جرمنی اور اس سے ملحق جرمن نژاد ریاستوں میں نازی ازم کی راہ ہموار کر دی تھی۔ مغرب کے نزدیک یہ زیادہ بڑا خطرہ تھا کیونکہ یہ ان کے اپنے اندر سے جنم لے رہا تھا۔ اس لیے فی الحال امریکا اور اس کے اتحادیوں نے سوشلزم کو نظر انداز کیا اور اس نے

ایشیا اور جنوبی امریکا کے خطوں میں اپنی جڑیں پھیلانا شروع کر دی تھیں۔ وہاں پائی جانے والی بھوک، غربت، جہالت اور بیماریوں نے سوشلزم کو ایک قدرتی راہ فراہم کی تھی۔ ارجنٹائن بھی اس وقت مشکل حالات سے گزر رہا تھا۔ معاشی حالات دگرگوں تھے اور امیروں و غریبوں میں بہت زیادہ فرق تھا۔ بیونس آئرس اور دوسرے شہروں میں امرا کے محلات کے ساتھ ساتھ غریبوں کے جھونپڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی موجود تھا۔ ملک کی بیشتر دولت اور زمین چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے جنوبی امریکا کے اس دوسرے بڑے ملک میں نوّے فیصد لوگ غربت سے نیچے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

شمال مشرقی ارجنٹائن کے ایک متوسط شہر روزاریو سانتافے کے متوسط خاندان میں پہلے بچے نے جنم لیا۔ ارنسٹو گویرا لانچ اور سیلیا ڈی لا سرینا لوئیسا کی یہ پہلی اولاد ہی نہیں بلکہ پہلا بیٹا بھی تھا۔ انہوں نے اسے باپ کا نام دیا اور اسے ارنسٹو گویرا کے نام سے بپتسمہ دیا گیا۔ اس خاندان کا تعلق اسپین کی کالونی باسک سے اور نسلی تعلق آئرلینڈ سے تھا مگر باسک اور اسپین آنے کے بعد انہوں نے اسپینش رسم و رواج اور نام اپنا لیے تھے۔ باسک سے اس خاندان نے ہجرت کی اور ارجنٹائن آ کر آباد ہو گیا۔ اس وقت ارجنٹائن اسپینش مہاجروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مغربی یورپ کے دو ممالک اسپین اور پرتگال نے جنوبی امریکا کے ان بڑی زمین والے ممالک یعنی ارجنٹائن اور برازیل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ مگر جلد اسپین برازیل اور پرتگال ارجنٹائن سے دست بردار ہو گیا اور ان ملکوں میں ان دو ممالک کے افراد آباد ہونے لگے۔ یہ صدیوں پرانی آویزش آج بھی برقرار ہے۔

ارنسٹو خوش شکل اور خوش مزاج بچہ تھا۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ موجود رہتی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے چار بہن بھائی دنیا میں آئے اور ارنسٹو نے انسانوں سے ہمدردی اور ان کی مدد کا اوّلین سبق گھر سے حاصل کیا جب وہ اپنے بہن بھائیوں کو سنبھالنے میں اپنی ماں کی مدد کرتا تھا۔ اس کا باپ ایک متوسط طبقے کا تاجر اور ملازم پیشہ شخص تھا۔ مگر اس کی سیاسی ہمدردیاں واضح تھیں۔ اسپینش سول وار میں وہ ری پبلکنز کا حامی تھا اور جب ارنسٹو نے ہوش سنبھالا تو عام طور سے اس کا چھوٹا سا گھر ان پناہ گزینوں سے بھرا دیکھا جو خانہ جنگی کے ہاتھوں ترک وطن کر کے ارجنٹائن چلے آ رہے تھے۔ اسپینیوں کے جھگڑے سمندر پار کر کے یہاں تک چلے آئے تھے اور ارنسٹو نے چار سال کی عمر میں اپنی گلی میں پہلا قتل دیکھا۔ جب مخالف پارٹی نے اس کے گھر میں رہنے والے چند پناہ گزینوں پر حملہ کیا اور اس لڑائی میں ایک شخص مارا گیا تھا۔

اس لڑائی کے بعد گویرا لانچ اپنے اہل خانہ کو لے کر کچھ عرصے کے لیے ایک مضافاتی فارم میں جا کر روپوش ہو گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جو کمسن ارنسٹو نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزارا تھا۔ گھر میں اسے عام طور سے کئی کئی دن اپنے باپ کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس فارم میں وہ سارا دن باپ کے ساتھ رہتا تھا اور یہاں اس نے شطرنج کھیلنا سیکھی۔ چند دنوں میں وہ اس کھیل میں اتنا رواں ہو گیا کہ بارہ سال کی عمر میں وہ ملک گیر ٹورنامنٹس میں شرکت کرنے لگا تھا۔ شطرنج کے بعد اسے رگبی کا شوق تھا۔ حالانکہ دونوں متضاد کھیل ہیں۔ ایک میں ذہن اور دوسرے میں جسم استعمال ہوتا ہے۔ چودہ سال کی عمر میں وہ یونین مقابلوں میں حصہ لینے لگا۔ ایک طرف وہ کھیلوں کا شیدائی تھا تو دوسری طرف وہ تعلیم کے معاملے میں بھی سنجیدہ تھا۔

سورج ڈوبنے کے بعد اس کا بیشتر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ اس کی سیاسی تربیت براہِ راست ان محفلوں سے ہو رہی تھی جن میں یورپ اور جنوبی امریکا کے اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔ ان میں مختلف الخیال لوگ تھے۔ یوں اسے مختلف حلقہ ہائے سیاست کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ اگرچہ ان میں بہت کم ایسے تھے جو سوشلسٹ نظام کے حامی ہوں مگر ارنسٹو نے خاص طور سے سوشلزم میں دلچسپی محسوس کی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں روس کا کردار نہ ہونے کے برابر تھا لیکن جیسے جیسے یہ جنگ آگے بڑھتی رہی۔ سوویت یونین کا کردار کھل کر سامنے آنے لگا۔ اسی مناسبت سے سوشلزم کی اشاعت بھی ہونے لگی۔ اسٹالن گراڈ سے جرمنوں کی پسپائی نے یکا یک سوویت یونین کو ایک عالمی طاقت کا درجہ دے دیا تھا۔ اور پھر مشرقی یورپ کے ممالک کو اپنے زیرِنگین لا کر سوویت یونین نے مغرب کی طرف بھی پیش قدمی شروع کر دی۔ جنگِ عظیم کے بعد سوشلزم کی پیش قدمی میں مزید تیزی آئی اور خاص طور سے جنوبی امریکا کے ممالک اس کی توجہ کا مرکز بننے لگے۔ ان میں ایک ارجنٹائن بھی تھا۔

متوسط گھر اور غریبانہ علاقے میں پرورش پانے والا

ارنسٹو متجسس فطرت اور ان تھک محنت کا عادی تھا۔ اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی کمسنی میں یہ پارہ صفتی دیکھ کر اس کے باپ لانچ نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ ''میرے بیٹے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے اندر صحیح معنوں میں اپنے آئرش آباواجداد کی بے چینی اور حریت پسندی موجود ہے۔''

جب وہ اپنے اردگرد موجود بھوک اور غربت دیکھتا تو وہ ان لوگوں کے لیے کچھ کر گزرنے کو بے تاب ہو جاتا۔ ابھی وہ پندرہ سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے بھوکے بچوں کو کھانا کھلانے کے حوالے سے مقامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ جب وہ گھر سے نکلتا تو بچے اسے گھیر لیا کرتے تھے۔ اس کے جیب خرچ اور وہ جو کھیلوں سے کماتا تھا اس کا بڑا حصہ ان غریب بچوں کا پیٹ بھرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ جس سال جنگ عظیم ختم ہوئی اسی سال اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کر لی۔ جنگ کے آخری دنوں میں اس کے گھر میں کچھ پُراسرار افراد کی آمد بھی ہوتی تھی اور اسے بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک خفیہ یہودی تنظیم کے لوگ تھے جو جنگی جرائم میں ملوث فرار ہونے والے نازیوں کو جنوبی امریکا میں تلاش کر رہے تھے۔ وہ کبھی نہیں جان سکا کہ اس کے باپ نے ان لوگوں کی مدد کی تھی یا نہیں۔ اس کا باپ مذہب پسند نہیں تھا مگر وہ یہودیوں کے خلاف بھی نہیں تھا۔ ارنسٹو کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ یہودی مذہب کے نام پر دوسروں کی زمین چھین کر اپنا وطن بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ ساری عمر اسرائیل کا شدید ترین مخالف رہا اور کہتے ہیں کہ اس کی موت میں اسرائیلیوں کا بھی ہاتھ تھا۔

ابھی وہ جوان تھا اور زندگی کے ان لمحوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک دمے کے پے در پے حملوں نے اسے ان تمام مشاغل سے دور کر دیا۔ وہ ایتھلیٹ تھا۔ اعلیٰ درجے کا تیراک تھا۔ رگبی، فٹ بال اور گولف کا کھلاڑی تھا۔ کھیلوں میں اسے شوٹنگ پسند تھی اور نوعمری میں اس نے بہترین نشانے باز کا اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ وہ ان تھک سائیکل چلانے کا عادی تھا اور چھ چھ گھنٹے مسلسل سائیکل چلانا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ اس نے پیشہ ور رگبی کھیلی اور وہ یونین کے کلب یونیورسٹیز ار یوڈی بیونس آئرس کا اہم ترین کھلاڑی تھا۔ اس کے جارحانہ انداز اور رویے کی وجہ سے اسے کلب میں ''اڑنے والا'' کہہ کر پکارا جاتا تھا اس وقت جب وہ اوپر جانے والا تھا اس موذی بیماری نے اسے ایک ریٹائرمنٹ پر مجبور کر دیا۔ بعد میں بھی دمے کے اثرات نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

بیس سال کی عمر تک اس کی زندگی دو حصوں میں تقسیم رہی تھی۔ ایک حصہ جو دن کی روشنی میں ہوتا تھا۔ جب وہ شاذ ہی گھر میں پایا جاتا تھا۔ شہر کی گلیاں اور کھیل کے میدان اس کی جولان گاہ ہوتے تھے۔ لوگوں سے ملنا، ان کی مدد کرنا اور انہیں دوست بنانا۔ ان دنوں اس کے حریف صرف کھیل کے میدان میں ہوتے تھے۔ اس کی خوش مزاجی اور شوخ طبیعت اس کے مخالفوں کو بھی اس کا دوست بنا دیتی تھی۔ مگر اس کے دن کے یہ ساتھی ناواقف تھے کہ سورج غروب ہوتے ہی ارنسٹو کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا تھا۔ تب وہ اپنے گھر اور اس میں بیشتر وقت اپنے کمرے میں پایا جاتا تھا۔ ادبی ذوق اور کتاب سے محبت اسے ورثے میں ملی تھی۔ اس کے گھر میں تین ہزار سے زیادہ کتابیں تھیں اور یہ اتنی ضرور تھیں کہ ارنسٹو اپنے بے پناہ شوق مطالعہ کی تسکین کر سکے۔ یورپ، امریکا اور لاطینی امریکا میں اسپینش زبان میں لکھنے والا کوئی ادیب اور شاعر ایسا نہیں تھا جس کی لکھی کوئی بھی چیز اس کی نظروں سے گزرنے سے رہ گئی ہو۔ ابتدائی طور پر اس نے اسپینش اور لاطینی زبانیں سیکھی تھیں۔ بعد میں اس نے انگریزی اور روسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔ ان چاروں زبانوں کا ادب اس نے اپنے ذہن میں سمو لیا تھا۔

اسے صرف مطالعے کا شوق نہیں تھا۔ وہ ادیبوں، فلاسفروں، سیاست دانوں اور معیشت دانوں کی کتابوں میں جو حصے پسند آتے انہیں اپنی ہینڈ رائٹنگ میں نوٹ کر لیتا تھا۔ پھر وہ ان نوٹس پر اپنے تبصرے بھی لکھتا تھا۔ نوجوانی میں وہ لکھ لکھ کر ایسی درجنوں نوٹ بکس بھر چکا تھا۔ ان کے علاوہ وہ خود بھی مضامین لکھتا تھا اور شاعری کرتا تھا مگر اس نے اپنی لکھی کوئی چیز چھپوانے کی کوشش نہیں کی۔ تاریخی شخصیات میں اسے ماتما بدھ اور ارسطو پسند تھا۔ اس نے اپنی نوٹ بکس میں کئی جگہوں پر ان کے حوالہ دیتے ہوئے ان کے اسکیچ بھی بنائے تھے۔ ان کے ساتھ اسے برٹرینڈ رسل محبت اور حریت پسندی، جیک لنڈن معاشرہ اور نطشے موت کے خیالات کی وجہ سے پسند تھا۔ نفسیات میں اس کی پسند سگمن فرائیڈ تھا۔ اسکول میں دوران تعلیم اس کے پسندیدہ سبجیکٹ فلسفہ، ریاضی، انجینئرنگ، پولیٹیکل سائنس، سوشیالوجی، تاریخ اور آرکیالوجی تھے۔ ارنسٹو کا یہ روپ اس کے قریب ترین

دوستوں اور احباب سے بھی پوشیدہ تھا۔ حد یہ کہ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اس کی رات کی ان سرگرمیوں کے بارے میں بہت کم جانتے تھے۔

☆☆☆

1948ء میں وہ یونیورسٹی آف بیونس آئرس میں میڈیکل کے ایک طالب علم کے طور پر داخل ہوا۔ بیونس آئرس روزیریو سانتا فے کے مقابلے میں بڑا اور ثقافت سے مالا مال شہر تھا۔ یہاں اس کی دل چسپی کی بہت سی چیزیں تھیں۔ مگر حیرت انگیز طور پر اسے کبھی بیونس آئرس پسند نہیں آیا۔ شہروں کے مقابلے میں اس کی دل چسپی ہمیشہ چھوٹے دیہات اور جنگلوں سے رہی تھی۔ اس نے دوران تعلیم ہی جنوبی امریکا کی سیر کا ارادہ کیا۔ یہاں اس کا سب سے اچھا دوست البرٹو گریناڈو تھا۔ ان دونوں نے مل کر پروگرام بنایا کہ موٹر سائیکل پر پورے براعظم کا ٹرپ کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے یونیورسٹی کی سالانہ چھٹیوں کا انتخاب کیا۔ 1950ء میں انہوں نے اس سفر کا آغاز ارجنٹائن کے ایک دیہی علاقے سے کیا۔ تقریباً ساڑھے چار ہزار کلومیٹرز طویل یہ سفر تھا۔ ان کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی اور موٹر سائیکل بھی معمولی سی تھی جس میں ایک چھوٹا انجن فٹ تھا۔ جب ان کے پاس رقم ختم ہو جاتی تو وہ کہیں کام اور محنت مزدوری کر کے کچھ رقم جمع کر لیتے اور آگے سفر کرتے تھے۔ جب ان کی بائیک خراب ہوتی تو وہ خود اس کی مرمت کرتے تھے۔ حیرت انگیز طور پر ان کا یہ طویل سفر کامیاب رہا اور وہ کولمبیا تک گئے تھے۔ اس کامیابی سے حوصلہ پا کر انہوں نے اگلے سال زیادہ طویل سفر کا پروگرام بنایا جو آٹھ ہزار کلومیٹرز طویل تھا۔ اس سفر کا نقطۂ عروج سان پابلو لیبر کالونی پیرو میں چند ہفتے کا قیام تھا یہ وہ جگہ ہے جہاں سے دریائے ایمزون کا آغاز ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ چند ہفتے وہاں رضا کار کے طور پر گزارے۔

مگر تفریح اور معلومات کے نقطۂ نظر سے کیے جانے والے یہ سفر جلد گیویرا کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کا باعث بن گئے۔ جب وہ دیکھتا کہ اس بڑے اور وسائل سے مالا مال براعظم میں ہر طرف بھوک اور غربت کا ڈیرہ ہے اور اس کی وجہ پیداوار میں کمی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ چند افراد کا تمام دولت پر قابض ہو جانا تھا۔ جو بے لگام سرمایہ داری نظام کا ایک منطقی نتیجہ تھا۔ اس نے چلی میں تانبے کی کانوں میں کام کرنے والے کان کنوں کی حالتِ زار دیکھی۔ انہیں ان کی چودہ گھنٹے کی جان توڑ محنت کا صرف اتنا صلہ ملتا تھا کہ وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ دنیا کے چند سرد ترین صحراؤں میں سے ایک صحرائے آٹاکاما میں اسے ایسے لوگ ملے جن کے پاس سرد ترین راتیں گزارنے کے لیے ایک کمبل تک نہیں تھا۔ حالانکہ وہ محنت کر کے کماتے تھے اور سرمایہ داری نظام کا براہ راست نشانہ تھے۔

ماچو پیچو کے تاریخی مقام کا سفر کرتے ہوئے اس نے بلند علاقوں میں ایسی غربت دیکھی جس کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔ جب اس کا واسطہ ان لوگوں سے پڑا تو وہ لوگ بھی امیر لگنے لگے جنہیں وہ اپنے شہر میں غریب سمجھتا تھا۔ اس سفر میں اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ غربت کا تعلق وسائل کی کمی سے نہیں بلکہ معاشی نظام سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ایک ہی نظام جو یورپ اور شمالی امریکا میں کامیاب ہے وہی نظام لاطینی امریکا اور ایشیا میں کیوں ناکام ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظام کسی خاص خطے یا کسی خاص براعظم کے مفادات کی تکمیل کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔ جب وہ اپنے آس پاس دیکھتا اور ان دو سفروں میں اس نے جو دیکھا تھا اس سے اسے لگتا کہ غربت، بھوک اور بیماریوں کا براہِ راست ذمے دار یہ معاشی نظام ہے۔ کیونکہ اس کے تمام ذمے دار اصل میں سرمایہ داری کے نمائندے تھے۔ وہ ملک کی معیشت، تجارت، سیاست اور میڈیا پر چھائے ہوئے تھے۔ مزدور، کسان اور کان کن سب ان کے غلام تھے۔

ان دنوں پیرو جنوبی امریکا میں سوشلزم کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خاص طور سے سان پابلو کی لیبر کالونی اسے ایک ارضی جنت کی طرح لگی۔ جہاں کمیونزم کا عملی تجربہ کیا جا رہا تھا۔ اس کالونی اور یہاں موجود کھیتوں کا شمار دنیا کے بلند ترین رہائشی علاقوں میں ہوتا تھا جہاں رات کے وقت درجہ حرارت ہمیشہ منفی میں چلا جاتا تھا، چاہے موسم شدید گرمی کا کیوں نہ ہو۔ یہاں سب کام مل جل کر کیے جاتے تھے اور اس کے نتیجے میں جو حاصل ہوتا تھا وہ سب کی ملکیت ہوتا تھا اور سب کو برابر کا ملتا تھا۔ یہ جگہ ان لوگوں کے لیے خاص طور سے اہمیت اختیار کر گئی تھی جو اس دنیا میں اکیلے تھے۔ لیبر کالونی ان کے لیے کنبہ بن گئی تھی۔ اس سفر کے دوران گیویرا اپنے مشاہدات اور تجزیے ایک ڈائری کی صورت میں لکھتا رہا تھا اور اس نے اس کا نام ''موٹر سائیکل ڈائریز'' رکھا۔ بعد میں یہ ڈائریز نیویارک ٹائمز میں شائع ہوئیں اور انہوں

نے بیسٹ سیلر کا اعزاز حاصل کیا۔ 2004 میں اسی نام کی ایک فلم بنی اور اس فلم نے بے شمار ایوارڈ اور بڑی تعداد میں عوامی توجہ حاصل کی تھی۔

گیویرا نے پہلا سفر بہت تیزی سے اور مختصر مدت میں مکمل کر لیا تھا مگر دوسرا سفر اس نے رک کر اور آرام سے کیا تھا۔ اس سفر میں وہ پورے ارجنٹائن، چلی، پیرو، ایکوے ڈور، کولمبیا، وینزویلا اور پانامہ سے ہوتا ہوا میامی فلوریڈا تک گیا تھا۔ دوسرے سفر میں اس نے تقریباً یہی روٹ اختیار کیا مگر اس بار اس نے کئی ذیلی سفر بھی کیے اور وہ ایمزون میں بھی گیا تھا۔ دریا کا سفر ایک الگ ایڈونچر تھا جس میں اس نے ایک نئی دنیا دریافت کی۔ اسے پتا چلا کہ اس براعظم کا پرانا رواج کیا تھا اور اب بھی یہاں قدیم نسل کے لوگ آباد تھے۔ مگر اس سفر میں اس نے ان تمام ملکوں کو ایک الگ ملک کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اس نے پورے براعظم کو ایک وحدت کی صورت میں دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ یہاں کے مسائل ایک سے ہیں اور ان کا حل بھی آپس میں جڑا ہوا ہے۔ اس نے ایک ہی بنا سرحد کے لاطینی امریکا کا خواب دیکھا جس کا کلچر لاطینی ہسپانک ہو۔ یہی خواب بعد میں اس کی حریت پسند سرگرمیوں کا مرکز بنا۔

دوسرے سفر سے واپسی پر اس نے تعلیمی سلسلہ شروع کیا اور 1953 میں میڈیکل کی ڈگری حاصل کی۔ اب وہ خود کو ڈاکٹر ارنسٹو گیویرا کہہ سکتا تھا۔ مگر اس نے زندگی میں کبھی خود کو بہ حیثیت ڈاکٹر متعارف نہیں کرایا۔ اس کی بجائے اس نے خود کو اصلاح پسند کہلوانا شروع کر دیا۔ اس نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ ”میں نے لاطینی امریکا کے دو سفر کیے اور اس دوران میں، میں نے خود کو غربت، بھوک اور بیماری سے منسلک دیکھا۔ غربت ایسی تھی کہ لوگ ایک بچے کی پرورش بھی نہیں کر پاتے تھے۔ باپ اپنے بچے کی بھوک اور بیماری سے موت یوں قبول کرتے تھے جیسے یہ کوئی غیر اہم حادثہ ہو۔ تب میں نے جانا کہ سرمایہ داری نظام نسلوں کو ختم کر دیتا ہے۔“

اس نے محسوس کیا کہ ان لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے کیونکہ وہ اپنی مدد خود کرنے کے قابل نہیں تھے۔ تب اس نے ڈاکٹری اور دواؤں کا بکس ایک طرف رکھنے اور حالات تبدیل کرنے کے لیے سیاسی اور عملی مزاحمت کے میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اپنے لیے ایک موزوں پلیٹ فارم کی ضرورت تھی اور یہ پلیٹ فارم اسے ارجنٹائن میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ملک کی اہمیت اس کی نظروں میں پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اس لیے اسے یہاں سے نکلنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ایک بار پھر سفر پر روانہ ہوا اور اس بار وہ اکیلا تھا۔ اس بار وہ بولیویا، پیرو، ایکویڈرو، پانامہ، کوسٹا ریکا، نکاراگوا، ہنڈوراس اور ال سلواڈور گیا۔ اس کی آخری منزل گوئٹے مالا تھا۔ جب وہ گوئٹے مالا پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے جس پلیٹ فارم کی تلاش تھی۔ وہ یہیں ہے۔

اس وقت صدر جیکب اربنز گزمان ایک جمہوری منتخب صدر بن کر ملک میں اصلاحات کا جامع پروگرام چلا رہا تھا اور اس میں سب سے اہم زمین کی اصلاحات تھیں۔ اس وقت گوئٹے مالا میں بیشتر زرعی زمین چند بڑے جاگیرداروں اور کمپنیوں کے قبضے میں تھی۔ ان میں خاص طور سے یونائیٹڈ فروٹ فارمز کمپنی اہم تھی کیونکہ اس کے پاس لاکھوں ایکڑ زمین تھی اور اس کے فارمز پر ہزاروں افراد کام کرتے تھے۔ جب گیویرا نے ان فارمز پر کام کرنے والے مزدوروں کی حالت دیکھی تو اس نے اپنے ایک خط میں یونائیٹڈ فروٹ فارمز کمپنی کو ایک سرمایہ داری ہشت پا قرار دیا۔ مشکل سے دس ایکڑ رقبے پر کام شروع کرنے والی اس کمپنی نے دو عشرے میں ملک کی دس فیصد سے زیادہ زرعی اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ کمپنی کا طریقہ یہ تھا کہ وہ غریب اور معمولی زمین رکھنے والے کسانوں کو ملازمت کا لالچ دے کر ان کی زمین خرید لیتی اور زمین کے مالک کو ملازم رکھ لیتی تھی۔ جب وہ کسی علاقے کی بیشتر زمین پر قابض ہو جاتی تو وہاں اپنی مرضی کے معاوضے دیتی جو کم ہوتے ہوتے برائے نام رہ گئے تھے۔

ایسے میں جیکب اربنز نے اصلاحات کا نعرہ لگایا تو عوام نے اسے بھاری اکثریت سے ووٹ دیا۔ اس نے صدر بننے کے بعد حسبِ وعدہ اپنے اصلاحاتی ایجنڈے پر عمل درآمد شروع کیا۔ اس کے تحت متعدد بڑے جاگیرداروں اور کمپنیوں سے زمین واپس لی جانے لگی جو وہ آباد نہیں کرتے تھے۔ لاکھوں ایکڑز زمین لے کر ان بے زمین کسانوں میں بانٹی گئی جو غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ صرف یونائیٹڈ فروٹ فارمز سے سوا دو لاکھ ایکڑز زمین حاصل کی گئی۔ اس قدم نے نہ صرف نچلے طبقے کو زمین کا مالک بنا دیا بلکہ سرمایہ داروں اور ان کی کمپنیوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ملازمین سے بہتر سلوک کریں اور انہیں ان کی

محنت کا درست معاوضہ دیں۔ گیویرا نے ان لوگوں کی حالت خود بدلتے دیکھی اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہی ماحول اس کے لیے ہے یہاں ایک سچے حریت پسند کی روح سرشار ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ جانتا تھا کہ مغرب ان اصلاحات کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرے گا وہ انہیں ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

یہاں گیویرا کی ملاقات ہلڈا گاڈیا اگوسٹا سے ہوئی۔ وہ پیرو سے تعلق رکھنے والی ماہر معاشیات تھی اور امریکن پاپولر ایولیوشنز الائنس کی سرگرم ممبر اور مشیر تھی۔ گیویرا سے اس کی اولین ملاقات ایک مباحثے میں ہوئی جہاں گیویرا نے تقریر کے دوران اپنے کچھ مشاہدات بیان کیے اور پھر لاطینی امریکا کی وحدت کا اپنا خواب پیش کیا۔ ہلڈا اس سے متاثر ہوئی۔ مباحثے کے بعد اس نے گیویرا سے ملاقات کی اور اسے پیشکش کی کہ وہ اسے اربنز حکومت کے اعلیٰ حکام سے ملاقات کرا سکتی ہے۔ وہ یہاں رہ کر بہت کام کر سکتا ہے۔ گیویرا یہاں کام تو کرنے آیا تھا وہ راضی ہو گیا اور ہلڈا نے جلد اس کی ملاقات اعلیٰ سرکاری حکام سے کرائی۔ مگر گیویرا کو سرکاری حکام سے ان حریت پسندوں سے دل چسپی تھی جو کیوبا سے فرار ہو کر گوئٹے مالا میں جمع ہو رہے تھے۔ جولائی 1953 میں گیویرا کی ان پناہ گزینوں سے اولین ملاقات ہوئی اور وہ فیڈرل کاسترو سے متعارف ہوا۔ فیڈرل کاسترو نے اس کے رابطے کا گرم جوشی سے جواب دیا اور کہا جاتا ہے اس کا معروف لقب چی اصل میں فیڈرل کاسترو نے استعمال کیا تھا۔ چی بھائی کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔

فیڈرل کاسترو کیوبا کے صدر مون کاڈا بارا کس پر ناکام قاتلانہ حملے کے بعد روپوش تھا اور روپوشی کے دوران تحریک چلا رہا تھا۔ بہترین ماحول اور دوستوں سے قطع نظر چی گیویرا کی مالی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے میڈیکل اسکالرشپ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہا۔ اب تک اس کا نہ تو ذریعہ آمدن تھا اور نہ ہی کوئی مالی سہارا جو اس کے اخراجات برداشت کرتا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان دنوں اسے بعض اوقات پورا دن فاقے سے گزارنا پڑتا تھا۔ ہلڈا اس کے نزدیک تھی مگر وہ بھی اس کی مالی حالت سے بے خبر تھی۔ ان حالات میں اسے اپنی نہیں بلکہ لاطینی امریکا میں سرمایہ داری کے بڑھتے اثرات کی فکر تھی جس کے براہِ راست اثر اس خطے کے سیاسی اور معاشی حالات پر پڑتے۔ امریکا یہاں براہ راست مداخلت کر رہا تھا اور اس نے آمر کارلوس کاسلو کی حمایت شروع کر دی تھی۔ دوسری طرف سوویت یونین کا یہ حال تھا کہ وہ کھل کر اپنے اتحادیوں کی مدد بھی نہیں کر رہا تھا۔

مئی 1954 میں چیکوسلواکیہ سے اسلحے کی ایک کھیپ اربنز انتظامیہ کے لیے بھیجی گئی۔ اسے بہانہ بنا کر سی آئی اے نے کارلوس کاسلو کی ملیشیا کو اسلحے کی فراہمی شروع کر دی۔ یہ ایک آزاد ملک اور اس کی منتخب حکومت کے خلاف براہِ راست حملہ تھا۔ چی گیویرا نے غصے سے بے تاب کر اس کی مزاحمت کرنے کا فیصلہ کیا اور اس نے ایک کمیونسٹ ملیشیا میں شمولیت اختیار کر لی جو گوئٹے مالا اور اس خطے میں دوسرے ملکوں میں موجود سوشلسٹ تحریکوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں نے قائم کی تھی۔ مگر ان کے پاس اسلحے اور تربیت کی کمی تھی اور وہ کارلوس کی بہتر تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس ملیشیا کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کی بے عملی سے مایوس ہو کر چی گیویرا نے یونٹ چھوڑ دی اور ملیشیا کے میڈیکل کور میں خدمات انجام دینے لگا۔ اس دوران میں اس نے ایک بار پھر لڑائی میں شمولیت اختیار کی اور اس کا خاتمہ یوں ہوا کہ صدر جیکب اربنز نے جان بچانے کے لیے میکسیکو کے سفارت خانے میں پناہ لے لی اور اپنے غیر ملکی اتحادیوں سے کہا کہ وہ جان بچانے کے لیے گوئٹے مالا چھوڑ کر چلے جائیں۔

حالات یک دم بدل گئے تھے۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں سوشلسٹ پسپا ہو رہے تھے اور کارلوس کی ملیشیا تیزی سے آگے بڑھ کر ملک کے تمام اہم مقامات پر قابض ہو چکی تھی۔ سرکاری فوج ہتھیار ڈال چکی تھی اور کچھ سوشلسٹ گروپ مزاحمت کر رہے تھے مگر ان کی مزاحمت میں جان نہیں تھی۔ چی گیویرا نے ارجنٹائن کے سفارت خانے میں پناہ لے لی تھی مگر وہ وہاں سے مسلسل مزاحمت کاروں کی حمایت اور حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ اس وقت وہ کارلوس کے قاتل دستے کی نظروں میں تھا اور اگر وہ ان کے ہاتھ آجاتا تو اس کی کہانی بہت پہلے ختم ہو جاتی۔ کارلوس انتظامیہ نے اس کے بیانات پر ارجنٹائن سے باقاعدہ احتجاج کیا تھا۔ اس پر ارجنٹائن کی حکومت نے کارلوس انتظامیہ سے مذاکرات کیے اور بالآخر اس سے ایک پاس حاصل کر لیا جس کی مدد سے چی گیویرا یہاں سے باہر جا سکتا تھا۔ گوئٹے مالا حکومت نے مناسب سمجھا کہ اسی طرح اس سے جان چھڑالی جائے اور وہ چند ہفتے بعد۔ وہاں سے نکل کر میکسیکو پہنچ گیا۔

گوئٹے مالا میں قیام کے دوران چی گیویرا کو اس
وقت اپنی زندگی کا سب سے بڑا جذباتی دھچکا پہنچا جب اسے
معلوم ہوا کہ ہلڈا کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ ہلڈا جیکب اربنز کی
معروف حمایتی اور اس کے لیے کھل کر کام کرنے والے
کارکنوں میں سے تھی۔ ملک پر کنٹرول حاصل کرتے ہی
کارلوس کے ڈیتھ اسکواڈ نے ایک طرف تو قتل و غارت گری
کا بازار گرم کردیا تھا۔ چن چن کر سیاسی کارکنوں کو ہلاک کیا
جارہا تھا۔ اس کے علاوہ معروف شخصیات کو گرفتار بھی کیا جا
رہا تھا۔ جو اعلیٰ شخصیات فرار نہیں ہوسکی تھیں وہ گرفتار کرلی
گئیں اور ہلڈا بھی ان میں سے ایک تھی۔ بہت سے گرفتار
شدگان کبھی دوبارہ نظر نہیں آئے اور نہ ہی ان کے بارے
میں کوئی اطلاع ملی۔ ان کے بارے میں یہی خیال تھا کہ
انہیں قتل کرکے نامعلوم قبروں میں دفنا دیا گیا تھا۔ ایسے میں
ہلڈا کی زندگی کی بھی زیادہ امید نہیں تھی۔

مگر اس وقت چی گیویرا کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب
اس نے سنا کہ کارلوس انتظامیہ نے ہلڈا اور چند دوسری قیدی
عورتوں کو رہا کردیا تھا۔ رہائی کے فوراً بعد ہلڈا بھی میکسیکو پہنچ
گئی اور ستمبر 1955 میں اس کی اور چی گیویرا کی شادی
سادگی اور بنا کسی دھوم دھام کے ہوگئی۔ اپنی ذاتی خوشیوں
اور کامیابی کے باوجود چی گیویرا گوئٹے مالا میں جیکب اربنز
کی حکومت کے خاتمے پر افسردہ اور غصے میں تھا کہا جاتا ہے
کہ اس نے خود دیکھا کہ ایک منتخب جمہوری حکومت جو عوام
کے لیے اصلاحاتی پروگرام چلا رہی تھی۔ اسے سازشوں اور
مسلح بغاوت کرکے ختم کیا گیا۔ اس بغاوت کے پیچھے امریکا
کا ہاتھ تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ امریکا صرف اپنے
مفادات کی خاطر لاطینی امریکا اور دنیا کے بیشتر ترقی پذیر
ملکوں میں سیاسی اور معاشی مداخلت کرتا ہے اور اکثر اوقات
یہ مداخلت مسلح حد تک پہنچ جاتی ہے۔ امریکا کا رویہ ایک
جمہوری ملک کا سا نہیں بلکہ ایک شہنشاہیت کے حامل ملک کا
سا ہے۔ اس نے اپنے ایک خطاب میں کہا۔

”آخری ترقی پسند جمہوری حکومت جو لاطینی امریکا
میں تھی، بالآخر اس کا خاتمہ کردیا گیا۔ یہ سب واضح طور پر
امریکا کے اشارے پر ہوا اور امریکی وزیر خارجہ جان فوسٹر
ڈیلس براہ راست اس میں ملوث رہا ہے جو ایک اسٹاک
ہولڈر اور یونائیٹڈ فروٹ فارمز کمپنی کا وکیل بھی ہے۔“

اس خطاب سے ظاہر تھا کہ چی گیویرا کا ذہن بن چکا
ہے کہ لاطینی امریکا اور دنیا کے بیشتر ترقی پذیر ملکوں میں
سیاسی عدم استحکام، غربت اور بھوک کا سبب امریکا ہے۔ اگر
اسے ان چیزوں کے خلاف لڑنا ہے تو اسے پہلے امریکا کے
خلاف لڑنا ہوگا۔ وہ یہ بھی طے کرچکا تھا کہ مارکسزم کا تحفظ
صرف جمہوری اقتدار سے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے مسلح
جدوجہد لازمی ہوگی۔ ورنہ ہر ترقی پسند حکومت کا وہی حشر ہو
گا جو گوئٹے مالا میں جیکب اربنز کی حکومت کا ہوا۔ ہلڈا گیویرا
نے بعد میں اپنے ایک نوٹ میں واضح کیا۔ ”درحقیقت یہ
گوئٹے مالا میں حکومت کی تبدیلی تھی جس نے چی گیویرا کے
ذہن کو بدل دیا اور وہ مسلح جدوجہد کی طرف مائل ہوا ورنہ
اس سے پہلے وہ اصلاحات اور جمہوریت کا حامی تھا اور اس
کے خیال میں مسلسل جمہوری عمل سے تبدیلی ممکن تھی۔ یہ
کارلوس کاسلو کی کامیابی تھی جس نے چی گیویرا کو جنم دیا تھا۔“

میکسیکو آنے کے بعد چی گیویرا کی مالی مشکلات کم
ہوئی تھیں۔ وہ ستمبر 1954 میں یہاں آیا اور اسے فوری طور
پر میکسیکو سٹی کے جنرل اسپتال میں الرجی سیکشن میں
ملازمت مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیشنل آٹونومس
یونیورسٹی آف میکسیکو میں لیکچر دینے لگا تھا۔ مزید آمدنی کے
لیے وہ لاطینا نیوز ایجنسی کے لیے فوٹو گرافر کی حیثیت سے بھی
کام کرنے لگا تھا۔ جب ہلڈا سے اس کی شادی ہوئی تو وہ
اس قابل تھا کہ ایک خاندان کو سپورٹ کرسکے۔ شادی کے
بعد ہلڈا نے اس کے ساتھ جو وقت گزارا اسے بعد میں اس
نے اپنی یادداشت ”میری زندگی چی کے ساتھ“ میں تفصیل
سے لکھا۔ ایک جگہ اس نے لکھا۔ ”ڈاکٹر کی حیثیت سے چی
گیویرا اکثر غریب ممالک کا دورہ کرتا تھا اور وہ افریقا بھی
گیا۔ وہ جہاں گیا اسے غربت اور عام آدمی کی کسمپرسی نے
متاثر کیا۔ وہ اس معاملے میں اتنا حساس تھا کہ ایک بوڑھی
عورت جو ہمارے ساتھ کام کرتی تھی اور جب وہ نظر نہیں آتی
تو چی مضطرب ہوجاتا۔ وہ اس کے بارے میں پوچھتا تھا۔
وہ اسے نچلے طبقے کا بھولا اور نظرانداز کیا نشان قرار دیتا تھا
اور کہتا کہ یہی لوگ ہیں جن کے لیے وہ کچھ کرنا چاہتا ہے۔“

چی نے اس بوڑھی عورت کے لیے ایک نظم بھی کہی تھی
اور اس میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی بہتری
کے لیے پوری کوشش کرے گا اور اگر اسے اس مقصد کے
لیے جان بھی دینا پڑی تو اس سے گریز نہیں کرے گا۔ شاید
وہ اپنے وعدے کا پہلا حصہ ممکن نہیں بنا سکا لیکن اس نے
اپنے مقصد کے لیے جان ضرور دے دی تھی۔ میکسیکو میں
قیام کے دوران چی گیویرا کے کچھ پرانے روابط پھر استوار

ہوئے۔ ان میں ایک نیچو لوپاز بھی تھا۔ لوپاز کیوبا کا تارک
وطن تھا اور وہ وہاں سوشلسٹ حکومت کے قیام کے لیے
کوشش کر رہا تھا۔ لوپاز نے اس کی ملاقات راؤل کاسترو
سے کرائی اور اس نے اسے اپنے بھائی فیڈل کاسترو سے
ملوایا۔ فیڈل کاسترو پہلے ہی اس کے بارے میں جانتا تھا اور
اسی نے گیویرا کو چی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس سے ملاقات
کے بعد چی گیویرا کو اندازہ ہوا کہ لیڈر کسے کہتے ہیں اور اس
کے عزائم کیا تھے۔ وہ کیوبا سے ڈکٹیٹر فل گنسیو باتسٹا کی
حکومت ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ زیر زمین مزاحمت
جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس تحریک کو چھبیس جولائی تحریک کا
نام دیا گیا تھا کیونکہ اسی تاریخ کو اس کا آغاز ہوا تھا۔ کیوبا
امریکا کی بغل میں اور اتنا پاس تھا کہ وہاں امریکا کے خلاف
کوئی تحریک جاری رکھنا دنیا کا مشکل ترین کام تصور کیا جاتا
تھا اور کاسترو یہی کام کر رہا تھا۔

کاسترو چھپ کر میکسیکو آیا ہوا تھا۔ یہاں اسے زیر
زمین سوشلسٹوں کی مدد حاصل تھی۔ ممکن ہے وہ کسی اور کام
سے آیا ہو لیکن اس دورے میں چی گیویرا سے اس کی ملاقات
اہم ترین واقعہ بن گئی۔ یہ ملاقات ایک خفیہ مقام پر رات
کے وقت شروع ہوگئی اور صبح تک جاری رہی۔ چی گیویرا
کاسترو سے اس کی تحریک اور اس کے خیالات پر بات کرتا
رہا تھا اور صبح سے پہلے وہ چھبیس جولائی تحریک کا ممبر بن چکا
تھا۔ چی گیویرا نے محسوس کیا کہ کیوبا کا میدان اور یہ تحریک
دراصل اس کے لیے تھی۔ وہ جیسا لاطینی امریکا چاہتا تھا
کاسترو اسی کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس نے حلف اٹھایا
کہ وہ تحریک کے لیے اپنا سب قربان کردے گا اور کبھی اس سے
غداری نہیں کرے گا۔ وہ خوش تھا کہ اب سوشلسٹ
جمہوریت کے دھوکے میں آنے کی بجائے مسلح جدوجہد
سے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس
ملاقات کے آخر میں کاسترو اور چی گیویرا کی ایک تصویر لی
گئی۔ مشہور صحافی اور دونوں شخصیات کا سوانح نگار سائمن
ریڈ ہنری اس تصویر کے نیچے لکھتا ہے۔

''دوستی جس نے دنیا بدل دی۔''

کاسترو نے بھانپ لیا تھا کہ اس نوجوان میں بے پناہ
صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اور وہ ایک بہترین آرگنائزر ہے۔ مگر
ابھی اسے سیکھنے کی ضرورت تھی اور اس مقصد کے لیے کاسترو
نے اسے کیوبا آنے کی دعوت دی۔ وہاں باتسٹا کی حکومت
صرف ہوانا تک محدود تھی اس سے باہر پورے کیوبا میں
سوشلسٹوں کی خفیہ حکومت تھی۔ وہ سیاسی سے لے کر معاشی
معاملات تک سب کنٹرول کر رہے تھے۔ تحریک کے مسلح
ونگ کا سربراہ جنرل بائیو تھا۔ اس نے نئے آنے والوں کے
لیے ایک سخت تربیتی پروگرام ترتیب دیا ہوا تھا۔ جس وقت
کاسترو نے اسے کیوبا آنے کی دعوت دی اس وقت بھی چی
گیویرا بہ حیثیت پیرامیڈک تحریک میں عملی شمولیت کا سوچ
رہا تھا۔ مگر جب وہ کیوبا پہنچا تو اسے گوریلا تربیت سے دل
چسپی ہوئی۔ اس نے جنرل بائیو کے گروپ میں شمولیت
اختیار کرلی۔

اسے ایک سخت تربیتی پروگرام دیا گیا جس میں
روزانہ پندرہ گھنٹے کا سفر تھا۔ اس سفر میں وہ پہاڑوں،
جنگلوں، دریاؤں، ندی نالوں اور جھاڑیوں سے بھرے
میدانوں سے گزرتے تھے۔ ہر طرح کے خطرات کا سامنا
کرتے تھے اور بھوک پیاس اور نیند کی کمی برداشت کرتے
تھے۔ آغاز میں جنرل بائیو اور اس کے ساتھیوں نے چی
گیویرا کی طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن جلد انہوں نے محسوس کیا
کہ وہ ایک حیران کن شاگرد تھا۔ وہ نہ صرف بہت تیزی سے
سیکھتا تھا بلکہ تربیت میں اپنی اختراع بھی شامل کرتا تھا۔ یہی
وجہ تھی کہ کورس کے اختتام پر اسے نہ صرف بہترین گوریلا کا
اعزاز حاصل ہوا بلکہ اس کی ایجاد کی ہوئی ترکیبوں کو جنرل
بائیو نے کورس کا حصہ بنا دیا۔ اس نے تربیت میں ابتدائی طبی
امداد کے طریقے بھی شامل کیے تاکہ گوریلے زخمی یا بیمار
ہونے کی صورت میں از خود طبی امداد لے سکیں اور اپنے
ساتھیوں کی مدد کرسکیں۔

کیوبا میں قیام کا عرصہ چی گیویرا کے لیے ایک سنہری
خواب جیسا تھا۔ وہ جس ماحول کے بارے میں سوچتا تھا اور
جس کے خواب دیکھا کرتا تھا اب وہ اسی ماحول میں تھا۔ ان
کا گروپ تربیت کے دوران جب رات کے وقت کسی گاؤں
پہنچتا تو وہاں دیہاتی کھانے پینے کا سامان لے کر ان کے
پاس آجاتے۔ وہ ان کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اور
سرکاری حکام کو ان سے بے خبر رکھتے تھے۔ وہ انہیں اپنے
درمیان موجود جاسوسوں سے خبردار کرتے تھے۔ دوران
تربیت چی گیویرا نے ایک اسکواڈ منظم کیا جو ایسے جاسوسوں کو
خاموشی سے اغوا کرکے ان سے اقبالِ جرم کراکے انہیں
فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے سزائے موت دیتا تھا۔ بعد میں
اس کا بنایا ہوا اسکواڈ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار
کر گیا تھا اور تحریک کی کامیابی کے بعد اس نے کیوبا میں

ایسے افراد کو تلاش کر کے سزا دی جو جنگی جرائم میں ملوث تھے اور انہوں نے باتستا کے حکم پر اپنے ہی لوگوں کا قتل عام کیا تھا۔ مگر مغربی میڈیا نے اسے چی گویرا کا جرم قرار دیا۔
اس کورس میں شرکت کے بعد بھی چی گویرا نے اب تک کسی لڑائی میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا۔ کاسترو اپنے پلان پر عمل درآمد کے لیے میکسیکو میں تھا۔ اس نے طے کیا کہ باتستا کی حکومت پر پہلا حملہ میکسیکو سے کیا جانا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے کیوبا کے ایک پرانے اور خستہ حال کروزر شپ ''گرین ما'' کا انتخاب کیا اور اس پر کاسترو اپنے مسلح ساتھیوں سمیت 25 نومبر 1956 کے دن کیوبا کے ساحل تک آیا اور یہاں باتستا کی ملٹری پوسٹ پر حملہ کیا۔ مگر حملہ ناکام رہا اور کاسترو کے اٹھاسی ساتھیوں میں سے بیشتر مارے گئے یا پکڑے جانے پر موقع پر ہی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ حملہ آور تتر بتر ہو گئے اور بعد میں جب انہوں نے ایک دوسرے کو تلاش کیا تو صرف بائیس افراد زندہ بچے تھے جن میں سے ایک چی گویرا بھی تھا۔ عجیب بات ہے کہ کورس میں بہترین گوریلے کا اعزاز حاصل کرنے والا چی گویرا اس حملے میں بہ حیثیت میڈیکل آفیسر شامل تھا۔ اس نے حملے میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا۔
مگر جب حملہ ناکام ہوا اور اس نے اپنے ساتھیوں کی لاشیں جا بہ جا پائیں تو اس نے اپنا میڈیکل بکس چھوڑ دیا اور ایک ایمونیشن بکس اٹھا لیا۔ پہلی بار وہ کسی لڑائی میں شریک ہوا تھا۔ اس نے کوشش کر کے بچ جانے والوں کو جمع کیا اور ان کے ساتھ کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کی تگ و دو شروع کر دی۔ وہ انہیں لے کر سیرا میسترا کے پہاڑوں میں داخل ہوا۔ باتستا کے مسلح فوجی ان کا تعاقب کر رہے تھے اور ان کے پاس ناکافی اسلحہ تھا اور ان میں سے بیشتر زخمی تھے۔ ان کے تعاقب میں ایک پلاٹون تھی جس میں کم سے کم ڈیڑھ سو افراد تھے۔ ان کے پاس جدید ترین امریکی اسلحہ تھا۔ مگر چی گویرا انہیں چکمہ دے کر اپنے آدمیوں کو بہ حفاظت نکال لے گیا مگر اب انہیں رسد اور خوراک کی ضرورت تھی۔ ایسے میں ایک مقامی گوریلا گروپ فرینک پاؤز ان کی مدد کے لیے آیا۔ یہ چھبیس جولائی تحریک کا اتحادی تھا۔ اس حملے کے بعد کاسترو روپوش ہو گیا تھا اور دنیا پُرتجسس تھی کہ وہ زندہ ہے یا مارا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ کاسترو کو روپوشی کا مشورہ چی گویرا نے دیا تھا تاکہ امریکا کی توجہ کیوبا کی زیر زمین تحریک سے ہٹائی جا سکے اور وہ اسے بھول کر کاسترو کے پیچھے پڑی رہے۔ نومبر 1957 میں کاسترو نے نیویارک ٹائمز کے صحافی ہربرٹ میتھیوز کو انٹرویو دیا اور تب دنیا کو معلوم ہوا کہ فیڈل کاسترو زندہ ہے۔
مگر دنیا ابھی چی گویرا اور چھبیس جولائی تحریک میں اس کے کردار سے زیادہ واقف نہیں تھی۔ سی آئی اے کی لاطینی امریکا کی ڈیسک بھی اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ ان کی بیشتر معلومات ارجنٹائن پولیس کی طرف سے مہیا کی گئی تھیں۔ اس انٹرویو میں کاسترو اور اس کے گوریلوں کی تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں لیکن کسی تصویر میں چی گویرا موجود نہیں تھا۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ ایک گوریلا لیڈر کو تشہیر سے دور رہنا چاہیے۔ مگر آنے والے مہینوں میں اس نے میڈیا کی اہمیت محسوس کر لی جو ایک گوریلا تحریک کے لیے لازمی تھی۔ ان ہی دنوں اسے مچھروں کے کاٹنے سے جسم پر بڑے بڑے دانے سے بن آئے تھے اور ان میں شدید خارش اور درد ہوتا تھا۔ اس کے لیے دوا اسے باہر سے منگوانا پڑی تھی اور وہ جنگ کے دوران اپنے دردناک ترین دن قرار دیتا تھا۔ شاید اس بیماری کی وجہ سے بھی وہ میڈیا پر نہیں آیا تھا۔
ناکام حملے اور بیماری کی وجہ سے چی گویرا خاصے عرصے تک سیرا میسترا کے پہاڑوں میں چھپا رہا۔ یہاں اس نے دیکھا کہ مقامی لوگ بجلی سے محروم تھے۔ اس پورے علاقے میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بالغ آبادی کا صرف چالیس فیصد حصہ پڑھا لکھا تھا اور ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں صرف اپنا نام لکھنا اور پڑھنا آتا تھا۔ اس طرح دس تک گنتی گن لینے والا بھی تعلیم یافتہ شمار ہوتا تھا۔ غربت اور گندگی کی وجہ سے بیماریاں بے شمار تھیں۔ ماحول زہریلے کیڑے مکوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی وجہ سے بھی بیماریاں عام تھیں۔ وہ لوگ معمولی قسم کے جراثیم اور حشرات کش سے بھی ناواقف تھے۔ وہ ایسی جھونپڑیوں میں رہتے تھے جو موسمی حالات سے محفوظ نہیں تھیں۔ صفائی کا فقدان تھا اور ان مسائل کی بنیادی وجہ غربت و جہالت تھی۔
چی گویرا نے محسوس کیا کہ اگر سوشلسٹ انقلاب کو کامیاب بنانا ہے تو مسلح اور سیاسی جدوجہد کے ساتھ عوامی فلاح و بہبود کے لیے بھی کام کرنا ہوگا۔ اس نے اس دوران میں ایک فلاحی پروگرام کا منصوبہ بنایا جس کی بنیاد کمیونزم کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے دیہات میں

چھوٹے چھوٹے یونٹوں کی تشکیل تھی۔ ان میں سے ہر یونٹ روزگار، صحت اور تعلیم کے معاملے میں خود کفیل ہوتا۔ اس نے سیرا میسترا میں چھوٹے پیمانے پر اس پر عمل بھی کیا۔ چھوٹے چھوٹے کھیتوں کو مشترک کیا گیا۔ اسکول بنائے اور بنیادی صحت کے مراکز بنا کر وہاں لوگوں کو صحت سے متعلق شعور دیا جانے لگا۔ چی گویرا نے نوجوانوں کی ایک ٹیم بنائی اور اسے ابتدائی طبی امداد اور صحت سے متعلق مدد کے اصولوں کی تربیت دی۔ اس نے بالغان کے لیے ایک اسکول قائم کیا جہاں اٹھارہ سے زیادہ عمر کے وہ افراد جو پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے تھے انہیں لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔

اس کے مثبت اثرات نمودار ہوئے۔ مختصر عرصے میں صحت اور تعلیم کے میدان میں بہتری آئی۔ اس مختصر عرصے میں ایک ہزار سے زیادہ ان پڑھ افراد لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے۔ جان لیوا بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد نصف رہ گئی۔ اسی طرح بیمار افراد کی تعداد میں بھی کمی آئی تھی۔ کھیتوں کو مشترک کرنے سے پہلی ہی فصل میں تقریباً پچاس فیصد اضافہ ہوا تھا۔ خوراک کی مساوی تقسیم سے بھوکے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی کیونکہ ہر فرد کو کچھ نہ کچھ کھانے کو مل رہا ہے۔ سب سے بڑھ کر چی گویرا کے اس پروگرام سے تحریک کو اس علاقے سے ناقابلِ شکست حمایت حاصل ہو گئی تھی اور روزانہ درجنوں نوجوان چی گویرا سے آکر درخواست کرتے کہ وہ اس کرپٹ نظام کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں جس نے انہیں پسماندہ اور غلام بنا رکھا ہے۔ چی گویرا انہیں حوصلہ دیتا اور ان کی رہنمائی کرتا۔ وہ ان میں سے چن کر نوجوانوں کو آگے بھیجتا تھا۔

جیسے جیسے تحریک آگے بڑھنے لگی اور چی گویرا اس میں زیادہ سے زیادہ متحرک ہوتا گیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے اپنا پروگرام بڑے پیمانے پر آگے بڑھایا۔ ایک طرف تو اس نے ایسی فیکٹریاں قائم کیں جن میں ہینڈ گرنیڈ اور اسلحہ بنتا تھا تو دوسری طرف اس نے روٹی بنانے کے کارخانے قائم کیے۔ تحریک کے گوریلے صرف لڑنے کے ماہر نہیں رہے تھے بلکہ وہ لوگوں کے لیے فلاحی کام بھی کرنے لگے تھے۔ چی گویرا نے اس معاملے میں بہت سخت اصول بنائے تھے کہ گوریلا جنگ میں عام افراد کا نقصان نہ ہو اور اگر کوئی گوریلا کسی عام آدمی کے ساتھ زیادتی کرتا تو اسے سر عام سزا دی جاتی تھی۔ چی گویرا کا کہنا تھا کہ یہ تحریک عام لوگوں کو سرمایہ داری کے استبداد سے نجات دلانے کے لیے وجود میں آئی تھی نہ کہ سوشلسٹ گوریلے خود عوام کو... اذیت دینے لگیں۔ وہ خود ورکشاپ کرتا جہاں نئے آنے والے گوریلوں کو عملی طور پر سکھایا جاتا کہ دشمن سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔

ایک طرف چی گویرا عوام کے فلاحی کام کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ فیڈل کاسترو کے لیے سیاسی، سفارت کاری اور تدبر کے طریقے بھی وضع کر رہا تھا۔ مگر اس طرح کہ بہ ظاہر اس کا نام سامنے نہیں آتا تھا۔ تین برس بعد امریکی جان سکے کہ وہ کون تھا جو اصل میں فیڈل کاسترو کا دماغ تھا۔ اس نے بتایا کہ جب تک دشمن کو دہشت زدہ نہ کیا جائے آپ جنگ نہیں جیت سکتے ہیں۔ انقلاب کی کامیابی کے لیے دہشت اور سفاکی کا مظاہرہ ضروری ہے۔ مگر لازمی ہے کہ اس کا نشانہ صرف دشمن ہو نہ کہ عام لوگ جو خود دشمنوں کے چنگل میں پھنسے ہیں۔ اس نے باتسٹا کے لوگوں سے نمٹنے میں ایسی سفاکی اور مہارت دکھائی کہ جلد وہ لوگ چی گویرا کے نام سے تھرانے لگے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ چی گویرا کے نام کی دہشت سے باتسٹا انتظامیہ کے بے شمار لوگ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس وقت تک دنیا چی گویرا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی اور پھر ٹائم میگزین نے چی گویرا کے بارے مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا۔ ”کاسترو برین۔“

سیکنڈ ان کمانڈ کی حیثیت سے چی گویرا نے تحریک میں سخت ترین ڈسپلن قائم کیا جو اکثر اوقات سفاکی کی حدوں کو چھوتا تھا۔ اس نے حکم عدولی اور تحریک سے فرار کی سزا موت رکھی تھی اور ایسا کرنے والوں کو تلاش کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اس نے مخبروں اور جاسوسی کرنے والوں کو بھی سزائے موت دی۔ اپنی ایک ڈائری میں اس نے جس پہلے شخص کا ذکر کیا کہ اسے مخبری کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ وہ ایک گائیڈ اٹیمو گیرا تھا۔ وہ رقم کے لیے گوریلوں کی نقل و حرکت کی اطلاع کیوبن حکام کو دیتا تھا اور کیوبن ائرفورس ان گوریلوں پر فضا سے حملہ کرتی تھی۔ ان حملوں کے نتیجے میں کم سے کم سو گوریلے مارے گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کیوبن فوج کو گوریلوں کے ہمدرد دیہاتیوں کے بارے میں بتاتا تھا اور فوج ان کے گاؤں نذر آتش کر دیتی تھی۔ پکڑے جانے پر اٹیمو نے اعتراف جرم کیا اور اس کی آسان موت کی درخواست پر چی گویرا نے خود اس کے سر میں گولی مار کر اسے ہلاک کر دیا۔

چی گیویرا نے خوشی سے یہ کام نہیں کیا تھا اسے افسوس تھا مگر دوسروں کے لیے مثال قائم کرنا لازمی تھی۔ البتہ اس نے یہ کیا کہ آئیمو کے بیوی بچوں کی پرورش کی ذمے داری لے لی تھی۔ اس کے خیال میں ایک حقیقی حریت پسند کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس کا ڈسپلن سب سے پہلے اس پر لاگو ہوتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کوئی چیز نہیں لیتا تھا اور اکثر اوقات ان کے لیے ایثار سے کام لیتا۔ اس تحریک میں اس کے ایک ماتحت ٹومس البا کہتا ہے۔ ''چی سراپا محبت تھا۔ وہ ہمدردی کا ایسا احساس تھا کہ ہم سے ہر ایک اس کے لیے جان دینے کو تیار رہا کرتا تھا۔''

اس کا کمانڈنگ آفیسر فیڈل کاسترو ایک طرف اس کی صلاحیتوں اور قابلیت کا سب سے بڑا مداح تھا تو دوسری طرف وہ اس کی کچھ زیادہ ہی ہمدردانہ رویے اور اپنی ذات سے بے پروائی سے نالاں بھی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چی گیویرا کو احساس ہونا چاہیے کہ اس کی ذات تحریک کے لیے کس قدر قیمتی ہے۔ چی گیویرا سے صرف اس کے دوست ہی نہیں اس کے دشمن بھی متاثر ہوتے تھے۔ ایک لڑائی کے دوران اس کا ایک ماتحت جیول لگ لیسیس زخمی ہو کر دشمنوں میں گھر گیا اور اس قابل نہیں رہا تھا کہ اپنی مدد آپ کر سکے۔ اس موقع پر چی گیویرا نے وہ حرکت کی جس کا تصور بھی مشکل ہے وہ اپنی پوزیشن چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا اور زخمی جیول کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر لے گیا۔ کیوبن آرمی کے سپاہی جنہوں نے جیول کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا کچھ نہ کر سکے۔ انہوں نے ایک فائر بھی نہیں کیا اور چی گیویرا جیول سمیت بہ حفاظت نکلتا چلا گیا۔

ایک طرف چی گیویرا بے شمار ذمے داریاں پوری کر رہا تھا تو دوسری طرف اس نے پروپیگنڈے کے میدان میں دشمن کو شکست دینے کے لیے ایک اخبار جاری کیا اور ایک ریڈیو اسٹیشن بنایا جہاں سے تحریک کے بارے میں اطلاعات عوام تک پہنچائی جاتی تھیں اور اس پروپیگنڈے کا توڑ کیا جاتا تھا جو کیوبن حکومت کی طرف سے تحریک کے بارے میں کیا جا رہا تھا۔ چی گیویرا نے پورے ملک میں پھیلے گوریلا گروپس میں رابطہ بہتر بنانے کے لیے ریڈیو ٹیلی فون رائج کیے۔ مزے کی بات ہے یہ ریڈیو ٹیلی فون جو کارکردگی میں نہایت اعلیٰ تھے۔ دشمن ملک امریکا سے حاصل کیے گئے تھے۔ چی گیویرا نے ان ریڈیو ٹیلی فون کی کارکردگی گوئٹے مالا میں دیکھی تھی جو سی آئی اے نے جیکب اربنز کے مخالفوں کو مہیا کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک کا اثر امریکا تک پھیلا ہوا تھا جہاں بے شمار کیوبن نژاد افراد موجود تھے اور ان میں سے بہت سے تحریک سے پوری ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ چوری چھپے تحریک کو سامان اور پیسے مہیا کر رہے تھے۔ یہ ہمدرد تحریک اور مغربی میڈیا کے درمیان رابطے کا کام بھی کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ تحریک کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور اس کے ساتھ ہی باتستا کے دستوں نے پورے ملک میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ حریت پسندوں کو گرفتار کرتے ہی موقع پر سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ جہاں سے حریت پسند پکڑے جاتے وہ پورا گاؤں یا پوری کالونی نذر آتش کر دی جاتی۔ دہشت پھیلانے کے لیے عام لوگوں کا قتل عام کیا جانے لگا۔ لوگوں کو گرفتار کر کے غائب کر دیا جاتا اور ان کو بدترین تشدد سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ ہزاروں افراد غائب کر دیئے گئے جو ملے وہ رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانیاں سناتے تھے۔ ظلم و تشدد کی یہ داستانیں اتنی تیزی سے پھیلیں کہ بالآخر امریکی حکومت رائے عامہ کے دباؤ میں آ کر کیوبن حکام کو اسلحے کی سپلائی روکنے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن سی آئی اے بدستور کیوبن حکومت کی مدد کر رہی تھی۔

اسلحے کی بندش سے کیوبن فورسز کو کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ اس پابندی سے پہلے ہی امریکی یہاں اتنا اسلحہ پہنچا چکے تھے جو کئی سال کے استعمال کے لیے کافی ہوتا۔ کیوبن فورسز تحریک کے خلاف بھرپور طاقت استعمال کر رہی تھی۔ باتستا نے اپنے ایک نئے جنرل سینٹیلو کو مشن دیا کہ وہ کاسترو کی فوج کو گھیرے میں لے کر اسے محصور کر دے پھر تباہ کر دے۔ سینٹیلو نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کیا اور جولائی 1958 میں لاس مرسیڈیس میں کاسترو کی ملیشیا کو گھیر لیا۔ اس موقع پر چی گیویرا نے بہترین قیادت کا مظاہرہ کیا اور سینٹیلو کے منصوبے کو مکمل طور پر ناکام بنا دیا۔ اس نے صرف ایک کالم کے ساتھ (جس میں ڈھائی سو آدمی تھے) سینٹیلو کے پندرہ سو آدمیوں کی پوری طرح مسلح فوج کو آگے بڑھنے سے روکا جسے بھاری توپ خانے اور فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ یہی نہیں بلکہ امریکی میرین کورپس کا ایک دستہ بھی ان کی مدد کے لیے موجود تھا۔ اس دستے کے میجر لاری بک مین نے برسوں بعد اعتراف کیا کہ اس جنگ میں چی گیویرا کی جنگی حکمت عملی اور تیزی سے بدلتی تدابیر لاجواب تھیں۔

اس جنگ میں چی گیویرا نے ضرب لگاؤ اور بھاگ جاؤ کی ترکیب کو عملی صورت دی۔ بعد میں ویت کانگ گوریلوں نے اسی پر عمل کرتے ہوئے ویت نام میں امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کو شکست فاش دی۔ اس جنگ میں کامیابی کے بعد چی گیویرا نے گوریلوں کی ایک نئی فوج بنائی اور اسے آخری معرکے کے لیے ہوانا کی طرف روانہ کیا۔ چی گیویرا خود اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ سات ہفتوں کے تکلیف دہ ..سفر میں جب وہ صرف رات کو سفر کرتے تھے تا کہ فضائی حملوں سے محفوظ رہ سکیں اور اکثر اوقات انہیں کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ یہ سارا فاصلہ چی اور اس کے ساتھیوں نے پیدل طے کیا۔ ہوانا کی فتح سے پہلے چی گیویرا کیوبا کے جزیرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے لاس ویلاس کے صوبے کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ یہاں اس نے بے شمار چھوٹی بڑی لڑائیوں میں شاندار فتوحات حاصل کیں اور سوائے صوبے کے صدر مقام سانتا کلارا کے پورا علاقہ قبضے میں لے لیا۔ صرف سات ہفتے میں اتنی فتوحات نا قابلِ یقین تھیں۔

اس کے بعد اس نے اپنے خودکش دستے کو لے کر براہ راست سانتا کلارا پر حملہ کیا اور اس دلیرانہ حملے نے کیوبن فورسز کو پسپا ہونے اور ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ صرف چھ ہفتے پہلے وہ اور اس کے آدمی محاصرے کی حالت میں تھے اور دشمن نے انہیں چاروں طرف سے یوں گھیر لیا تھا کہ ان کے پاس فرار کا راستہ بھی نہیں تھا۔ مگر چی گیویرا نے ہمت نہیں ہاری اسے اپنی فتح کا یقین تھا اور اس نے اسے ممکن کر کے دکھایا۔ اس جنگ میں اس نے دس ایک کے نا قابلِ یقین تناسب سے دشمن کو نقصان پہنچایا اور بعض جھڑپوں میں اس نے اس سے بھی بہتر تناسب حاصل کیا۔ سال کے آخری حصے میں تحریک کے ریڈیو نے سانتا کلارا کی فتح کا اعلان کیا۔ اس کے مقابل سرکاری میڈیا پہلی جنوری تک جنگ میں چی گیویرا کی موت کی جھوٹی رپورٹ نشر کرتا رہا۔

امریکا اور پوری مغربی دنیا کی امداد کے باوجود باتستا کی آمریت ڈگمگانے لگی اور اس نے اپنے جنرلوں کو ذمے داری سونپی کہ وہ چی گیویرا سے امن معاہدے کی کوشش کریں۔ دوسرے لفظوں میں اسے کاسترو سے توڑنے کی کوشش کریں۔ مگر ساتھ ہی اسے ناکامی کا اتنا یقین تھا کہ وہ ایک جنوری 1959 کے دن اپنے اہل خانہ اور اپنی تمام دولت (ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت کے تیس کروڑ ڈالرز اور آج کے تقریباً دو اعشاریہ چھ ارب ڈالرز) لے کر ایک طیارے میں ڈومینن ری پبلک چلا گیا۔ اس سے اگلے دن دو جنوری کو چی گیویرا اپنی فوج کے ہمراہ دارالحکومت ہوانا میں داخل ہوا اور انتظام سنبھال لیا۔ فیڈل کاسترو مزید چھ دن کی تاخیر سے ہوانا پہنچا کیونکہ وہ راستے میں آنے والے دوسرے شہروں کی حتمی فتح کو یقینی بناتا ہوا آرہا تھا۔

یوں دو سالہ تحریک اپنے کامیاب انجام کو پہنچی۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں کل دو ہزار گوریلے مارے گئے تھے۔ کیوبن فوجیوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں عام شہری مارے گئے تھے جن میں سے بیشتر کیوبن فوج کی بربریت کا نشانہ بنے تھے۔ کامیابی کے آخری چند دن چی گیویرا پر بہت بھاری گزرے تھے۔ اسے آرام اور سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا تھا اور اس کا نتیجہ دمے کے شدید دورے کی صورت میں نکلا۔ اسے وسط جنوری میں ٹارارا صوبے کے ایک صحت افزا مقام سرولا بھیجا گیا۔ مگر وہ وہاں بھی مصروف رہا اور اس نے وہاں ٹارارا گروپ تشکیل دیا۔ اس کا مقصد کیوبا کی معاشی، سیاسی اور فلاحی پالیسیاں بنانا اور ان کو نافذ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ”گوریلا طرز جنگ“ لکھنا شروع کر دی۔ یہیں اسے اطلاع ملی کہ کیوبا کی نئی حکومت نے اس کی نا قابل فراموش خدمات کی وجہ سے اسے کیوبا کے پیدائشی شہری کا درجہ دے دیا تھا۔

ایک طرف وہ سیاسی اور فوجی محاذ پر کامیابیاں حاصل کر رہا تھا تو دوسری طرف اس کی شادی خطرے میں پڑ چکی تھی کیونکہ ہلڈا کئی مہینے سے اس سے دور تھی اور اس دوران میں اس کے تعلقات تحریک سے تعلق رکھنے والی ایک کیوبن عورت آلیڈا مارچ سے اتنے بڑھ چکے تھے کہ وہ شادی پر غور کرنے لگے تھے۔ اس لیے جب جنوری کے آخر میں ہلڈا کیوبا پہنچی تو چی گیویرا نے اسے صاف گوئی سے بتا دیا کہ وہ اب آلیڈا سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیوبا کے قوانین کے مطابق وہ ایک وقت میں ایک ہی شادی کر سکتا تھا اس لیے آلیڈا سے شادی کے لیے ہلڈا سے علیحدگی لازمی تھی۔ ہلڈا اس سے محبت کرتی تھی اور الگ ہونا نہیں چاہتی تھی مگر دوسری طرف اس نے محسوس کیا کہ طویل دوری نے گیویرا کے اندر اس کے لیے محبت کو ختم کر دیا تھا

اس لیے مجبوراً وہ طلاق پر آمادہ ہو گئی۔ مئی کے مہینے میں ان کے درمیان طلاق ہو گئی اور جون کے آغاز میں اس نے آلیڈا سے شادی کر لی۔ اہم بات یہ ہے کہ ہلڈا نے اس کے بعد بھی چی گیویرا کو بہت اچھے لفظوں میں یاد کیا اور اس نے اپنے اور چی کے ازدواجی دور پر ایک کتاب بھی لکھی۔

چی گیویرا کی مختصر عوامی زندگی کی طرح اس کی عائلی زندگی بھی ہنگامہ خیز رہی۔ اس نے ہلڈا سے محبت کی شادی کی اور اس سے اس کے دو بچے ہوئے۔ پھر اسے آلیڈا سے محبت ہوئی اور اس کی یہ شادی اس کے مرنے تک قائم رہی اور اس سے اس کے تین بچے ہوئے تھے۔ دوسری شادی کا ہنی مون اس نے ٹارارا کے ایک ساحلی گاؤں میں منایا جہاں وہ ایک معرکے میں کئی بار مرتے مرتے بچا تھا۔ ایک موقع پر ایک ہینڈ گرنیڈ اس سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر پھٹا اور وہ اس لیے بچ گیا کہ وہ ایک چھوٹی سی خندق میں لیٹا ہوا تھا۔ البتہ دھماکے نے اس کے کانوں کو نقصان پہنچایا تھا اور اس کے بعد اسے کم سنائی دینے لگا تھا۔ چی گیویرا کو اپنے دوسرے ہنی مون سے لطف اندوز ہونے کا موقع کم ملا کیونکہ کامیابی کے فوراً بعد بحران نے سر اٹھا لیا تھا۔ دوسری طرف آلیڈا بھی ورکنگ وومین تھی اور اسے حکومت میں اپنی ذمے داریاں سنبھالنا تھیں۔

بحران باتسعا حکومت کے ان حکام کے بارے میں تھا جو پکڑے گئے تھے اور سنگین قسم کے جنگی جرائم میں ملوث تھے جو انہوں نے تحریک کے کارکنوں، اس کے حامیوں اور عام کیوبن عوام کے خلاف کیے تھے۔ ان کے کیس سے نمٹنے کے لیے فیڈل کاسترو نے ملک کے اولین حکمران کی حیثیت سے ایک آرڈر پاس کیا جس کے تحت عدالتیں قائم ہوئیں جو ان مجرموں کے لیے سزا تجویز کرتیں۔ یہ آرڈر نورمبرگ ٹرائل سے ملتا جلتا تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کے نازی مجرموں کو اتحادی عدالتوں سے سزائیں ملی تھیں۔ ابتدا میں یہ صرف جنگی مجرموں کے لیے مخصوص تھا مگر بعد میں اس آرڈر کو پورے کیوبا کے تمام اقسام کے مجرموں اور دہشت گردوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ کاسترو نے سزائیں دینے کے لیے چی گیویرا کو پانچ مہینے کے لیے اس کمیشن کا سربراہ مقرر کیا اور اس نے جنگی جرائم میں ملوث افراد کو سزائیں دینے کے لیے ایک کمیشن تشکیل دی جس میں پانچ افراد شامل تھے۔ اس کمیشن نے بعض افراد کو فائرنگ اسکواڈ کے ذریعے سزائے موت سنائی۔ اس کمیشن کو دنیا بھر میں خاص طور سے مغرب میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ کاسترو نے اس کا دفاع کرتے ہوئے امریکی ریڈیو کو انٹرویو میں کہا۔

”میں خود اس قسم کی احتسابی کارروائیوں پر یقین نہیں رکھتا ہوں لیکن کیوبن عوام کی بہت بھاری اکثریت احتساب چاہتی ہے۔ ایک ملین افراد سے پوچھا گیا تو ترانوے فیصد افراد نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ باتسعا حکومت نہ صرف تحریک کے کارکنوں بلکہ عام کیوبن عوام کے قتل عام کی ذمے دار تھی۔ اب لوگ اس کا احتساب چاہتے ہیں۔ ہم ایک جمہوری حکومت ہونے کے ناطے اپنے عوام کے جذبات کا پاس رکھنے پر مجبور ہیں۔“

جیسے ہی کمیشن کی مدت ختم ہوئی اسے تحلیل کر دیا گیا اور پھر کبھی سابق حکومت کے حکام کو سزا نہیں دی گئی۔ جو جیل میں تھے ان میں سے بہت سارے رہا کر دیے گئے اور باقی اپنی سزا پوری کر کے رہا ہوئے تھے۔ مگر کمیشن نے صرف پانچ مہینے کی مدت میں بہت سارے لوگوں کو سزائے موت سنائی اور اس پر عمل درآمد کیا گیا۔ آزاد ذرائع کے مطابق سزا پانے والوں کی تعداد کئی سو تھی مگر کمیشن کا اصرار تھا کہ سزا پانے والوں کی تعداد پچپن سے ایک سو کے درمیان تھی۔ اس کمیشن کے کام کے دوران ہی چی گیویرا کے سخت رویے اور دی جانے والی سزاؤں کی سختی پر اس کے اور کاسترو حکومت کے درمیان اختلافات جنم لینے لگے تھے۔ خاص طور سے ان اطلاعات پر کہ چی گیویرا جوش انتقام میں خود سزا دینے والے فائرنگ اسکواڈ میں شامل ہوتا تھا اور وہ ٹرائل کے دوران سزا دینے میں غیر معمولی عجلت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ پھانسی کی بجائے فائرنگ اسکواڈ سے سزا دینے پر بھی اسے تنقید کا نشانہ بنایا گیا مگر وہ اسے ”انصاف“ قرار دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا جنہیں گولی ماری گئی انہوں نے بھی دوسروں کو گولیاں ماری تھیں۔

ایک طرف سزائیں دینے کا کام جاری تھا تو دوسری طرف چی گیویرا نے کیوبا میں زمین کی اصلاحات کا اپنا منصوبہ پیش کر دیا۔ اس کے مطابق زمین کو پھر سے آرگنائز کیا جانا تھا۔ یعنی جو زمین کے مالک تھے ان سے زمین لے لی جاتی اور اسے ایک ایک ہزار ایکڑ کے قطعوں میں بانٹ کر مشترکہ فارمنگ کی صورت دی جاتی۔ اس منصوبے کے تحت اب غیر ملکی شکر سازی کے پلانٹ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ باتسعا کے دور تک شکر سازی کے سو فیصد کارخانے غیر ملکیوں کی

ملکیت تھے۔ یوں چینی سازی کا سارا نفع غیر ملکی لے جاتے تھے اوران میں سے اکثریت امریکیوں کی تھی۔ فیڈل کاسترو کے کچھ ساتھی اس کے منصوبوں کے مخالف تھے۔ خود فیڈل کاسترو نے محسوس کیا کہ چی گیویرا انقلاب کے لیے نہایت موزوں شخص تھا مگر جہاں تک اس کے بعد حکومت سازی اور اصلاحات کا معاملہ تھا وہ مسائل کو بڑھا رہا تھا۔ وہ نظریات اور زمینی حقائق کو آپس میں گڈمڈ کر رہا تھا۔

1959 کے وسط میں کاسترو نے چی گیویرا کو تین مہینے کے بین الاقوامی دورے پر روانہ کیا۔ بہ ظاہر اس کا مقصد کیوبا کی نئی سوشلسٹ حکومت کے لیے بین الاقوامی حمایت اور مدد حاصل کرنا تھا۔ اس طویل دورے میں چی گیویرا مراکش، مصر، سوڈان، شام، پاکستان، انڈیا، سری لنکا، برما، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، جاپان، یوگوسلاویہ اور یونان گیا۔ اس کے علاوہ اس نے ہانگ کانگ اور سنگاپور کا شہروں کی حیثیت سے دورہ کیا۔ اس سفر پر بھیجنے کا اصل مقصد چی گیویرا کو اس کے بعض اقدامات سے باز رکھنا تھا جو نہ صرف امریکا بلکہ فیڈل کاسترو کی پارٹی کے بعض افراد کو بھی ناگوار گزر رہے تھے۔ یہ بھی واضح تھا کہ چی گیویرا سرمایہ داری کی اصلاح نہیں بلکہ اس کے خلاف جنگ چاہتا تھا جب کہ فیڈل کاسترو اپنا سوشلسٹ پروگرام لے کر چلنا چاہتا تھا جو کیوبا اور جنوبی امریکا کے مقامی حالات کے مطابق تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امریکا سے کھلی محاذ آرائی کیوبا کے حق میں نہیں تھی۔

معاشی اصلاحات میں شکر سازی کے پلانٹ کی غیر ملکیوں کے لیے ممانعت کیوبا کی معیشت کے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی معیشت کا انحصار ہی شکر سازی پر تھا۔ دوسرے فیڈل کاسترو انقلاب برآمد کرنے کے حق میں نہیں تھا جب کہ چی گیویرا کے خیال میں کیوبا میں سوشلسٹ انقلاب لاطینی امریکا میں انقلاب کا آغاز تھا اور ابھی انہیں دوسرے ممالک میں بھی ایسا ہی انقلاب لانا تھا۔ اپنے تین مہینے کے دورے سے واپس آتے ہی چی گیویرا نے اپنے ایجنڈا پر.... کام شروع کر دیا مگر اس دوران میں کاسترو مزید سیاسی قوت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے زمین کی اصلاح کے قانون میں ترمیم کی، زمین کی ساخت بدل گئی تھی لیکن زمین کی ملکیت برقرار رکھی گئی تھی۔ بعض طاقتور حلقے زمین کی ملکیت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے اور وہ اس کے خلاف کسی بھی حد تک جانے کو تیار بیٹھے تھے۔ خاص طور سے دولت مند مویشی پالنے والے جن کے امریکی مویشی پالنے والوں سے گہرے تعلقات تھے۔

یہاں چراگاہیں متعدد امریکی کارپوریشن کے پاس تھیں اور وہ زمین کی اصلاح سے براہ راست متاثر ہو رہی تھیں۔ واپسی کے بعد چی گیویرا نے ایک لاکھ افراد پر مشتمل اپنی ملیشیا تیار کی جو زمین کی اصلاحات میں اس کی معاون تھی۔ اس نے سب سے پہلے امریکی کارپوریشنوں سے زمین واپس لی اور نتیجے میں امریکا نے کیوبا میں شکر سازی پر پابندی لگا دی۔ ایک طرف یہ بحران تھا اور دوسری طرف کاسترو کو جوابی تحریک کا سامنا تھا۔ اس تحریک کے پس پشت نہ صرف امریکی بلکہ یورپی طاقتیں بھی تھیں جو بہر صورت کاسترو کی حکومت کو ناکام بنانا چاہتی تھیں۔ امریکی حکومت کی پابندی کا جواب چی گیویرا نے ایک بہت بڑی ریلی سے خطاب کر کے دیا اور اس نے امریکا کو زر پرست ملک قرار دیا۔ یورپ سے آنے والی ایک شپ منٹ میں موجود دھماکا خیز مادہ کیوبا کی بندرگاہ پر پھٹ پڑا اور ستر سے اوپر افراد مارے گئے جب کہ کئی سو زخمی ہوئے تھے۔

اس کا الزام سی آئی اے پر لگا اور دونوں ملک اب کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آگئے تھے۔ امریکی پابندیوں سے ہونے والے نقصان کی تلافی کے لیے چی گیویرا نے کیوبا کے اقتصادی تعلقات مشرقی بلاک سے استوار کیے اور خاصی حد تک مالی نقصان کی تلافی ہو گئی مگر اس طرح کیوبا کی معیشت محدود ہو کر رہ گئی۔ امریکیوں کا خیال تھا کہ کیوبا یہ نقصان برداشت نہیں کر سکے گا اس لیے جب کیوبا نے اسے برداشت کر لیا تو امریکیوں نے راست اقدام کیا اور امریکا سے چودہ سو جلاوطن کیوبن افراد پر مشتمل ایک فوج امریکی فوج کی نگرانی اور مدد کے ساتھ کیوبا وارد ہوئی اور 17 اپریل 1961 کو بے آف پگو میں اتر گئی۔ اگرچہ چی گیویرا نے اس لڑائی میں براہ راست حصہ نہیں لیا مگر اس نے کیوبن فوج کو اس حد تک منظم کر دیا تھا کہ اس نے با آسانی امریکی حملہ ناکام بنا دیا۔

ایک طرف چی گیویرا کیوبا کی سوشلسٹ حکومت کو مضبوط کرنے کی سعی کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ امریکا کے خلاف ایک مثالی اتحاد تشکیل دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ ساری دنیا کے دورے بھی کر رہا تھا۔ مشرقی جرمنی کے دورے میں اس کی ملاقات تمارا بینک سے ہوئی۔ یہ روسی نژاد عورت چی گیویرا کے نظریات سے بہت متاثر ہوئی اور

بعد میں وہ اس کے ساتھ شامل ہوگئی۔ (جب چی گویرا بولیویا میں مارا گیا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی ماری گئی تھی۔) چی گویرا کی توجہ کا مرکز وہ ممالک تھے جہاں انقلابی براہ راست استعمار کے خلاف لڑ رہے تھے۔ بدقسمتی سے کیوبا کے لیے چی گویرا کا انقلابی معاشی اصلاحاتی پروگرام ناکامی سے دوچار ہونے لگا۔ پیداوار گرنے لگی اور ورکر ریکارڈ تعداد میں کام سے غیر حاضر ہونے لگے۔ یہ تقریباً وہی صورت حال تھی جو بعد میں اسی کی دہائی میں سوویت یونین میں درپیش تھی۔

البتہ چی گویرا کا بنایا ہوا تعلیمی اور صحت کی اصلاحات کا پروگرام بے حد کامیاب رہا۔ جب سوشلسٹ حکومت آئی تو کیوبا میں تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب ساٹھ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ چی گویرا نے ایک لاکھ اساتذہ پر مشتمل ایک فورس تشکیل دی اور اس نے ایک سال کی مختصر مدت میں ایک ملین کیوبن بالغ افراد کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ ہر بچے کے لیے اسکول جانا اور ہائی اسکول کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک سال میں تعلیم یافتہ آبادی کا تناسب چھیانوے فیصد ہوگیا۔ اسکول کی تعلیم کے ساتھ اس نے اعلیٰ تعلیم اور خاص طور سے یونیورسٹیوں کی اصلاحات پر توجہ دی۔ کیوبا میں میڈیکل کالجز قائم کیے۔ بے شمار نئے اسپتال اور بنیادی صحت کے مراکز بنائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کیوبا چند سالوں میں تعلیم اور صحت کے معاملے میں لاطینی امریکا میں ایک مثال بن گیا تھا۔ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز کی حیثیت سے چی گویرا نے مشرقی بلاک سے صنعتیں اور کارخانے لگانے کے معاہدے کیے اور کیوبا چند سال بعد صنعتی میدان میں بھی آگے آگیا تھا مگر اس وقت تک چی گویرا دنیا میں نہیں رہا تھا۔

چی گویرا کو کیوبا سوویت یونین تعلق کا معمار بھی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے انقلاب کے فوراً بعد سوویت یونین سے مضبوط معاشی اور دفاعی تعلقات قائم کیے اور اس کا نقطۂ عروج اس وقت آیا جب سوویت نے نیوکلیئر ہتھیاروں سے لیس میزائلوں کو کیوبا میں نصب کیا۔ یہ کام امریکا اور باقی دنیا سے چھپ کر کیا گیا تھا۔ مگر سی آئی اے کو اس کی بھنک مل گئی اور امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے سوویت یونین کو ایٹمی جنگ کی دھمکی دے دی۔ مجبوراً سوویت یونین نے کیوبا سے اپنے ایٹمی میزائل ہٹا لیے۔ یہ امریکا کی فتح اور چی گویرا کی شکست تھی۔ مگر اس کے بعد امریکا نے چی گویرا کو اپنا دشمن نمبرون قرار دے دیا۔ سی آئی اے کو حکم دیا گیا کہ اسے تلاش کرکے بہر صورت دنیا سے رخصت کیا جائے۔ دوسری طرف چی گویرا خود کو لاحق خطرات سے بے نیاز ساری دنیا میں امریکا اور سرمایہ داری نظام کے خلاف اتحاد تشکیل دینے کی کوشش کررہا تھا۔

چی گویرا نے الجزائر کی تحریک آزادی کی حمایت کی اور اس مقصد کے لیے فرانسیسی دانشور جان پال سارتر سے ملاقات کی۔ وہ اس کے کھلے خیالات سے بھی متاثر ہوا تھا۔ سارتر کو فرانس میں غدار قرار دے کر اس کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا جارہا تھا مگر صدر ڈیگال نے یہ مطالبہ مسترد کردیا۔ چی گویرا کو سوویت یونین سے امید تھی کہ وہ عالمی حریت پسند اور سوشلسٹ تحریکوں کی کھل کر حمایت کرے گا مگر اس کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا تھا۔ مشرقی یورپ ہتھیانے اور ایشیا میں قابل قدر کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوویت یونین کی توجہ لاطینی امریکا کی طرف سے ہٹ گئی تھی اور اس نے سوائے کیوبا کے وہاں جاری تحریکوں کی امداد میں کمی کردی تھی۔

چی گویرا چینی سوشلزم سے متاثر نہیں تھا اس کے خیال میں چینیوں نے سوشلزم کو اپنے حالات کے مطابق ڈھال کر اسے دوسری صورت دے دی تھی اس وقت چی گویرا نے پیش گوئی کی کہ ایک وقت آئے گا کہ چین سرمایہ داری کی طرف جائے گا۔ کیونکہ چینی سب سے پہلے اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی یہ پیش گوئی بعد میں درست ثابت ہوئی۔ کھلے چین کی پالیسی کے معمار ڈیاؤ زینگ پنگ کی چی گویرا سے ملاقات ہوئی تھی اور اس ملاقات میں چی گویرا نے بھانپ لیا کہ چینی سوشلسٹوں کی نئی نسل کس طرح سوچ رہی ہے۔ اس لیے چی گویرا نے اپنی توجہ طاقتور سوشلسٹ ممالک کی بجائے ان کمزور اور پسے ہوئے ملکوں کی طرف مبذول کرلی جو استبدادی نظام سے چھٹکارے کی کوشش کررہے تھے۔

ان دنوں چی گویرا بظاہر کیوبا میں نہایت مستحکم اور دوسری طاقتور شخصیت تھا۔ مگر اندرون خانہ اس کے اور کاسترو کے درمیان اختلافات بڑھ رہے تھے اور اس کی بنیادی وجہ دونوں شخصیتوں کی مختلف وفاداریاں تھیں۔ کاسترو بے شک سوشلسٹ تھا مگر اس کی اولین وفاداری اپنے ملک سے تھی جب کہ چی گویرا بین الاقوامی شہری تھا اس نے نظریے کی خاطر اپنا وطن ترک کردیا تھا اور اس کی اولین وفاداری اس کے نظریے سے تھی۔ دسمبر 1964 میں

چی گیورا آخری بار کیوبا کے نمائندے کے طور پر ملک سے باہر گیا اور اس بار وہ امریکا گیا تھا۔ لیکن اس دورے کا مقصد کیوبا کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ سے خطاب کرنا تھا۔ اپنے اس تاریخی خطاب میں چی گیورا نے حسب توقع امریکا اور سرمایہ داری نظام کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس نے امریکا کی اپنے ملک میں نسلی امتیاز کی پالیسی اور جنوبی امریکا میں نسل پرست حکومت کی مدد کی شدید مذمت کی۔ اپنے خطاب کے آخر میں چی گیورا نے لاطینی امریکا کو ایک وحدت قرار دیتے تھے اسے دو سو ملین افراد کا گھر قرار دیا جو ایک جیسے مسائل اور مشکلات سے دوچار تھے۔ یہ چی گیورا کے چارٹر کا اعلان تھا اور اس نے امریکا اور مغربی دنیا میں کھلبلی مچا دی تھی۔

امریکا جنوبی امریکا کے وسائل سے استفادہ کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس برِاعظم کے ستر فیصد تک قدرتی وسائل امریکا کے زیر تسلط تھے اور وہ اس کے بدلے صرف چند مقامی کٹھ پتلیوں کو نواز رہا تھا اور یہاں کی عوام کو سوائے بھوک، جہالت اور بیماریوں کے کچھ نہیں مل رہا تھا۔ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے اس خطے میں امریکی نواز حکومتیں قائم تھیں اور عوام کی حالت بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ وسائل کی بے دریغ لوٹ کھسوٹ جاری تھی۔ حد یہ کہ جنوبی امریکا میں پیدا ہونے والی منشیات کا بھی زیادہ فائدہ امریکی ڈرگ لارڈز اٹھا رہے تھے اور مقامی کاشت کاروں کو بس چند ڈالرز ملتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ اس خطے سے چی گیورا کے نظریات کو سب سے زیادہ حمایت مل رہی تھی۔ جہاں جہاں امریکی پٹھو حکمران تھے وہاں ان کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔

چی گیورا کو قتل کرنے کی سازشوں کا آغاز اس کے امریکی دورے کے دوران ہوگیا تھا۔ اسے بعد میں علم ہوا کہ اسے وہاں قتل کرنے کی دو کوششیں کی گئیں۔ پہلی کوشش مولی گونزالز نامی شخص نے کی اور اس نے چی گیورا کی اقوام متحدہ آمد کے موقع پر ایک سات انچ لمبے چاقو کے ساتھ حفاظتی حصار کو توڑنے کی کوشش کی۔ وہ پکڑا گیا۔ گولی مرو نو وانا می کیوبن نے اس پر دریا سے بزوکا فائر کیا جو خوش قسمتی سے نشانے سے دور گیا۔ دونوں حملہ آور کیوبن جلاوطن افراد تھے۔ امریکا نے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اس سے ظاہر تھا کہ اصل میں انہوں نے امریکا کے اشارے پر چی گیورا کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اقوام متحدہ سے خطاب کے بعد وہ پھر ایک عالمی سفر پر روانہ ہوا۔ اس نے فرانس، چین، شمالی کوریا، متحدہ عرب جمہوریہ، الجزائر، گھانا، گنی، مالی، کانگو اور تنزانیہ کا دورہ کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنے نظریات پہنچا سکے اور جہاں تک ممکن ہو سرمایہ داری کے خلاف ایک عالمی اتحاد کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرے۔

آئرلینڈ کے دورے کا مقصد وہاں جاری برطانیہ سے آزادی کی تحریک کا جائزہ لینا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ وہاں کے لوگ سرمایہ داری نظام سے بالکل مطمئن تھے اور تحریک کی وجہ دونوں قوموں کا فرق تھا۔ اس نے یہاں سے اپنے باپ کو ایک خط میں لکھا۔ ”یہاں کے لوگ میری آمد سے اس لیے خوش ہیں کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق آئرلینڈ سے رہا ہے۔ انہیں میرے نظریات اور خیالات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک ٹی وی پروگرام میں مجھ سے پوچھا گیا کہ میں یہاں آکر کیا محسوس کر رہا ہوں اور میرا جواب تھا کچھ نہیں۔ ممکن ہے جب میرے آباؤ اجداد یہاں سے نکلے ہوں تو وہ گھوڑے چور ہوں یا اسی قسم کا کوئی گھٹیا کام کرتے ہوں۔ ورنہ وہ یہاں سے کیوں نکل کر گئے تھے۔“

چی گیورا نے محسوس کیا کہ اب اس کا زیادہ دیر کیوبا کی حکومت سے منسلک رہنا خود اس کے کاز کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا انقلابی کردار ادا کرتا رہے۔ دنیا کے اس سفر کے دوران اس نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ سوشلسٹ انقلاب حکومتوں کی مدد سے آنا بہت مشکل ہے کیونکہ سوویت یونین اور چین جیسے طاقتور ممالک بھی انقلاب کے بعد ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے اور انہوں نے دنیا میں سوشلسٹ انقلاب سے زیادہ اپنے مفادات کے لیے کوشش کی۔ ان کا مرکزی نقطہ بھی چند افراد کے مفاد تک محدود ہو گیا تھا اور وہ لاتعداد لوگ جن کے لیے سوشلزم کا نظریہ وضع کیا گیا تھا ان ملکوں میں بھی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جنوری 1965 میں چی گیورا الجزائر میں ایک کانفرنس میں شریک ہوا۔ اس میں اس نے پسے ہوئے پسماندہ طبقوں کی بات کی جو دنیا کے ہر ملک میں موجود تھے۔

یہ آخری موقع تھا جب وہ منظر عام پر آیا اور یہاں سے چی گیورا کی ڈھائی سالہ پُراسرار گمشدگی کا دور شروع ہوا۔ جب اس کے بارے میں بے شمار افواہیں پھیلائی گئیں اور کئی بار اسے مردہ قرار دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں سی آئی اے کی طرف سے بھیجے جانے والے قاتلوں سے بچنے کے

لیے روپوشی اختیار کی۔ جب اسے علم ہوا کہ اسے امریکا میں قتل کرنے کی دو کوششیں کی گئی تھیں تب اس نے روپوشی کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کا امکان کم ہے اصل وجہ وہی تھی کہ چی گیویرا نے حکومتی سطح پر اپنے نظریات کو عملی صورت دینے میں ناکامی کے بعد واپس انقلاب کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آج جو تفصیلات منظر عام پر آ رہی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ روپوشی کے بعد سے اس کا ایک ایک لمحہ دنیا میں متحرک سوشلسٹ تحریکوں کی عملی مدد اور حمایت میں گزرا تھا۔

چی گیویرا ویت نام نہیں گیا تھا مگر اس نے ویت نامیوں کی تحریک آزادی کی بھرپور حمایت کی اور دنیا پر زور دیا کہ سرمایہ داری کے خلاف گئی ویت نام قائم کرنا ضروری ہیں۔ اس نے ویت نامی گوریلوں کی تربیت کے لیے کتابچہ لکھ کر بھیجا اور ان کی تعریف میں نظم کہی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس نے سوویت یونین کو ایک کمزور سوشلزم قرار دیا جو مغرب کے مقابلے میں ویسی مستعدی نہیں دکھا رہا ہے جیسی کہ ایک سوشلسٹ ملک کو دکھانی چاہیے تھی۔ اس کے مقابلے میں اسے ماؤ کے چین سے زیادہ اُمید تھی کہ وہ دنیا کے کمزور ملکوں کی حمایت اور مدد کرے گا۔ اپنے آخری دور میں اس نے کیوبا کو چین سے پاس کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت یہ دونوں سوشلسٹ دیو آپس میں لڑ رہے تھے اور سوویت یونین نے کیوبا کو چین سے دور رہنے کا کہہ دیا تھا اور کاسترو نے چی گیویرا کی رائے مسترد کر کے سوویت یونین سے تعلق رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے کیوبا کا سارا ہی انحصار سوویت یونین پر ہو گیا تھا۔

چی گیویرا کی گم شدگی کیوبا کے لیے بھی حیران کن تھی۔ کیونکہ وہاں اس کی حیثیت کاسترو کے بعد دوسری تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ وزیر انڈسٹری کی حیثیت سے وہ اپنے ناکام پروگرام کی وجہ سے روپوش ہوا۔ مگر یہ وجہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اس کا لینڈ ریفارم اور تعلیمی پروگرام نہایت کامیاب رہا اور چند سالوں میں کیوبا کی چینی کی پیداوار میں دوگنا سے بھی زیادہ اضافہ ہوا تھا کیونکہ زیادہ مشترکہ فارم قائم کرنے سے گنے کی اوسط اور مجموعی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ پھر تمباکو کی پیداوار پر بھی بہت زیادہ توجہ دی گئی اور اعلیٰ درجے کی تمباکو سے بننے والے ہوانا سگار ساری دنیا میں ایک لگژری برانڈ بن گیا۔ اس لیے چی گیویرا کی روپوشی ناقابلِ فہم تھی۔ جون 1965 میں پہلی بار سرکاری طور پر چی گیویرا کو گمشدہ قرار دیا گیا اور اس سے اپیل کی گئی کہ وہ واپس کیوبا

اور منظر عام پر آ جائے۔ اس کے تین مہینے بعد چی گیویرا کے خطوط منظر عام پر آئے جو اس نے روپوشی سے چند مہینے پہلے ہی تحریر کر لیے تھے اور ان خطوط میں اس نے کیوبا کے انقلاب سے اپنی غیر متزلزل وابستگی کا اعادہ کیا مگر ساتھ ہی وضاحت کی کہ وہ دنیا کی دوسری انقلابی تحریکوں کی مدد اور ان میں عملی حصہ لینے کے لیے روپوش ہوا ہے۔ اس نے رضاکارانہ طور پر کیوبن حکومت اور کمونسٹ پارٹی میں اپنے تمام عہدے چھوڑ دیے اور کیوبا کی شہریت بھی ترک کر دی۔

اپنی روپوشی کے آغاز میں وہ کانگو میں جاری لڑائی میں ایک گوریلے اور لیڈر کے طور پر شریک ہوا اور بعد میں الجزائر کے صدر احمد بن بیلا نے تصدیق کی کہ چی گیویرا افریقا کو سرمایہ داری کا کمزور پہلو سمجھتا تھا اور وہ افریقا میں جاری تحریکوں میں سوشلسٹ روح پھونک دینا چاہتا تھا۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے چی گیویرا کو خبردار کیا کہ وہ کانگو کی لڑائی میں شریک ہو کر اپنی ساری ساکھ کھو دے گا اور ٹارزن کا روپ دھار لے گا۔ اس نے چی گیویرا کے اس اقدام کو غیر دانشمندانہ قرار دیا۔ اس کے باوجود چی گیویرا کانگو گیا۔ وہاں پہلے ہی کیوبن ٹروپس موجود تھے اور سوشلسٹ تحریک کی مدد کر رہے تھے۔ چی گیویرا وہاں کیوبن آرمی اور کابیلا کی کانگو آرمی کے ساتھ مل کر صدر لومبا کی فورس کے خلاف لڑنے لگا۔

افریقی گوریلے چی گیویرا کے کردار اور اس کے آدمیت کے نظریے سے متاثر تھے۔ کیونکہ وہ سیاہ فاموں کی بھی اسی طرح تنظیم کرتا تھا جس طرح سفید فاموں کی کرتا تھا۔ دوسری طرف چی گیویرا کابیلا کے آدمیوں کی غیر ذمے دارانہ حرکتوں اور عوام کے خلاف جرائم سے نالاں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سچا حریت پسند کبھی ذاتی مفاد کے لیے کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے اور جو ایسا کرتا ہے وہ اصل میں تحریک سے غداری کرتا ہے۔ کیوبن تحریک کے دوران اس نے کئی حریت پسندوں کو اسی بات پر سزا دی تھی۔ جس وقت دنیا والے چی گیویرا کے بارے میں سوال کر رہے تھے کہ وہ کہاں ہے۔ سی آئی اے اس کی کانگو میں موجودگی سے واقف تھی۔ چی گیویرا کی جاسوسی کے لیے جنوبی افریقا کی حکومت کے لیے کام کرنے والے عیسائی مشنریز کو استعمال کیا جا رہا تھا اس مشن کا سربراہ مائیک ہور ہے تھا۔ اس کی مدد کے لیے سی آئی اے اور کیوبن جلاوطنوں کی تنظیم بھی شامل تھی۔ چی گیویرا کے روابط لاطینی حریت پسندوں سے بھی تھے

اور وہ ان سے ریڈیو سے رابطہ کرتا تھا۔ سی آئی اے ان تمام ریڈیو ٹرانسمیشن کو پکڑ رہی تھی اور اسے نہ صرف چی گیویرا کی موجودگی بلکہ اس کے دستوں کی سپلائی لائنز کا بھی علم رہتا تھا۔ چی گیویرا کی کوشش تھی کہ یہاں متحارب دستوں کو آپس میں متحد کر کے کانگو کی امریکن نواز حکومت کے خلاف فیصلہ کن لڑائی کی جائے مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مایوس اور بیمار چی گیویرا اپنی ساتھیوں سمیت واپس جنوبی امریکا چلا گیا۔

افریقا میں قیام کے دوران چی گیویرا نے محسوس کیا کہ انقلاب کے لیے موزوں ترین سرزمین جنوبی امریکا کی ہے کیونکہ وہاں لوگوں اور ان کے مسائل میں یکسانیت ہے۔ دنیا کے دوسرے خطوں میں یہ کیفیت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ایک بار پھر جنوبی امریکا کا رخ کیا اور اس بار اس نے بولیویا کو میدان کے طور پر منتخب کیا۔ بولیویا میں اس وقت ایک نام نہاد جمہوری حکومت تھی جس کے آمر صدر کو امریکا کی مکمل حمایت اور مدد حاصل تھی۔ وہ اقتدار میں بھی امریکی مدد سے آیا تھا اور اس کے آنے کے بعد امریکا نے بولیویا کی فوج کو تربیت اور اسلحہ فراہم کیا تھا۔ امریکا وسطی جنوبی امریکا کے اس ملک کو بہر صورت سوشلسٹ انقلاب سے بچانا چاہتا تھا۔ بولیویا کی حالت زار دوسری جنوبی امریکن ممالک کی طرح پتلی تھی۔ ملک کی پچانوے فیصد آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی تھی اور تمام دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں مرکوز ہو گئی تھی اور یہی لوگ آمر صدر اور امریکا کے حامی تھے۔

مقامی افراد نے سوشلسٹ حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی اور جلد یہ جدوجہد گوریلا جنگ میں بدل گئی۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری کا طوفان آیا ہوا تھا۔ کیونکہ گوریلوں کو ملک کے اکثر عوام کی حمایت حاصل تھی اس لیے بولیوین فوج اپنے ہی لوگوں کا قتل عام کر رہی تھی جو ذرا بھی احتجاج کرتا نظر آتا اسے غائب کر دیا جاتا۔ بے شمار لوگ غائب ہو چکے تھے۔ براہ راست مارے جانے والوں کی تعداد بھی ہزاروں میں تھی۔ چی گیویرا بولیویا کی سوشلسٹ تحریک سے بے خبر نہیں تھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس تحریک کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے وہ پیرو کے دارالحکومت لاپاز پہنچا اور وہاں سے اس نے سرحد عبور کر کے بولیویا کی سرزمین پر قدم رکھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے زیرِ زمین چلنے والی تحریک سے رابطہ کیا اور میدان عمل میں آ گیا۔

بولیویا میں سرکاری فوج ہر طرف گوریلوں کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہی تھی۔ دوسری طرف سی آئی اے کو اطلاع مل گئی کہ چی گیویرا بولیویا پہنچ گیا ہے اس لیے فوری طور پر سی آئی اے کا اسپیشل دستہ (اسے قاتل دستہ بھی کہا جاتا تھا) بولیویا پہنچ گیا اور وہاں اس نے چی گیویرا کی تلاش شروع کر دی۔ جلد سی آئی اے کو اپنے ذرائع سے پتا چل گیا کہ چی گیویرا وسطی بولیویا میں اپنے گوریلوں کے ساتھ موجود ہے۔ سی آئی اے نے براہِ راست کارروائی کی بجائے بولیویا کی فوج کو استعمال کیا اور اس کی مدد سے چی گیویرا کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ چی گیویرا کے ساتھ موجود گوریلے زیادہ تجربے کار نہیں تھے اور ان کی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے اسے ان سے بات کرنے میں بھی دشواری پیش آتی تھی۔ اس لیے بھی چی گیویرا جنگی حکمت عملی اتنی اچھی نہیں تیار کر سکا جیسی کہ اس نے کیوبا میں کی تھی۔ سی آئی اے نے کیوبا میں اس کی حکمت عملی کا بہ غور مشاہدہ کر کے اس کا توڑ تیار کیا اور خاص طور سے بولیوین فوج کے ان دستوں کو اس کی تربیت دی جو چی گیویرا کے خلاف سرگرم تھے۔

بالآخر بولیوین فوج نے چی گیویرا اور اس کے ساتھیوں کو وسطی بولیویا کے ایک پہاڑی مقام پر گھیر لیا۔ شدید لڑائی کے بعد جس میں چی گیویرا کے بیشتر ساتھی مارے گئے۔ ان میں تمارا بینک بھی شامل تھی۔ خود چی گیویرا زخمی حالت میں ایک ہائیڈ آؤٹ میں روپوش ہو گیا۔ مگر بولیوین فوج نے بو سونگھنے والے کتوں کی مدد سے ہائیڈ آؤٹ کو تلاش کر لیا اور وہاں سے چی گیویرا کو زندہ گرفتار کر لیا۔

گرفتاری کے بعد اسے ایک چھوٹے سے گاؤں کے اسکول میں رکھا گیا۔ وہاں اس نے صرف تمباکو کا مطالبہ کیا اور اسکول کی حالت زار کا مشاہدہ کر کے اس نے اسکول کی ٹیچر سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی ملاقات ٹیچر سے کرا دی گئی اور چی گیویرا نے اسے اسکول کی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ ٹپس دیں۔ وہ بچوں اور عورتوں سے باتیں کرتا رہا۔ حتیٰ کہ بولیویا کے صدر نے اس کی موت کے احکامات جاری کر دیئے اور بولیوین فوج کے ایک سپاہی نے رضا کارانہ طور پر جلاد کا کردار ادا کرتے ہوئے اسے نو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑے انقلابی کا بہت چھوٹا سا انجام تھا۔

خصوصی تحریر اس شمارے کے لیے

زویا اعجاز

تین کھلاڑی

پاکستان کے وہ تین مایہ ناز کھلاڑی جن کے ماہرانہ اقدام سے حریف ٹیم لرزاں براندام رہتی ہے۔ کیا ان کا حالیہ فیصلہ صحیح ہے۔

کرکٹ پاکستان کا قومی کھیل نہیں ہے۔ ہمارا قومی کھیل ہاکی ہے لیکن عوامی سطح پر اس کی مقبولیت نے دیگر کھیلوں کو مات دے دی ہے۔ کرکٹ کا سب سے بڑا میلہ عالمی کپ کی صورت میں ہر چار سال بعد منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں دنیا کی بہترین ٹیمیں حصہ لے کر جیت کے لیے اپنے جوہر آزماتی ہیں۔ دنیائے کرکٹ کی بادشاہت ہر ٹیم اور ہر کھلاڑی کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ہوتی ہے۔ رواں سال اس اہم ترین ٹورنامنٹ کا آغاز 14 فروری سے مشترکہ طور پر آسٹریلیا اور

نیوزی لینڈ میں ہوا جس نے 29 مارچ تک شائقین کو اپنے آسیب میں جکڑے رکھا۔ گیارہواں عالمی کپ اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ پاکستانی شاہینوں کی اڑان اس ٹورنامنٹ میں کوارٹر فائنل تک رہی۔ پاکستان کے عالمی کپ میں سفر کے اختتام کے ساتھ ہی کئی اہم کھلاڑیوں کے نام شہ سرخیوں میں رہے ہے۔ ان میں کپتان مصباح الحق، نائب کپتان شاہد خان آفریدی اور یونس خان سرفہرست ہیں۔

مصباح الحق

مصباح الحق خان نیازی ۲۸ مئی ۱۹۷۴ء کو صوبہ پنجاب کے شہر میانوالی میں پیدا ہوئے اور پاکستان کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ کھلاڑی ہیں۔ وہ یونیورسٹی آف مینیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور سے ایم بی اے ڈگری ہولڈر ہیں۔ دائیں ہاتھ سے مڈل آرڈر میں بیٹنگ کرنے والے یہ کھلاڑی رائٹ آرم لیگ بریک باؤلر بھی ہیں۔ تحمل مزاجی اور پُرسکون اعصاب سے کھیلنا ان کا خاصہ ہے۔ ان کا ٹیسٹ ڈیبیو 8 مارچ 2001ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف ہوا۔ وہ ٹیسٹ کیپ حاصل کرنے والے پاکستان کے 166 ویں کھلاڑی تھے۔ ایک روزہ کرکٹ میں مصباح الحق کی آمد ۲۷ اپریل 2002ء میں نیوزی لینڈ کے ہی خلاف ہوئی۔ جبکہ مختصر ترین فارمیٹ میں وہ 2 ستمبر 2007ء میں بنگلہ دیش کے خلاف جلوہ افروز ہوئے۔

ایک روزہ کرکٹ میں مصباح الحق نے کینیا میں ہونے والے سہ ملکی ٹورنامنٹ میں سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی جس میں کھیلے گئے تین میچز میں انہوں نے دو نصف سنچریاں اسکور کیں۔ تاہم آسٹریلیا کے خلاف کھیلی گئی تین ٹیسٹ میچز کی سیریز میں ان کی کارکردگی اچھی نہ رہی جس کے باعث انہیں ٹیم سے باہر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد 2003ء کے عالمی کپ میں ابتدائی راؤنڈ میں پاکستان کی شکست کے بعد ٹیم میں بہت سی ہنگامی تبدیلیاں کی گئیں۔ مصباح الحق بھی ان تبدیلیوں کی بدولت ٹیم میں شامل ہوئے مگر خراب پرفارم کے بعد دوبارہ ٹیم سے باہر ہو گئے۔

33 سال کی عمر میں مصباح نے ایک بار پھر ٹیم میں اپنی جگہ بنائی 2007ء کے پہلے ٹی ٹونٹی عالمی کپ میں ہونے والے دو میچز مصباح الحق کی شہرت کا باعث بنے۔ پہلا میچ گروپ اسٹیج پر پاکستان اور انڈیا تھے۔ حسب معمول پاکستانی بیٹنگ بکھر چکی تھی مگر مصباح الحق آخر تک ڈٹا رہا۔ رن آؤٹ ہونے سے وہ میچ ٹائی ہو گیا اور وکٹس پر تھرو کرنے کے اصول کے تحت پاکستان میچ ہار گیا۔ بھارت سے اگلا ٹکراؤ اسی ٹورنامنٹ کے فائنل میں ہوا۔ ورلڈ کپ کا فائنل ہو، بھارت سے مقابلہ ہو تو پوری قوم ایک جنگی جنون میں مبتلا ہو جایا کرتی ہے۔ یہی حال اس دن تھا پاکستان کی سیکنڈ بیٹنگ تھی اور تمام شاہین خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھرتے چلے گئے۔ ایک وقت تو ایسا لگ رہا تھا کہ پاکستانی ٹیم 100 اسکور بھی نہیں کر سکے گی۔ یونس خان نے ایک پورا اوور میڈن کھیلا اور آؤٹ ہو کر چلتے بنے۔ شاہد آفریدی بھی پہلی گیند پر آؤٹ۔ جیت تو کیا ملتی ادھر تو عزت بھی داؤ پر لگی تھی۔ مگر سنجیدہ چہرے، مضبوط ارادوں کا تاثر دیتی آنکھوں کے ساتھ وہ ڈٹے رہے۔ آخر تک بڑی حکمت عملی سے گیم کرتے رہے لیکن بالکل آخری لمحات میں جب جیت صرف دو قدم کے فاصلے پر تھی ان سے ایک غلطی ہو

گئی وہ اپنے تئیں گیند کو باؤنڈری کے پار بھیجنے کی کوشش میں شارٹ فائن لیگ پر سری سانتھ کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہو گئے۔ بیٹ تھامے، گھٹنے زمین پر ٹیکے سر جھکائے وہ شخص نہیں جانتا تھا کہ یہ غلطی اس کا ایسا ناقابل معافی گناہ بن جائے گی جس کا خمیازہ اسے سارے کیریئر میں بھگتنا پڑے گا۔ اس پر ایک ٹیگ لگ گیا کہ ورلڈ کپ کا فائنل ہم بس مصباح کی وجہ سے ہارے ہیں۔ اس گناہ کا خمیازہ اس نے 8 سال بھگتا۔ اس کھلاڑی نے ٹیم کے لیے بے شمار ریکارڈز بنائے، بے انتہا محنت کی۔ تن تنہا وہ اس ڈوبتے ٹائی ٹینک کو پار لگاتا رہا۔ مگر عوام بس یہی کہتی۔ "ٹک ٹک مصباح۔ اسی کی وجہ سے ہم ہارے تھے ورلڈ کپ" مگر آفرین ہے اس شخص کی ہمت پہ اس نے اپنی بے مثال کارکردگی سے ناقدین کا منہ بند کیا۔ جوں جوں ان کے خلاف بیانات والزامات تیز ہوتے تھے ان کی کارکردگی میں مزید نکھار آتا تھا۔ یہ ان کی اچھی نیت کا پھل تھا۔

مصباح کا کیریئر نو آموز کرکٹرز کے لیے لائق تقلید

ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی ٹیسٹ سنچری بھارت کے خلاف کولکتہ میں کی۔ اس میچ میں بھارت کے 616 رنز کے جواب میں 150 رنز پر آدھی پاکستانی ٹیم پویلین لوٹ چکی تھی اور فالو آن کی تلوار ٹیم کے سر پر لٹک رہی تھی اس نازک مرحلے پر مصباح الحق نے کامران اکمل کے ساتھ 207 رنز کی شراکت قائم کر کے میچ بچا لیا۔ ان کا انفرادی اسکور 161 ناٹ آؤٹ رہا۔ اگلے میچ میں بھی انہوں نے ایک شاندار سنچری بناتے ہوئے 133 رنز بنائے اس بار بھی کوئی بھارتی باؤلر انہیں آؤٹ نہ کر سکا۔

سال 2008ء مصباح کے کیریئر کے لیے بہت اہم ثابت ہوا انہیں سینٹرل کانٹریکٹ میں A گریڈ سے نوازتے ہوئے ٹیم کا نائب کپتان بھی بنایا گیا۔ بین الاقوامی کرکٹ میں واپسی کے بعد مصباح نے جس مستقل مزاجی سے مثبت کھیل کا مظاہرہ کیا۔ وہ آج بھی کرکٹ کے حلقوں میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت مصباح نے بھارت کے خلاف ٹیسٹ میچز کی پانچ اننگز میں 152.67 کی ایوریج سے 458 رنز بنائے۔ اس کے علاوہ پانچ ایک روزہ میچز میں ان کا سکور 63.33 کی ایوریج سے 190 رہا۔ ان کی کارکردگی کا یہ سلسلہ ڈومیسٹک کرکٹ میں بھی جاری رہا جس میں پنجاب کی نمائندگی کرتے ہوئے انہوں نے 195.33 کی ایوریج سے 586 رنز بنائے۔ جن میں دو سنچریوں کے علاوہ ان کا بہترین ڈومیسٹک سکور 208 ناٹ آؤٹ بھی شامل ہے۔

2010ء کے تیسرے ٹی ٹوئنٹی عالمی کپ میں ان کی بیٹنگ فارم اچھی نہ رہی جس کی وجہ سے وہ ٹیم سے ڈراپ کر دیئے گئے۔ یہی وجہ تھی کہ اگست 2010ء میں پاکستان کے متنازعہ دورہ انگلینڈ میں وہ ٹیم کا حصہ نہ تھے۔ پاکستانی بیٹنگ کی ناکامی کی وجہ سے انہیں واپس بلوا لیا گیا۔ وہ وقت پاکستان کرکٹ کے لیے ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہد آفریدی کے ٹیسٹ کرکٹ سے اچانک مستعفی ہو جانے کے بعد ٹیم کی قیادت سلمان بٹ کو سونپی گئی لیکن اسپاٹ فکسنگ اسکینڈل کی وجہ سے ان پر بھی پابندی عائد کر دی گئی۔ حیران کن طور پر کرکٹ بورڈ نے کامران اکمل، محمد یوسف اور یونس خان جیسے مضبوط امیدواروں کو نظر انداز کرتے ہوئے مصباح الحق کو نیا ٹیسٹ قائد مقرر کر دیا۔ بورڈ کے اس فیصلے کو کئی سابق کرکٹرز نے کافی تنقید کا نشانہ بنایا۔ پاکستانی ٹیم کے سابق کوچ جیف لاسن نے اس موقع پر مصباح کی مکمل حمایت کرتے ہوئے بیان دیا کہ ”مجھے یقین ہے پاکستان میں اس وقت مصباح الحق سے بہتر کرکٹ کی سمجھ بوجھ اور مثبت سوچ کا حامل کوئی کھلاڑی نہیں۔ اور یقینی طور پر وہ اپنی کپتانی میں ناقابلِ یقین کارنامہ ہائے سرانجام دے گا۔“

کپتان بنائے جانے پر بے جا تنقید کرنے والوں کو مصباح نے اپنی کارکردگی سے منہ توڑ جواب دیا اور بحیثیت قائد اپنے پہلے ہی میچ میں انہوں نے یونس خان کے ساتھ 168 رنز کی شراکت قائم کر کے میچ ڈرا کیا۔ اس شراکت میں مصباح کا انفرادی سکور 71 ناٹ آؤٹ تھا۔ مصباح نے 33 ٹیسٹ میچز میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ 15 میچز میں کامیابی ان کا مقدر بنی۔ 9 میچز میں شکست ہوئی جبکہ 8 بے نتیجہ رہے۔

2011ء میں شاہد آفریدی کی مشروط ریٹائرمنٹ کے بعد مصباح الحق کو ایک روزہ کرکٹ کا قائد بنایا گیا۔ انہوں نے ٹیم کے لیے مثبت طرزِ عمل سے نئی راہیں متعین کیں۔ وقار یونس نے مصباح الحق کے بارے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ: ”میں مصباح الحق کو ٹیم کے استحکام کے لیے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ وہ ساتھی کھلاڑیوں کے لیے بہت آرام دہ اور پُرسکون ماحول فراہم کرتا ہے۔ جس کی بدولت وہ اپنے کھیل سے بھرپور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار انسان ہے۔ جو خندہ پیشانی سے دوسروں کے اچھے مشورے قبول کرتا ہے، تاہم اس کی واحد بدقسمتی اس کی بڑھتی ہوئی عمر ہے۔“

2012ء میں متحدہ عرب امارات میں پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان ایک سیریز کا انعقاد ہوا۔ انگلینڈ اس وقت عالمی نمبر ایک ٹیسٹ ٹیم تھی۔ لیکن مصباح کی قیادت میں پاکستان نے انگلینڈ کو 0-3 سے ہرا کر نئی تاریخ رقم کی۔ ایک روزہ سیریز کے علاوہ پاکستان ٹی ٹوئنٹی سیریز بھی انگلینڈ سے ہار گیا۔ اس موقع پر تنقید کا ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور مصباح نے ٹی ٹوئنٹی ٹیم سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔

مارچ 2012ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والے ایشیا کپ میں بھی پاکستان کو فتح نصیب ہوئی۔ معین خان کے بعد مصباح دوسرے پاکستانی کپتان تھے جنہوں نے ملک کو ایشین چیمپین کا تاج دلوایا۔ دسمبر 2012ء میں بھارت میں ایک قدرے ناتجربہ کار ٹیم کے ساتھ مصباح نے ایک روزہ سیریز جیت کر عوام کو نئے سال کا ناقابلِ فراموش تحفہ دیا۔

2013ء میں آئی سی سی کی جانب سے آخری بار چیمپینز ٹرافی کا انعقاد کیا گیا۔ پاکستان کوئی بھی گروپ میچ نہ جیت سکا۔ بیٹنگ لائن بری طرح ناکام رہی لیکن مصباح نے فقید المثال

کارکردگی پیش کی۔انہوں نے 86.50 کی ایوریج سے تین میچز میں 173 رنز بنائے۔جو اس ٹورنامنٹ میں کسی بھی بیٹسمین کی جانب سے چھٹی اور پاکستان کی جانب سے بہترین کارکردگی تھی۔اسی دوران ایک ویسٹ انڈیز کے خلاف میچ میں وہ صرف چار رنز کی دوری سے اپنی پہلی سنچری نہ بنا سکے۔اور 96 رنز کے ساتھ ناٹ آؤٹ رہے۔اسی سال دورہ ویسٹ انڈیز میں انہوں نے پانچ میچز میں چار ففٹیز اسکور کیں۔65.00 کی ایوریج سے مصباح نے اس سیریز میں 260 رنز بنائے اور سیریز کے بہترین کھلاڑی قرار دیئے گئے۔انہوں نے 2013ء میں نو نصف سنچریز کی مدد سے 808 رنز بنا کر آئی سی سی ایک روزہ رینکنگ میں اپنے کیریئر کی بہترین ساتویں پوزیشن حاصل کی۔

بین الاقوامی کرکٹ کے علاوہ مصباح نے ڈومیسٹک کرکٹ میں بھی اپنی شاندار کارکردگی جاری رکھی۔قومی سطح پر وہ فیصل آباد وولفز کی قیادت کرتے ہیں۔

2013ء میں بھارت نے جنوبی افریقا میں تین ٹیسٹ میچز، سات ایک روزہ میچز اور تین ٹی ٹوئنٹی میچز پر مشتمل سیریز کھیلنی تھی۔یہ دورہ بھارتی کرکٹ بورڈ کی جانب سے مختصر کردیا گیا۔مالی خسارے سے بچنے کے لیے جنوبی افریقا کی جانب سے پاکستان کو تین ایک روزہ میچز کھیلنے کے لیے مدعو کیا گیا۔پہلا میچ پاکستان نے 23 رنز جبکہ دوسرا میچ انتہائی سنسنی خیز مقابلے کے بعد ایک رن سے جیت کر تین میچز کی سیریز میں ناقابل شکست برتری حاصل کرلی۔یہ کسی بھی ایشیائی کپتان کے لیے جنوبی افریقی سرزمین پر پہلی فتح تھی۔

2014ء میں متحدہ عرب امارات میں پاکستان نے مصباح کی قیادت میں آسٹریلیا کو 32 سال بعد ٹیسٹ سیریز میں ہرا کر ایک نئی تاریخ رقم کی۔

رواں سال 7 مارچ کو جنوبی افریقا کے خلاف ہونے والے عالمی کپ کے ایک اہم میچ میں مصباح نے اپنے کیریئر کے 5000 رنز مکمل کیے۔ان کی پاکستانی ٹیم کے لیے خدمات بلاشبہ لکھنے کے قابل ہیں۔لیکن کرکٹ ناقدین نے انہیں ہمیشہ بے جا تنقید کا نشانہ بنایا۔عالمی کپ میں کوارٹر فائنل میں شکست کے بعد وطن واپسی پر مصباح نے پریس کانفرنس میں کہا کہ "لوگ اب خوش ہو جائیں۔میں ایک روزہ کرکٹ میں واپس نہیں آؤں گا۔پاکستان کرکٹ کی تباہی کا ذمہ دار اکیلا میں نہیں ہوں۔لیکن ہمیشہ مجھے ہر بات کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہا۔"

مہندر سنگھ دھونی ہو تا دم تحریر بھارتی تاریخ کا کامیاب ترین کپتان ہے اس کے بدلے بھارتی کمنٹیٹرز نے مصباح جیسا کھلاڑی بھارتی ٹیم میں نہ ہونا اپنی بدقسمتی قرار دیا۔میڈیا اور عوامی منفی ردِعمل کے باعث کئی غیر ملکی کمنٹیٹرز نے سوشل میڈیا پر مصباح کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔بھارت کے مشہور کمنٹیٹر ہرشہ بھوگلے نے ٹوئٹر پر پیغام دیا کہ "مصباح کی گرانقدر خدمات کے باوجود انہیں ہمہ وقت تنقید کی زد میں رکھنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ان کی حالت زار سات بہنوں کے اس اکلوتے بھائی جیسی ہے۔جس سے خاندان ہمیشہ اس کی کم تر تنخواہ اور معاشی حالت کی بدولت نالاں رہے۔مجھے تو یوں لگتا ہے کہ مصباح 85 سال کی عمر میں بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے بھی یونہی پاکستانی ٹیم کی ڈوبتی ناؤ بچاتے نظر آیا کریں گے۔"

41 سال کی عمر تک وہ ٹیم کے سب سے فٹ کھلاڑی رہے۔اکیلے سپہ سالار کی طرح باقی دس کھلاڑیوں کا بوجھ بھی ڈھوتے رہے اور کیا خوب صلہ وفاؤں کا دیتے ہیں لوگ۔ہمارے اپنوں نے انہیں بزدل ترین کپتان قرار دیا۔کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا ان میں بھی کچھ کوتاہیاں تھیں مگر ہم نے ان کی جدوجہد کو بھی سراہا نہ گیا اور ہماری اس کوتاہ بینی کا اندازہ ہمیں تب ہوگا جب کسی انتہائی شرمناک بیٹنگ پرفارمنس میں ایک چٹان کی طرح ایستادہ کوئی مصباح الحق نظر نہ آئے گا۔۔۔۔۔کیونکہ فی البدیہہ پاک ٹیم میں کوئی ایسا کھلاڑی دور دور تک نظر نہیں آتا جو آپ کے طنز و ذلت کے وار بھی سہے،اور پھر بھی اپنی کارکردگی سے ٹیم کی نیا اکیلا پار لگاتا رہے۔جیت کے بعد بھی تنقید برداشت کرے۔انہوں نے کبھی انا پرستی کا بے جا مظاہرہ کرکے کسی کھلاڑی کا کیریئر داؤ پر نہیں لگایا۔مصباح کی شہرت،عزت اور کامیابی ایک دو دن کی پرفارمنس کی مرہونِ منت نہیں ہے۔سالہا سال کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔عنقریب ہمیں سوشل میڈیا پر یہی پوسٹس نظر آیا کریں گی کہ مصباح اگر ہوتا تو یوں نہ ہوتا۔یعنی مصباح نہ ہوا 1122 ہو گیا۔مستقبل قریب میں ہمیں اس عاجز،بے لوث اور بلند ارادوں کے حامل اس انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔

مصباح الحق نے اکیاون ٹیسٹ میچز میں پاکستان کی نمائندگی کی۔اور 50.80 کی ایوریج سے 3658 رنز بنائے جن میں 8 سنچریاں اور 26 نصف سنچریاں شامل ہیں۔کسی بھی ٹیسٹ میچ میں مصباح الحق کا سب سے زیادہ انفرادی سکور 161 ناٹ آؤٹ ہے۔اس کے علاوہ انہیں ٹیسٹ میچ میں تیز ترین سنچری کا ریکارڈ برابر کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

162 ایک روزہ میچز میں انہوں نے 40.43 کی ایوریج سے 5122 بنائے جس میں کوئی سنچری شامل نہیں۔ تاہم وہ 42 ففٹیز اسکور کرنے میں کامیاب رہے بہترین انفرادی اسکور 96 ناٹ آؤٹ ہے۔ مصباح نے 39 ۔ٹی ٹونٹی میچز میں 37.52 کی ایوریج سے 788 رنز بنائے۔ جن میں تین ففٹیز شامل تھیں۔ سب سے زیادہ انفرادی اسکور 87 ناٹ آؤٹ ہے۔ ٹیسٹ، ایک روزہ اور مختصر فارمیٹ کرکٹ میں مصباح الحق نے بالترتیب 38، 66 اور 14 کیچز بھی پکڑے۔

مصباح الحق فی الوقت ٹیسٹ میچز میں پاکستان کے کپتان برقرار رہیں گے۔ کرکٹ کے سنجیدہ حلقے ایک روزہ کرکٹ میں The Rock نامی مصباح کی کمی شدت سے محسوس کریں گے۔ ان کی مستقل مزاجی ان کے کھیل کا سب سے بڑا مثبت پہلو رہی ہے۔ پاکستان کے لیجنڈ کھلاڑی جاوید میانداد نے ان سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کی اپیل کی ہے تاہم ابھی وہ اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔

مصباح کے چند مزید اہم ترین ریکارڈز میں ایک ٹیسٹ میچ میں چوبیس منٹوں اور اکیس گیندوں پر ابوظہبی میں آسٹریلیا کے خلاف کی گئی ففٹی، ایک روزہ کرکٹ میں کسی بھی سنچری کے بغیر سب سے زیادہ 42 ہاف سنچریز، بطور پاکستانی کپتان سب سے زیادہ انفرادی اسکور، 2013ء کیلنڈر ائیر میں سب سے زیادہ اسکور اور 15 ففٹیز شامل ہیں، اس کے علاوہ وہ پندرہ ٹیسٹ میچز میں کامیابی سمیٹنے والے پہلے پاکستانی کپتان، جنوبی افریقا کو ان کی سرزمین پر ہرانے والا پہلا ایشیائی کپتان، ایشیا کپ کے دوسرے فاتح پاکستانی کپتان اور آٹھویں پاکستانی کھلاڑی ہیں جنہوں نے ایک ٹیسٹ میچ کی دونوں اننگز میں سنچری اسکور کی ہے۔ جنوبی افریقا کی 26 مسلسل ٹیسٹ فتوحات کا سلسلہ ختم کرنے والے وہ پہلے کپتان ہیں۔ وہ ٹیسٹ میچز میں دو، ایک روزہ کرکٹ میں 6 جبکہ مختصر ترین فارمیٹ میں بھی دو بار مرد میدان قرار دیئے گئے۔

اپنی ابتدائی ایک غلطی کے بدلے مصباح نے پاکستان کرکٹ کو اتنے اعزازات دیئے ہیں جن کا شمار مشکل ہے۔

شاہد خان آفریدی

اس سال پاکستان کے دوسرے ریٹائرڈ ہونے والے کھلاڑی بوم بوم آفریدی کے نام سے مشہور صاحبزادہ محمد شاہد خان آفریدی ہیں۔ وہ یکم مارچ 1980ء میں خیبر ایجنسی فاٹا میں پیدا ہوئے۔ دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے والے یہ لیگ اسپنر بطور آل راؤنڈر 19 سال پاکستانی ٹیم کا اہم ستون رہے ہیں۔ ان کا میچ شرٹ نمبر 10 ہے۔ شاہد آفریدی نے اپنے ایک روزہ کیریئر کا آغاز کینیا کے خلاف کیا جس میں بیٹنگ کے لیے ان کا نمبر نہ آسکا اور بطور باؤلر انہیں اس میچ میں کوئی وکٹ نہ ملی۔ اپنے اگلے میچ میں 2 اکتوبر 1996ء کو سری لنکا کے خلاف سولہ سال 217 دن کی عمر میں 37 گیندوں پر تیز ترین سنچری بنا کر وہ دنیائے کرکٹ میں راتوں رات مقبول ہو گئے۔ یہ سنچری کم ترین عمر میں بنائی جانے والی پہلی عالمی سنچری تھی۔ اس میچ میں انہوں نے گیارہ چھکے رسید کیے جو اس وقت کسی بھی ایک روزہ اننگز میں سب سے زیادہ انفرادی چھکے تھے۔ ان کے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز 22 اکتوبر 1998ء میں آسٹریلیا کے خلاف ہوا۔ وہ پاکستان کی طرف سے ٹیسٹ میچ کھیلنے کا اعزاز حاصل کرنے والے 153 ویں کھلاڑی تھے۔ اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میچ میں انہوں نے پانچ وکٹیں حاصل کیں۔ اپنا دوسرا ٹیسٹ میچ انہوں نے بھارت کے خلاف جنوری 1999ء میں کھیلا۔ یہ ان دونوں ممالک کے درمیان نو سال بعد کھیلا جانے والا ٹیسٹ میچ تھا۔ اس میچ میں شاہد آفریدی نے 191 گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے 141 رنز بنائے اور 54 رنز کے عوض تین وکٹیں بھی حاصل کیں۔

شاہد آفریدی نے لیسٹر شائر کی طرف سے کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ وہ اپنے جارحانہ انداز کی بدولت مخالفین کے چھکے چھڑانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ کریز پر ان کی موجودگی ہی مخالف باؤلر کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ سال 2005ء ان کے لیے بیٹنگ اور باؤلنگ ہر لحاظ سے بہترین ثابت ہوا۔ اسی سال اپریل میں انہوں نے انڈیا کے خلاف 45 گیندوں پر دھواں دھار سنچری بنائی۔ اکیس نومبر 2005ء میں شاہد آفریدی پر انگلینڈ میں پچ جان بوجھ کر خراب کرنے کی پاداش میں ایک ٹیسٹ اور دو ایک روزہ میچز کی پابندی لگائی گئی۔ جسے انہوں نے بعد ازاں تسلیم بھی کیا۔ 12 اپریل 2006ء میں انہوں نے ایک روزہ کرکٹ پر زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرنے کے لیے ٹیسٹ میچز سے وقتی ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا۔ 2007ء میں ہونے والے پہلے ٹی ٹونٹی عالمی کپ میں ان کی بیٹنگ فارم بہت خراب رہی۔ لیکن ان کی باؤلنگ کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ وہ اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں کوئی بھی وکٹ نہ لے سکے اور بیٹنگ میں بھی صفر پر آؤٹ ہو گئے لیکن یہ کارکردگی بھی انہیں ٹورنامنٹ کے بہترین کھلاڑی کا ایوارڈ نوازنے سے نہ روک سکی۔ 2009ء کے دوسرے عالمی کپ میں انہوں نے ٹیم کے لیے سیمی فائنل اور فائنل میں

شاندار ففٹیز، اسکور کیں اور عالمی چیمپئن کے تاج کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ٹورنامنٹ کے بعد یونس خان کی ٹی ٹوئنٹی سے ریٹائرمنٹ کی وجہ سے انہیں مختصر ترین فارمیٹ کا کپتان بنایا گیا۔ 31 جنوری 2010ء میں آسٹریلیا کے خلاف کھیلے جانے والے میچ میں شاہد آفریدی پر دانستہ بال ٹمپرنگ کی وجہ سے دو میچز کی پابندی عائد کی گئی۔

25 مئی 2010ء میں آفریدی کو ٹیسٹ کرکٹ میں واپسی کے بعد تمام طرز کرکٹ کا کپتان بنا دیا گیا۔ جولائی 2010ء میں لارڈز کے تاریخی گراؤنڈ پر انہوں نے آسٹریلیا کے خلاف آخری ٹیسٹ میچ کھیلا اور سیریز کے دوران ہی ٹیسٹ کرکٹ سے حتمی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ ٹیسٹ کرکٹ ان کے جارحانہ مزاج سے بالکل مختلف تھی۔ اس سال ہونے والے سپاٹ فکسنگ سکینڈل میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کا شیرازہ بری طرح بکھر گیا لیکن شاہد آفریدی کی ساحرانہ قیادت نے ٹیم کو نئی بلندیوں پر پہنچایا۔ 2011ء میں ہونے والے دسویں عالمی کپ میں ان کا بھرپور کردار رہا۔ انہوں نے اس ٹورنامنٹ میں 4000 رنز اور 300 وکٹس مکمل کیں۔ ان کی قیادت میں پاکستان نے عالمی کپ میں آسٹریلیا کی 34 مسلسل فتوحات کو فل سٹاپ لگایا اور کینگروز کو شکست دے کر گروپ میں ٹاپ پوزیشن حاصل کی۔ بدقسمتی سے پاکستان بھارت سے سیمی فائنل میں ہار گیا۔ شاہد آفریدی اس ٹورنامنٹ میں 21 وکٹس کے ساتھ بھارتی کھلاڑی ظہیر خان کے ساتھ مشترکہ ٹاپ باؤلر رہے۔ آفریدی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ سیمی فائنل جیسے اہم میچ میں بھارت سے شکست کے باوجود عوام نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ یہ کسی بھی پاکستانی کپتان کے لیے پہلا اعزاز تھا۔

عالمی کپ 2011ء کے بعد ویسٹ انڈیز کے ساتھ سیریز کھیلی گئی۔ جس میں آفریدی کے کوچ وقار یونس کے ساتھ اختلافات کھل کے سامنے آئے۔ 19 مئی کو شاہد آفریدی کپتانی کے عہدے سے سبکدوش کر دیئے گئے اور ٹیم کی کمان مصباح الحق کے حوالے کی گئی۔ آفریدی نے 34 میچز میں ٹیم کی قیادت کی جس میں 15 میں شکست جبکہ 18 مقابلوں میں فتح نصیب ہوئی۔ کرکٹ بورڈ سے اختلافات کی بدولت انہوں نے 30 مئی 2011ء میں مشروط ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا واپسی کی صورت صرف کرکٹ بورڈ کے عہدیداران کی تبدیلی تھی۔ کرکٹ بورڈ نے ان کا سینٹرل کانٹریکٹ ختم کرتے ہوئے چار اعشاریہ پانچ ملین کا جرمانہ عائد کر دیا۔ کاؤنٹی کرکٹ کے لیے ان کا این او سی بھی منسوخ کر دیا گیا۔

کوچ وقار یونس ہمیشہ شاہد آفریدی سے ناخوش نظر آتے تھے۔ دورہ ویسٹ انڈیز کے بعد ایک بیان میں انہوں نے کہا کہ: ”آفریدی ایک غیر ذمہ دار کرکٹر ہیں جو حکمت عملی سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ ان میں گیم پلان کی صلاحیت کم ہے اور وہ کسی کے بھی مثبت مشورے پر بھی کان نہیں دھرتے۔“

سندھ ہائی کورٹ میں پٹیشن دائر کرنے کے بعد کرکٹ بورڈ سے ان کے معاملات طے ہو گئے اور اکتوبر 2011ء میں چیئرمین اعجاز بٹ کی کرکٹ بورڈ سے روانگی کے بعد انہوں نے ایک روزہ کرکٹ میں واپسی کا اعلان کر دیا۔ آفریدی کی واپسی کے بعد انہوں نے پھر مڑ کر نہیں دیکھا اور ریکارڈز کے جھنڈے گاڑتے چلے گئے۔ 2011ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف گیانا کے مقام پر انہوں نے 12 رنز کے عوض سات کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ کرکٹ فینز نے اس دن کو یوم آفریدی کے نام سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔

جارح مزاجی کی وجہ سے شاہد آفریدی کو بوم بوم آفریدی کا خطاب دیا گیا۔ ان کے انیس سالہ دور میں بے شمار ریکارڈز ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ (سات) مرتبہ مین آف دی میچ کے ایوارڈز ملے ہیں۔ دنیائے کرکٹ کی سات تیز ترین سنچریوں میں سے تین سنچریاں آفریدی نے اسکور کی ہیں۔ کرکٹ کی تاریخ میں بہترین اسٹرائیک ریٹ کے حوالے سے وہ تیسرے نمبر پر ہیں۔ ٹیسٹ کرکٹ جیسے سست رفتار فارمیٹ میں ان کا اسٹرائیک ریٹ 86.97 ہے۔ شاہد

آفریدی نے کرکٹ کی تاریخ میں سب سے زیادہ چھکے لگائے ہیں۔ ٹی ٹوئنٹی کرکٹ میں 1000 رنز کرنے اور 50 وکٹیں لینے والے وہ واحد کھلاڑی ہیں۔ ان کے تمام تر کیریئر میں ان کی غیر مستقل مزاجی آڑے آتی رہی جس کی وجہ سے ان کا بیٹنگ آرڈر بھی سیٹ نہیں ہو سکا۔ برصغیر پاک و ہند میں کرکٹ گیند اپنی چمک جلدی کھو دیتی ہے لہٰذا آفریدی اننگز کے آغاز میں کھیلنا پسند کرتے رہے جبکہ دوسرے براعظموں میں نمبر چھ پر کھیلنا ان کی ترجیح ہوتی تھی۔ باؤلنگ میں کسی اسپنر کے پاس آفریدی جیسا تنوع نہیں رہا۔ وہ 130 کلومیٹر اور 81 میل فی گھنٹے کے حساب سے بھی باؤلنگ کرواتے رہے ہیں۔ بحیثیت اسپنر انہیں بیٹسمین کو باؤنسر کرانے کا منفرد اعزاز بھی حاصل ہے۔ ٹیسٹ کرکٹ میں پانچ اور ایک روزہ کرکٹ میں چھ سنچریز کی ہیں۔ جبکہ نو دفعہ پانچ وکٹس کے حصول میں کامیاب رہے ہیں۔ غیر ملکی لیگز انہیں اپنی ٹیم کا حصہ بنانے میں کوشاں رہتی ہیں۔ انہیں طوفانی کھیل کی وجہ سے The Storm بھی کہا جاتا ہے۔

2014ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والے ایشیا کپ میں بھارتی باؤلر روی چندر ایشون کو دو مسلسل چھکے مار کر انہوں نے پاکستان کو جیت سے ہمکنار کیا اور کروڑوں پاکستانیوں میں جوش و ولولے کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اسی ٹورنامنٹ میں بنگلہ دیش کے خلاف 25 گیندوں پر 59 رنز کی برق رفتار اننگز کھیل کر پاکستان کو یقینی شکست سے بچا کر عوام کے دلوں میں ایک نیا اور بلند تر مقام حاصل کیا۔ شاہد آفریدی نے عالمی کرکٹ میں سب سے زیادہ چھکے رسید کیے ہیں۔ دنیائے کرکٹ کا سب سے طویل (168 میٹر) چھکا بھی انہوں نے ہی جنوبی افریقا کے خلاف لگایا۔

اپنے کیریئر کے آخری ٹورنامنٹ عالمی کپ 2015ء میں انہوں نے 8000 رنز کا سنگ میل عبور کیا لیکن بدقسمتی سے 400 وکٹس مکمل نہ کر سکے۔

شاہد آفریدی ہر عمر کے لوگوں میں یکساں مقبول ہیں۔ ان کے کسی بھی کھلاڑی کو آؤٹ کر کے دونوں بازو ہوا میں اٹھانے کے سٹائل کی نقل پاکستان کے پچانوے فیصد کرکٹ شائقین کرتے ہیں۔ 2007ء اور 2011ء میں انہیں بہترین اسٹائلش کھلاڑی کے ایوارڈز مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک پاکستانی فلم "میں ہوں شاہد آفریدی" میں بھی جلوہ افروز ہو چکے ہیں۔

غیر ملکی میڈیا اور کھلاڑی شاہد آفریدی کی خدمات کو ہمیشہ سراہتے رہے ہیں۔ مشہور آسٹریلوی لیگ اسپنر شین وارن کا کہنا ہے: "میرا تو عمر بیٹا اپنے باپ جیسا نہیں بلکہ شاہد آفریدی جیسا کرکٹر بننا چاہتا ہے۔ آفریدی اس کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔"

انگلش کھلاڑی کیون پیٹرسن کا کہنا ہے: "کرکٹ کی تاریخ میں کوئی بھی دوسرا شاہد آفریدی پیدا نہیں ہو سکتا۔"

پاکستانی عوام کی اکثریت کوئی بھی کرکٹ میچ صرف شاہد آفریدی ہی کی وجہ سے دیکھتے ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانی شائقین ان کے آؤٹ ہوتے ہی اسٹیڈیم سے چلے جاتے ہیں۔ ایک روزہ کرکٹ سے شاہد آفریدی کی ریٹائرمنٹ نے عوام میں مایوسی اور اداسی پیدا کر دی ہے۔ کرکٹ کو جارحانہ روح عطا کرنے والے آفریدی کی عدم موجودگی اور کمی بلاشبہ ایک ناقابلِ بیان خلا ثابت ہوگی۔ مختصر فارمیٹ کرکٹ میں وہ بطور کپتان اپنی خدمات سرانجام دیتے رہیں گے۔

یونس خان

پاکستان کے تیسرے ریٹائرڈ ہونے والے کھلاڑی ہمہ وقت مسکراتے چہرے اور ٹھنڈے مزاج کے حامل محمد یونس خان ہیں۔ یونس خان 29 نومبر 1977ء میں خیبر پختونخواہ کے شہر مردان میں پیدا ہوئے۔ دائیں ہاتھ سے بیٹنگ کرنے کے علاوہ وہ رائٹ آرم میڈیم لیگ بریک باؤلر بھی ہیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 26 فروری 1999ء میں سری لنکا کے خلاف ٹیسٹ میچ سے کیا۔ وہ ٹیسٹ کیپ حاصل کرنے والے پاکستان کے 159 ویں کھلاڑی تھے۔ ایک روزہ کرکٹ میں ان کا سفر 13 فروری 2000ء سے کراچی میں سری لنکا ہی کے خلاف شروع ہوا۔ ان کی بیچ شرٹ کا نمبر 75 ہے۔ یونس خان ان چند کھلاڑیوں میں شامل تھے جو 2003ء کے عالمی کپ کی بدترین شکست کے بعد ٹیم میں اپنی جگہ برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ لیکن بنگلہ دیش اور جنوبی افریقا کے خلاف کھیلی گئی ہوم سیریز میں خراب کارکردگی کے باعث وہ ٹیم سے باہر کر دیئے گئے۔ ان کی واپسی سری لنکا کے خلاف اکتوبر 2004ء میں ممکن ہوئی۔ اس کے بعد آسٹریلیا اور بھارت کے خلاف ہونے والی سیریز میں ان کی کارکردگی میں مزید بہتری آئی۔ بنگلور میں ہونے والے ایک ٹیسٹ میچ میں انہوں نے 504 گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے 267 رنز بنائے۔ ان کی کارکردگی کی بدولت انہیں نائب کپتان بنا دیا گیا۔ 2005ء میں کولکتہ میں بھارت کے خلاف 147 رنز بنائے۔ 2005ء میں انٹرنیشنل

کرکٹ کونسل کی جانب سے منتخب کردہ پندرہ بہترین ٹیسٹ کھلاڑیوں میں یونس خان کا نام بھی شامل تھا۔ وہ جاوید میانداد کے بعد ٹیسٹ کرکٹ میں تیز رفتار 4000 رنز بنانے والے دوسرے کھلاڑی ہیں۔ فروری 2009ء میں سری لنکا کے خلاف بحیثیت کپتان کھیلے گئے ٹیسٹ میچ میں انہوں نے 313 رنز کی بہترین اننگز کھیل کر آئی سی سی رینکنگ میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

یونس خان کا کرکٹ کیریئر کپتانی کی وجہ سے بہت سے تنازعات کا شکار رہا۔ انہیں سب سے پہلے 2005ء میں جزائر غرب الہند کے خلاف ٹیم کی قیادت کا موقع ملا۔ ستمبر 2006ء میں انضمام الحق پر عائد عارضی پابندی کی وجہ سے انہیں چیمپینز ٹرافی کے لیے وقتی قائد بنانے کی پیشکش کی گئی لیکن انہوں نے یہ کہہ کر اس موقع کو ٹھکرا دیا کہ وہ کٹھ پتلی قائد نہیں بننا چاہتے۔ سات اکتوبر 2006ء کو انہیں کرکٹ بورڈ نے چیمپینز ٹرافی کے لیے قائد مقرر کیا جسے بادل نخواستہ انہیں قبول کرنا پڑا۔ 2007ء کے عالمی کپ کی شرمناک شکست کے بعد انضمام الحق ٹیم کی قیادت سے مستعفی ہوگئے۔ بورڈ نے اس موقع پر کپتانی کا تاج مستقل طور پر یونس خان کے سر پر سجانا چاہا۔ لیکن انہوں نے کسی بھی شکست کی صورت میں عوام کے جذباتی اور شدید ردِعمل سے نالاں ہونے کی وجہ سے اس عہدے کو منظور نہ کیا۔ قیادت کا ہما شعیب ملک پر مہربان ہوا لیکن 2009ء میں ان کی مسلسل خراب ترکارکردگی کے باعث یونس خان ہی کو ٹیسٹ اور ایک روزہ ٹیم کا مستقل قائد ٹھہرایا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ: ''میں ٹیم کے تمام تر معاملات درست رکھنے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ میں اپنی ٹیم کو مستقل مزاجی کی بلندیوں پر دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ شعیب ملک بطور سینئر کھلاڑی میری بھرپور معاونت کریں گے۔''

اسی سال یونس کی قیادت میں پاکستان نے پہلی مرتبہ انگلینڈ میں ہونے والے دوسرے ٹی ٹوئنٹی عالمی کپ میں سری لنکا کو آٹھ وکٹوں سے شکست دے کر ٹی ٹوئنٹی کرکٹ کی حکمرانی حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے مختصر فارمیٹ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہتے ہوئے ایک پریس کانفرنس میں کہا۔ ''یہ میرا پاکستان کے لیے آخری ٹی ٹوئنٹی میچ ہے اور میں بین الاقوامی ٹی ٹوئنٹی مقابلوں سے دستبردار ہو رہا ہوں۔ میری عمر اب اکتیس سال ہے اور ان مقابلوں کے لیے میں اپنی عمر اب زیادہ محسوس کرتا ہوں۔''

تیرہ اکتوبر 2009ء میں انہوں نے میچ فکسنگ الزامات کی وجہ سے ایک روزہ کرکٹ کی قیادت سے بھی احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ اسی سال منعقدہ چیمپینز ٹرافی میں انہیں انگلی کے فریکچر کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وہ سیمی فائنل میچ کھیلے جس میں ان کی طرف سے گرانٹ ایلیٹ کا کیچ گرانے کے باعث پاکستان نیوزی لینڈ سے وہ میچ ہار گیا۔ بعدازاں کرکٹ بورڈ نے انہیں استعفیٰ واپس لینے کی پیشکش کی جسے انہوں نے مشروط طور پر قبول کرلیا۔ نیوزی لینڈ کے خلاف تین میچز کے بعد انہوں نے آسٹریلیا میں ہونے والی آئندہ سیریز سے معذرت کرلی۔ ان کی جگہ محمد یوسف کو کپتان بنا دیا گیا۔ اس کے بعد یونس خان نے کسی بھی میچ میں قومی ٹیم کی قیادت نہیں کی۔

قیادت سے مستعفی ہونے کے بعد ان کا کیریئر بہت سے نشیب و فراز سے گزرا۔ احتجاجی استعفیٰ کے باعث وہ کرکٹ بورڈ کی طرف سے زیرِ عتاب آگئے، 10 مارچ 2010ء میں ان پر کرکٹ کے دروازے بند کردیئے گئے۔ تین ماہ بعد جون 2010ء میں یہ پابندی ہٹالی گئی تاہم انہیں دورہ انگلینڈ کے لیے منتخب نہ کیا گیا۔ اس دورہ میں پاکستان کی بیٹنگ ٹیسٹ میچز میں مسلسل بری طرح ناکام ہوتی رہی اور اسی دباؤ کے تحت کرکٹ بورڈ یونس خان کو انگلینڈ بھیجنے پر آمادہ ہوگیا۔ اسپاٹ فکسنگ سکینڈل کی وجہ سے کپتان سلمان بٹ کو فوری طور پر ٹیم سے باہر کرنا پڑا۔ معین خان اور ظہیر عباس سمیت کئی سابق کرکٹرز نے یونس خان کو ٹیم کی کمان سونپنے کی تجویز دی۔ لیکن کرکٹ بورڈ نے انہیں دورہ جنوبی افریقا کے لیے نظرانداز کر دیا۔ چیف سلیکٹر محسن حسن خان کی طرف سے قیادت مصباح الحق کے حوالے کردی گئی۔ اس کے بعد کرکٹ بورڈ اور یونس خان کے تعلقات میں قدرے بہتری آنے لگی اور انہیں جنوبی

افریقا کے خلاف سیریز میں منتخب کرلیا گیا۔ جس میں ان کی کارکردگی انتہائی شاندار اور پاکستانی ٹیم کے لیے بہت سود مند رہی۔

31 اگست 2010ء میں برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلی گراف کے ایک آرٹیکل میں یونس خان اور میچ فکسر مظہر مجید کے تعلقات کی خبریں شائع کی گئیں۔ یونس نے اس جھوٹی خبر پر اخبار انتظامیہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دی۔ انتظامیہ نے اس بے بنیاد خبر پر ان سے باضابطہ معافی مانگی۔ جس کے بعد یونس نے مقدمہ خارج کردیا۔

2011ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف ٹیسٹ سیریز کے دوسرے میچ میں انہیں ایمپائر کی غلطی کے باعث شاٹ لیگ پر کیچ آوٹ قرار دیا گیا اس وقت ان کا انفرادی سکور ۳۷ تھا۔ میچ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں انہوں نے خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "ایمپائرز بھی انسان ہیں اور ان سے غلطی ہوجانا بعید از امکان بالکل نہیں۔" انہوں نے امپائرنگ میں غلطیوں کی گنجائش ختم کرنے کے لیے UDRS سسٹم کو ہر ٹیسٹ میچ میں استعمال کرنے کی تجویز بھی دی۔

اگلے دو سال ان کی کارکردگی اتار چڑھاؤ کا شکار رہی لیکن سال 2014ء میں سری لنکا کے خلاف ہونے والی سیریز میں ان کی شاندار بیٹنگ فارم دیکھنے میں آئی۔ پہلے ٹیسٹ کی پہلی اننگز میں انہوں نے 177 رنز بنائے جس کی بدولت پاکستان 451 رنز کرنے میں کامیاب ہوا۔ اسی سیریز میں یونس خان نے 51 مرتبہ سو سے زائد رنز کی شراکت قائم کرنے کا نیا ریکارڈ بنایا۔ اس سے پہلے یہ اعزاز جاوید میانداد کے پاس تھا جنہوں نے پچاس مرتبہ ایسی شراکت قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ متحدہ عرب امارات میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے خلاف بھی ان کی کارکردگی قابلِ تعریف تھی

مستند بیٹسمین ہونے کے علاوہ وہ ایک بہت اچھے اور چست فیلڈر بھی ہیں۔ انہوں نے کئی غیر ملکی لیگز کے علاوہ برطانیہ میں کاؤنٹی کرکٹ بھی کھیلی ہے۔

رواں سال ہونے والے عالمی کپ کے ابتدائی دو میچز میں بھارت اور ویسٹ انڈیز کے خلاف ان کی بیٹنگ فارم بہت خراب رہی۔ جس پر انہیں میڈیا اور سابق کرکٹرز کی طرف سے بہت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی ٹورنامنٹ کے دوران انہوں نے ایک روزہ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔

پاکستان کرکٹ کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان کے ریکارڈز ان کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یونس نے پاکستان کے لیے 28 ٹیسٹ سنچریز بنائیں جو کسی بھی پاکستانی کرکٹر کی طرف سے سب سے زیادہ سنچریز ہیں۔ انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں پانچ دفعہ ڈبل سنچریز بنائیں۔ 21 فروری 2009ء میں انہوں نے کراچی میں سری لنکا کے خلاف 313 رنز کی اننگز کھیلی تھی۔ وہ تیسرے پاکستانی کھلاڑی ہیں جنہیں ٹرپل سنچری بنانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ بارہویں بین الاقوامی اور پہلے پاکستانی کھلاڑی ہیں جنہوں نے ٹیسٹ میچ کھیلنے والی تمام تر 9 ٹیموں کے خلاف سنچری بنائی ہے۔ اکتوبر 2014ء میں انہوں نے ٹیسٹ کرکٹ میں 8000 رنز مکمل کیے۔ یہ سنگ میل عبور کرنے والے وہ تیسرے پاکستانی اور مجموعی طور پر اٹھائیسویں بین الاقوامی کھلاڑی ہیں۔ غیر ملکی سرزمین پر وہ سب سے زیادہ (17 مرتبہ) سنچریاں بنانے اور ٹیسٹ میچز میں 100 کیچز پکڑنے والے پہلے پاکستانی کھلاڑی ہیں۔ یونس خان نے آسٹریلیا کے خلاف تین مسلسل سنچریز بنائی ہیں۔ ان سے پہلے یہ کارنامہ ہربرٹ سٹکلیف نامی کھلاڑی نے 25-1924ء میں سرانجام دیا تھا۔ سر ڈان بریڈ مین اور ہربرٹ سٹکلیف کے بعد وہ واحد کھلاڑی ہیں جن کی ٹیسٹ میچز کی چاروں اننگز میں 50 سے زائد رنز ایوریج ہے۔ ایک ٹیسٹ میچ کی دونوں اننگز میں سنچری بنانے والے وہ چھٹے پاکستانی کرکٹر ہیں۔ یہ کارنامہ بھی انہوں نے آسٹریلیا جیسی مضبوط ٹیم کے خلاف 2014ء میں سرانجام دیا۔

یونس خان فی الوقت صرف ٹیسٹ کرکٹ میں پاکستان کی نمائندگی کریں گے۔

پاکستانی ٹیم کے ان تجربہ کار، محنتی، جری، غیور اور مخلص کھلاڑیوں کی مثلث ایک روزہ کرکٹ کو الوداع کہہ چکی ہے۔ ان کی خدمات ان مٹ یادوں کی صورت میں کرکٹ شائقین کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہیں گی۔ ٹیم میں ان کی کمی بے حد محسوس کی جائے گی۔ بلاشبہ یہ مثلث فخر پاکستان ہے۔ ملکی آن اور وقار کو بڑھانے میں ان کا نمایاں کردار رہا ہے عوام کو کئی بار بے بہا خوشیاں دے کر اداس اور ملکی حالات و واقعات سے پریشان اور افسردہ چہروں پر مسکراہٹیں بکھیری ہیں۔ اپنی فٹنس کے حوالے سے یہ آج بھی کئی نوجوان کرکٹرز سے کہیں آگے ہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرتے ہوئے ہمیں ایک بار پھر ایک روزہ کرکٹ کے میدانوں میں جلوہ افروز نظر آئیں گے۔ کیونکہ ماہرین کرکٹ کے خیال میں ابھی ان کی بہت کرکٹ باقی ہے۔

سراب

راوی : شہبازملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 97

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جینس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر مارا پستول نکل کر دور جاگرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جاپہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس چمکیں بیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" سادی کو لے کر چیمبر...... "مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چِتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجکشن کردیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔

فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہے پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ''پاپا'' تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو نہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔۔۔۔۔ ہم چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گیا۔

اب آگے پڑھیں

سامنے موت تھی اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا جب موت کا سامنا ہوا تھا۔ بارہا میں اس مرحلے سے گزر چکا تھا اور عین موقع پر قدرت نے میری مدد کی کیونکہ وہ وقت نہیں آیا جسے میرے لیے لحۂ اجل کہا جا سکتا۔ مگر اس وقت سامنے کچھ نہیں تھا ایک بار میں جاتا تو خلا میں جاتا اور پھر اس وقت کچھ دیر کے لیے رکتا جب رسی کھنچ جاتی۔ اس کے بعد باقی کیلیں بھی نکل جاتیں اور پھر سینکڑوں فٹ تک کوئی روک نہیں تھی۔ میں آگے کی طرف جھک رہا تھا کہ اچانک کوئی چیز سر کے پیچھے سے دونوں طرف سے آئی اور میرے سینے سے لپٹ گئی اس کے ساتھ ہی میں واپس دیوار سے چپک گیا۔ میرا سانس جو ایک لمحے کو رک گیا تھا وہ پھر سے چل پڑا مگر مجھے یقین کرنے میں کچھ لمحے لگے تھے کہ ابھی لمحہ اجل نہیں آئی ہے۔ آتے آتے رہ گئی تھی۔ میرے سینے سے لپٹنے والی دو چیزیں دو عدد ٹانگیں تھیں اور یہ ٹانگیں زینی کی ثابت ہوئیں۔ وہ اپنی رسی کے ساتھ پھسلتی ہوئی مجھ تک آئی اور اس نے بروقت عقب سے ٹانگیں ڈال کر مجھے واپس کھینچ لیا۔

مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ باسو رسی سے جھول رہا تھا اور اوپر موجود چار کیلیں اپنی جگہ چھوڑ رہی تھیں۔ زینی نے مجھ سے کہا۔ ''شہباز رسی کھول دو۔''

پہلے میں سمجھا کہ وہ باسو کی رسی کاٹنے کی بات کر رہی ہے مگر فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ وہ میری رسی کی بات کر رہی تھی۔ میں نے تیزی سے خود کو رسی سے الگ کیا۔ اب صرف باسو کا وزن تھا۔ مگر وہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ رسی الگ کرنے کے بعد اب کیلوں سے میرا تعلق نہیں رہا تھا اور میں ان کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔ باسو اپنے کیلوں والے جوتے برف میں مار کر خود کو نیچے جانے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نکلتی کیلوں کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اسی دوران میں کرنل وہاں تک آ گیا۔ اس نے پہلی کیل کو ہتھوڑی سے ٹھونک کر واپس لگایا اور پھر اوپر سے ایک رسہ اور نیچے پھینکا۔ اسے باسو نے اپنی بیلٹ سے باندھ لیا۔ کرنل واپس نیچے کی طرف گیا تھا اور دوسری رسی کی مدد سے باسو کو جھلاتے ہوئے واپس راستے پر کھینچ لیا۔ یہ آسان کام تھا ورنہ صرف رسی سے باسو کو اوپر کھینچنا بہت مشکل کام تھا خود اس کے لیے اوپر چڑھنا آسان کام نہیں تھا۔

''اب تو جان چھوڑو۔'' میں نے شانوں پر سوار زینی سے کہا۔ اوشا اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں خود بھی اس سواری سے خفت محسوس کر رہا تھا۔

''یہ صلہ ہے جان بچانے کا۔'' وہ شوخی سے بولی اور رسی کے سہارے اوپر سرک گئی۔ میں کیلوں سے بندھی رسی کے سہارے واپس راستے پر آیا۔ باسو نیچے سے آرہا تھا۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے میرے پاس رکا مگر کچھ کہے یا تاثر دیے بغیر اوپر چلا گیا۔ وقت پہلے ہی کم تھا اور اس چکر میں تقریباً آدھا گھنٹا اور ضائع ہوا تھا اس لیے فوری طور پر سفر شروع کیا گیا تھا۔ جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے راستہ دشوار اور موسم خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔ گیارہ بجے ہم نے چوٹی تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب دوسری طرف اتر رہے تھے۔ درحقیقت ہم دوسری طرف نہیں اتر رہے تھے بلکہ ایک تنگ پل سے ہوتے ہوئے دوسری چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔ اصل

اترائی اس کے بعد تھی۔ تقریباً ایک کلومیٹر پر مشتمل یہ پل بعض ایسی جگہوں سے بھی گزرا جہاں اس کے دونوں طرف ہزاروں فٹ تک سیدھی گہرائی تھی۔

ان جگہوں سے بہت احتیاط سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ باقی پل آسان تھا۔ اس پر سفر کرتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان کے ساتھ لگ کر کسی خلا میں سفر کر رہے ہیں۔ یہاں سفر کے آغاز میں، میں نے اوشا کو ساتھ رکھا تھا اور مشکل مقامات پر اسے سہارا دیتا تھا۔ سفر کے شروع میں میری حالت اچھی نہیں تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتی گئی تھی۔ شاید میں اس ماحول اور بلندی کا عادی ہو رہا تھا۔ البتہ اوشا اب تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس کی رفتار کم تھی اور بعض جگہوں پر اسے مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخی اب کم ہو گئی تھی۔ لنچ ہم نے اسی پل پر کیا اور جب دوسری چوٹی کے پاس پہنچے تو تین بج رہے تھے اور ابھی ہمیں اس کی ڈھلان پر طویل سفر کرنا تھا۔ ڈیوڈ شا کی حالت میری توقع سے کم خراب تھی مگر اسے اچھا بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بیشتر سفر اس نے باسو اور مارک کے سہارے طے کیا تھا۔ آرام کے وقفوں میں وہ سب سے الگ اور خاموش بیٹھا رہتا تھا۔

لنچ کے دوران میں، میں نے کرنل سے کہا۔ ”اگر ہم رات سے پہلے دوسری طرف نہ اتر سکے تو ڈھلان پر رات گزارنے کے لیے ہمارے پاس کیا ہے؟“

”کچھ خاص نہیں ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”صرف ڈیوڈ شا کے لیے ایک خاص خیمہ اور سلیپنگ بیگ ہے۔ وہ یہاں کی سردی برداشت نہیں کر سکے گا۔“

”اور کیا ہم کر لیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم سب جوان اور فٹ ہیں۔“

”اوشا اس ماحول کی عادی نہیں ہے اور وہ عورت ہے۔“

”ڈیوڈ شا کا کہنا ہے کہ اس کے جسم میں موجود زہر اسے سردی سے محفوظ رکھے گا اور تم نے دیکھا کہ اس نے کسی بھی موقع پر کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا۔“

”ٹھیک ہے اس کا زہر اسے سردی سے بچائے مگر یہ پُرمشقت سفر تو اسے اپنے جسم کے بل بوتے پر ہی کرنا ہے۔“

کرنل نے میری طرف دیکھا۔ ”تم بیکار کی بحث کر رہے ہو۔ اب ہم نصف راستہ طے کر چکے ہیں۔ پرسوں صبح تک ہم وادی کے کنارے پہنچ جائیں گے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔ اب یہ بحث بیکار تھی اور مجھے سوچنا تھا کہ آگے کیا حالات ہوں گے اور مجھے خود کو اور اوشا کو کیسے محفوظ رکھنا تھا۔ مگر میں مجبور تھا۔ اول تو میرے پاس کوئی اختیار نہیں تھا اور نہ ہی اپنی یا اوشا کی حفاظت کے لیے کوئی ہتھیار تھا۔ پھر یہاں پیش آنے والے خطرات فطرت کے تھے اور اس سے مقابلہ مشکل تھا۔ اس معاملے میں میرا ذہن صاف تھا کہ اگر مجھے راستے میں کوئی موقع ملا تو میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں اپنی اور اوشا کی زندگی کے لیے ڈیوڈ شا یا اس کے ساتھیوں پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ دوبارہ سفر کے آغاز میں، میں نے موقع پا کر اوشا کو بھی یہ بات سمجھا دی تھی اور وہ خوش ہو گئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”کاش کہ تو پہلے یہ سوچ لیتا۔ جب وہ دیو گرا تھا تب موقع تھا۔“

”نہیں تب موقع نہیں تھا، تو نے دیکھا نہیں کسی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ جب میں اس کی مدد کو گیا تو کرنل آیا تھا۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے۔“ اوشا ہانپتے ہوئے بولی۔ ”یہ بہت خود غرض ہیں۔“

تین بجے کے بعد ہم نے بہت دور تک پھیلی ڈھلان پر اترنا شروع کر دیا تھا یہاں ہمیں زیادہ اترنا تھا اور نیچے موجود میدان میرے حساب سے سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھا۔ مگر یہاں مستقل برف جمی رہتی تھی کیونکہ یہ جگہ ہمالیہ کے عین وسط میں تھی۔ اس اترائی کے دوران میں ڈیوڈ شا ایک جگہ رک گیا تھا اور وہاں برف سے نکلی کسی چیز کا معائنہ کر رہا تھا۔ مارک اور سین بھی اس کے پاس موجود تھے۔ زینی ذرا فاصلے پر تھی۔ میں اور اوشا ان کے پاس پہنچے تو حسبِ عادت زینی نے لگاوٹ بھرے انداز میں پوچھا۔ ”کیسے ہو ہینڈسم؟“

”میں ٹھیک ہوں لیکن یہ کیا چکر ہے؟“

اس نے شانے اچکائے اور نارمل لہجے میں بولی۔ ”اسنو مین کی لاش ہے۔“

”اسنو مین؟“ میں حیران ہوا۔ ”تم اتنے نارمل انداز میں بتا رہی ہو۔“

”ہاں مجھے صرف مین سے دلچسپی ہے اسنو مین سے نہیں۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں اس کے واہیات جملے پر جز بز ہوتا ہوا ڈیوڈ شا کے پاس آیا تو برف سے جھانکتی اسنو مین کی لاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اسنو مین ہی تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار میں اس افسانوی مخلوق کو دیکھ رہا تھا جس کے بارے میں لاتعداد کہانیاں لکھی جا چکی تھیں اور جو بے شمار موویز کا

مرکزی کردار تھا۔ چہرہ انسانی ہی تھا مگر رخساروں تک پر
بالوں کی لہر آرہی تھی۔ کسی قدر پھیلی ناک اور تنگ ماتھا تھا۔
آنکھیں نیم وا تھیں اور ان میں انسانی آنکھوں جیسے ڈیلے
تھے۔ کسی قدر کھلے منہ سے انسانوں جیسے ہموار دانت جھلک
رہے تھے۔ مگر اس کا چہرہ عام انسانی چہرے سے کم سے کم
دوگنا بڑا تھا۔ راجا عمر دراز نے اپنے حوالے سے اس کے
بارے میں مجھے بتایا تھا اور مجھے اس کے کہے ایک ایک لفظ پر
یقین تھا مگر جو یقین اپنی آنکھ سے دیکھ کر ہوتا ہے وہ مجھے اس
وقت ہوا تھا۔ برف سے اسنو مین کا سر اور دائیں شانے کا
کچھ حصہ جھانک رہا تھا۔ سب اس کی تصویریں لے رہے
تھے۔ بلکہ مارک اور سین منصوبہ بنا رہے تھے کہ واپسی
میں اس کا سر کاٹ کر لے جائیں گے تاکہ ہمارے پاس
برفانی آدمی کے بارے میں حتمی ثبوت ہو۔ مگر میں کچھ اور...
سوچ رہا تھا۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

''تم نے سوچا کہ یہ یہاں موجود ہیں؟''

ڈیوڈ شا نے میری طرف دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے
کہ دوسرے اسنو مین کی موجودگی بھی ممکن ہے؟''

''بالکل جہاں ایک ہو سکتا ہے وہاں دوسرا کیوں نہیں
ہو سکتا؟''

ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''دوسرے میں نے اس درندے کے بارے میں
راجا عمر دراز سے تفصیل سے سنا ہے۔ ہماری خوش قسمتی کہ
ہمارا واسطہ ایک مردہ اسنو مین سے پڑا ہے۔ دوسری صورت
میں ہم بہت بڑی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔ بلکہ اب بھی پڑ
سکتے ہیں۔''

ڈیوڈ شا نے کرنل کی طرف دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ
شناس تھا اس نے سر ہلا کر ڈیوڈ شا کو اطمینان دلایا کہ وہ اس
معاملے میں بے فکر رہے۔ فوٹو سیشن کے بعد دوبارہ سفر
شروع ہوا اور مارک نے ایک سرخ جھنڈی پانچ فٹ لمبی
ایک اسٹک پر سنو مین کے پاس لگا دی تھی تاکہ نشانی
رہے۔ اس کا پورا امکان تھا کہ برف باری سے اسنو مین
چھپ جائے گا۔ ہم نے ڈھلان پر دوبارہ سفر شروع کیا۔
پانچ بجے کے بعد ڈھلان نسبتاً آسان ہو گئی تھی۔ اس لیے
اترنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی اس کے باوجود سات بجے جب
اندھیرا ہوا تو ہم ابھی ڈھلان پر ہی تھے اور آلٹی میٹر کے
مطابق بلندی چودہ ہزار فٹ تھی۔ ڈیوڈ شا نے فیصلہ کیا کہ سفر
جاری رہے گا جب تک ہم بارہ ہزار فٹ کی بلندی تک نہیں
پہنچ جاتے۔ اس سے اوپر رات گزارنا اس کے لیے مسئلہ بن
جاتا۔ پہاڑوں کے دوسری طرف آنے کے بعد کم سے کم
مجھے موسم اتنا سخت نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال ابھی تو رات کا
آغاز تھا اور شاید رات کو سردی کی شدت بڑھ جاتی۔

اوشا نے اسنو مین دیکھا تھا اور سہم گئی تھی۔ اس نے
سفر کے دوران میں مجھ سے کہا۔ ''ایک بار بابا نے اس کے
بارے میں بتایا تھا۔''

میں چونکا۔ ''اسے کیسے پتا چلا؟''

''بابا جڑی بوٹیوں کے لیے پہاڑوں میں بھی جاتا تھا
وہیں اسے ایک بار یہ برف والا آدمی ملا تھا۔ اس نے بابا پر
حملہ کیا مگر بابا بچ گیا تھا۔'' اوشا نے انکشاف کیا۔

''میں نے اس کے بارے میں سنا ہے لیکن دیکھا
آج پہلی بار ہے۔''

''اچھا ہے رے مرا ہوا تھا ورنہ سب کو پتا چل
جاتا۔'' اوشا نے کہا۔ تاریکی کی وجہ سے ایمرجنسی لائٹس نکال
لی گئی تھیں اور ان کی روشنی میں سفر ہو رہا تھا۔ سب کے پاس
ایک ایک لائٹ تھی۔ ہم اپنا راستہ خود دیکھ بھال کر اتر رہے
تھے۔ پورا دن سفر نے سب کا حشر کر دیا تھا اور دو پہاڑ سر کرنا
تو اچھے خاصے کوہ پیماؤں کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ مگر ہم
اس کے بعد بھی سفر کے لیے مجبور تھے۔ آٹھ بجے ہم تیرہ ہزار
فٹ کی بلندی سے نیچے آچکے تھے۔ تقریباً سب کا تھکن سے
برا حال تھا مگر اوشا کی حالت بری تھی۔ وہ میرا سہارا لے کر
چل رہی تھی اور اس کے قدم بہت مشکل سے اٹھ رہے تھے۔
میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

''اب ہمیں رک جانا چاہیے۔ سب تھک گئے ہیں۔''

خود ڈیوڈ شا کی حالت اچھی نہیں تھی اور وہ بہت مشکل
سے سانس لے رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے انکار
کیا۔ ''ابھی نہیں...... بارہ ہزار فٹ کے بعد......''

''اس کے لیے ہمیں ایک گھنٹا اور سفر کرنا پڑے گا۔''

''بارہ ہزار فٹ سے نیچے۔'' ڈیوڈ شا نے فیصلہ کن
لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ سب سفر کر رہے تھے مجبوراً
مجھے اور اوشا کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔ کرنل کے پاس گھڑی میں
آلٹی میٹر تھا اور اس سے بلندی کا پتا چل رہا تھا۔ باسواب
مستقل ڈیوڈ شا کو سہارا دیے ہوئے تھا اور کچھ دیر بعد اس
نے ڈیوڈ شا کو اپنے شانے پر اٹھا لیا۔ گویا وہ ٹھاٹ سے سفر
کرتا اور ہم اپنے پیروں کو گھسیٹتے۔ اوشا کی حالت ٹھیک نہیں
تھی اور وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ میں اسے مستقل سہارا دے رہا
تھا۔ پھر میں نے اس کا بیگ لے لیا۔ اس نے منع کیا مگر مجھے
لگ رہا تھا کہ اب اس میں سکت باقی نہیں رہی ہے۔ بیگ

اتارنے کے باوجود مجھے اوشا کو سہارا دینا پڑ رہا تھا۔ چلنے کے دوران میں اوشا ہانپتے ہوئے ڈیوڈ شا کو اپنی زبان کی منتخب گالیوں سے نواز رہی تھی جو خود تو باسو کے شانے پر سوار تھا اور ہمیں پیدل خوار کر رہا تھا۔ میں اوشا سے متفق تھا مگر میں نے کہا۔

''اپنی سانس مت ضائع کرو۔''

آٹھ بجے کے بعد ہم ایک سیدھی جگہ پہنچے جو سوا بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی۔ ڈیوڈ شا نے یہاں قیام کا فیصلہ کیا اور رکتے ہی جو جہاں تھا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سین کی حالت بھی اچھی نہیں تھی مگر اس کی مجبوری تھی کہ اسے کک کا کردار بھی ادا کرنا تھا۔ اس نے باورچی خانے والا خیمہ لگایا اور اندر کھانا بنانے کا سامان کرنے لگا۔ سب سے پہلے ہم نے انرجائل کے گلاس پیے اور ہماری جان میں جان آئی۔ اس کے بعد قواعد کے مطابق پہلے نوڈلز اور پھر چائے آئی۔ سوائے باسو کے سب کچن میں سمٹ آئے تھے۔ گرم ماحول نے بھی ہماری مدد کی۔ گرما گرم ڈنر نے خاصی حد تک آج کی تھکن کا مداوا کر دیا تھا۔ اس لیے جب سب اپنے اپنے خیموں اور سلیپنگ بیگز میں گھسے مطمئن تھے۔ اوشا نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے رے، میں تیرے پاس ہی رہوں گی۔''

''تمہارا خیمہ پاس ہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈر کس بات کا ہے؟''

''برف والے آدمی کا۔''

میں نے تسلی دی۔ ''وہ تو مرا ہوا تھا۔''

''ہاں پر اس جیسے اور بھی تو ہوں گے۔'' اس نے بھی وہی کہا جو میرے ذہن میں تھا۔ ''ایک یہاں ہے تو اور بھی یہیں ہوں گے۔''

''تم فکر مت کرو ان کے پاس ہتھیار ہیں اگر برفانی آدمی آیا تو یہ اس سے نمٹ سکتے ہیں۔''

''میں کسی کو نہیں جانتی رے بس تجھ پر بھروسا ہے۔''

''تو جانتی ہے میں نے بھی ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسا کیا ہے لیکن اصل بھروسا مجھے اللہ کی ذات پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے لیے بھی اور تیرے لیے بھی اسی پر بھروسا کرتا ہوں۔''

''میں اپنے بھگوان کو جانتی ہی نہیں ہوں رے۔'' اس نے حسرت سے کہا۔ ''تم اپنے بھگوان پر کیسے اتنا اعتماد کرتے ہو۔''

''یہ بھی اسی کی مہربانی ہے کہ اس نے اعتماد دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب سو جا صبح پھر سفر کرنا ہے اور پتا نہیں کتنی دور جانا ہے۔''

اوشا اپنے خیمے میں گھس گئی اس کا خیمہ میرے اور باسو کے خیمے کے درمیان میں تھا۔ سب سو گئے تھے لیکن باسو جاگ رہا تھا۔ وہ اپنے خیمے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ لازمی بات تھی کہ اس کی ڈیوٹی ڈیوڈ شا نے لگائی تھی کہ وہ سونے کی بجائے میری اور اوشا کی نگرانی کرے۔ میں اپنے سلیپنگ بیگ میں گھسا اور ایک منٹ میں سو گیا تھا۔ رات کسی وقت ایک طویل چیخ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ چیخ کی گونج اس وقت بھی باقی تھی اور یہ خاصی دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں یہ سوچتے ہوئے دوبارہ سو گیا کہ چیخ کسی جاندار کی ہے یا ہوا کی آواز ہے۔ پہاڑوں اور برفانی میدانوں میں ہوا بھی ایسی آوازیں نکالتی ہے جن پر انسانی یا جانوروں کی آوازوں کا گمان ہوتا ہے۔ صبح میری آنکھ خود بہ خود چھ کے آس پاس میں کھل گئی اور اس کی وجہ مثانے پر آنے والا دباؤ تھا۔ مگر جب میں باہر آیا تو کرنل اور باسو کو ہمارے کیمپ سے ذرا دور ایک جگہ کھڑے دیکھا۔ وہ جھک کر زمین کا معائنہ کر رہے تھے۔ سین جاگ کر کچن کی طرف جا رہا تھا اور میں نے ایک ٹیلے کا رخ کیا۔ وہاں سے واپس آیا تو کرنل اور باسو واپس آتے دکھائی دیے۔ مجھے لگا کہ کرنل کسی قدر فکر مند تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے موسم سے زیادہ سرد لہجے میں کہا اور ڈیوڈ شا کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ وہ اب تک خیمے سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ اوشا نکلی اور اسے بھی رفع حاجت کا مسئلہ تھا میں اسے ٹیلے تک لے گیا۔ واپسی میں ہم براہ راست کچن میں آئے کیونکہ اس وقت ایک وہی جگہ تھی جو گرم ہو سکتی تھی۔ اندر آ کر ہمیں سکون ملا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر اس سے کہیں زیادہ سردی تھی جتنی کہ ہمالیہ کی ڈھلانوں پر ہو سکتی تھی۔ وہاں اس وقت بارہ ہزار فٹ بلند کی جگہوں پر برف پگھل چکی ہوتی ہے اور گھاس پھونس، کائی اور چھوٹے پھولوں والے پودے بھی نکل آتے ہیں۔ یہاں سوائے برف کے کچھ نہیں تھا اور یہ سخت جمی ہوئی برف تھی۔ سین نے پہلے سب کو گرم کافی مہیا کی۔ ڈیوڈ شا کے لیے کافی اس کے خیمے میں بھجوا دی گئی تھی۔ وہ وہاں سے نہیں نکلا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کل کا سفر اس نے جیسے تیسے کر لیا تھا مگر اس کے بعد اس کی حالت خراب ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے وہ اب تک اپنے خیمے سے نہیں نکلا تھا۔ مگر جب ہم ناشتے سے فارغ ہو کر باہر آئے تو ڈیوڈ شا خیمے کے پاس اپنے بیگ پر بیٹھا ہوا شیو بنا رہا تھا۔ شیو وہ روایتی

انداز میں استرے سے مار رہا تھا اور ڈرائی شیو کر رہا تھا کیونکہ پانی یا جھاگ فوراً جم جاتا۔ میں اس کے پاس چلا آیا۔ وہ مجھے دیکھ کر خفیف سا مسکرایا اور خوشگوار لہجے میں بولا۔

"ہیلو شہباز کیسے ہو؟"

"فائن اور مجھے تم نے بھی حیران کیا ہے۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ تم آج صبح خیمے سے برآمد ہو سکو گے۔"

"یہ سفر میری زندگی کا مقصد ہے اور اپنے مقصد کے لیے آدمی اس سے بھی زیادہ مشکلات برداشت کرتا ہے۔" ڈیوڈ شا نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ "تم نے کل بہت بڑا خطرہ مول لیا۔"

"یہ میری عادت ہے۔ صرف باسو نہیں کوئی بھی شخص حد یہ کہ اگر تم بھی کسی مشکل سے دوچار ہو گے تو میں سوچے سمجھے بغیر تمہاری مدد کروں گا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "برف والے نے تمہیں ایسے ہی طلب نہیں کیا ہے۔ تم صاحب کردار آدمی ہو۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "کاش کہ میں ذرا بدمعاش ہوتا تو ان چکروں میں نہ پڑتا۔"

"یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم قسمت اور تقدیر جیسے الفاظ پر یقین رکھتے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "کون نہیں رکھتا ہے میں بھی رکھتا ہوں لیکن اپنے انداز میں۔"

میں ہنسا۔ "تم مغرب والوں کی فطرت میں سمجھنے لگا ہوں تم لوگ تقدیر بھی اپنے مطلب کی چاہتے ہو اور یہ بھول جاتے ہو کہ تقدیر بنانے والا کوئی اور ہے۔"

ڈیوڈ شا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ جب تک ہم نے سامان باندھا ڈیوڈ شا نے ناشتا کیا۔ اس دوران میں کرنل ایک بار پھر اسی طرف گیا تھا جہاں وہ اور باسو صبح کے وقت دکھائی دیے تھے۔ جب وہ واپس آیا تو میں ٹہلنے کے انداز میں اس طرف گیا۔ ابھی میں ذرا آگے گیا تھا کہ کرنل نے آواز دی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں بھاگ نہیں رہا۔" میں نے مڑے بغیر جواب دیا۔ "ذرا ٹہل رہا ہوں۔"

"ہمیں روانہ ہونا ہے۔"

"جب روانہ ہو گے تو مجھے اپنے ساتھ ہی پاؤ گے۔"

میں نے پیش قدمی جاری رکھی۔ کرنل نے پھر مجھے رکنے کو کہا اور جب میں نہیں رکا تو وہ میرے پیچھے آیا تھا۔ اس جگہ کے عین قریب پہنچ کر اس نے میرا راستہ روک لیا اور درشت لہجے میں بولا۔

"تم سنتے کیوں نہیں ہو؟"

"تم بیکار میں میرا پیچھا کر رہے ہو۔" میں نے رخ واپس کیمپ کی طرف کر لیا اور چلنے لگا۔ کرنل میرے ساتھ آ گیا۔

"تم ضدی آدمی ہو۔"

"میں نے دیکھ لیا جو تم مجھ سے چھپا رہے تھے۔"

کرنل بھی سمجھ گیا تھا کہ میں نے دیکھ لیا ہے تب ہی میں پلٹ کر آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "اگر تم کسی سے کہو گے تو اس سے صرف پینک پھیلے گی۔"

"یہ خطرے کی بات ہے برفانی آدمی ہمارے کیمپ تک چلا آیا ہے اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

"تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

"اس کے برف پر بنے پیروں کا رخ کیمپ کی طرف تھا اور وہ مخالف سمت سے آیا تھا پھر اسی سمت واپس چلا گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے اس نے رات کو حملہ کیوں نہیں کیا؟"

"کوئی جاگ رہا ہو گا اور وہ اکیلا بھی تھا اس نے خیموں سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔ جہاں تک میں نے اس مخلوق کے بارے میں سنا ہے کہ یہ عقل رکھتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ آس پاس ہی ہے؟"

"بالکل اور ہماری نگرانی کر رہا ہو گا۔ شاید کہیں گھات لگا کر بیٹھا ہو۔"

میری اس گفتگو کے نتیجے میں روانگی کے وقت کرنل اور باسو کے پاس شاٹ گن نظر آنے لگی تھیں۔ اوشا میرے پاس تھی اس نے مجھ سے پوچھا۔ "تو اس طرف کیوں گیا تھا رے؟"

"رات کیمپ کے پاس برفانی آدمی آیا تھا۔ وہاں اس کے پیروں کے نشان ہیں۔" میں نے بتایا تو اوشا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"میں نے تجھے کہا تھا نا؟"

"ہاں لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے اور کسی سے کہنا بھی مت۔"

اس کا منہ بن گیا۔ ''لے تیرے سوا کس سے بات کرتی ہوں رے۔''

''مطلب یہ کہ میرے ساتھ بھی کسی اور کے سامنے برفانی آدمی کا ذکر مت کرنا۔''

''نہیں کروں گی رے پر مجھے لگتا ہے یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔''

وہ درست کہہ رہی تھی اور کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ سب ہی جان گئے تھے کیونکہ زینی ڈیوڈ شا سے بات کر رہی تھی اور مارک وسین آپس میں محو گفتگو تھے اور سب کا انداز پُراسرار سا تھا۔ باسو اور کرنل خاموش تھے کیونکہ وہ پہلے سے جانتے تھے۔ جب ہم نے سفر شروع کیا تھا تو ہمارے پاس کوئی دو سو کلوگرام وزن تھا مگر اب اس میں کوئی پچیس کلوگرام کی کمی آئی تھی۔ استعمال ہونے والی اشیا خوراک، ایندھن اور آکسیجن کی بوتلیں تھیں۔ کم ہونے والا وزن سب میں برابر کی شرح سے تقسیم کر دیا گیا تھا اور سب ہی کسی قدر ہلکے ہوئے تھے۔ سامان میں اصل وزن خوراک کا ہی تھا جو سو کلوگرام سے اوپر بنتا تھا۔ سو کلوگرام دوسرا سامان تھا۔ اگر واپسی کا سفر ہمارے نصیب میں ہوتا تو ہم بہت ہلکے ہو کر واپس جاتے۔ ذاتی سامان اس دو سو کلوگرام کے علاوہ تھا۔ میں اور اوشا صرف اپنا سامان اٹھائے ہوئے تھے اس لیے میں نے اوشا کا بیگ بھی سنبھال لیا تھا۔

اب ہم ایک ٹیم کی صورت میں سفر کر رہے تھے۔ مگر آپس میں فاصلہ رکھا تھا کیونکہ یہاں کچھ پتا نہیں تھا کہ برف تلے کوئی خلا موجود ہو اور ہمارے وزن سے برف ٹوٹ جائے۔ سب آپس میں رسی سے منسلک تھے۔ آج صبح سے آسمان پر بادل تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے برف باری ہوگی یا ہلکا طوفان آئے گا۔ ہم سات بجے روانہ ہوئے تھے اور نو بجے جب پہلا وقفہ آیا تھا تو ہوا میں تیزی آگئی۔ آدھے گھنٹے بعد روانہ ہوئے تو آگے بڑھنے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا، ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔ بعض اوقات تو جوتے پھسلنے لگتے تھے۔ پہاڑوں سے اترنے کے بعد ہم نے جوتوں سے کیلوں والے تلے نکال دیے تھے۔ آگے بڑھنے کے لیے ہم نے چھڑیاں نکال لیں اور انہیں برف میں گاڑ کر ان کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ دس بجے طوفان میں شدت آگئی اور کرنل نے ڈیوڈ شا سے بات کی۔ وہ دور تھے اس لیے میں ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا حالانکہ ہواؤں کے شور کی وجہ سے وہ چلا کر بات کر رہے تھے مگر ڈیوڈ شا کے نفی میں ہلتے سر سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کرنل کی کسی بات سے انکار کر رہا تھا۔

کرنل نے شاید طوفان کے دوران میں سفر روکنے کو کہا تھا۔ اس نے درست کہا تھا کیونکہ اس طوفان میں سفر کرنا خود کو کسی خطرے سے دوچار کرنے کے مترادف تھا۔ ڈیوڈ شا یہ بات تسلیم نہیں کر رہا تھا وہ شاید بہر صورت آج کے دن ہی وادی کے کنارے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مجبوراً کرنل نے سفر جاری رکھا۔ مگر گیارہ بجے طوفان اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ اب چند گز سے آگے دیکھنا بھی محال تھا اور برف کے باریک ذرّے جسم کے کھلے حصوں پر چھروں کی طرح لگ رہے تھے اور یقیناً درجہ حرارت خاصا گر گیا تھا۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ہم برف میں خیمے لگا کر انہیں رسیوں اور کیلوں سے باندھ کر اندر گھس جائیں۔ کرنل نے پھر ڈیوڈ شا سے بات کی اور اس بار وہ ماننے پر مجبور ہو گیا۔ ایک جگہ ہم نے برف میں بڑی والی کیلیں لگا کر ان سے رسیاں باندھ کر خیمے لگائے اور انہیں رسیوں سے جکڑ دیا۔ خیموں کو آپس میں بھی جکڑا تھا اور سامان کے بیگز ان کے درمیان میں رکھ دیے تھے۔

جس جس کا خیمہ لگ رہا تھا وہ اندر گھستا جا رہا تھا۔ سب سے آخر میں کرنل اپنے خیمے میں گیا تھا۔ نہایت تند ہوا میں خیمے لگانا آسان کام نہیں تھا مگر کسی نہ کسی طرح اسے انجام دے لیا گیا۔ اوشا کا خیمہ میرے ساتھ تھا۔ اس کا تو اصرار تھا کہ وہ میرے خیمے میں ہی آجاتی ہے مگر کرنل نے کوئی خیمہ خالی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے توازن خراب ہوتا۔ مجبوراً اوشا کو اپنے خیمے میں جانا پڑا تھا۔ ہواؤں کا شور ایسا تھا کہ بالکل پاس سے بھی بات کرنے کے لیے حلق کے بل چلانا پڑ رہا تھا۔ درجہ حرارت بہت تیزی سے گرا تھا اور جب میں خیمے میں آیا تو مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ باہر کس قدر سردی ہو چکی تھی۔ خیمے کی زپ بند کرتے ہی جیسے سکون آگیا تھا۔ یہاں ہواؤں کا شور بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ سلیپنگ بیگز نہیں نکالے تھے۔ وہ بدستور بیگز میں تھے۔ اس وجہ سے خیمے میں جگہ تھی اور مجھے خیال آیا کہ اگر اوشا میرے خیمے میں آجاتی تو یہاں تنگی نہ ہوتی ایک خیمہ بھی کم لگانا پڑتا۔ بہرحال اب تو وہ اپنے خیمے میں جا چکی تھی۔

میں اس سے پہلے بھی ہمالیہ کے خطوں میں اس قسم کے طوفان دیکھ چکا تھا اور میرا اندازہ تھا کہ دو سے تین گھنٹے میں طوفان اپنی شدت سے گزر جائے گا اور تب ہم آگے سفر کر سکیں گے۔ مگر اس صورت میں آج کے دن وادی کے

کنارے تک رسائی ممکن نہیں ہوگی۔ اب تک اس کی جو مسافت سامنے آئی تھی اس میں دو پہاڑوں کو سر کرنے کے بعد کم سے کم ایک دن کا سفر تھا جب وادی کے کنارے تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میرے پاس وقت کا اندازہ کرنے کے لیے گھڑی تک نہیں تھی۔ ڈیوڈ شا اور کرنل نے مجھے کوئی غیر ضروری چیز فراہم نہیں کی تھی۔ اس لیے میں وقت کا اندازہ کیے بغیر بور ہوتا رہا۔ شاید ایک گھنٹا گزر گیا تھا اور باہر ہواؤں کی تندی اور شور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہوا کے زور سے خیمہ دب رہا تھا اور کبھی کبھی تھوڑا سا زمین سے اٹھ جاتا۔ اس لیے جب ایک طرف سے خیمہ دبا تو میں اسے ہوا کا دباؤ سمجھا تھا۔ پھر خیمہ ایک طرف سے تھوڑا سا بلند ہوا پھر واپس نیچے آگیا۔ اسی لمحے اوشا کی چیخ سنائی دی اور پھر ایک خوفناک غراہٹ کی آواز آئی۔ یہ غراہٹ ایسی تھی کہ طوفان کے شور پر بھی حاوی ہوگئی تھی اور اس میں ایسا خونخوار تاثر تھا کہ سننے والے کا خون خشک ہو جائے۔ میرا بھی ہوا تھا مگر دوسرے لمحے میں اپنی ہتھوڑی اٹھا کر زپ اتار رہا تھا ساتھ ہی میں نے چلا کر کرنل کو آواز دی۔

''کرنل اسنو مین۔''

زپ کھلتے ہی تند ہوا اور برف کے ذرات اندر گھس آئے۔ یخ ایسی آئی کہ میں لرز اٹھا مگر پھر کسی چیز کی پروا کیے بغیر باہر آیا۔ اوشا نے دوسری چیخ ماری اور یہ خیمے کی طرف سے نہیں آئی تھی بلکہ ذرا فاصلے سے آئی تھی۔ وہ پشت کے بل برف پر گری ہوئی تھی اور ایک سفید برف جیسا ہیولہ اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ چند سیکنڈ میں اوشا سمیت سو فٹ سے زیادہ فاصلے پر جا چکا تھا۔ اوشا کا خیمہ پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ یہ برفانی آدمی کی جناتی قوت کا کمال تھا کہ اس نے مضبوط ترین میٹریل سے بنا خیمہ کاغذ کی طرح پھاڑ دیا تھا۔ میں بھاگا تھا مگر خیمے کی کھل جانے والی رسی سے الجھ کر گرا اور میرا سر برف میں لگی فولادی کیل کے سرے سے ٹکرایا۔ میرے سر پر موٹی فرو لا ہڈ تھا مگر بدقسمتی سے گرتے ہوئے ہوا کے زور سے ہڈ پیچھے ہوا اور میری کنپٹی کیل کے سرے سے ٹکرائی اور ایک جھماکے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ اسی اندھیرے میں مجھے اوشا کی ایک چیخ اور سنائی دی اور اس بار آواز جیسے بہت دور سے آئی تھی۔ ہواؤں کے شور کے پس منظر میں اور لوگوں کے چلانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں مگر وہ واضح نہیں تھیں۔

میں ذہن پر چھانے والی تاریکی سے لڑ رہا تھا۔ مجھے اوشا کی فکر تھی کہ اسے برفانی آدمی لے گیا تھا۔ مگر جب تک میں خود پر قابو پاتا بہت دیر ہو چکی تھی۔ مجھے ہوش آیا تو میں برف پر دراز تھا اور سین میری ناک سے امونیا کی بوتل لگائے ہوئے تھا اسی کی بو مجھے ہوش میں لائی تھی۔ سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور جہاں کیل کا چپٹا سرا لگا تھا۔ وہاں سے کھال پھٹ گئی تھی اور نکلنے والا خون فوراً ہی جم گیا تھا۔ میں اٹھنے لگا تو سین نے مجھے روکا مگر میں اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں ڈیوڈ شا، زینی اور مارک بھی تھے۔ البتہ کرنل اور باسو نظر نہیں آرہے تھے۔ میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''اوشا کہاں ہے؟''

زینی آگے آئی اور نرمی سے بولی۔ ''کرنل اور باسو اس کے پیچھے گئے ہیں وہ اسے لے آئیں گے۔''

ڈیوڈ شا کا چہرہ ساکت تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ڈیوڈ شا اگر اوشا نہ آئی تو اس کا حساب تمہیں دینا ہوگا۔''

''وہ ابھی نہیں ملے گی۔'' اس نے سکون سے کہا۔ ''لیکن وہ زندہ رہے گی اور تمہیں واپس ملے گی۔''

''اب تم اپنے ستاروں کا علم جھاڑنے کی کوشش کر رہے ہو۔'' میں نے اپنی کن پٹی دباتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں نے حقیقت بیان کی ہے دوسرے جو ہو چکا ہے میں اور تم اسے لوٹا نہیں سکتے۔''

''میں تقدیر کے لکھے کی بات نہیں کر رہا میں تم سے حساب لینے کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف انگلی دراز کی۔ ''میری اس مشکل کی براہ راست ذمے داری تم پر آتی ہے ڈیوڈ شا۔''

''پلیز اس وقت تمہیں ریلیکس اور ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔'' زینی نے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے میرے خیمے میں لے آئی۔ میں نے مزاحمت نہیں کی تھی۔ اوشا کے یوں جانے سے مجھے دھچکا لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اس کی حفاظت کروں گا اور وہ مجھ پر اعتماد کرتی تھی مگر میں اسے نہیں بچا سکا۔ زینی مجھ سے کچھ کہہ رہی تھی اور اس نے میرے کن پٹی کے زخم کو صاف کر کے پٹی بھی چپکا دی تھی۔ باہر سے آوازیں تو نہیں آرہی تھیں مگر مجھے لگا کہ شاید کرنل اور باسو واپس آئے ہیں۔ میں باہر نکلا تو وہ یخ آگئے تھے اور ڈیوڈ شا کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی کہ اوشا نہیں ملے گی۔ اگرچہ مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں تھا کیونکہ اوشا کو ان کے ساتھ نہ پا کر میرا دل

ڈوبنے سا لگا تھا اور مجھے لگا کہ اب وہ کبھی نہیں ملے گی۔ کرنل آگے آیا اور اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"سوری شہباز ہم ان کے پیچھے گئے مگر برفانی آدمی کہیں زیادہ تیز ثابت ہوا، وہ اوشا کو لے کر ایک گھاٹی میں اتر گیا جب کہ ہمیں اس میں اترنے کا راستہ بھی نہیں ملا تھا۔"

"کتنا تیز رفتار ہو سکتا ہے وہ ایک انسان جتنا ہی بھاگ سکتا ہے اور پھر اس نے اوشا کو بھی اٹھا رکھا ہوگا۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "تم لوگوں نے کوشش ہی نہیں کی اسے بچانے کی۔"

کرنل خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ندامت تھی اور باسو حسب معمول بے تاثر کھڑا تھا۔ طوفان کی شدت میں کمی آئی تھی یا پھر میرے اندر جاری طوفان کے سامنے اس کی شدت کم لگنے لگی تھی۔ کرنل نے کچھ دیر بعد کہا۔ "سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسے موسم میں حملہ کرے گا۔"

"اس کے لیے یہ موسم معمول کی بات ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "اب تم اس غلط فہمی کا شکار مت ہو جانا کہ وہ ایک لے گیا ہے تو دوبارہ نہیں آئے گا۔ وہ اپنے علاقے میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا ہے۔ وہ پھر آئے گا اور بار بار آئے گا جب تک سب کو نہیں لے جائے گا یا مار نہیں ڈالے گا۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" کرنل نے بدلے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے اس درندے کے بارے میں سنا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "جیسا سنا تھا اس سے زیادہ خطرناک پایا۔ کیسے وہ سب کے درمیان سے اوشا کو لے گیا اور تم لوگ منہ دیکھتے رہ گئے۔"

کرنل جھنجلا گیا۔ "میں نے کہا نا وہ بہت تیز رفتار تھا۔ ہم اس کا پیچھا نہیں کر سکے۔"

رفتہ رفتہ میرا ابال کم ہونے لگا اور میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر تم لوگوں کے پاس نگرانی کے آلات ہیں تو نکال لو ورنہ دیر ہو گئی تو وہ پھر کسی اور کو لے جائے گا یا مار ڈالے گا۔"

زینی ویسے تو بہت بے خوف اور تیز عورت تھی۔ ڈیوڈ شا کی بیٹی کو ایسی ہی ہونا چاہیے تھا مگر اس وقت وہ بھی خوفزدہ نظر آئی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "وہ اوشا کو اور دوسروں کو کیوں لے جائے گا؟"

"بھوک۔" میں نے جواب دیا۔ "انسان کی طرح اسے بھی پیٹ کی اور جنس کی بھوک ہوتی ہے۔ انسان سے وہ دونوں طرح کی بھوک مٹا سکتا ہے۔"

زینی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "تت..... تمہارا مطلب ہے کہ وہ انسان سے تعلق بھی قائم کر سکتا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میں ایسے فرد کو جانتا ہوں جو برفانی آدمی کی مادہ کی زیادتی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی قسمت تھی کہ وہ مرنے سے بچ گیا ورنہ مادہ نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

میری بات نے زینی کو مزید سہما دیا تھا۔ سچی بات تھی کہ ڈیوڈ شا کی پیش گوئی کے باوجود مجھے اوشا کی زندگی کا یقین نہیں رہا تھا۔ راجا عمر دراز نے رانا ویاس کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی اس کے مطابق اسے لے جانے والی برفانی آدمی کی مادہ تھی اور وہ رانا ویاس سے اظہار عشق کرتی رہی جب تک کہ وہ مرنے والا نہیں ہو گیا۔ پھر برف والے نے اس کی جان اس درندے سے چھڑائی تھی۔ مگر اوشا عورت تھی اور اگر اسے لے جانے والی مادہ تھی تو اس کے لیے اوشا بیکار تھی وہ اسے مار دیتی۔ ہاں اسے لے جانے والا نر ہوتا تو اوشا کی زندگی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کی بچت بہت بڑی قیمت کے بدلے ہوتی اور شاید اسی وجہ سے اس کی جان بچ جاتی کہ اس کے پاس آنے والا برفانی آدمی اس کے زہر کا شکار بن جاتا اور اس کا بھی امکان تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اوشا کو مار دیتا۔ اس کی جناتی قوت کے سامنے دھان پان سی اوشا کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایک ہاتھ مار کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

سوچیں میرے دماغ میں آوارہ بگولوں کی طرح گھوم رہی تھیں اور ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں دوسری طرف متوجہ ہوا۔ کرنل اور مارک ایک بیگ سے کچھ آلات نکال رہے تھے اور انہیں خیموں کے آس پاس لگا رہے تھے۔ پھر ان آلات کو تاروں سے آپس میں ملانے لگے۔ ان ڈش انٹینا نما آلات کو ایک چھوٹے سے کمپیوٹر سے منسلک کیا جا رہا تھا۔ ڈشوں کا رخ چاروں طرف کر رہے تھے۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس آیا اور اس سے مطالبہ کیا۔ "مجھے کوئی ہتھیار چاہیے۔"

"تمہیں یا پارٹی کے کسی دوسرے فرد کو ہتھیار نہیں مل سکتا ہے۔ یہاں ہتھیار رکھنے کا مجاز صرف میں، کرنل اور باسو ہیں۔"

"تم لوگ کسی کی حفاظت کی ذمے داری نہیں لے سکتے ہو مگر اسے ہتھیاروں سے محروم ضرور رکھ سکتے ہو۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "اگر میرے پاس کوئی ہتھیار

ہوتا تو وہ درندہ اتنی آسانی سے اوشا کو نہیں لے جاسکتا تھا۔''

ڈیوڈ شا کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔''شہباز تم زیادہ فکر مند ہورہے ہو۔ تمہارے جیسے آدمی کے عزائم بلند ہونے چاہییں ایک معمولی لڑکی کے لیے فکر مند ہونا تمہیں زیب نہیں دیتا ہے۔''

''میں معمولی آدمی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔''غالباً تم مجھے اپنے لیول کا آدمی سمجھ رہے ہو۔ اس بحث کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ مجھے ہتھیار دے رہے ہو یا نہیں؟''

''میں نے بتایا نا کہ یہاں ہتھیار صرف تین آدمی رکھ سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کا لہجہ حتمی تھا۔ میں اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پانے لگا۔ یہاں برف زار میں اور برفانی آدمی کے خطرے کے ہوتے ہوئے ہمارا آپس میں لڑنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اوزاروں میں سے چن کر سب سے بڑی کلہاڑی نما ہتھوڑی نکال لی۔ بہ وقت ضرورت یہ بھی اچھا ہتھیار ثابت ہوسکتا تھا۔ طوفان کی شدت میں کمی آئی تھی مگر ہوا میں اڑتے باریک برف کے ذرات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور ان کی وجہ سے حد نگاہ سو فٹ بھی نہیں تھی۔ میں کرنل کے پاس آیا تو لیپ ٹاپ نما آلہ لے کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر سرخ دھبے حرکت کررہے تھے۔ کرنل نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔''سرخ دھبے زندہ انسان ہیں۔''

میں نے گنا ان کی تعداد سات تھی۔ کرنل وسط میں تھا اور باقی سب بکھر گئے تھے۔ ڈیوڈ شا اور زینی ایک جگہ تھے۔ مارک، سین اور باسو تین الگ الگ سمتوں میں تھے۔ میں نے پوچھا۔''فرض کرو برفانی آدمی دوبارہ آتا ہے تو یہ آلات اسے کتنی دور سے دیکھ لیں گے؟''

''ویسے ان کی رینج ایک کلومیٹر ہے مگر اس موسم میں رینج گھٹ گئی ہوگی۔ ویسے اسنو مین کا جسم بڑا ہوتا ہے اس لیے وہ انفراریڈ کا بڑا منبع ہوگا اسے خاصی دور سے نظر آجانا چاہیے۔''

ڈیوڈ شا اپنے خیمے میں چلا گیا تھا کیونکہ باہر سردی کی شدت بہت زیادہ تھی۔ مارک نے برانڈی کی بوتل نکال لی تھی۔ وہ، سین، کرنل اور باسو اس بوتل سے باری باری چسکی لگا کر خود کو گرم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ میرے پاس خود کو گرم رکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ چائے کافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ زینی بھی آگئی اس نے برانڈی لی اور مجھ سے کہا۔''تم نہیں پیتے ہو لیکن اس موسم میں یہ ضروری ہے۔''

''موسم ایسا ہو یا ویسا میں نے کبھی اس حرام شے کے استعمال کے بارے میں نہیں سوچا۔''

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔''تم لوگ عجیب ہو۔ کچھ ایسے پیتے ہیں کہ کیا مغرب والے پیتے ہوں گے اور کچھ ایسے بھاگتے ہیں کہ جیسے یہ موت ہو۔''

''دوسروں کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے شانے اچکائے۔''ہاں میں کسی صورت استعمال نہیں کرسکتا۔ تمہیں یاد ہے کہ جب تم نے رنی شاہ کے اکسانے پر مجھے شراب پینے پر مجبور کیا تھا تو کیا ہوا تھا؟''

وہ ہنسی۔''ہاں تم نے اس کے لباس اور قالین کا ستیاناس کردیا تھا۔''

''حالانکہ اس وقت میں تمہارے قابو میں تھا اور اگر پی لیتا تو مجھے اُمید ہے کہ یہ میرا گناہ شمار نہیں ہوتا اس کے باوجود اوپر والے نے مجھے محفوظ رکھا۔''

زینی کا منہ بن گیا۔''تم اوپر والے کو کچھ زیادہ ہی یاد نہیں کرتے ہو۔''

''اسے یاد کرتے رہنا چاہیے تاکہ جب وہ یاد کرے تو ہمارے پاس پیش کرنے کے لیے کچھ تو ہو۔''

''میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''تب تم اپنے باپ سے بہتر ہو جو یقین رکھتا ہے مگر اس میں اپنا مفاد بھی شامل کردیتا ہے۔''

ہم دونوں کرنل کے پاس ہی کھڑے تھے اور میں کبھی کبھی اسکرین پر نظر ڈال لیتا تھا۔ ایک بار میں نے اسکرین کی طرف دیکھا تو مجھے شبہ ہوا۔ دھبوں کی تعداد زیادہ لگ رہی تھی اور اسی لمحے کرنل نے بھی یہ بات محسوس کرلی۔ اس نے جلدی سے گنا۔''ایک دو تین...... چھ سات آٹھ۔''

''برفانی آدمی۔'' میں نے کہا اور زینی تیزی سے ڈیوڈ شا کی طرف لپکی۔ اسے اپنے باپ کی فکر نہیں تھی بلکہ وہ اس کے پاس موجود ہتھیار لینے گئی تھی۔ میں اور کرنل اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ برفانی آدمی کہاں ہوسکتا تھا۔ ایک دھبے کے بارے میں مجھے شبہ ہوا اور میں نے کہا۔''یہ ہوسکتا ہے۔''

وہ دھبا ذرا بڑا تھا کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔''یہ باسو ہے۔''

مگر اسی لمحے بڑا دھبا ایک چھوٹے دھبے پر جھپٹا اور طوفان کے شور میں ایک چیخ سنائی دی۔ میں اور کرنل اچھل پڑے تھے۔ کرنل نے اسکرین سے سمت کا اندازہ کیا،

مارک۔'' اس نے کہا اور اس طرف دوڑا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اڑتے ذرات منظر میں حائل تھے اور جب تک ہم اس جگہ پہنچے جہاں مارک تھا تو وہاں برف پر سوائے خون کی سرخی کے اور کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ میں اور کرنل کچھ آگے اور گئے مگر جیسے ہی عقب میں کیمپ نظروں سے اوجھل ہوا میں رک گیا۔ ''بس اس سے آگے جانا مناسب نہیں ہے۔''

''وہ مارک کو لے گیا ہے۔''

''میرا خیال ہے ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ تم نے برف پر خون کا دھبا دیکھا۔ وہ اتنا بڑا ہے جو کسی جان لیوا زخم سے خون نکلنے کی صورت میں بن سکتا ہے۔ ہمیں واپس جانا ہوگا ایسا نہ ہو برفانی آدمی دوسری سمت سے حملہ کر دے یا اس کے اور ساتھی بھی ہوں۔''

بات کرنل کی سمجھ میں آگئی اور ہم واپس آئے۔ سب کو پتا چل گیا تھا کہ مارک بھی غائب ہو گیا ہے۔ وہ سب اب کیمپ میں تھے۔ کرنل نے جب خون کے بڑے سے دھبے کے بارے میں بتایا تو سب کے چہرے ستے گئے تھے۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔ ''یہ دوسرا خون ہے جو تمہاری اس احمقانہ مہم جوئی کی نذر ہوا ہے۔''

مگر وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوا۔ اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''یہ ایسی مہم ہے کہ اس کے لیے میں اپنی اور زینی سمیت سب کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔''

''تم شوق سے خود کو قربان کرو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں قربانی کا بکرا نہیں ہوں۔''

''پلیز۔'' زینی نے ایک بار پھر ثالث کا کردار ادا کیا۔ ''یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے۔''

''ہاں یہ وقت اس درندے کے ہاتھوں ایک ایک کر کے مارے جانے کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات اپنے باپ کو سمجھاؤ جو مجھے اسلحہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ مارک بھی اسی وجہ سے مارا گیا کہ وہ مسلح نہیں تھا۔''

کرنل نے جھک کر ڈیوڈ شا کے کان میں کچھ کہا اور اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ کرنل نے اسلحہ پالیسی کے حوالے سے بات کی تھی مگر ڈیوڈ شا اپنے مؤقف پر قائم تھا۔ اس دوران میں طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی اور دس منٹ میں ہوا کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ اڑتے ذرات کی مقدار میں کمی آنے سے حد نگاہ بڑھنے لگی اور پھر اوپر بادل چھٹے تو سورج نکل آیا اور درجۂ حرارت بھی بہتر ہونے لگا۔ پاسو اور سین مل کر خیمے پیک کرنے لگے۔ یہ آسانی سے کھل اور بند ہو جانے والے خیمے تھے۔ جب تک خیمے پیک ہوئے موسم تقریباً صاف ہو گیا تھا۔ ہوا نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی اور سردی بھی کم ہو گئی تھی۔ برسنے والی برف نے مارک کے خون اور برفانی آدمی کے پیروں کے نشان مٹا دیے تھے۔ ہم یہ اندازہ کرنے سے بھی قاصر تھے کہ وہ اسے کہاں لے گیا تھا۔ لیکن میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ اگر ہمیں مارنا مقصود تھا تو برفانی آدمی کو مارک کی لاش لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اسے خوراک کے طور پر استعمال کرنے کے لیے لے گیا تھا۔ یہی بات زینی کے ذہن میں بھی اور اس نے مجھ سے کہا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا وہ آدم خور بھی ہے۔''

''ان معنوں میں نہیں، اصل میں اسے یہاں کھانے کے لیے جو بھی ملے گا وہ کھائے گا۔''

''میرے خدا۔'' اس نے کانپ کر کہا۔ ''یہ اتنا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔''

''اس نے ثابت کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ مارک کی کمی سے سب کے حصے میں آنے والا سامان بڑھ گیا تھا۔ اب مجھے بھی سامان اٹھانا تھا جب کہ میرے پاس اپنے ساتھ اوشا کا سامان بھی تھا۔ کمی صرف ایک خیمے کی ہوئی تھی جسے برفانی آدمی نے پھاڑ کر بیکار کر دیا تھا۔ میں نے اوشا کے بیگ سے اس کا سامان نکال کر اپنے بیگ میں ٹھونسا کیونکہ اب مجھے پشت پر سامان کا بیگ اٹھانا تھا اور اپنا بیگ میں ہاتھ میں رکھتا۔ تیار ہو کر ہم یوں روانہ ہوئے کہ سب سے آگے کرنل اور ڈیوڈ شا تھے۔ ان کے پیچھے میں اور زینی تھے جب کہ سب سے پیچھے پاسو اور سین تھے۔ ہر ٹولی کے درمیان دس گز کا فاصلہ تھا اور ہم رسیوں سے منسلک تھے۔ طوفان کے بعد جگہ جگہ برف کے ڈھیر لگ گئے تھے اور آنے والے دنوں میں گرمی سردی کے امتزاج سے پگھل اور جم کر یہ ڈھیر ہموار ہو جاتے۔ مگر فی الحال ان کی وجہ سے سفر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ زینی ذرا دیر میں ہانپنے لگی تھی۔

''نرم برف پر چلنا اتنا دشوار ہوتا ہے مجھے آج پتا چلا۔''

''اگر ہم اسکیز استعمال کریں تو بہت تیزی سے سفر کر سکتے ہیں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پاپا اسکیز استعمال نہیں کر سکتے۔''

''پاپا کچھ بھی نہیں کر سکتے مگر یہاں ضرور آ سکتے ہیں۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اگر ضدی آدمی طاقتور بھی ہو تو دوسروں کو کس قدر مشکل میں ڈال سکتا ہے۔''

میری بات پر وہ کسی قدر جھنجلا گئی۔ ''اب بس بھی کرو۔ کب تک اسی بات کو لے کر بیٹھے رہو گے۔''

''میرے لیے سب سے اہم بات یہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب بھی میری باری آئی ڈیوڈ شا کو حساب دینا ہوگا۔''

ہر پارٹی میں کم سے کم ایک مسلح فرد موجود تھا۔ زینی کے پاس شاٹ گن تھی۔ پیچھے باسو کے پاس اس کی جسامت کے لحاظ سے بنائی گئی شاٹ گن تھی۔ جب کہ کرنل اور ڈیوڈ شا دونوں ہی مسلح تھے۔ میں نے غور کیا تو برفانی آدمی نے دونوں بار غیر مسلح افراد کو نشانہ بنایا تھا۔ اوشا بے شک خیمے میں تھی مگر مارک کھلی جگہ اس کا نشانہ بنا تھا۔ اگر وہ چن کر غیر مسلح افراد کو نشانہ بنا رہا تھا تو اس سے دو باتیں سامنے آتی تھیں۔ ایک یہ کہ وہ اسلحے اور اس کی ہلاکت خیزی سے واقف تھا اور دوسرے میں اور سین اب خطرے میں تھے۔ ہم دونوں ہی غیر مسلح تھے۔ سانس لینے کے لیے ہوا اب بھاری تھی اور میرا اندازہ تھا کہ ہم خاصے نیچے آ گئے تھے۔ شاید یہ جگہ سطح سمندر سے دس ہزار کے آس پاس بلند تھی۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور طوفان نے کئی گھنٹے ضائع کیے تھے۔ آج کے دن وادی کے کنارے پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ دو بجے ہم ایک جگہ رکے تھے۔ سین نے ہلکا پھلکا لنچ کرایا۔ اس نے صبح ہی سینڈوچز بنا لیے تھے جو اس وقت ہلکے گرم کر کے سب کو دیے تھے۔ میں کرنل کے پاس بیٹھا ہوا تھا میں نے اسے اپنے خدشے سے آگاہ کیا۔

''اسنو مین اب تک غیر مسلح افراد کو لے کر گیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے اگلی باری میری یا سین کی ہو سکتی ہے۔''

''تم فکر مت کرو اس بار ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔'' اس نے کہا۔

''مجھے فکر ہے کیونکہ تم لوگوں کی تمام تر ہوشیاری صرف اپنے لیے ہے۔ جب باسو چٹان سے لٹک رہا تھا تب بھی تم لوگ اطمینان سے تماشا دیکھ رہے تھے۔''

''تم ڈیوڈ شا کے لیے اہم ترین فرد ہو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس لیے تمہاری ہر قیمت پر حفاظت کی جائے گی۔''

''دیکھتے ہیں۔'' میں نے خشک لہجے میں کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ ہم نے ایک کھلی جگہ پڑاؤ ڈالا تھا جہاں سے چاروں طرف دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ غالباً برفانی آدمی کی وجہ سے یہاں رکے تھے مگر وہ بھول رہے تھے کہ اس کے پاس بہت وقت تھا۔ یہاں ہمیں رات بھی گزارنی تھی اور جب ہم وادی کے کنارے پہنچتے تو وہاں برفانی آدمی کے لیے گھات لگانے کی بے شمار جگہیں تھیں۔ وہ احمق نہیں تھا کہ دن دہاڑے اور کھلی جگہ ہم پر حملہ آور ہوتا۔ اس نے دونوں بار جتنی ہوشیاری سے وار کیا تھا اس سے اس کی حیوانی ذہانت واضح تھی۔ وہ دور سے ہماری نگرانی کر رہا تھا جہاں اسے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے مگر وہ ہمیں دیکھ سکتا تھا اور وہ ہمارا تعاقب کرتا جب تک کہ اسے اگلا وار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لنچ اور آرام کے وقفے کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔

چھ بجے کے قریب ہم کھلی جگہ سے ہٹ کر ایک کسی قدر تنگ درّے میں سفر کرنے لگے اور اب بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ مگر یہ درہ کسی پہاڑی چوٹی تک نہیں جاتا تھا بلکہ شاید کسی سطح مرتفع کو درمیان سے کاٹتا تھا۔ اس کے دونوں طرف اونچی ہوتی ڈھلانیں تھیں اور مجھے یاد آیا کہ شاید وہ گڑھے تھے جن میں سے ایک میں راجا عمر دراز وادی سے واپسی کے وقت گر گیا تھا اور برفانی آدمی کی مادہ اسے نکالنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میں نے کرنل اور دوسروں کو یہاں موجود گڑھوں سے خبردار کیا۔ کرنل نے پوچھا۔ ''کیسے گڑھے ہو سکتے ہیں۔''

''کہنا مشکل ہے کہ کس قسم کے گڑھے ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ گلیشیر بھی نہیں ہے جس کے نیچے دراڑیں ہوں۔''

کرنل نے سب کو ہوشیار رہنے کو کہا اور ہم آگے بڑھے۔ اب تاریکی قریب تھی کیونکہ سورج پہاڑوں کے پیچھے جا چکا تھا اور کچھ دیر بعد ہمیں لائٹس آن کرنا پڑتیں۔ گڑھوں سے بچنے کے لیے سب آگے بڑھنے سے پہلے چھڑی سے برف دبا کر دیکھتے تھے اور پھر اس پر قدم رکھتے۔ میں بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے ایک جگہ کو چھڑی سے دبایا تو وہ مجھے ٹھوس لگی تھی مگر جب میں نے قدم رکھا تو ایک لمحے کو ڈگمگایا۔ مجھے لگا کہ نیچے سے برف سرک رہی ہے مگر جب وہ اپنی جگہ قائم رہی تو میں سمجھا کہ میرا پاؤں پھسلا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مگر چند گز آگے گیا ہوں گا کہ عقب سے برف ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی زینی کو جھٹکا لگا اور وہ تیزی سے پیچھے گئی۔ اس کے بعد رسی سے میں بندھا ہوا تھا میں نے زمین میں پاؤں جمانے کی کوشش کی مگر میں بھی زور میں پیچھے گیا اور زمین پر گرا تھا۔ رسی بہت زور سے کھنچ رہی تھی۔ نیم تاریکی کی وجہ سے

میں دیکھنے سے قاصر تھا کہ کیا ہوا تھا۔ پھر جس طرح میں تیزی سے کھنچا تھا اسی طرح اچانک رک گیا۔ رسی کا زور ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے پیچھے دیکھا تو مجھے اسی جگہ برف میں گڑھا دکھائی دیا جہاں میرا پاؤں ڈگمگایا تھا۔ زینی گڑھے کے بالکل کنارے تھی اور اگر وہ بھی گڑھے میں جاتی تو میں بھی کھنچا چلا جاتا۔ باسو اور سین غائب تھے اور اس کا مطلب تھا کہ وہی گڑھے میں گرے تھے اور رسی سے منسلک ہونے کی وجہ سے ہم بھی کھنچے چلے گئے تھے۔ مگر گڑھا بڑا نہیں تھا اس لیے ہم رک گئے۔ ڈیوڈ شا اور کرنل بھی کھنچے آئے تھے مگر انہیں زیادہ رگڑنا نہیں پڑا تھا۔ ڈیوڈ شا تو گرا بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لباس سے ٹارچ نکالی اور رسی الگ کرتا ہوا گڑھے کی طرف بڑھا۔ زینی نے بھی اٹھ کر خود کو رسی سے الگ کر لیا تھا۔ بہ ظاہر وہ ٹھیک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اس کی خیریت نہیں پوچھی۔ میں نے گڑھے میں روشنی ڈالی تو سین باسو کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ تہہ میں دراز تھا۔ میں نے آواز دی۔

"سب ٹھیک ہے؟"

"نہیں۔" سین نے اوپر دیکھا۔ "میرا خیال ہے اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

یہ نہایت تشویشناک خبر تھی۔ باسو ہماری ٹیم کا سب سے مضبوط رکن تھا اور وہی ناکارہ ہو گیا تھا۔ میں نے روشنی میں گڑھے کا جائزہ لیا۔ یہ تقریباً بارہ فٹ گہرا تھا اور اس کا قطر آٹھ نو فٹ تھا۔ تہہ ٹوٹنے سے اندر اچھی خاصی برف گری تھی اور گڑھا خاصی حد تک بھر گیا تھا۔ میں نے کناروں پر کلہاڑی ماری تو برف مزید اندر گری تھی۔ سین چلایا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟ برف اندر گر رہی ہے۔"

"فکر مت کرو تم برف میں دفن نہیں ہو گے۔" میں نے کہا اور برف گرانے کا عمل جاری رکھا۔ میں اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ ٹوٹنے والی کوئی تہہ باقی نہ رہے جس پر کسی کا قدم جائے اور وہ بھی اندر گر جائے۔ دوسری جتنی برف اندر جائے گی گڑھے کی تہہ اتنی ہی اونچی ہو گی۔ زینی میرا ساتھ دینے لگی اور ذرا سی دیر میں کناروں پر جمی ساری برف نیچے گر گئی۔ سین سمجھ گیا اور گرنے والی برف کو ایک طرف جمع کر رہا تھا۔ وہ اس کی مدد سے تہہ کی بلندی بڑھا کر باہر آنے میں آسانی پیدا کر رہا تھا۔ کرنل اور ڈیوڈ شا آ گئے تھے۔ کرنل نیچے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ "تمہارا، زینی اور ڈیوڈ شا کا باہر رہنا ضروری ہے اب تم برفانی آدمی سے بچ ہوشیار ہو جاؤ۔ اگر وہ پاس موجود ہے تو یہ حملہ کرنے کا بہترین وقت ہو گا۔"

یہ سنتے ہی وہ باسو کو بھول گئے اور انہوں نے اپنے ہتھیار اور لائٹس نکال لی تھیں۔ میں نے کنارے پر کیل ٹھونکی اور اس سے رسی باندھ کر نیچے اترا۔ ڈھائی تین فٹ تک برف جمع ہونے سے تہہ کی اونچائی بڑھ گئی تھی اور مجھے خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ نیچے اتر کر میں نے باسو کو دیکھا جو ٹارچ کی روشنی میں اپنی بائیں پنڈلی کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیچے گرتے ہوئے اس کا بایاں پاؤں تہہ میں موجود پتھر سے ٹکرایا تھا۔ موٹی اونی پتلون کا وسطی حصہ نوکیلا ہو رہا تھا۔ اس کی ایک ہڈی لازمی ٹوٹ گئی تھی اور کھال پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔ مگر آفرین ہے جو اس کے چہرے پر درد کی معمولی سی بھی جھلک ہو۔ وہ یوں اپنی پنڈلی کا معائنہ کر رہا تھا جیسے یہ کسی دوسرے کی پنڈلی ہو۔ میں نے کہا۔ "مجھے اپنا پاؤں دیکھنے دو۔"

اس نے سر ہلایا اور گھٹنے سے پکڑ کر پاؤں میری طرف کیا۔ میری نظر ایک لمحے کے لیے اس کی مہیب شاٹ گن کی طرف گئی تھی مگر اس نے اس حالت میں بھی اسے نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے اس کا بھاری بھر کم جوتا پکڑا اور زور لگا کر اس کا پاؤں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے پر چند لمحے کے لیے کرب کی لہر آئی تھی۔ مگر اس کا پاؤں سیدھا ہو گیا اور پتلون میں جو سرا سا ابھرا ہوا تھا وہ غائب ہو گیا۔ پھر میں نے اس کی پتلون اوپر کی گھٹنے تک بہ مشکل چڑھائی۔ نیچے اس نے موزہ بھی پہنا ہوا تھا اور وہ خون آلود ہو رہا تھا۔ موزہ نہ صرف بہت موٹا بلکہ تنگ بھی تھا اور اس نے پنڈلی کو جکڑ لیا تھا۔ میں نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ مجھے لگا کہ ٹوٹ جانے والی ہڈی اپنی جگہ بیٹھ گئی تھی۔ اب اس میں نوک محسوس نہیں ہو رہی تھی اور میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ موزہ ہٹا کر زخم کا معائنہ کرنے کی کوشش کروں۔ اس کوشش میں ہڈی دوبارہ اپنی جگہ سے ہٹ سکتی تھی۔ یہ سمپل فریکچر تھا۔ اگر وہ کسی آبادی میں ہوتا اور اسے میڈیکل ایڈ مل جاتی تو وہ چند ہفتوں میں ٹھیک ہو جاتا۔ مگر اس برفانی ویرانے میں یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ تقریباً جان لیوا حادثہ تھا۔ میں نے کرنل سے کہا۔

"میڈیکل پیک دو۔"

میڈیکل پیک میں طبی امداد کا سامان تھا۔ کرنل نے اپنے بیگ سے پیک نکال کر نیچے اچھال دیا۔ میں نے اسے کیچ کیا اور کھول کر اندر سے پہلے زخموں کو صاف کرنے والا ٹنکچر نکالا۔ یہ جمتا نہیں ہے اور سخت ترین سردی میں بھی مائع حالت میں رہتا ہے۔ میں نے اسے موزے کے اوپر سے

ہی زخم والی جگہ ڈالا۔ باسو کا جسم ایک لمحے کو اینٹھا۔ اسے خاصی تکلیف ہوئی تھی مگر اب انفکشن کا خطرہ کم ہوگیا تھا۔ پھر میں نے فریکچر کے لیے مخصوص رکھی ہوئی لکڑیاں نکال کر انہیں باسو کے پاؤں پر رکھا اور پھر مضبوط پٹی سے باندھ دیا۔ میں نے پٹی سخت رکھی تھی مگر اتنی نہیں کہ نیچے کا دوران خون رک جائے۔ پھر انفکشن اور درد سے بچانے والے کیپسول اسے انرجی ڈرنک کے ساتھ دیئے۔ اس دوران میں سین باہر چلا گیا تھا اور مزید برف آس پاس سے جمع کر کے نیچے گرا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک زینہ سا بنا لیا۔ میں نے رسی باسو کی بیلٹ سے منسلک کی اور اوپر جا کر اسے سین اور کرنل کی مدد سے باہر کھینچ لیا۔ ڈیوڈ شا ایک طرف خاموش کھڑا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ باسو کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ باسو کام کا آدمی تھا مگر اب اس کی حیثیت ایک لنگڑے ہو جانے والے گھوڑے سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ ماحول تقریباً تاریک ہوگیا تھا مگر آسمان صاف تھا اور اگر چاند نکل آتا تو کسی قدر روشنی ہو جاتی۔

''باسو کو اب سہارا دینا ہوگا۔'' میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

''کیسے؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''اس کا وزن بہت زیادہ ہے اور پھر ہمارے پاس سامان بھی ہے۔''

''ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

کرنل ہماری طرف آیا اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں اب سلیج بنا لینی چاہیے۔''

میں چونکا۔ ''تمہارے پاس سلیج ہے؟''

''ہاں لیکن اسے تیار کرنا پڑے گا۔''

''سلیج ہے تو پہلے کیوں نہیں استعمال کی؟''

''پہلے ضرورت نہیں تھی اور پہاڑوں پر اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسے ایسے ہی علاقوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔'' کرنل نے کہا اور ایک بیگ سے سلیج کا سامان نکالنے لگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی سلیج تھی جس کے بیشتر حصے فائبر گلاس سے بنے ہوئے تھے۔ کرنل تیزی اور مہارت سے کام کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے روشنیاں نکال کر یوں چاروں طرف رخ کر کے لگا دی تھیں کہ سو گز تک کوئی بھی چیز حرکت کرتی تو فوراً نظر میں آ جاتی۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔

''ہم یہیں نہ قیام کر لیں؟''

''آگے ایک جگہ ہے جہاں ہمیں غار ملیں گے وہاں ہم زیادہ محفوظ ہوں گے۔''

مجھے یاد آیا کہ راجا عمر دراز اور پھر ڈیوڈ شا نے بھی کبھی ان غاروں کا ذکر کیا تھا۔ غار ہمیں برفانی آدمی سے محفوظ رکھ سکتے تھے مگر ساتھ ہی کسی حملے کی صورت میں ہم محصور ہو کر رہ جاتے۔ بہر حال باخبری میں محصور ہونا بے خبری میں مارے جانے سے بہتر تھا اس لیے میں نے ڈیوڈ شا سے اتفاق کیا۔ باسو اس حالت میں اپنی شاٹ گن سنبھالے پہرے داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میں ڈیوڈ شا کے پاس سے ہٹا تو زینی اس کے پاس پہنچ گئی اور دونوں باپ بیٹی میں سرگوشیوں میں کسی موضوع پر تبادلہ خیال ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ زینی کسی بات پر اصرار کر رہی تھی اور ڈیوڈ شا انکار کر رہا تھا۔ اس سفر کے دوران میں بہت کم مواقع ایسے آئے جب ڈیوڈ شا نے کسی معاملے پر کسی دوسرے سے اتفاق کیا ہو ورنہ وہ زیادہ تر اپنی ہی چلاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہا تھا۔ زینی مایوسی کے عالم میں اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ کچھ برہم ہو رہی تھی۔ سلیج تیار ہوئی تو باسو اور اضافی سامان جو باسو نے ہی اٹھایا ہوا تھا اس پر بار کیا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''اسے کھینچے گا کون؟''

''تم اور سین۔'' کرنل نے کہا۔

''میں کس خوشی میں یہ ذمے داری اٹھاؤں؟'' میں نے کہا۔

''دوسری صورت میں ہم مجبور ہوں گے کہ باسو کو یہیں چھوڑ جائیں۔'' کرنل کی بجائے ڈیوڈ شا نے جواب دیا۔ ''اب اسے لے جانے کی دوسری صورت نہیں ہے۔''

''میں ہتھیار استعمال کرنے کے لیے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔'' کرنل نے کہا۔ ''ویسے تم فکر مت کرو زیادہ بوجھ نہیں ہوگا کیونکہ باسو عقب سے اپنی چھڑی برف میں گاڑ کر دھکا دے گا۔''

باسو کو یہاں چھوڑ جانا خلاف انسانیت ہوتا اور ڈیوڈ شا نے چالاکی سے بندوق میرے شانے پر رکھ دی تھی۔ مجبوراً میں نے سین کے ساتھ مل کر سلیج کھینچنا شروع کی۔ اس میں آگے کی طرف دو چوڑی بیلٹس تھیں جنہیں کمر اور شانوں سے باندھ کر سلیج کھینچنا آسان ہو جاتا۔ ہمارے ہاتھ آزاد تھے۔ کرنل نے ٹھیک کہا تھا کہ بوجھ اتنا زیادہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور باسو بھی عقب سے برف میں چھڑی گاڑ کر سلیج کو آگے دھکیلنے میں مدد دے رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ عقب کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ سلیج پر اس طرح لائٹس نصب کی گئی تھیں کہ اس کے پیچھے اور دائیں بائیں دور تک روشنی ہو رہی تھی۔

سامنے کی طرف ہم نے روشنیاں کی ہوئی تھیں۔سب سے آگے کرنل تھا اور اس کے پیچھے زیبی اور ڈیوڈ شا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔میں نے دیکھا کہ اب کرنل کے شانے پر ایک خودکار رائفل بھی نظر آرہی تھی۔رات کے آٹھ بج چکے تھے اور کم سے کم میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے آج صبح ناشتا کیا اور دوپہر میں برائے نام ہی کھایا تھا۔میں نے ڈیوڈ شا سے پوچھا۔

''غار یہاں سے کتنی مسافت پر ہیں؟''

''تقریباً دو میل کی دوری پر ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔''اس رفتار سے ہم آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔''

آدھے گھنٹے میں تو نہیں لیکن پون گھنٹے میں ہم ان غاروں کے پاس تھے۔یہ چھوٹی ٹیلے نما پہاڑیاں تھیں جن کے اندرونی حصے کھوکھلے ہونے سے غار وجود میں آئے تھے۔ان کے دہانے اوپر سے آتی برف میں چھپ جاتے تھے اور گرمیوں میں جب برف کم ہوتی تو یہ نمایاں ہو جاتے تھے۔ایک لائن میں تین دہانے تھے۔ڈیوڈ شا نے وسطی غار کی طرف اشارہ کیا۔''یہ سب سے بہترین اور بڑا ہے۔''

کرنل نے اندر جانے سے پہلے تینوں کا معائنہ کرنے کا کہا۔اس نے فاسفورس اسٹک ہلا کر اندر پھینکیں تو ان کی روشنی سے غار اندر سے روشن ہو گئے اور کرنل مختلف زاویوں سے جھانک کر ان کا اندر سے معائنہ کرنے لگا۔چند منٹ بعد اس نے کلیئر کا سگنل دیا۔وہ پہلے وسطی غار کے اندر گیا۔پھر اس نے ڈیوڈ شا کو بلایا۔زیبی، میں، سین اور باسو باہر تھے۔آسمان پر کہیں آخری تاریخوں کا چاند تھا۔اس کی روشنی منعکس ہو کر یہاں تک آرہی تھی اور ماحول کو اس قابل بنا رہی تھی کہ ہم آس پاس دیکھ سکتے تھے۔میں دیکھ رہا تھا کہ دہانہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ سلیج اس میں باسو سمیت جا سکے۔باسو کو الگ سے لے جانا پڑتا یا وہ خود جاتا۔کرنل اور ڈیوڈ شا کو اندر گئے ہوئے تقریباً پانچ منٹ ہو گئے تھے اور اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی۔جب دس منٹ ہو گئے تو میں نے اندر جھانکا۔

''کیا ہمیں باہر رکھنے کا ارادہ ہے۔''

کرنل اور ڈیوڈ شا کسی چیز پر جھکے ہوئے تھے۔کرنل نے مڑ کر مجھ سے کہا۔''ہوشیار رہو یہ جگہ برفانی آدمی کے استعمال میں ہے۔''

یہ سن کر میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔میں نے بدمزگی سے کہا۔''تم اب بتا رہے ہو۔'' پھر پلٹ کر زیبی اور سین کو ہوشیار کیا۔''ہر طرف دیکھو، کرنل کہہ رہا ہے یہ غار برفانی آدمی کا مسکن ہیں۔''

ایک منٹ بعد کرنل باہر آیا۔اس نے کہا۔''اندر ایک گڑھے میں مارک کی لاش ہے۔''

یہ سن کر سب کو دھچکا لگا تھا۔میں نے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ برفانی آدمی بھی آس پاس ہے۔''

''بالکل۔'' کرنل نے کہا۔''اس نے لاش گڑھے میں تقریباً چھپا دی تھی مگر مارک کی جیکٹ کا ایک کونا باہر رہ گیا اور وہ مجھے نظر آگئی۔میں نے برف ہٹائی تو نیچے مارک کی لاش موجود تھی۔''

''اب ہم کیا کریں گے؟'' زیبی نے پوچھا۔

''ہم یہیں قیام کریں گے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔

''اور برفانی آدمی اس کا کیا ہوگا؟''

''اس کا علاج بھی ہمارے پاس ہے۔'' ڈیوڈ شا نے حکم دیا۔''سامان اندر لے چلو۔''

''اندر ایک لاش موجود ہے۔'' میں نے پھر کہا تو ڈیوڈ شا نے سرد نظروں سے مجھے دیکھا۔

''وہ لاش ہمیں کچھ نہیں کہے گی۔''

باہر کھڑے رہنا بھی عقل مندی نہیں تھی مجبوراً ہم اندر آئے۔غار کے اندر بھی برف تھی اور یہاں جا بہ جا برفانی آدمی کے قدموں کے نشانات تھے۔برف سخت تھی مگر ان پر وزنی پاؤں آنے سے برف دب گئی تھی اور یوں اس پر نشان آگئے۔یہ نشان عام آدمی کے پاؤں جیسے مگر اس سے تقریباً دوگنے بڑے تھے۔مارک کی لاش گڑھے میں موجود تھی۔کرنل نے اس کے اوپری جسم سے برف ہٹا دی تھی برفانی آدمی نے اس کی گردن ادھیڑ دی تھی اور اس کی پوری جیکٹ سامنے سے سرخ ہو رہی تھی۔یہ منظر خاصا خوفناک تھا۔زیبی نے منہ پھیر لیا۔میں نے کرنل سے کہا۔''اسے دفنا دینا ہی بہتر ہوگا۔''

''نہیں پہلے برفانی آدمی کا سدباب کرو۔'' ڈیوڈ شا نے حکم دیا تو کرنل سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔اس دوران میں سین ایک کونے میں اپنا کچن لگا رہا تھا۔ہم کو پیش آنے والے حادثات اور اموات اپنی جگہ اور پیٹ کی بھوک اپنی جگہ تھی۔اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر برفانی آدمی مارک کی لاش یہاں لایا تھا تو اسے اوشا کو بھی یہیں لانا چاہیے تھا۔میں باہر جانے لگا تو ڈیوڈ شا نے مجھے روک دیا۔''ابھی باہر مت جاؤ۔''

''مجھے اوشا کو دیکھنا ہے ممکن ہے برفانی آدمی اسے

بھی یہاں لایا ہو۔"

"اوشا یہاں نہیں ہے اور اس وقت تمہارا باہر جانا تمہارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔"

"مجھے برفانی آدمی کی پروا نہیں ہے۔"

"نہیں خطرہ دوسرا ہے باہر کرنل بارودی سرنگیں لگا رہا ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

"بارودی سرنگیں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہم خاص طور سے اس خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ بارودی سرنگیں بھی لائے ہیں۔ اسی لیے میں تمہیں باہر جانے سے روک رہا ہوں۔"

"اوکے میں باہر نہیں جاؤں گا لیکن دہانے تک تو جا سکتا ہوں۔"

"ہاں دہانے تک خطرہ نہیں ہے۔"

میں دہانے تک آیا اور باہر جھانکا تو کرنل ٹیلے کی دیوار کے ساتھ سرنگ نصب کر رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے آواز نکال کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور اشارے سے پوچھا کہ کیا ہے؟ میں نے اسے جوابی اشارے سے پاس آنے کو کہا۔ اس نے انگلی سے ایک منٹ رکنے کو کہا اور پھر اپنا کام مکمل کر کے محتاط انداز میں دہانے تک آیا۔ "کیا ہے تم باہر کیوں آئے ہو؟"

"مجھے اوشا کا خیال آیا ہے شاید برفانی آدمی اسے بھی یہاں لایا ہو۔"

"میں نے پہلے ہی باقی دو غاروں کا جائزہ لے لیا وہ خالی ہیں اور وہاں کوئی نشان بھی نہیں ہے۔"

"ممکن ہے آس پاس کوئی اور بھی جگہ ہو۔"

"اس وقت باہر کا جائزہ لینا بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔" کرنل نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ اگر برفانی آدمی باہر موجود نہیں بھی ہے تو جلد وہ یہاں آنے والا ہے۔"

میرا بھی یہی خیال تھا کہ جلد یا بدیر برفانی آدمی اس غار کا رخ کرے گا۔ مگر اوشا کا خیال مجھے بے چین کر رہا تھا۔ اگرچہ کرنل کہہ رہا تھا کہ اس نے باقی دو غار دیکھ لیے ہیں مگر میں اس کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف وہ باہر بارودی سرنگیں لگا چکا تھا اور ان کی پوزیشن سے صرف وہی واقف تھا۔ اگر میں باہر جاتا اور میرا قدم کسی سرنگ پر آ جاتا تو میں مارا جاتا۔ کرنل نے جان بوجھ کر غار کے دہانے پر برف جمع کی تھی جیسے اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کا مقصد برفانی آدمی کو ہوشیار کرنا تھا

تاکہ وہ براہِ راست اندر آنے کی کوشش نہ کرے اور باہر گھومے پھرے۔ اس طرح کسی بارودی سرنگ پر اس کا پاؤں آنے کا امکان زیادہ ہو جاتا۔ میں نے سوچا اور فی الحال خاموش ہو گیا۔ دہانے کی نگرانی باسو کر رہا تھا اور اس کے ساتھ کرنل اور زینی بھی مسلح اور چوکنا تھے۔ سین اپنے کام میں مصروف تھا۔ ڈیوڈ شا آرام کر رہا تھا۔ میں نے کرنل سے پوچھا۔

"ان بارودی سرنگوں کی قوت کیا ہے؟"

"ایک انسان کو بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے اس کا نصف دھڑ اڑ جائے گا مگر ایک برفانی آدمی بھی بچ نہیں سکے گا۔ اگر وہ نہ مرے تب بھی حرکت کے قابل نہیں رہے گا۔"

سین نے ٹیونا مچھلی کے ٹن نکالے اور برنر پر اس کے قتلے فرائی کرنے لگا اس کے ساتھ خشک نان تھے جو راشن میں ساتھ آئے تھے۔ گرم کرنے پر یہ نرم اور تازہ ہو جاتے تھے۔ وہ قتلے فرائی کر کے باری باری سب کو گرم نان کے ساتھ پیش کر رہا تھا۔ کھانے کے بعد گرم کافی تھی۔ آج پہلے نوڈلز اور چائے نہیں بنی تھی کیونکہ ہم ہنگامی حالات میں تھے اس لیے پیٹ بھرنا اولین ترجیح تھی۔ ایک عدد لاش کی موجودگی میں بھی کسی نے کھانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ غار بند ہونے کی وجہ سے اندر سے اتنا سرد نہیں تھا اور جب یہاں ہم آئے اور پھر برنر بھی جلا تو اندر کا درجہ حرارت مزید بہتر ہوا تھا۔ یہاں ہمیں خیموں کی ضرورت نہیں تھی اس لیے نیچے ترپال بچھا کر اسی پر سلیپنگ بیگز بچھا لیے گئے تھے۔ کیونکہ پہریداری میں میرا کوئی حصہ نہیں تھا اس لیے میں کافی پینے ہی اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ آج سفر نہ صرف طویل بہ اعصاب شکن رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے پیش آنے والے حادثات نے طبیعت کو بدمزہ کر دیا تھا۔ میں سو جانا چاہتا تھا تاکہ جب کوئی ہنگامی موقع آئے تو میں تازہ دم ہوں۔

میرے علاوہ ڈیوڈ شا، سین اور زینی بھی سونے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ کرنل اور باسو پہرہ دے رہے تھے۔ باسو کو تکلیف تھی مگر اسے بروقت طبی مدد اور آرام ملنے سے اس کی حالت خراب نہیں ہوئی تھی خاص طور سے اس کا پاؤں اچھی حالت میں تھا۔ اس کے باوجود آنے والا وقت اس کے لیے آسان نہیں ہوتا کیونکہ جب ہم وادی کے پاس پہنچ جاتے تو اسے اوپر ہی چھوڑنا پڑتا اور اس ویرانے میں اکیلے ہونے کا مطلب ہے کہ جلد یا بدیر فرشتۂ اجل آ سکتا ہے۔ اکیلا آدمی یہاں خود کو نہیں بچا سکتا ہے خاص طور سے جب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو۔ تھکن کے باوجود پریشان کن سوچیں

اور اوشا کا خیال نیند کی راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ مگر نیند وہ چیز ہے جو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ میں تو پھر بھی گرم آرام دہ سلیپنگ بیگ میں لیٹا ہوا تھا اس لیے بالآخر سو ہی گیا۔ نیند کے باوجود میرا ذہن چوکنا تھا۔ اس لیے جب کسی نے مجھے ذرا سا ہلایا تو میں فوراً جاگ گیا۔

"کون ہے؟"

"شش۔" زینی نے سہمی آواز میں کہا۔ "وہ باہر آگیا ہے۔"

وضاحت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہوشیار ہوا اور سلیپنگ بیگ سے نکل آیا۔ میں نے اپنا واحد ہتھیار یعنی کلہاڑی نما ہتھوڑی سنبھال لی تھی۔ تقریباً ڈھائی پونے تین کلوگرام وزنی اس کلہاڑی کی ضرب اگر صحیح جگہ لگ جاتی تو ایک ہی ضرب میں برفانی آدمی جیسے درندے کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ باسو دہانے پر مستعد تھا اور کرنل دہانے کے آخری حصے میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے زینی کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "باہر سے غراہٹ سنائی دی تھی مگر اس کے بعد سے کچھ نہیں ہوا۔ سامنے کوئی نظر بھی نہیں آرہا ہے۔"

"جب غراہٹ سنائی دی تو تم جاگ رہی تھیں؟"

"ہاں اتفاق سے میری آنکھ کھلی ہوئی تھی۔"

"کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"پانچ منٹ ہوگئے ہیں۔"

"وقت کیا ہوا ہے؟"

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "سوا پانچ بج رہے ہیں۔"

یعنی صبح ہونے والی تھی۔ میں دہانے کی سمت آیا اور دیوار سے لگ کر باہر کی طرف دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ اگر چاند نکلا ہوا تھا تب بھی آسمان پر بادل ہونے سے روشنی نہیں تھی۔ کرنل بالکل ساکت تھا۔ اس کی ساری توجہ باہر کی طرف تھی اس کے باوجود وہ اس پتھر کو آتے نہیں دیکھ سکا جو باہر سے پھینکا گیا تھا اور وہ دہانے کی دیوار سے ٹکرا کر کرنل پر گرا۔ اس نے بے ساختہ فائر کیا تھا۔ یہ سنگل فائر تھا اس کے باوجود محدود جگہ رائفل کی آواز بم کی طرح گونجی تھی۔ کرنل فائر کرتے ہی تیزی سے پیچھے سرکا اور اسی وجہ سے دوسرے پتھر سے بچ گیا جو نہ ہٹنے کی صورت کرنل کے سر پر لگتا۔ یہ تین چار سیر وزنی پتھر تھا جو اس کا سر توڑنے کے لیے کافی تھا۔ پیچھے ہوتے ہوئے کرنل نے دو فائر اور کیے اور کھڑا ہوا تو اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس نے اپنا شانہ تھامتے ہوئے کراہ کر کہا۔

"لعنت ہو۔"

پتھر دیوار سے ٹکرا کر لگا تھا اس لیے چوٹ بہت زیادہ نہیں تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ کرنل تکلیف محسوس کر رہا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ پوری طرح حرکت نہیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بازو ہلا کر چیک کرتا جب اسے محسوس ہوا کہ ہڈی کو نقصان نہیں ہوا تو وہ کچھ مطمئن ہوا۔ میں برفانی آدمی کی ہوشیاری پر حیران تھا۔ ڈیوڈ شا اور کرنل اس کے لیے بارودی سرنگیں لائے تھے مگر وہ ان کے چکر میں نہیں آیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے ٹھکانے پر قبضہ ہوگیا ہے تو اس نے پاس آنے کی بجائے دور سے سنگ باری شروع کر دی۔ ایک تو باہر تاریکی تھی اور دوسرا یہ کہ وہ کہیں چھپا ہوا تھا اس لیے کرنل پتھر مارتے اور آتے نہیں دیکھ سکا۔ برفانی آدمی کا نشانہ بھی اچھا تھا کرنل کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بال بال بچا تھا۔ میں نے کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟ کوئی اس سنگ باری میں باہر جا سکتا ہے۔ رات کی تاریکی میں اس کے نشانے کا یہ عالم ہے تو دن میں تو وہ پن پوائنٹ پتھر مارے گا۔"

"دوسروں کو ڈی مورلائز مت کرو۔" کرنل غرایا۔ "جلد وہ اس طرف آئے گا۔"

"فرض کرو وہ اس وقت باہر موجود تھا جب تم بارودی سرنگیں لگا رہے تھے تو اس نے دیکھ لیا ہوگا اور اس کی ذہانت تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ اس جگہ قدم رکھے گا۔"

"وہ جانور ہے کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو انسان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔"

برفانی آدمی نے دو ہی پتھر اچھالے تھے اور اس کے بعد خاموش ہوگیا تھا۔ ہماری طرف سے ردعمل نے اسے بتا دیا تھا کہ یہاں مسلح افراد موجود ہیں اور اب وہ غار کے پاس بھی نہ پھٹکتا مگر میں یہ بات کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کرنل اسے اپنی مزید حوصلہ شکنی سمجھتا اور فی الحال وہی ڈیوڈ شا کا سپہ سالار تھا اور اسے ہی یہ جنگ لڑنا تھی۔ سین بھی جاگ گیا تھا اور ڈیوڈ شا اگر جاگ گیا تھا تب بھی اس نے سلیپنگ بیگ سے باہر آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں نے سین سے کافی تیار کرنے کو کہا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "تمہیں اس وقت بھی کافی کی پڑی ہے۔ جب کہ باہر وہ درندہ گھوم رہا ہے۔"

"اگر میرے کافی نہ پینے سے وہ واپس چلا جاتا ہے تو

تم بے شک کافی مت بناؤ۔‘‘

’’یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘ ڈیوڈ شا نے سلیپنگ بیگ سے سر نکالا۔ ’’کافی تیار کرو ہمیں ٹھنڈے دماغ سے اس درندے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔‘‘

’’بارودی سرنگوں کی بجائے تم لوگ کریکر لے آتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ اس قسم کے درندے دھماکوں اور شعلوں سے ڈرتے ہیں۔ فائر کریکر زیادہ اچھے ہوتے۔‘‘

’’افسوس کہ تم سے مشورہ نہیں کیا۔‘‘ کرنل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

’’تم دل برداشتہ نہ ہو۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’مجھے بھی یہ باتیں اس وقت سوجھ رہی ہیں ممکن ہے تم اس وقت پوچھ لیتے تو میں بارودی سرنگ جیسے احمقانہ ہتھیار کا مشورہ دیتا۔‘‘

کرنل مجھے گھور کر رہ گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ میں اسے تسلی دے رہا ہوں یا اسے مزید گھس رہا ہوں۔ سین برنر جلا کر کافی تیار کرنے لگا۔ اس کے پاس پھینٹی ہوئی کافی کے ساشے موجود تھے اور وہ چند منٹ میں اس سے بہت اعلیٰ درجے کی کافی تیار کر سکتا تھا۔ اس نے سب کے لیے کافی تیار کی اور مگوں میں دی۔ اس دوران میں باہر روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ’’کوئی ایسی صورت ہے کہ ہم باہر جائے بغیر باہر کا جائزہ لے سکیں۔‘‘

’’اگر باسو ٹھیک ہوتا تو یہ جا سکتا تھا۔‘‘ کرنل نے سوچتے ہوئے کہا۔ ’’اس کے علاوہ ایک صورت ہے۔‘‘

کرنل نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹی سے ٹینک نما گاڑی نکالی اور اس میں ڈرائی سیل فٹ کیے۔ اس کے ساتھ ایک اسکرین والا ریموٹ کنٹرول بھی تھا جس کے ساتھ لگی جوائے اسٹک سے اسے چلایا جا سکتا تھا۔ کرنل نے گاڑی نیچے چھوڑی اور اسے ریموٹ کی مدد سے چلانے لگا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹے سے شیشے کے گنبد میں گھومنے والا کیمرا لگا ہوا تھا جس کی ویڈیو ریموٹ کی اسکرین پر آ رہی تھی۔ ہم سب ہی کرنل کے پیچھے جمع ہو گئے۔ گاڑی چلتی ہوئی دہانے تک آئی۔ سامنے کا منظر نمایاں تھا اور اس منظر میں دور تک کوئی حرکت کرنے والی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ کرنل گاڑی کو تھوڑا اور آگے لے گیا اور دہانے سے نکلنے کے بعد گاڑی کا کیمرا دائیں بائیں گھما کر دیکھا۔ مگر دائیں بائیں بھی کوئی نظر نہیں آیا۔ روشنی خاصی ہو گئی تھی اور کیمرے کا بڑا لینس منظر کو بہت واضح کر کے دکھا رہا تھا۔ یہ یقیناً فوجی استعمال کا زمینی ڈرون تھا۔ زیبی نے کہا۔

’’باہر کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’اوپر کی طرف کیمرا کرو؟‘‘ میں نے مشورہ دیا۔ کرنل نے کیمرا گھمایا اور اس کا منہ اوپر کی طرف کر دیا۔ اب ٹیلے کے اوپر کا حصہ کسی قدر دکھائی دے رہا تھا۔ مگر یہ بہت واضح نہیں تھا کیونکہ برف کی دیوار آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ’’گاڑی مزید آگے جا سکتی ہے؟‘‘

’’ہاں لیکن سامنے بھی ایک سرنگ موجود ہے گاڑی اس پر چڑھ گئی تو......‘‘ کرنل نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شانے اچکائے۔

’’اتنی ہلکی گاڑی بھی اسے ایکٹو کر دے گی۔‘‘

’’یہ فوری پھٹ جانے والی سرنگ ہے اس پر صرف ایک کلوگرام کا وزن آنے کی دیر ہوگی۔ گاڑی اس سے زیادہ وزنی ہے۔‘‘ کرنل نے کہا اور پہلے کیمرا گھما کر گاڑی کے سامنے دیکھا مگر یوں سمجھ میں نہیں آیا تو وہ خود محتاط انداز میں دہانے تک گیا اور پھر گاڑی کو تھوڑا اور آگے بڑھایا۔ اب اسکرین پر اوپر کا منظر دکھائی دے سکتا تھا۔ کرنل واپس آیا اور ایک بار پھر سب اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ کیمرے کا رخ اوپر کیا اور فوراً ہی ایک لمحے کی حرکت سی محسوس ہوئی اور یہ سب نے محسوس کی تھی۔ اوپر ٹیلے کے ابھرے اور دبے حصوں کے درمیان کوئی سفید سی چیز ایک لمحے کو نظر آئی اور غائب ہو گئی۔ ڈیوڈ شا نے پوچھا۔ ’’تم لوگوں نے بھی دیکھا؟‘‘

’’ہاں میں نے دیکھا ہے۔‘‘ میں نے کہا تو باقی سب نے تائید کی تھی۔ ڈیوڈ شا نے کرنل سے کہا۔

’’گاڑی اور باہر لے جاؤ۔‘‘

’’اس میں رسک ہے گاڑی اب سرنگ کے بہت پاس ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ اسی لمحے اوپر سے ایک پتھر آ کر گاڑی پر گرا۔ کیمرے نے بالکل آخری لمحے میں پتھر دکھایا۔ پتھر گرنے کی آواز اندر تک آئی اور پھر ایک خوفناک دھماکا ہوا اور برف و سنگریزے اڑ کر اندر تک آئے تھے۔ دھماکا ایسا شدید تھا کہ اس کی لہر نے سب کو گرا دیا اور غار کے اندر بھی چھت سے مٹی اور سنگریزوں کی بارش ہوئی تھی۔ ابتدائی ردعمل میں سب ہی سکڑ سمٹ گئے کہ کہیں غار گرے تو ان کا جسم پتھروں کی زد میں نہ آئے۔ میں لاشعوری طور پر دیوار کے ساتھ لگا اور چہرہ اس میں چھپا لیا۔ چند لمحے بعد مجھے محسوس ہوا کہ غار کو کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اس کی دیواریں اور چھت اپنی جگہ برقرار تھیں۔ البتہ دھول مٹی خوب گری تھی۔ میں اٹھا تو اندر گرد کا غبار پھیلا ہوا تھا اور

کھانسی کی آوازیں آرہی تھیں میں نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں؟"

"ہاں۔" زینی نے کہا۔ کرنل اٹھ گیا تھا اور وہ دہانے کی طرف گیا۔ معاملہ واضح تھا۔ پتھر پہلے گاڑی پر گرا اور پھر سرنگ پر جا گرا اور اس سے دھماکا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے دہانے کے سامنے برف موجود تھی اور دھماکے کے بیشتر اثرات اس نے سہہ لیے تھے ورنہ اندر زیادہ تباہی ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے اندر برف اڑ کر آئی تھی اور ہر چیز پر برف کا اسپرے جم گیا تھا۔ دھماکے سے دہانے کے عین سامنے زمین میں کوئی فٹ بھر گہرا اور ایک میٹر قطر کا گڑھا پڑ گیا تھا۔ کرنل جو دہانے کے بالکل پاس چلا گیا تھا اس نے باہر جھانک کر جلدی سے اپنا سر اندر کر لیا تھا۔ چند ایک بار اس نے اسی طرح کیا اور جب تیسری بار سر باہر نکال کر اندر کیا تو زن سے ایک پتھر آ کر اس جگہ سے گزرا جہاں اس کا سر تھا اور وہ تیزی سے اندر بھاگا کیونکہ پتھر لڑھک رہا تھا اور خطرہ تھا کہ وہ بھی کسی بارودی سرنگ پر نہ جا گرے۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"وہ...... اوپر موجود ہے۔"

خالی جگہ میں کرنل نے ایک ناقابلِ بیان گالی فٹ کی تھی۔ یہ گالی کوئی شریف آدمی کسی عورت کی موجودگی میں نہیں دے سکتا تھا مگر ایک تو کرنل بدحواس تھا اور یہاں جو عورت تھی وہ بالکل بھی شریف نہیں تھی۔ میں پیچھے ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ "وہ اتنی آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گا اور دیکھا جائے تو اس نے ہمیں یہاں محصور کر دیا ہے۔"

"وہ کب تک ہمیں یہاں روک سکتا ہے۔" کرنل نے تند لہجے میں کہا اور اپنے بیگ سے کچھ نکالنے لگا۔ جب اس نے چیز نکالی تو میں چونک گیا۔ یہ وہی اسکرین نما ڈی ٹیکٹر تھا جو کسی جاندار شے کا سراغ لگا سکتا تھا اس کی اسکرین پر جاندار کی لوکیشن اور فاصلہ سب آ جاتا تھا۔ کنور پیلس پر حملے کے وقت ہمیں اس قسم کے آلے فراہم کیے گئے تھے۔ کرنل اسے لے کر دہانے کی طرف گیا۔ باسو کل رات والی جگہ موجود تھا اور اس نے دھماکے کے وقت بھی اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی تھی۔ اس کے تاثرات سے تکلیف یا تھکن کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری ٹانگ کیسی ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"میں اسے مسلسل اینٹی بایوٹک دے رہی ہوں۔" زینی نے مجھے بتایا۔ "پھر یہ آرام بھی کر رہا ہے امید ہے اس کا زخم خراب نہیں ہوگا۔"

"تم لوگوں کے پاس جدید ترین ادویات ہیں کیا کوئی ایسی دوا نہیں ہے جو زخم آسانی سے بھر دے اور ٹوٹی ہڈی جلدی جوڑ دے۔"

"نہیں ایسی کوئی دوا نہیں ہے۔"

ڈیوڈ شا بولا۔ "ایسی حیرت انگیز دوائیں صرف ایک جگہ ہیں جہاں ہم جا رہے ہیں۔"

میں نے اٹھ کر باسو کا پاؤں اوپر سے ٹٹول کر چیک کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے ہاتھ بھی نہ لگانے دیتا اور تکلیف سے آسمان سر پر اٹھا لیتا مگر اس نے میرے ٹٹولنے پر کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ میں نے دونوں پنڈلیوں کا موازنہ کیا تو مجھے خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ یعنی سوجن نہیں آئی تھی اور اس کا امکان تھا کہ زخم ٹھیک حالت میں تھا۔ کرنل دہانے کے پاس جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ برفانی آدمی باہر... کہاں ہے؟ باسو کو دیکھ کر میں اس کے پیچھے آیا لیکن ایک فاصلے پر رہا کہ اگر اسے تیزی سے اندر آنا ہو تو میں رکاوٹ نہ بنوں۔ مجھے اس کے ہاتھ میں موجود آلے کی اسکرین نظر آ رہی تھی اور اس پر کوئی دھبا نہیں تھا۔ یعنی برفانی آدمی آس پاس موجود نہیں تھا اور اگر تھا تب بھی کسی ایسی جگہ تھا جہاں یہ آلہ اسے چیک کرنے سے قاصر تھا۔

کرنل آگے جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ایک تو سنگ باری کا خطرہ تھا اور اس سے زیادہ خطرہ بارودی سرنگ کا تھا پتھر اس پر پڑتا تو آس پاس موجود لوگ بھی مارے جاتے۔ دیکھا جائے تو بارودی سرنگوں نے خود ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دی تھی۔ میں اندر آیا تو ڈیوڈ شا کو کسی سوچ میں منہمک پایا۔ غالباً وہ اس مسئلے کا حل سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کرنل کو آواز دی۔ کرنل اندر آیا اور ڈیوڈ شا نے اس سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ کرنل کا چہرہ تن گیا تھا مگر اس نے انکار نہیں کیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا اور پھر سین کو آواز دی۔ "میرے ساتھ آؤ۔"

سین آیا تو کرنل اس کے ساتھ مل کر مارک کی قبر سے برف ہٹانے لگا۔ میں مضطرب ہو گیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"دیکھتے رہو۔" کرنل نے سرد لہجے میں کہا۔ وہ اوزاروں سے مدد لے رہے تھے اور کچھ ہی دیر میں برف کھود کر مارک کی لاش تک پہنچ گئے۔ اس بار میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

"لاش کیوں نکالی جا رہی ہے؟"

"اس کی مدد سے ہم برفانی آدمی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔ "میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ لاش کی بے حرمتی ہے۔"

"تم سے کوئی اجازت طلب بھی نہیں کر رہا ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ "یہ تمہارا نہیں میرا ساتھی ہے اس لیے تم دخل نہیں دے سکتے۔"

میرے اندر اشتعال کی لہر سی آئی تھی۔ یہ لوگ مارک کی لاش استعمال کرنے جا رہے تھے اور اسے چارے کے طور پر برفانی آدمی کے سامنے ڈال رہے تھے۔ مگر جب میں نے غور کیا تو ڈیوڈ شا کی بات دل کو لگی۔ مارک ان کا ساتھی تھا اور مرنے کے بعد وہ ان کی ذمے داری تھا۔ اس لیے میں نے خود کو ٹھنڈا کر لیا۔ کرنل اور سین نے برف کھود کر اکڑی ہوئی لاش نکالی۔ برفانی آدمی نے اسے گڑھے میں ٹھونسنے کے لیے توڑ مروڑ دیا تھا اور وہ بے چارہ اسی حالت میں تھا۔ کرنل اور سین اسے اٹھا کر دہانے تک لے گئے اور پھر کرنل ایک چھڑی کی مدد سے اسے آگے دھکیلنے لگا۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ لاش کو اس گڑھے میں دھکیلنے میں کامیاب رہا جو بارودی سرنگ پھٹنے سے وجود میں آیا تھا۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔

"فرض کر دو وہ اس چارے پر نہ آیا۔ اتنی عقل تو اس کے پاس بھی ہے کہ ہم آتشیں ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ وہ لاش لینے آئے گا تو مارا جائے گا۔"

"ہوسکتا ہے لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔

زینی نے کرنل سے کہا۔ "کیا ہم باہر نکل کر کوشش نہیں کر سکتے؟"

"اس میں خطرہ زیادہ ہے۔ وہ بہت قوت سے پتھر مار رہا ہے اس کے خلاف تو زرہ بکتر بھی ناکام ہو جائے گی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے کرنل کی تائید کی۔ "اس وقت کوئی کوشش خطرناک ہو سکتی ہے۔ ہمیں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی اپنانا ہوگی۔"

ڈیوڈ شا ذرا مضطرب ہوا اسے خیال آیا ہوگا کہ اس صورت میں وادی تک پہنچنے میں تاخیر ہوگی۔ مگر وہ سمجھتا تھا کہ موجودہ صورت حال میں غار سے باہر جانا بہت رسکی ہے اس لیے وہ چپ رہا۔ سو حسب معمول خاموش اور پہرے پر تھا اس لیے سب ریلیکس ہو کر بیٹھ گئے۔ اس سفر میں پہلی بار مجھے سکون سے بیٹھنے اور سوچنے کا موقع ملا۔ میں اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ ایمن سے رابطہ ہوا تھا اور اس کے توسط سے میرا وِیم اینڈ پارٹی سے بھی رابطہ ہوا تھا اور انہیں کم سے کم یہ علم تھا کہ میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں جا چکا ہوں اور وہ مجھے لے کر وادی کی طرف جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔ پھر ایمن کی مدد سے میرے ساتھیوں کو بھی علم ہوا ہوگا کہ ڈیوڈ شا سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔ اب ہم وادی سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھیوں کا کیا ردِعمل ہوا ہوگا مگر وہ سکون سے بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھے میری واپسی کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔

راجا عمر دراز اور مرشد اب پیچھے رہ گئے تھے۔ ایک مخلص دوست اور دوسرا جانی دشمن تھا مگر فی الحال دونوں لاتعلق ہو گئے تھے۔ جب تک میں واپس نہ جاتا ان سے دوبارہ تعلق قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں سوچوں میں گم تھا کہ زینی سرک کر میرے پاس آ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم اوشا کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

"نہیں۔"

"پھر کس کے بارے میں سوچ رہے ہو؟"

میں نے اسے گھورا۔ "ضروری ہے کہ میں کسی کے بارے میں سوچوں؟"

"آدمی سوچتا ہے اور زیادہ تر اپنوں کے بارے میں سوچتا ہے۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اس لیے اگر تم سوچ رہے ہو تو اپنے کسی دوست یا دشمن کے بارے میں ہی سوچ رہے ہو گے۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔ "بائی دی وے تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے مجھے کس کیٹگری میں رکھا ہے۔ دوست یا دشمن؟"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے تم کس کیٹگری میں آ سکتی ہو؟"

"فی الحال تو دشمن۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں تمہیں دوست بنا لوں گی۔"

"یہ توقع کیوں؟"

"سنا ہے تم عورتوں میں مقبول ہو میری کزن تمہارے پیچھے پاگل ہے۔"

"اگر تم ایمن کی بات کر رہی ہو تو ایسی کوئی بات نہیں ہے ہم صرف دوست ہیں اس سے زیادہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا اس کے بارے میں، میں نے

جو سنا ہے وہ کچھ اور ہے۔''

''تم نے غلط سنا ہے اور یہ بھی غلط ہے کہ میں عورتوں میں مقبول ہوں۔''

''تم ہینڈسم ہو۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی عورت تمہارے پاس آئے اور تم سے متاثر نہ ہو۔''

''یہ بھی غلط ہے میرے پاس بہت سی عورتیں آئیں مگر ان میں سے سوائے چند ایک کے کسی اور نے میرے لیے جذبوں کا اظہار نہیں کیا۔ بہت سی میری بہنوں کی طرح ہیں۔''

''یہ لڑکی اوشا بھی ہے۔''

''ہاں یہ لڑکی، ایک اور لڑکی جو مر چکی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' وہ مزید نزدیک سرک آئی اتنے قریب کہ درمیانی فاصلہ ختم ہو گیا اگرچہ ہمارے جسموں کے اتصال میں کئی موٹی رکاوٹیں حائل تھیں اس کے باوجود میں ذرا دور سرک گیا۔

''وہ کس لحاظ سے؟''

''یہی کہ میں دیکھنے میں کیسی لگتی ہوں؟''

''ٹھیک لگتی ہو۔''

''بس ٹھیک۔'' وہ مزید آگے سرکی۔

''ہاں کیا یہ کافی نہیں ہے۔'' میں بھی سرکا۔

''نہیں۔'' اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''میں چاہتی ہوں تمہیں بہت اچھی لگوں۔''

''جو لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں وہ کام بھی بہت اچھے کرتے ہیں اور تم نے اب تک ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کی بنا پر تم مجھے اچھی لگو۔'' میرا لہجہ سرد ہو گیا۔

''جب تم گرنے والے تھے تو میں نے تمہیں بچایا تھا۔''

''اگر ایسا کوئی موقع تمہارے ساتھ پیش آتا تو میں بھی یہی کرتا میں نے تو باسو کو بھی بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کون سی ایسی بات ہے جسے جتایا جائے۔''

وہ کھسیا گئی۔ ''میں جتا نہیں رہی، صرف پوچھ رہی ہوں کہ میرے اس فعل کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''میں جواب دے چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مہربانی کر کے اپنی جگہ رہو اب یہاں سرکنے کی گنجائش ختم ہو گئی ہے۔''

''تم بہت سنگ دل ہو۔'' اس نے مرجھائے انداز میں کہا۔ ''آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی کی طرف پیش قدمی کی ہو اور اس نے میرے ساتھ ایسا رویہ رکھا ہو۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری توقعات پر پورا نہیں اتر پایا مگر اس میں میرا نہیں میری فطرت کا قصور ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔ مرد کے لیے عورت بس عورت ہوتی ہے۔'' وہ تنک گئی تھی۔

''تم کہہ سکتی ہو کیونکہ اب تک تمہارا واسطہ ایسے مردوں سے پڑا ہو گا جو عورت کو بس عورت سمجھتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک عورت بہت سے رشتوں کا نام ہے۔ ہر رشتہ محترم ہوتا ہے۔''

ہمارے درمیان گفتگو بہت دھیمی آواز میں ہو رہی تھی اور اس کا امکان کم تھا کہ دوسروں نے کچھ سنا ہو مگر زینی کی پیش قدمی اور میری پسپائی سب نے نوٹ کی ہو گی۔ زینی کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شہباز اب تم میری ضد بن گئے ہو میں تمہیں توڑ کر رہوں گی۔''

میں اس سے کیا کہتا جسے اس عالم میں بھی ہری ہری سوجھ رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی اوپر والا بچاتا آیا تھا اب بھی اسی سے اُمید تھی کہ اس فتنے سے محفوظ رکھے گا جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی فتنہ نہیں ہے۔ وقت آہستہ آہستہ سے گزر رہا تھا۔ کرنل اور باسو دونوں مارک کی لاش کی نگرانی کر رہے تھے مگر ابھی تک برفانی آدمی کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ کرنل، باسو اور ڈیوڈ شا بالکل خاموش تھے مگر زینی اور سین آپس میں بات کر رہے تھے۔ میں جس دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا اپنی کلہاڑی کی نوک اس پر ہلکے ہلکے مار رہا تھا۔ میرا کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ میں ایسے ہی بے خیالی میں یہ حرکت کر رہا تھا۔ ایک بار میں نے نوک ماری تو وہ دیوار میں یوں گھس گئی جیسے دیوار کچی ہو یا پھر اس کے دوسری طرف خلا ہو۔ میں چونکا اور کلہاڑی کھینچ کر اسے دوبارہ مارا اس بار بھی وہ دوسری طرف نکل گئی تھی۔

اگلی بار میں نے کلہاڑی استعمال نہیں کی بلکہ اس کا دستہ سوراخ میں داخل کیا اور اسے آگے دھکیلنے لگا۔ مزاحمت کے باوجود دستہ آگے جا رہا تھا۔ پھر ایسا لگا جیسے دستہ آزاد ہو گیا ہو اس کے آگے رکاوٹ نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے کھینچا اور دوبارہ اندر گھسایا اور اس بار یہ آسانی سے چلا گیا۔ یوں لگا جیسے آر پار سوراخ مکمل ہو گیا ہو۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا اس لیے میں یوں جھکا جیسے لیٹ رہا ہوں

اور پھر سوراخ کے دوسری طرف دیکھا تو مجھے تاریکی سی نظر آئی۔ پھر میں نے کان لگا کر سنا تو یوں لگا جیسے کوئی بہت ہی آہستہ سانس لے رہا ہو لیکن یہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔ کیونکہ آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس غار کے برابر میں ایک غار اور تھا اور درمیان میں موجود دیوار کسی وجہ سے کمزور ہوئی تھی اور جب میں نے اس پر کلہاڑی آزمائی تو اس کا کچھ حصہ ٹوٹ کر الگ ہوگیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ ان لوگوں کو بتاؤں مگر پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ بے شک میں ان کے ساتھ تھا اور ہم برفانی آدمی کے خطرے کا اکٹھے سامنا کر رہے تھے مگر ان کو ہر بات بتانا بھی درست نہیں تھا۔

میں کچھ دیر یونہی لیٹا رہا اور سن گن لیتا رہا مگر دوسری طرف مستقل قسم کی خاموشی طاری رہی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی اس لیے میں نے کچھ دیر سونے کا سوچا اور پھر سو بھی گیا۔ خواب میں، میں نے دیکھا کہ اوشا کو برفانی آدمی نے کسی ایسے ہی غار میں قید کیا ہوا ہے اور وہ اس کے نزدیک آنا چاہتا ہے مگر اس کے بدن میں موجود زہر کو محسوس کر کے وہ بدک کر پیچھے ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے اوشا کو مارا نہیں اگرچہ وہ مرنے کی حد تک خوفزدہ تھی۔ پھر برفانی آدمی کو غصہ آجاتا ہے اور وہ اوشا کو زبردستی کھینچ کر غار سے لے جانے لگتا ہے اور وہ چیخ رہی ہوتی ہے۔ میں برفانی آدمی سے کہہ رہا ہوں کہ اسے چھوڑ دے۔ مگر وہ شاید میری آواز سن نہیں رہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے ہلایا اور میں چونک کر بیدار ہوگیا اس وقت بھی میرے کانوں میں اوشا کی آخری چیخ گونج رہی تھی۔ مجھے جگانے والا سین تھا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا تم خواب میں ڈر گئے ہو کچھ کہہ رہے تھے؟"

میں نے سر جھٹکا اور اٹھ بیٹھا۔ "شاید...... وقت کیا ہوا ہے؟"

"دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔" سین نے جواب دیا اور پیچھے ہوگیا۔ میں نے پانی پیا۔ جب سے ہم غار میں محدود ہوئے تھے کھانے اور خاص طور سے پینے میں احتیاط کر رہے تھے کیونکہ یہاں اخراج کا مسئلہ ہوجاتا تو باہر جانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ مگر کب تک جلد یا بدیر یہ مرحلہ آنا ہی تھا۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پاسو ویسا ہی تھا اور اس وقت دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا مگر

بائل کا کلیہ

گیسوں کے حجم اور دباؤ کا تعلق ظاہر کرنے کا کلیہ جسے رابرٹ بائل نے 1662ء میں پیش کیا۔ اس کے مطابق اگر درجۂ حرارت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو تو کسی گیس کے حجم میں تبدیلی دباؤ کے الٹ متناسب ہوتی ہے۔ یعنی درجۂ حرارت ایک ہی رہے تو کسی گیس کے حجم اور دباؤ کے حاصل ضرب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

مرسلہ: نعمان اصغر۔ جہلم

اس کے ہاتھ میں شاٹ گن بدستور موجود تھی۔ ڈیوڈ شا اور زینی آرام کر رہے تھے اور سین لنچ کی تیاری کر رہا تھا۔ صبح ہم نے ہلکا ناشتا کیا تھا اور اب شاید سب ہی بھوکے تھے۔ لنچ بھی ہلکا پھلکا تھا اور وجہ وہی تھی کہ اخراج کا مسئلہ نہ ہو۔ لنچ کے بعد سب ہی اونگھنے لگے تھے۔ اچانک زینی کی آواز آئی۔

"مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے میں باہر جاؤں گی۔"

"کوئی باہر نہیں جائے گا۔" ڈیوڈ شا نے سخت لہجے میں کہا۔

"تب کیا یہیں کر دوں۔" زینی چنچنائی۔

"کرنل اس کونے میں برف سے دیوار بنا دو۔" ڈیوڈ شا نے کرنل کو حکم دیا۔ "سب اس دیوار کے پیچھے جائیں گے۔"

غار میں اچھی خاصی برف جمع تھی۔ کرنل نے چھوٹے سے بیلچے کی مدد سے برف سے اس کونے میں دو فٹ اونچی دیوار سی بنا دی جس کے عقب میں روپوش ہوا جا سکتا تھا۔ اس نے زینی سے کہا۔ "اب خود ایک چھوٹا گڑھا کھود لینا اور پھر اسے بند کر دینا۔"

کرنل کا مطلب واضح تھا کہ گڑھا کھود کر جو کرنا ہے اسی میں کرنا اور پھر اسے بند کر دینا تاکہ بدبو نہ پھیلے۔ زینی بلبلاتی ہوئی اس دیوار کے پیچھے چلی گئی۔ اس دن مجھے پتا چلا کہ کسی کی موجودگی میں رفع حاجت کرنا یا کوئی دوسرا آپ کی موجودگی میں کرے تو کس قدر عجیب محسوس ہوتا ہے۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی مگر آوازیں آرہی تھیں اور پھر بو بھی پھیلنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ وہاں سے نکلی تو جھینپ رہی تھی۔ یقیناً باقی سب بھی جھینپ رہے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد

سب نارمل ہو گئے تھے۔ فطرت انسان کی مجبوری نہیں دیکھتی ہے۔ میں نے کرنل سے پوچھا۔ ''کیا ہم رات کا انتظار کر رہے ہیں؟''

''نہیں اسنو مین کا۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''جلد یا بدیر وہ لاش لینے آئے گا اور تب ہم اس پر حملہ کرسکیں گے۔''

''یعنی ہم اس سے اعصاب کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ ہم محصور ہیں اور وہ آزاد ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''دوسرے لفظوں میں ہماری آزادی و بقا اس کے ہاتھ میں ہے۔''

''تب تم بتاؤ کیا کیا جا سکتا ہے۔'' کرنل نے کہا۔ ''باہر جانا تو دور کی بات ہے ذرا سی جھلک دیکھتے ہی وہ حملہ کرتا ہے۔''

''تاریکی میں ہم روشنی کے محتاج ہو جائیں گے اور وہ شاید تاریکی میں بھی دیکھ سکتا ہے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے لیے کچھ کرنے کو دن کی روشنی ہی بہتر ہے۔''

''ابھی ہمارے پاس وقت ہے۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''ہم انتظار کرسکتے ہیں۔''

''دوسرے وہ مارک کی لاش اچک کرلے جائے اور سرنگوں سے بھی بچ جائے تو پوزیشن پھر یہی ہو جائے گی۔'' میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ پتھر لے کر بیٹھ جائے گا اور ہم باہر نہیں جاسکیں گے۔''

کرنل زچ نظر آنے لگا۔ ''تم کیا چاہتے ہو باہر جانا؟''

''نہیں میں چاہتا ہوں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کی بجائے کچھ سوچیں اور حرکت میں آجائیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے ہو کہ یہ مخلوق زیادہ تعداد میں ہو سکتی ہے اور اگر یہ ایک سے زیادہ یہاں آگئی تو ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے۔''

''تم کوئی تجویز دو۔''

''میں کیسے تجویز دے سکتا ہوں جب کہ مجھے یہی نہیں معلوم کہ تمہارے پاس ذرائع کیا ہیں مزید کتنے ہتھیار ہیں جن سے ہم کام لے سکتے ہیں۔''

کرنل مجھے گھورنے لگا۔ ''تم بہت چالاک آدمی ہو۔''

''اس میں چالاکی کہاں سے آگئی؟''

''تم معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ ہمارے پاس کتنی طرح کے ہتھیار ہیں۔''

''برفانی آدمی سے لڑنے کے لیے۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میری نیت خراب ہے۔''

کرنل نے کوئی جواب نہیں دیا اور دہانے کی طرف چلا گیا۔ میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہماری طرف ایک محاورہ ہے کہ شک کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تم بلاوجہ کی باتیں کرنے کی بجائے اپنی تجویز پیش کر سکتے ہو اگر تمہارے ذہن میں ایسی کوئی چیز ہے۔''

''موجودہ حالات میں تو کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی۔ ویسے بھی یہ کرنل کی ذمے داری ہے۔''

زیبی ہر چھ گھنٹے بعد باسو کو اینٹی بایوٹک اور پین کلر دے رہی تھی۔ میں نے پھر اس کا پاؤں چیک کیا تھا اور وہ بہتر حالت میں تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ میں نے جو لکڑیاں اور ان پر پٹی باندھی تھی وہ کسی قدر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ یعنی چوٹ کے آغاز میں جو سوجن آئی تھی وہ کم ہوگئی تھی اور ایسا صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب زخم بہتر حالت میں آیا ہو۔ شاید باسو کا جسمانی نظام کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کے زخم تیزی سے بہتر ہوتے ہوں۔ بہر حال وہ دواؤں کی مدد سے بڑھایا ہوا جسم تھا جو عام انسانی جسم سے مختلف ہوتا ہے۔ ہم میں سے کوئی نہ کوئی کچھ دیر بعد دہانے تک جا کر باہر کا معائنہ کرتا تھا۔ اچانک کرنل نے یہ کیا کہ اپنی جیکٹ اتار کر اسے دو چھڑیوں کی مدد سے ہڈ تک سیدھا کیا اور پھر اسے آگے کیے ہوئے دہانے تک آیا اور اسے ذرا باہر نکالا۔ اگر برفانی آدمی اوپر یا کہیں اور موجود تھا تو اسے لگتا کہ کسی آدمی نے سر باہر نکالا ہے۔ ہڈ کی وجہ سے جیکٹ میں آدمی ہی لگ رہا تھا۔ اس نے وقفے وقفے سے کئی بار اسے آگے پیچھے کیا مگر کسی طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ سین نے کہا۔

''وہ اس وقت باہر موجود نہیں ہے ہمارے لیے موقع ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔'' زیبی نے کہا میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد شام ہو جائے گی اور ہم تاریکی میں باہر زیادہ غیر محفوظ ہوں گے۔''

کرنل نے کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ باہر نکلا جائے۔ مگر مجھے ایک آدمی کی اور مدد چاہیے ہوگی۔''

باسو قابل نہیں تھا۔ سین نے فوری ہاتھ اوپر کر

دیے۔ ''میں لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔''

''اس وقت سب کی جان پر بنی ہے۔'' کرنل غرایا۔ ''اگر برفانی آدمی یہاں گھس آیا تو کیا تم اسے یہی عذر پیش کرو گے۔''

''میں ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہوں لیکن مہارت نہیں ہے۔'' سین نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''میں کر سکتا ہوں لیکن تم مجھ پر اعتماد نہیں کرو گے۔'' میں نے ہنس کر کہا تو کرنل نے مجھے گھورا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ڈیوڈ شا نے کہا۔

''اسے ہتھیار دے دو اگر یہ تمہارے ساتھ باہر جانے پر راضی ہے۔''

کرنل نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا اور فوراً ہی اس کے تاثرات بدل گئے۔ وہ مخالفت کرنے والا تھا مگر ڈیوڈ شا نے شاید اسے کوئی اشارہ دیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم تیار ہو؟''

''ہاں کیونکہ یہاں میری بھی جان پر بنی ہے۔ میری ایک ساتھی برفانی آدمی کے قبضے میں ہے۔''

اس نے اپنی شاٹ گن میری طرف بڑھا دی۔ میں نے اسے لے کر چیک کیا یہ لوڈ تھی اور اس میں سات گولیاں موجود تھیں۔ کرنل نے اضافی بلٹ بھی دیے جو میں نے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیے۔ ''اب میں تیار ہوں۔''

''یہ بہت خطرناک ہے۔'' زینی نے کہا اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ''اگر اس نے تم لوگوں پر قابو پالیا تو پیچھے اس سے لڑنے والا کون رہ جائے گا؟''

''تم لوگ اپنے طور پر ہوشیار رہو۔'' کرنل نے کہا اور میرے ساتھ دہانے تک آیا۔ اس نے اشارہ کیا۔ ''دہانے کے بعد دو گز دائیں طرف اور دو گز بائیں طرف دو سرنگیں ہیں۔ اسی طرح ایک سرنگ بالکل سیدھ میں تھی جو تباہ ہو چکی ہے اس کے ٹھیک دائیں بائیں ایک ایک گز کے فاصلے سے سرنگیں موجود ہیں۔ سمجھ لو کہ ٹیلے کی دیواروں کے ساتھ ہیں۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''اب ایکشن پلان کیا ہے؟''

''میں پہلے جاؤں گا اور مارک کے اوپر سے پھلانگ کر دوسری طرف جاتے ہی اوپر کی طرف نشانہ لوں گا اگر کوئی نظر آیا تو اس پر فائر کروں گا دوسری صورت میں تمہیں کور دوں گا اور تم باہر آؤ گے۔ وقت کا خیال رکھنا میرے جانے کے پانچ سیکنڈ بعد تم باہر آؤ گے۔''

''اچھا پلان ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''او کے میں جا رہا ہوں۔'' کرنل نے کہا اور یک دم باہر نکلا۔ اس نے ایک ہی جست میں مارک کی گڑھے میں موجود لاش پھلانگی اور دوسری طرف جاتے ہوئے ایک گھٹنا برف پر ٹیکتے ہوئے گھوم کر اپنی خودکار رائفل کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ اس کے نکلتے ہی میں نے دل میں گنتی شروع کر دی اور پانچ کہتے ہی تیزی سے باہر آیا۔ مارک کی لاش پھلانگ کر دوسری طرف آیا اور کرنل کے پاس سے ہوتے ہوئے پیچھے نکل گیا۔ جیسے ہی میں آگے گیا پیچھے سے فائر ہوا۔ کرنل نے کسی پر گولی چلائی تھی۔ خطرے کا احساس کرتے ہی میں نے جست لگا کر گرتے ہوئے پشت برف پر کی اور پلٹ کر شاٹ گن کا رخ اوپر کی طرف کیا تھا۔ میں پھسلتا ہوا دور جا رہا تھا اور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کرنل نے کس پر گولی چلائی ہے۔ اسی لمحے اوپر سے ایک پتھر آ کر میرے پیروں کے پاس گرا اور میں نے پتھر چلانے والے کو دیکھ لیا۔ میں بال بال بچا تھا۔ برفانی آدمی کا پھینکا پتھر میرے پیروں کو لگتا تو یہ ہڈی توڑ سکتا تھا۔

وہ ٹیلے کے اوپری حصے میں تھا اور کرنل نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ اس کا چلایا ہوا پتھر ہم دونوں کے درمیان میں گرا۔ وہ حرکت میں تھا اور اس کی حرکت اتنی تیز تھی کہ کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ میں نے شاٹ گن اس کی طرف کی اور پہلی گولی چلائی۔ خوفناک دھماکے کے ساتھ ہی اس کے پاس سے برف کا غبار اٹھا۔ گولی اسے نہیں لگی تھی مگر اس نے اسے خوفزدہ ضرور کر دیا تھا۔ میں نے اسے غائب ہوتے دیکھا۔ میں گھسٹتا ہوا کئی گز دور گیا تھا اور رکتے ہوئے میں نے قلابازی کھائی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ کرنل مڑا تو مجھے کھڑے دیکھ کر کسی قدر حیران ہوا تھا۔ پھر وہ بھی تیزی سے پیچھے آیا۔ ہمارے ہتھیاروں کا رخ اوپر کی طرف تھا اور ہم برفانی آدمی کی حرکت دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''دور ہو جاؤ ایک ہی جگہ ہم پتھر کا آسان ہدف ہوں گے۔''

بات کرنل کی سمجھ میں آ گئی اور وہ دائیں طرف حرکت کرنے لگا۔ اس نے برفانی آدمی کی لوکیشن کا اندازہ کرنے کے لیے دو گولیاں اور چلائیں۔ میں نے اسے ٹیلے کے اوپر حصے میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اشارے سے کرنل کو سمجھایا کہ وہ شاید عقب میں جا چکا ہے۔ کرنل نے جوابی اشارے سے کہا کہ وہ پیچھے جا رہا ہے۔ میں نے سر ہلایا اور بدستور پیچھے ہٹتا رہا۔ سورج ہمارے بائیں طرف کسی قدر عقب میں

مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔ پیچھے ہٹنے سے مجھے دو فائدے ہوئے ایک تو میں پتھر کی ضرب سے دور ہو رہا تھا اور دوسرے مجھے ٹیلے کا اوپری حصہ دکھائی دینے لگا اور اسی وجہ سے میں برفانی آدمی کو دیکھ سکا۔ اس نے دو ٹیلوں کے درمیانی خلا سے چھلانگ لگائی اور ناقابلِ یقین طور پر کوئی آٹھ گز کا خلا عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ کوئی انسان اس قسم کی جگہ پر ایسی چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ میں نے گولی چلائی مگر وہ اس بار بھی بچ گیا۔ میں نے چلا کر کرنل سے کہا۔

''وہ شمالی ٹیلے پر چلا گیا ہے۔''

''راجر۔'' کرنل نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا اس نے میری بات سمجھ لی تھی۔ وہ جنوبی سمت سے جاتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ یہ ٹیلے برف کی اس ہموار ڈھلان پر الگ سے ابھرے ہوئے تھے۔ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں ہموار جگہ تھی۔ گویا برفانی آدمی ان کے علاوہ اور کہیں چھپ نہیں سکتا تھا۔ ہاں غار کے دہانے کے سامنے کچھ دور ہی ڈھلان نیچے اتر رہی تھی اور وہاں سے برفانی آدمی نے حملہ کیا تھا۔ میں شمال کی طرف ہٹ رہا تھا اور میری نظر اس ٹیلے پر مرکوز تھی جس پر برفانی آدمی گیا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں تیزی سے جھکا تو ایک بھاری بھرکم پتھر زن سے میرے عین اوپر سے گزرا۔ جھکنے کی وجہ سے میں بچا تھا اور میں نے اسی پوز میں گھومتے ہوئے دیکھا تو برفانی آدمی میری طرف جھپٹ رہا تھا۔ وہ مشکل سے دس گز دور رہ گیا تھا اور چند سیکنڈ میں مجھ تک آ جاتا۔ میں نے بے ساختہ فائر کیا اور اس کے سینے میں سوراخ نمودار ہوا۔

اس کے باوجود اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ غراتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا۔ اس نے شاٹ گن تھام لی اور مجھے نیچے گرا لیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی خوفناک مخلوق کو سامنے سے دیکھا۔ اس کا قد بہت زیادہ نہیں تھا تقریباً ساڑھے چھ فٹ ہوگا مگر وزن مجھ سے دوگنا ضرور تھا مجھے لگا جیسے میرے اوپر کوئی پہلوان آ گرا ہو۔ اس کا جسم ڈھائی تین انچ لمبے اور بے پناہ گھنے بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا درندگی سے بھرپور چہرہ مجھ سے کچھ ہی دور تھا۔ سرخ آنکھیں اور پھیلی ہوئی ناک تلے منہ سے نکلے ہوئے دانت خاصے بڑے تھے۔ اس کے چہرے پر پرانے زخموں کے نشانات تھے جیسے ہمارے ہاں غنڈے اور بدمعاش قسم کے لوگوں کے منہ پر پائے جاتے ہیں اور وہ انہیں بہ طور ٹریڈ مارک استعمال کرتے ہیں۔ وہ غرانے کے انداز میں سانس لے رہا تھا اور مجھ سے شاٹ گن چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ اس کے پیٹ تک پاؤں لے آؤں اور اسے خود سے اچھالنے کی کوشش کروں۔ اس کے سینے کے کھلے زخم سے بہنے والا خون مجھ پر آ رہا تھا۔ زخم کی وجہ سے وہ کمزور ہو رہا تھا اور پورا زور نہیں لگا پا رہا تھا۔ جب اس نے یہ بات محسوس کر لی تو اس نے پینترہ بدلا اور شاٹ گن میری گردن کی طرف لانے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً وہ شاٹ گن سے میری گردن دبانا چاہتا تھا۔ اس کی کوشش میں اس کا پیٹ والا حصہ اوپر ہوا اور میں نے اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا۔ وہ غرایا اور ذرا اوپر ہوا تھا مجھے موقع ملا کہ میں اس کے پیٹ پر دونوں پاؤں جما سکوں۔ اس کے باوجود اسے اچھالنا آسان کام نہیں تھا اس میں رکاوٹ اس کا بے پناہ وزن تھا۔ وہ شاٹ گن تقریباً میری گردن تک لے آیا تھا۔ میں نے ایک بار پاؤں چلائے مگر وہ واپس مجھ پر آیا اور اب وہ مجھے پیٹ سے بھی دبا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔

بے پناہ خون بہنے کے باوجود اس کی قوت اور وحشت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے اچانک ہاتھ ڈھیلے کیے تو وہ تیزی سے نیچے آیا اور میں نے سر سے اس کی ناک کو نشانہ بنایا۔ وار بالکل ٹھیک بیٹھا اور سر اور ناک کے تصادم میں ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف آئی تھی۔ اس نے بلبلا کر سر اوپر کیا اور اس بار مجھے موقع ملا میں نے دونوں پاؤں اس کے پیٹ پر جماتے ہوئے پوری قوت سے اسے اچھالا اور وہ میرے سر پر سے ہوتا ہوا پیچھے جا گرا۔ اس نے شاٹ گن اب بھی نہیں چھوڑی تھی اسی لیے میرے پاس ہی گرا۔ شاٹ گن پر میرے بھی ہاتھ جمے ہوئے تھے اور میں نے اسے استعمال کرتے ہوئے پیچھے کی طرف قلابازی کھائی اور اس پر گرا۔ میرا گھٹنا اس کے زخم پر لگا تھا اور اس نے کربناک آواز نکالی۔ اب اس کی مزاحمت جواب دے گئی تھی۔ میں نے شاٹ گن اس سے چھین لی اور اس کی نال کا رخ اس کی طرف کر رہا تھا کہ میں نے سامنے سے دو ہیولوں کو جھپٹتے دیکھا۔

میں نے شاٹ گن کا رخ ان کی طرف کیا تھا کہ نیچے دبے برفانی آدمی نے حیران کن قوت سے اچانک مجھے پیچھے اچھالا اور میں تقریباً اڑتا ہوا غار کے دہانے پر گرا۔ شاٹ گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی مگر وہ پاس ہی گری تھی میں نے فوراً اٹھا لی۔ خوش قسمتی سے میں کسی سرنگ پر نہیں گرا تھا۔ آنے والے دو برفانی آدمی کوئی پچاس گز دور تھے اور

غیر معمولی رفتار سے آرہے تھے۔ میں نے برف پر پاؤں مارے اور دہانے کے اندر چلا گیا۔ اسی لمحے اندر سے خوفناک دھماکا ہوا اور گولی میرے اوپر سے ہوتی آگے آنے والے برفانی آدمی کے سر پر لگی اور اس کا سر غائب ہوگیا۔ یہ فائر باسو نے اپنی شاٹ گن سے کیا تھا۔ برفانی آدمی اوندھا گرا اور اس کی سربریدہ لاش تیزی سے پھسلتی ہوئی غار کی طرف آنے لگی۔ دھماکے نے میرے کان سن کردیے تھے مگر خطرے کا احساس باقی تھا میں اٹھ کر اندر کی طرف بھاگا۔

میں دہانے سے اندر آیا تھا کہ عقب میں دھماکا ہوا اور میں اچھل کر آگے گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر برف اور سنگریزوں کی بارش شروع ہوگئی تھی۔ گرنے سے پہلے میں نے ایک دھماکا اور سنا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ برفانی آدمی کی لاش نے دوسرنگوں کو تباہ کردیا تھا۔ میں اٹھا اور گردو غبار میں ٹٹولنے لگا۔ زینی چلا چلا کر پوچھ رہی تھی کہ باہر کیا ہوا ہے۔ لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ دھماکے کی بازگشت ختم ہوئی تو باہر سے دردناک انداز میں چلانے کی حیوانی آوازیں آنے لگیں۔ میری توجہ ان آوازوں کی طرف بھی نہیں تھی۔ بہ مشکل میں نے اپنی کلہاڑی تلاش کی اور اس دیوار تک آیا جس کے دوسری طرف خلا تھا میں نے کلہاڑی گھما کر دیوار پر ماری تھی کہ عقب سے زینی نے میرا بازو دبوچ لیا۔ اس نے تند لہجے میں کہا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے یہ کیا کررہے ہو۔''

''دہانے پر رہو۔'' میں نے دھاڑ کر کہا۔ ''باہر اور بھی ہیں وہ اندر آنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

میرے لہجے کی خونخواری نے اسے جھجکا دیا اور وہ پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے دہانے کی طرف لپکی۔ باسو کی طرف سے دو مزید فائر اس کا ثبوت تھے کہ باہر مزید برفانی آدمی آگئے تھے اور وہ اندر گھسنے کی فکر میں تھے۔ ڈیوڈ شا نے زینی کی جگہ لے لی مگر اس نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی تھی اس نے دور سے پوچھا۔ ''یہ کیا کررہے ہو؟''

''یہاں دوسری طرف بھی کوئی غار ہے اور شاید یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔'' میں نے کلہاڑی چلاتے ہوئے کہا اور اس بار ضرب نے دیوار کا ایک حصہ گرا دیا۔ میں نے دستہ مار کر ملبہ صاف کیا اور ٹارچ سے اندر روشنی ڈالی تو دوسری طرف سچ مچ ایک بڑا سا غار تھا اور وہاں سے شدید بدبو آرہی تھی۔ مگر بدبو برفانی آدمیوں سے زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ ان میں سے کوئی غار کے دہانے تک چلا آیا تھا۔ اس نے اندر گھسنے کی کوشش کی تو زینی اور باسو نے بیک وقت اس پر فائر کیے اور وہ غراتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔

وقت کم تھا۔ میں نے ایک بار پھر کلہاڑی چلانا شروع کر دی۔ سین بھی ایک کلہاڑی لے کر میری مدد کو آگیا تھا اور ہم دونوں نے مل کر ایک منٹ میں سوراخ اتنا بڑا کرلیا کہ ایک آدمی آرام سے اس سے گزر سکتا تھا۔ میں نے سین سے کہا۔

''میں اس طرف جارہا ہوں اگر خطرہ نہیں ہوا تو تم سامان اس طرف پھینکنا شروع کردینا۔''

میں نے دوسری طرف قدم رکھا اندر آتے ہی بدبو کا احساس شدید ہوگیا اور یہ سڑتے ہوئے فضلے کی بدبو تھی۔ غار کے فرش پر فضلے کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔ برفانی آدمی اس جگہ کو رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں جہاں جہاں ٹارچ گھما رہا تھا مجھے یہی نظر آرہا تھا لیکن نہیں وہاں کچھ اور بھی تھا میں نے ٹارچ گھمائی تو کوئی چیز چمکی تھی۔ میں نے دیکھا ایک کسی قدر صاف ستھرے کونے میں کوئی چیز تھی میں فضلے سے بچتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ نزدیک آنے پر میرا دل دھڑکا تھا کیونکہ وہ اوشا کی کلائی کا سنہری کنگن تھا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھایا۔ وہ اوشا کا ہی کنگن تھا اور جب برفانی آدمی اسے یہاں لایا تو شاید اس نے خود چھوڑ دیا لیکن نہیں۔ مجھے اپنا خواب یاد آگیا برفانی آدمی اسے کھینچ کر لے جارہا تھا اور وہ چیختے ہوئے مزاحمت کررہی تھی۔ کیا وہ خواب نہیں تھا اور میں نے سچ مچ اوشا کی آواز سنی تھی اور میرے خواب نے اس کی مکسنگ کی تھی۔ جب میں جاگا تو مجھے لگا کہ اوشا کی آخری چیخ سچ میں آئی تھی۔

شاید کچھ ایسا ہی تھا مگر میرے پاس غور وفکر کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اب باقی غار کا معائنہ شروع کیا یہ کھلا ہوا نہیں تھا مگر ایک طرف سرنگ نما راستہ کہیں جارہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ یہاں آمد و رفت کا راستہ تھا تب ہی برفانی آدمی یہاں رفع حاجت کے لیے آتے تھے۔ سین سوراخ سے جھانک رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ابھی رکو میں دیکھ رہا ہوں یہاں سے باہر جانے کا راستہ کیسا ہے پھر تم لوگ آنا۔''

''میں بھی آرہا ہوں۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''تمہیں ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔''

''یہاں گندگی اور بدبو ہے جو تمہاری طبع نازک پر ناگوار گزرسکتی ہے ویسے تمہاری مرضی ہے۔'' میں نے کہا اور سرنگ کی طرف بڑھ گیا۔ ویسے مجھے سچ مچ کسی مددگار کی ضرورت تھی کیونکہ ایک آدمی کے لیے مقابلہ مشکل تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ برفانی آدمی اوشا کو اس لیے یہاں لایا ہوگا تاکہ اسے دوسرے برفانی آدمیوں کی نظروں سے بچاسکے۔

میں نے کلہاڑی چھوڑ کر شاٹ گن اتاری تھی اس کے خالی ہو جانے والے خانوں میں کارتوس ڈالنے لگا۔ سرنگ کے پاس آکر اندر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو دیکھا سرنگ آگے جاکر گھوم رہی تھی میں روشنی نیچے کرکے آگے بڑھا اگر دوسری طرف کوئی موجود تھا تو روشنی اسے ہوشیار کر سکتی تھی۔ اس لیے میں روشنی محدود کر رہا تھا۔ مگر دوسری طرف کوئی نہیں تھا۔ اب مجھے باہر کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈیوڈ شا میرے پیچھے آچکا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس سے کہا۔

"دوسروں کو بلالو۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ سب آرہے ہیں۔ باسو دہانہ تباہ کردے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارے پاس کچھ بم ہیں جو ایک منٹ میں پھٹ جاتے ہیں۔"

مجھے باسو کا خیال آیا۔ "وہ کیسے آئے گا؟"

"آجائے گا تم اس کی فکر مت کرو۔" ڈیوڈ شا نے مجھ سے آگے جاتے ہوئے کہا اس نے باہر جھانکا تھا اور پھر بولا۔ "ادھر راستہ صاف ہے۔"

میرا اندازہ تھا کہ ہم ٹیلوں کے عقبی حصے میں آنکلے تھے۔ "کرنل نظر آرہا ہے؟"

"نہیں لیکن وہ یہیں ہوگا۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ پیچھے سے زینی نمودار ہوئی اور اس نے سامان والے بیگ اٹھا رکھے تھے۔ دو بیگ رکھ کر وہ واپس آگئی اور مزید دو چکروں میں اس نے سارا سامان اس طرف پہنچا دیا تھا۔ وہ سلیج بھی لے آئی تھی کہ باسو اس کے بغیر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ سامنے والے غار سے رہ رہ کر فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ برفانی آدمیوں کے حملے جاری تھے۔ پھر خود کار رائفل کے برسٹ کی آواز آئی۔ خودکار رائفل صرف کرنل کے پاس تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ زندہ اور مسلح تھا۔ آخر میں زینی اور سین باسو کو سہارا دیتے ہوئے نمودار ہوئے اور فوراً ہی عقب میں دھماکا ہوا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ پورا غار اور شاید ٹیلے بھی ہل کر رہ گئے تھے۔ سرنگ کے اوپر سے مٹی اور برف کی بارش ہوئی تھی۔ ڈیوڈ شا اور میں سامان اٹھا کر باہر لانے لگے۔ دو بیگ نکال کر میں نے شاٹ گن سنبھال لی اور آس پاس دیکھنے لگا۔ ہم ٹیلوں کے عقب میں تھے اور اس طرف کوئی برفانی آدمی نہیں تھا۔ سب باہر آئے باسو کو سلیج پر بٹھا دیا۔ ڈیوڈ شا اور سین کو اس کے پاس چھوڑ کر میں اور زینی ٹیلوں کے سرے کی طرف بڑھے۔ زینی نے مجھ سے کہا۔

"یہ تو بہت سارے ہیں میں نے سامنے سے کم سے کم نصف درجن برفانی آدمی آتے دیکھے تھے۔"

"تین تو میں نے بھی دیکھے ان میں سے دو مارے گئے تھے۔" میں نے کہا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ یہاں ان کا پورا قبیلہ آباد ہے۔"

"ایک سرنگ کا نشانہ بنا۔"

"وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ باسو کی شاٹ گن نے اس کا سر اڑا دیا تھا۔"

"جسے تم نے پہلے مارا تھا اور وہ شدید زخمی تھا دوسری بارودی سرنگ پر وہ آگیا تھا۔ اس کی ٹانگ بھی اڑ گئی تھی۔"

"میرا خیال ہے جتنے مارے گئے ہیں اتنے ہی یا اس سے زیادہ ابھی زندہ موجود ہیں۔" میں نے کہا اور ایک کونے سے جھانک کر دیکھا۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ اب مجھے کرنل کی فکر ہو رہی تھی۔ ایک برسٹ کے بعد وہ خاموش تھا اور نظر بھی نہیں آرہا تھا۔ ہم ٹیلوں کے شمالی سمت آگئے تھے اور مغربی حصے یعنی سامنے کی طرف جارہے تھے۔ اچانک ٹیلے کے اوپری حصے سے آہٹ ہوئی تو میں زینی کو کھینچتے ہوئے ایک کسی قدر نچلے چھجے کی آڑ میں ہوگیا۔ اوپر سے برف گر رہی تھی۔ کوئی نیچے آرہا تھا۔ زینی مجھ سے چپک گئی تھی۔ پتا نہیں اس میں خوف کا دخل تھا یا پھر وہ موقع سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اچانک اوپر سے دھم سے کوئی کودا اور میں بے ساختہ فائر کرتے کرتے رک گیا۔ وہ کرنل تھا۔ میں نے ہلکی سی آواز نکالی۔ "شش۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کا تنا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ باہر کیسے آئے باقی کہاں ہیں؟"

"سب آچکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "درمیان سے دیوار توڑ کر ہم ایک غار میں آئے اور اس سے باہر نکل آئے۔ کیا تم اب ہٹو گی۔" آخری جملہ میں نے زینی سے کہا تو وہ جھینپ کر دور ہوگئی۔ کرنل چونکا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا اس غار کا؟"

"بس پتا چل گیا۔" میں نے مبہم انداز میں جواب دیا۔ "میرا خدشہ درست تھا۔ اوشا کو یہیں رکھا ہوا تھا۔" میں نے اسے اوشا کا کڑا دکھایا۔ "اس جگہ کو برفانی آدمی رفع حاجت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہاں جتنی مقدار میں فضلہ موجود ہے اس سے لگتا ہے یہاں خاصی تعداد میں برفانی آدمی موجود ہیں۔ ویسے ان کے فضلے کی

بدبو بھی کم خوفناک نہیں ہے۔ آدمی چند منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رہ سکتا۔ دو برفانی آدمی پھر سے سامنے مارے گئے۔''

کرنل نے سر ہلایا۔ ''کم سے کم تین میں نے مارے ہیں۔''

''ایک میرے ہاتھوں مرا ہے اور ایک باسو کے ہاتھ۔''

''ایک کو میں نے شوٹ کیا تھا۔'' زیبی نے لقمہ دیا۔ ''مگر وہ مرا نہیں تھا بھاگ گیا تھا۔''

''آس پاس سکون بتا رہا ہے کہ فی الحال وہ پسپا ہو گئے۔'' کرنل نے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے فوری روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''لیکن کہاں اور کیا رات کی تاریکی میں سفر محفوظ ہو گا؟'' زیبی نے پوچھا۔

''نہیں مگر یہاں ٹھہرنا زیادہ رسکی ہے۔'' کرنل بولا اور پیچھے کی طرف بڑھا جہاں ڈیوڈ شا موجود تھا اس نے اس سے بات کی اور اس نے بھی فوری روانگی کے حق میں فیصلہ دیا۔ باسو نے بتایا کہ جب وہ غار سے نکل رہے تھے تو کم سے کم دو برفانی آدمی اندر آئے تھے اور اس کے بعد دھماکا ہوا تھا۔ اس طرح سے مارے جانے والے برفانی آدمیوں کی تعداد چھ ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود اس سے زیادہ کی موجودگی عین ممکن تھی۔ ہم فوری چل پڑے۔ کچھ سامان چھوڑ دیا تھا جیسے مارک کا ذاتی سامان اور وزن کم کرنے کے لیے ایسی اشیا جن کی ضرورت کم تھی وہ بھی چھوڑ دی تھیں۔ باقی سب سامان سلیج پر باسو سمیت لاد کر ہم آگے روانہ ہوئے۔ پہلے کی طرح میں اور سین سلیج کو کھینچ رہے تھے۔ ڈیوڈ شا جی پی ایس پر لوکیشن چیک کر رہا تھا اور پھر اس نے نقشہ دیکھا۔ میں نے پوچھا۔

''ہم وادی سے کتنی دور ہیں؟''

''تقریباً بیس میل۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ابھی ہم چڑھ رہے ہیں اس لیے رفتار سست ہو گی لیکن جلد ہمیں وادی کی طرف جانے والی ڈھلان ملے گی اور رفتار بڑھ جائے گی۔''

''رفتار تیز کرو۔'' میں نے سین سے کہا۔ ''ہمیں جلد یہاں سے دور نکل جانا ہے۔''

سین اپنی پوری کوشش کر رہا تھا میری بات سن کر اس نے رفتار تیز کی تھی۔ عقب میں باسو برف میں چھڑی مار کر سلیج کی رفتار کو بڑھا رہا تھا۔ کرنل اور زیبی ڈیوڈ شا کے ساتھ تھے۔ تاریکی تقریباً مسلط ہو چکی تھی۔ ہم نے سلیج پر لگی لائٹس آن کیں اور ساتھ ہی ہاتھوں میں موجود ٹارچیں بھی روشن کر لیں۔ ہم درے کے اوپری حصے کی طرف جا رہے تھے اور ابھی اوپر پہنچنے میں وقت تھا۔ سین نے کہا۔ ''کوئی آس پاس ہے۔''

''توجہ مت دو۔'' میں نے کہا۔ ''جب تک ہم بھاگ رہے ہیں وہ پاس نہیں آئیں گے۔''

''یہ...... تم کیسے...... کہہ سکتے ہو؟''

''جانور ہمیشہ اس وقت حملہ کرتا ہے جب اس کا شکار بے خبری میں ہو جب کہ اس وقت ہم ہوشیار اور حرکت میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہماری توجہ ہٹانے کے لیے وہ ڈرائے گا۔''

ابھی میں نے کہا تھا کہ عقب سے حیوانی چیخوں کی آواز آئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے چیخنے والے ہمارے تعاقب میں ہوں۔ ان چیخوں میں ڈرانے والا تاثر تھا۔ سین خوفزدہ ہو گیا۔ ''وہ ہم تک آ رہے ہیں۔''

''وہ ہمارے آس پاس ہیں مگر میں نے کہا نا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ابھی حملہ نہیں کریں گے۔''

کرنل نے چیخوں کے جواب میں پلٹ کر کچھ فائر کیے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''وقت مت ضائع کرو اپنی توجہ چلنے پر لگاؤ۔ وہ ہمیں خوفزدہ کر رہے ہیں۔''

''شہباز ٹھیک کہہ رہا ہے عقب پر توجہ مت دو ابھی وہ حملہ نہیں کریں گے۔'' ڈیوڈ شا نے بھی وہی بات کی۔ ''ہمیں بہر صورت آج ہی وادی کے کنارے پہنچنا ہے اسی صورت میں ہم ان سے بچ سکتے ہیں۔''

ڈیوڈ شا اپنی ہمت سے بڑھ کر دوڑ رہا تھا مگر اس کا لہجہ اور سانس حیرت انگیز طور پر ہموار تھی۔ کرنل نے کوئی جواب نہیں دیا غالباً اسے پسند نہیں آیا تھا کہ ڈیوڈ شا میری تائید کرے۔ کرنل کو میں نے عام طور سے معقول آدمی پایا تھا مگر بعض اوقات وہ ایب نارمل حرکتوں پر اتر آتا تھا حالانکہ اس جیسے آدمی کو ہر فیصلہ میرٹ پر کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال آدمی ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہوتا ہے خوبیاں اور خامیاں سب میں ہوتی ہیں۔ بات کرنے سے بھی سانس ضائع ہو رہا تھا اس لیے میں نے تو خاموشی اختیار کر لی۔ ان تھک قدم اٹھاتے ہوئے مجھے اوشا کا خیال آیا۔ ان ٹیلوں میں ایک اور غار ملا تھا اس کا مطلب تھا کہ وہاں مزید غار ہو سکتے تھے اور اوشا ان غاروں میں سے کسی میں ہو سکتی تھی۔ مگر اتنی مارا ماری اور ہنگامے کے باوجود اس کی ایک آواز بھی نہیں آئی تھی۔

اگر وہ وہیں تھی تو بے بس تھی یا بے ہوش تھی یا پھر کسی

ایسی جگہ تھی جہاں سے آواز باہر نہیں آسکتی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ کاش میں اسی وقت دیوار میں سوراخ کرنے کی کوشش کرتا جب میں نے دوسری طرف سانسوں کی آواز سی تھی۔ سانسوں کی آواز یقیناً اوشا کی تھی اور شاید وہ اس وقت ہوش میں نہیں تھی یا پھر سہمی ہوئی تھی جو آواز نہیں نکال رہی تھی۔ مگر ہو سکتا تھا کہ یہ صرف میرا خیال ہو اور اوشا درحقیقت وہاں آئی ہی نہ ہو۔ جہاں تک کڑے کی بات تھی تو وہ برفانی آدمی بھی لاکر وہاں ڈال سکتا تھا۔ اس کے باوجود میرا دل کہہ رہا تھا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ اوشا وہاں لائی گئی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ڈیوڈ شا کی بات درست ثابت ہوئی تھی کہ اوشا زندہ ہے البتہ وہ مجھے ملی نہیں تھی۔ شاید ڈیوڈ شا کا علم درست ہو کہ اوشا زندہ ہے اور بعد میں مجھے ملے گی۔ لیکن میں اس پر آنکھ بند کر کے یقین کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

مسلسل دوڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بالآخر درّے کے اوپر حصے میں پہنچ گئے۔ حالانکہ ہم سلیج بھی کھینچ رہے تھے۔ اس کے باوجود ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی ہم سے پیچھے رہ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا دور تک پھیلے ہموار برف کے میدان پر صرف ان لوگوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ میں اس برف زار کے کناروں کو دیکھنے لگا۔ میرا اندازہ تھا کہ برفانی آدمی سیدھے راستے سے آنے کی بجائے اس طرف سے ہمارے پیچھے آسکتے تھے۔ اگر چاند نکل آتا تو اس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنا آسان ہوتا مگر آسمان پر چند ایک تارے ضرور تھے مگر چاند فی الحال نہیں نکلا تھا۔ میں نے وادی والی سمت کی طرف دیکھا تو ڈھلان واضح طور پر نیچے جاتی دکھائی دی تھی۔ اس پر سلیج از خود چلتی اور ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ چند منٹ بعد کرنل، ڈیوڈ شا اور زینی آگئے۔ تینوں ہانپ رہے تھے اور ہمارا سانس اب بہتر تھا۔ ڈیوڈ شا نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

”رکو مت تم لوگ آگے جاؤ۔“

”اور تم لوگ؟“ میں نے کہا تو کرنل نے اپنے سامان سے اسکیٹ بورڈ نکالے مگر یہ پہیوں والے نہیں بلکہ برف پر پھسلنے والے اسکیٹ بورڈ تھے وہ تینوں انہیں پیروں میں جوتوں کے ساتھ فکس کرنے لگے۔ میں نے سلیج آگے دھکیلی اور اس کے ساتھ ہی چل پڑے۔ ڈھلان کی دوسری رخ پر آکر اندازہ ہوا کہ سلیج کھینچنا کتنا مشکل کام تھا اب اس مشکل سے نجات ملی تو بہت آسانی ہو گئی تھی۔ ہم تیز رفتاری سے سفر کر رہے تھے مگر اصل مزے تو ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی کے ہوئے تھے۔ ہم کوئی سو گز آگے نکلے تھے جب انہوں نے ڈھلان سے سفر شروع کیا اور چند منٹ بعد وہ ہم سے آگے نکل گئے تھے۔ وہ مزے سے بورڈ پر کھڑے تھے اور وہ پھسلتا ہوا آگے جا رہا تھا۔ اگر ہمیں سلیج کے ساتھ رہنے کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم بھی بورڈ استعمال کر سکتے تھے۔ بہر حال مسئلہ اب زیادہ نہیں تھا کیونکہ پیروں کو زحمت دیئے بغیر بھی ہماری رفتار خاصی تیز تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم چھ سات میل فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہے تھے اور اس رفتار سے ہم دو سے ڈھائی گھنٹے میں وادی کے کنارے پہنچ جاتے۔ مگر رفتار تیز ہونے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم خطرے سے دور نکل گئے تھے۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ برفانی آدمی ہمارے پیچھے ہوں گے۔ میں نے اس کے جو قصے سنے تھے اور پھر خود اسے دیکھا تھا تو لگ رہا تھا کہ ضدی اور خونخوار جانور آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ہمیں سلیج کو کھینچنا نہیں پڑ رہا تھا بلکہ بعض جگہوں پر اس کی رفتار ہماری رفتار سے بڑھ جاتی تھی اور اسے روکنا پڑتا تھا۔ رفتار کی وجہ سے خطرہ تھا کہ سلیج عقب سے ہم پر نہ چڑھ جائے۔ اس لیے اب ہم اس کے آگے کی بجائے دائیں بائیں دوڑ رہے تھے اور باسو کو بھی پیچھے سے ایڑ نہیں لگانی پڑتی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ہم سانس درست کرنے کے لیے رکے تھے۔ ڈیوڈ شا، کرنل اور زینی جب دیکھتے کہ وہ آگے نکل گئے ہیں تو وہ رفتار ذرا کم کر لیتے تھے کہ ہم ان کے پاس پہنچ جائیں۔

ساڑھے آٹھ بجے چاند طلوع ہوا یہ درمیانہ چاند تھا مگر اس برف زار میں اس کی روشنی دوسری جگہوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے چند منٹ میں ماحول روشن ہو گیا اور کئی سو گز تک بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ ہم نے سکون کا سانس لیا ورنہ تاریکی میں روشنی ہونے کے باوجود فکر تھی کہ برفانی آدمی کسی طرف سے حملہ نہ کر دیں اور ہم بے خبری میں ان کا نشانہ بن جائیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ان کی سنگ باری کی تھی میں دیکھ چکا تھا کہ وہ کئی کلوگرام وزنی پتھر کتنی قوت سے اور درست نشانے پر مارتے تھے۔ کرنل کا شانہ ابھی تک مضروب تھا مگر وہ ہمت کر کے کام چلا رہا تھا۔ اسے زخموں کا تجربہ تھا۔ ممکن ہے اس کی جگہ سین ہوتا تو کسی کام کا نہ رہتا تھا۔ دس منٹ آرام کے بعد ہم دوبارہ روانہ ہوئے اور ڈیوڈ شا نے خوشخبری سنائی کہ وادی اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

مجھے عجیب سا لگا میں کب سے اس وادی کے بارے میں سنتا آرہا تھا۔ اس کے عجائبات میں نے خود دیکھے تھے۔ راجا عمر دراز کے محل میں وہ تصویر جس میں عجیب و غریب

جانداروں کی تصویر کشی کی گئی تھی یہ کردار کبھی کبھی متحرک ہو جاتے تھے۔ وہ پتھر نما چیز جس میں کوئی سیال بھرا ہوا تھا جو روشنی جذب کر کے خود روشن ہو جاتا تھا اور جب اسے تاریکی میں رکھا جاتا تو رفتہ رفتہ دوبارہ سیاہ ہو جاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ حیرت انگیز چیز جو حکیم قادس اپنی دواؤں میں استعمال کرتا تھا اور وہ نہ صرف زخم حیرت انگیز تیزی سے بھر دیتی تھیں بلکہ ناکارہ ہو جانے والے اعضا کو بھی ٹھیک کر دیتی تھیں۔ میرا بایاں ہاتھ اب تک میرے جسم سے جڑا ہوا تھا اس میں ان دواؤں کا بنیادی کردار تھا۔ یہ سب چیزیں اس وادی سے تعلق رکھتی تھیں جو بذاتِ خود کسی عجوبہ سے کم نہیں تھی۔ ہمالیہ کے عظیم الشان برف زار کے عین وسط میں یہ وادی حیات کے لیے سازگار ماحول رکھتی تھی اور یہاں نہ صرف انسان آباد تھے بلکہ ایسے جاندار بھی تھے جو دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں پائے جاتے تھے وہاں ایک سنہری اہرام تھا جو اصل میں پجاریوں کی طاقت کا مرکز تھا۔ ایک خوب صورت اور آباد شہر تھا۔ یونانیوں جیسے نقوش اور خوب صورت جسموں والے لوگ اس وادی میں رہتے تھے۔ مگر وہ بس اسی لحاظ سے ذرا مختلف تھے ورنہ انسانوں والی تمام خوبیاں اور خامیاں ان میں موجود تھیں۔

بارہا ایسا ہوا کہ راجا عمر دراز نے مجھے یہاں آنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور ڈیوڈ شا نے مجھے اس مقصد کے لیے بلیک میل تک کیا مگر میں کبھی اس پر دل سے آمادہ نہیں ہو سکا تھا۔ شاید اسی وجہ سے حالات میرے موافق ہو جاتے تھے اور میں یہاں آنے سے بچتا رہا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ بالآخر اسے چھری تلے آنا ہی پڑا۔ اب میں وادی کے نزدیک تھا اور اس خطے میں فی الحال یہی ہمارے لیے جائے پناہ رہ گئی تھی۔ موسم، خوراک اور سب سے بڑھ کر پیچھے آتے برفانی آدمی تھے۔ جن سے بچنے کے لیے وادی میں اترنا لازمی تھا۔ مگر اولین مرحلہ اس کے کنارے پہنچنے کا تھا اور ابھی ہم اس سے دور تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے لگا جیسے دور کہیں زمین سے پر دھند ہو۔ میں نے سین سے پوچھا تو اس نے بھی دھند دیکھنے کی تصدیق کی۔ ڈیوڈ شا اور دوسرے آگے تھے اور اب وہ تیزی سے سفر کر رہے تھے۔

شاید انہوں نے بھی دھند دیکھ لی تھی اور اب وہ جلد از جلد وادی کے کنارے پہنچ جانا چاہتے تھے۔ میں نے اور سین نے بھی تھکن کے باوجود رفتار تیز کی۔ چاند نکل آنے سے ہمیں آسانی ہوئی تھی اور اب ہمیں روشنیاں سنبھالنے کی زحمت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ اس لیے ہمارے قدم تیز اٹھ رہے تھے۔ دھند واضح نظر آنے لگی تھی مگر ساتھ ہی وہ غائب بھی ہو رہی تھی اس کے مرغولے اوپر اٹھ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ چاند کی روشنی میں یہ منظر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے بے شمار برفانی علاقے دیکھے ہیں اور پاکستان کے سارے شمالی علاقے میں گھوما ہوں لیکن ایسی مرغولے بناتی دھند میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی تھی۔ جیسے جیسے ہم نزدیک جا رہے تھے ویسے ویسے چٹانیں نمایاں ہو رہی تھیں یہ زمین سے زیادہ بلند نہیں تھیں۔ کسی فصیل کی طرح نیم دائرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ چٹانیں اصل میں وادی کی دیواریں تھیں۔ ان چٹانوں کے درمیان میں کہیں راستہ تھا جو وادی کے اندر جاتا تھا۔ اس راستے پر وادی کا نگران برف والا بیٹھا ہوا تھا۔

برف والا ایک اور حیرت انگیز کردار تھا جو اس وادی کے دوسرے تمام عجائبات پر حاوی تھا۔ ایک ایسا لاغر اور معمر بوڑھا جو نہایت سرد ماحول میں نہ ہونے کے برابر لباس میں رہتا ہے اور صرف برف کھاتا ہے۔ وہ اتنی طویل عمر رکھتا ہے کہ وادی کے لوگ جو خود بھی طویل عمر رکھتے ہیں وہ بھی اسے کئی نسلوں سے ایسا ہی دیکھ رہے ہیں اور روایت کے مطابق جب ایک برف والا مرنے لگتا ہے تو وہ نیچے وادی میں آ کر اپنا جانشین چن کر اوپر لے جاتا ہے اور اسے اپنے علوم اور دوسری چیزیں سونپ کر مر جاتا ہے۔ جب سے یہ بات کھلی کہ برف والا مجھے طلب کر رہا ہے تو میرے ساتھیوں نے مذاق میں کہنا شروع کر دیا کہ وہ مجھے اپنا جانشین تو نہیں بنانا چاہ رہا ہے اور میں ان کی بات کو ہنس کر ٹالتا رہا۔ اس وقت مجھے یہ سب بہت دور لگ رہا تھا۔ کیونکہ نہ میرا وادی کی طرف جانے کا ارادہ تھا اور نہ ہی میں نے اس بارے میں سوچا تھا۔

مگر اب میں وادی کے سامنے تھا اور برف والا پُراسرار بوڑھا جس نے وادی میں اترنے کے لیے میری آمد کی شرط رکھی تھی۔ یہاں سے کچھ ہی دور تھا۔ جلد کھل کر سامنے آنے والا تھا کہ میری آمد کی شرط اس نے کیوں رکھی تھی۔ اسے مجھ سے ایسا کیا مطلب تھا کہ اس نے راجا عمر دراز اور ڈیوڈ شا کے سامنے شرط ہی یہ رکھ دی کہ جو مجھے لے کر آئے گا اسے ہی وادی میں اترنے کا راستہ ملے گا۔ چاند اوپر آنے سے منظر واضح ہو رہا تھا اور چٹانیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے پیچھے سے اٹھنے والی دھند اب مرغولے دار نہیں رہی تھی بلکہ وہ جیسے کناروں پر ٹھہر رہی تھی

اور چٹانوں سے امنڈ کر میدانوں کی طرف آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر باہر آنے والی دھند اتنی کم تھی کہ وہ زیادہ دیر ٹھہر نہیں پاتی تھی اور ہوا میں غائب ہو رہی تھی۔ سردی اسے منجمد کر رہی تھی اور شاید پانی اور برف میں تبدیل کر رہی تھی۔

جب میں غار میں تھا تب ہی مجھے مثانے میں دباؤ محسوس ہونے لگا تھا مگر وہاں مجھے موقع نہیں ملا اور پھر مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ اس کے بعد فرار کا ایسا مرحلہ آیا جس میں رکنے کا مطلب موت کا شکار ہونا بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے راستے میں بھی موقع نہیں ملا مگر اب معاملہ برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ چٹانیں اب نصف کلومیٹر دور تھیں اور ڈھلان ختم ہونے سے اب ہمیں سلیج کو کھینچنا پڑ رہا تھا۔ میں نے سین سے کہا۔ ”تم سلیج لے جاؤ میں آتا ہوں۔“

”نہیں۔“ باسو غرایا۔ ”تم کہیں نہیں جاؤ گے۔“

”میں جا نہیں رہا مجھے حاجت ہو رہی ہے۔“

”تب ہم بھی رکے ہیں۔“ باسو بولا اور اس نے اپنی چھڑی برف میں گاڑ کر سلیج روک لی۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھے اکیلے رکنے کا یا کہیں جانے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور نزدیکی چھوٹے سے برف کے ڈھیر کی طرف بڑھ گیا۔ پتلون کی زپ نیچے کرتے ہوئے میں آس پاس سے ہوشیار تھا۔ برفانی آدمیوں کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارا... پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر وہ فوری تعاقب میں نہ بھی آئے تب بھی ہمارے پیچھے ضرور آئیں گے اور ان کی آمد سے پہلے ہمارا وادی میں اتر جانا لازمی تھا۔ چند منٹ میں، میں فارغ ہو کر آیا تو کرنل بھی ہماری طرف آ رہا تھا اسے بھی ہمارے رکنے سے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ وہ لوگ چٹانوں کے پاس پہنچ گئے تھے اور سامان اتار دیا تھا۔ میں نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا اور سلیج کی رسی تھام لی۔ میں نے اور سین نے کھینچنا شروع کیا باسو ہماری مدد کر رہا تھا اور دس منٹ میں ہم چٹانوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ڈیوڈ شا روشنی لیے چٹانیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”جہاں تک میری معلومات ہے نیچے اترنے کا راستہ یہاں سے نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں یہاں رات گزارنے کے لیے جگہ دیکھ رہا ہوں۔ یہاں اسنو مین کا خطرہ کہیں زیادہ ہوگا۔“

میں نے سر ہلایا کہا۔ ”ہمیں ٹھکانا محفوظ چاہیے مگر ساتھ ہی ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔“

”یہاں ایک تنگ سی جگہ ہے جس میں برفانی آدمی اپنی جسامت کی وجہ سے آسانی سے نہیں گھس سکتے ہیں۔“

”ایسی جگہ باسو کیسے جائے گا؟“ میں نے نقطہ اٹھایا۔

”باسو باہر رہے گا۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

میں حیران نہیں ہوا مگر سوال ضرور کیا تھا۔ ”یعنی تم اسے ان درندوں کے سامنے بے یار و مددگار چھوڑ دو گے؟“

”مجبوری ہے ایک آدمی کی خاطر سب کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔“ ڈیوڈ شا نے کہا اور چٹانوں میں ایک طرف غائب ہو گیا۔ شاید اسے وہ جگہ نظر آ گئی تھی۔ ہم سب ایک ہی جگہ تھے کرنل ایک طرف اپنے بیگ پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ وہ عادی سگریٹ نوش نہیں تھا میں نے صرف فارغ اوقات میں اسے تمباکو نوشی کرتے دیکھا تھا۔ سین اس کے پاس چلا گیا اور اس سے سگریٹ لے کر پینے لگا۔ زینی باپ کے ساتھ لگی ہوئی تھی مگر وہ چٹانوں کے اندر نہیں گئی تھی۔ ڈیوڈ شا یقیناً پاس تھا۔ وہ اکیلا سب سے دور جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا جب کہ اسے معلوم تھا کہ خطرہ آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔ میں نے پہلے چٹانوں کو پاس سے دیکھا۔ ان کی ساخت کچھ عجیب سی تھی جیسے گولی لگنے سے کوئی فولادی چادر پھٹ جائے اور دوسری طرف اس کی جو ساخت بنتی ہے ویسی ہی ساخت ان چٹانوں کی تھی۔ جیسے ان کے اندر سے کوئی چیز بہت قوت سے نکلی ہو اور اس نے چٹانوں کو یہ شکل دی ہو۔ نوکیلی کٹی پھٹی اور مہیب سی ساخت تھی۔

نوکوں سے دھند جیسے ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہی تھی میں نے پاس جا کر دیکھا تو بیچ بیچ دھند پانی کے باریک قطروں میں بدل کر نیچے گر رہی تھی اور یہ قطرے پھیل کر برف کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ وادی میں برف باری اور بارش سے جو پانی جاتا تھا اس کا انخلا وادی سے اسی دھند کی صورت میں ہوتا تھا ورنہ پانی کی نکاسی نہ ہوتی تو اس وادی کی جگہ یہاں کوئی بہت بڑی جمی ہوئی جھیل ہوتی۔ پانی کے اسی انخلا کی وجہ سے یہاں آبادی ممکن ہوئی تھی۔ ڈیوڈ شا کو چٹانوں میں گھسے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تھے۔ مگر زینی اطمینان سے اپنی جگہ موجود تھی۔ اس لیے باقی بھی مطمئن تھے۔ بالآخر ڈیوڈ شا اندر سے برآمد ہوا اور اس نے اشارہ کیا۔ اس نے جگہ تلاش کر لی تھی۔ سب نے سامان اٹھایا۔ میں اور سین دوبارہ سلیج کھینچنے لگے اور ہم چٹانوں میں داخل ہوئے یہاں بھی شروع میں برف جمی ہوئی تھی لیکن

جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے برف کم ہو رہی تھی۔ ایک جگہ برف بالکل ہی ختم ہو گئی۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔
"سب سیج نہیں کھینچ سکتے۔"
"پہلے سامان اندر پہنچاؤ۔" اس نے کہا۔ کرنل، سین اور زیبی سامان اٹھا کر لے جانے لگے۔ میں وہیں ایک جگہ بیٹھ گیا یہاں چاند کی روشنی بہت کم تھی اور لائٹس آن کرنا پڑی تھیں۔ باسو سیج پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یوں بے فکر تھا جیسے اپنے آرام دہ اور محفوظ گھر میں بیٹھا ہو میں نے کبھی اسے اپنی ذات کی پروا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے آقا اسے بلا جھجک موت کے منہ میں جھونک دیتے تھے اور وہ بلا جھجک چلا بھی جاتا تھا۔ اس سے جو کہا جاتا وہ وہی کرتا تھا نہ تو اپنا دماغ استعمال کرتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی فکر کرتا تھا۔ وہ زمانہ قدیم کے غلاموں کی طرح تھا جو اپنے آقا کے حکم پر ہنسی خوشی اپنی جان دے دیتے تھے۔ کرنل آخری بیگ لینے آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "باسو کا کیا ہوگا؟"
"یہ اندر نہیں جا سکے گا۔" کرنل نے کہا۔ "راہ داری بہت تنگ ہے۔ اگر اس کے پاؤں میں مسئلہ نہ ہوتا تو شاید کسی نہ کسی طرح رگڑ کھا کر چلا جاتا مگر اس کنڈیشن میں بہت مشکل ہے۔"
میں نے کہا۔ "اگر یہ یہاں رہے گا تو برفانی آدمیوں کا آسان شکار بن جائے گا۔"
"تم اس کی فکر مت کرو۔" کرنل نے سرد لہجے میں کہا اور شاٹ گن کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مجھے دو۔"
"کس خوشی میں؟" میں نے انکار کیا۔ "اگر یہ میرے پاس ہے تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟"
"گن دو۔" باسو غرایا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی مہیب شاٹ گن کا رخ میری طرف تھا۔ اس حال میں بھی اسے اپنی ڈیوٹی یاد تھی جب کہ اس کے آقا کو اس کی زندگی کی خاص پروا نہیں تھی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کرنل مسکرایا اور اس نے ہاتھ آگے کیا تو میں نے بادل ناخواستہ شاٹ گن شانے سے اتار کر اس کی طرف بڑھا دی اور طنزیہ لہجے میں کہا۔
"دیکھتے ہیں کب دوبارہ مجھے دیتے ہو؟"
کرنل نے تسلیم کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ گن تم کو دینی پڑے مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے۔"
کرنل بیگ اور شاٹ گن لے کر اندر چلا گیا۔ باسو نے اپنی شاٹ گن رکھ لی اور پہلے کی طرح بے نیاز نظر آنے لگا تھا۔ وہ اس روبوٹ کی طرح تھا جس میں مکمل پروگرام فیڈ ہوتا ہے کہ اسے کس صورت حال میں کیا کرنا ہے اور وہ اپنا کام کر کے دوبارہ ساکت ہو جاتا ہے۔ میں بھی اندر کی طرف بڑھا۔ چٹانوں کے درمیان ایک پتلا سا راستہ تھا جو اوپر سے مزید تنگ ہو رہا تھا اور اوپر سے کسی کے اندر گھسنے کا امکان کم تھا۔ آگے جا کر دراڑ خاصی تنگ ہو گئی تھی اور میں بھی اس سے پھنس کر جا رہا تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ سامان کیسے اندر لے گئے تھے۔ باسو کی جسامت کا آدمی کسی صورت اندر نہیں جا سکتا تھا اور اسی طرح برفانی آدمیوں کے اندر گھسنے کا امکان بہت کم تھا۔ شاید وہ اندر گھس آتے لیکن بے خبری میں حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں بہت آسانی سے روکا جا سکتا تھا۔ دراڑ کے آخری حصے میں ایک چھوٹا سا بند کمرا تھا۔ بند یوں کہ اس کے اوپر چھت تھی۔ سب سامان سمیت وہیں تھے۔ بہ ظاہر یہ جگہ محفوظ تھی لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں نے ڈیوڈ شا سے کہا۔
"کہیں یہ جگہ ایک غار اور نہ ثابت ہو اور ہم پھنس کر رہ جائیں۔"
"کیا مطلب؟"
"ہمیں باہر پہرے کا انتظام کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہاں آمد و رفت کا راستہ ایک ہی ہے اور برفانی آدمیوں نے اسے بلاک کر دیا تو ہم یہیں پھنس کر رہ جائیں گے۔"
ڈیوڈ شا نے نفی میں سر ہلایا۔ "باہر خطرہ ہے۔"
خلاف توقع کرنل نے میری حمایت کی۔ "میرا خیال ہے شہباز ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں بالکل ہی اندر محصور ہو کر نہیں رہنا چاہیے۔ باہر کسی جگہ پہرہ ہوتا کہ ہم برفانی آدمیوں کو باہر ہی روک سکیں۔"
"اور جو باہر ہوگا......" ڈیوڈ شا نے کہنا چاہا۔
"باسو باہر ہی ہے اور ہم اس سے بھی کام لے سکتے ہیں مگر ایک آدمی اور ہونا چاہیے۔"
کسی قدر غور و خوص کے بعد ڈیوڈ شا نے سر ہلا دیا۔ "ٹھیک ہے تم لوگ آپس میں مکمل طے کر لو کہ کس طرح یہ کام ہونا ہے لیکن اب کوئی جانی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں کل بہر صورت وادی میں اترنا ہے۔"
کرنل نے میری طرف دیکھا۔ "تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟"
"ہاں اگر ہم ان چٹانوں پر کہیں چیک پوسٹ بنا لیں جہاں سے دور تک نظر رکھی جا سکے تو مناسب ہوگا اور آپس میں رابطے کے لیے آلات ضروری ہیں۔"
کرنل نے اپنے مخصوص بیگ سے چھوٹا ریڈیو سیٹ

نکالا۔ ان کے بلوٹوتھ ہیڈ سیٹ آرام سے کان میں فٹ ہو جاتے تھے اور مائک اتنا طاقتور تھا کہ سرگوشی کی آواز بھی کیچ کر لیتا تھا۔ سیٹ جیب میں رکھے جا سکتے تھے مگر ایک کلپ کی مدد سے جیکٹ کے کالر سے لگانے پر ان کی رینج بڑھ جاتی تھی اور یہ بند جگہوں پر بھی دو سو گز کی دوری تک کام کر سکتے تھے۔ میں اور کرنل باہر آئے۔ باسو اپنی جگہ خالی ہو جانے والی سلیج پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرنل نے اس سے سلیج خالی کرائی اور اسے چٹان کے ساتھ ٹکرا کر اوپر چڑھ گیا۔ اوپر جا کر اس نے آس پاس کا جائزہ لیا اور پھر مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی چڑھ گیا۔ یہاں سے آس پاس کی چٹانیں اور عقب میں دور تک پھیلے برفانی میدان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ کرنل نے ذرا آگے ایک تاج کی طرح اونچی ہوتی چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ''نگران پوسٹ کے لیے وہ کیسی رہے گی؟''

''بہترین لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''وہ کیا؟''

''ایک طرف تو تم لوگ مجھ پر اعتماد کر رہے ہو مجھے ہر معاملے میں شامل کر رہے ہو۔ دوسری طرف مجھے اسلحہ دیتے ہوئے ڈر رہے ہو۔''

وہ مسکرایا۔ ''آسان سی بات ہے۔ تم ہمارے ساتھ تمام خطرات کے سامنے ہو۔ اس لیے لازمی ہمارا ساتھ دے رہے ہو مگر اسلحہ ہاتھ میں آنے کی صورت میں تمہارے خیالات بدل سکتے ہیں اور تم اس کی مدد سے ہمیں مجبور کر سکتے ہو۔''

میں سمجھ رہا تھا مگر میں نے جان بوجھ کر اس سے یہ سوال کیا تھا۔ ''فرض کرو کہ میں اسلحہ چھین لوں۔ مجھے بہت سے مواقع ملے بھی تھے۔''

''تب تم نے اسلحہ کیوں حاصل نہیں کیا؟'' کرنل نے پوچھا اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب بھی دیا۔ ''تم جانتے ہو کہ اکیلے تم سب کو کنٹرول نہیں کر سکو گے اس لیے اسلحہ حاصل کرنا بھی بیکار ہوگا۔''

''جب تم یہ جانتے ہو تب مجھے ہتھیار کیوں نہیں دے رہے؟''

''بتایا نا کہ تمہارے ذہن میں اچانک کوئی خیال آئے اور تم ہتھیار کے زور پر اس پر عمل کر گزرو۔ ہو سکتا ہے وہ ہمارے پلان یا پالیسی میں نہ ہو اس صورت میں نقصان ہمارا ہوگا۔'' کرنل کہتے ہوئے اس تاج نما چٹان کی طرف بڑھ گیا اس کی آگے سے اٹھ جانے والی کگر نما دیواروں کے پیچھے ایک پیالہ نما جگہ تھی اور اس میں آرام سے ایک دو آدمی

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ جدہ (سعودی عربیہ) 1979ء میں یہ قانون نافذ ہو گیا تھا کہ کوئی بھی خاتون ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہیں نہا سکتی۔

☆ سموا میں بیوی کی سالگرہ کی تاریخ بھول جانا بہت بڑا جرم ہے۔ اس جرم پر سزا بھی ہو سکتی ہے۔

☆ انگلینڈ میں پارلیمنٹ کے اندر مرنا جرم سمجھا جاتا ہے (اب یہ نہیں معلوم کہ بے چارے اچانک فوت ہو جانے والے کو کیا سزا دی جاتی ہے)

☆ انگلینڈ کی ڈاک کے ٹکٹ پر ملکہ کی تصویر بنی ہوتی ہے اگر آپ نے غلطی سے ٹکٹ چپکاتے ہوئے الٹا چپکا دیا۔ یعنی سر نیچے کر دیا تو یہ جرم ہے۔

☆ انڈیانا میں باربی جیسی ڈریسنگ کرنا قانون کے خلاف ہے۔ چاہے آپ عورت ہوں یا مرد۔

☆ ٹیکساس میں کسی کو خالی پستول سے دھمکانا بہت بڑا جرم ہے۔

☆ آسٹریلیا میں اس جانور کا نام لینا جرم ہے جس کو آپ نے کھانے کا پروگرام بنایا ہے۔ (سمجھ سے باہر ہے کہ یہ کیسا قانون ہے اگر مجھے رات کے کھانے میں بیف کڑاہی کھانی ہو تو مجھے کہنا پڑے گا کہ رات کو چقندر کڑاہی بنا لینا یا اسی قسم کی کوئی اور چیز)۔

☆ کینز (فرانس کا ایک مشہور شہر) وہاں جیری لوئیس کا ماسک پہننا منع ہے (جیری لوئیس ایک بہت بڑا اداکار تھا)۔

☆ نیوجرسی میں اگر کوئی ٹریفک پولیس والا روک کر پوچھے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو کیوں روکا ہے اور آپ یہ جواب دیں کہ نہیں میں نہیں جانتا تو تین سو ڈالر سیدھا جرمانہ ہوگا۔ (کیوں کہ آپ کو اپنی غلطی کا احساس خود ہونا چاہیے)۔

☆ یارک میں آپ کسی اسکاٹش کو مار سکتے ہیں بشرطیکہ اس نے قدیم علاقے کی حدود میں تیر اور کمان اٹھا رکھا ہو۔

☆ لندن میں اگر ٹیکسی چلانے والا بیمار ہو تو وہ اپنی ٹیکسی کا میٹر ڈاؤن کر کے ٹیکسی نہیں چلا سکتا۔ (سوال یہ ہے کہ وہ اگر بیمار ہی ہے تو ٹیکسی کیوں چلائے گا)۔

☆ کینٹکی میں آپ اپنے لان کی دیواروں کو سرخ رنگ نہیں دے سکتے۔

☆ پرتگال میں سمندر میں پیشاب کرنا جرم ہے۔

☆ ساؤتھ کیرولینا میں غیر شادی شدہ خواتین پینٹیز نہیں خرید سکتیں۔

☆ مونٹانا میں ٹیلی فون ڈائریکٹری کو آدھا پھاڑ دینا جرم ہے۔

☆ مشی گن میں کسی مگرمچھ کو زنجیروں سے باندھ کر آتش دان کے پاس رکھنا جرم ہے۔

مرسلہ: ہما نازیہ نازی۔ حاصل پور

بیٹھ سکتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں اتنی سردی نہیں تھی اور نیچے آنے والی دھند کا درجۂ حرارت یہاں کے ماحول سے زیادہ تھا اس لیے وہ کسی قدر گرم محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ نیچے سے آنے والی دھند کی مقدار کم ہو رہی تھی۔ اب کنارے کی طرف گرنے والی چٹانیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کرنل نے تاج نما چٹان کا معائنہ کیا اور واپس آیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”باسو یہاں تک آ سکتا ہے؟“

”ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ یہ آسان نہیں ہوگا۔“

مگر جب باسو سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ”میں جا سکتا ہوں اوپر رسی باندھ کر مجھے دو۔“

”تم کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”تم دیکھو۔“ اس نے کہا۔ کرنل نے اوپر رسیاں باندھ کر نیچے پھینکیں اس نے رسیاں اپنی بیلٹ میں کوہ پیمائی والے ہکس سے منسلک کیں اور پھر بہت آرام سے رسی کی مدد سے اوپر پہنچ گیا۔ ٹانگوں سے زیادہ اس کے بازو طاقتور تھے۔ کرنل نے تاج نما چٹان کے بالکل پاس رسی باندھی تھی اس لیے باسو کو چٹان تک پہنچنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے اپنی ٹانگ پر زور نہیں دیا اور آرام سے اوپر پہنچ گیا۔ کرنل نے مجھے کہا۔

”تم اس کے ساتھ رکو، میں تم دونوں کے لیے کھانے اور پینے کی چیزیں لاتا ہوں۔“

کرنل چلا گیا مگر کچھ دیر بعد اس کی بجائے زینی آئی وہ میرے اور باسو کے لیے کھانا پانی لے کر آئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”یہاں اتنی سردی نہیں ہے۔“

”شاید نیچے سے گرمائش آ رہی ہے۔“ میں نے کہا اور اس کے لائے سینڈوچ کھانے میں لگ گیا۔ دیر کرتا تو یہ جم جاتے اور پھر منہ میں ڈال کر پہلے انہیں گھلانا پڑتا۔ کھا پی کر میں نے آرام کا ارادہ کیا تھا کہ زینی نے کہا۔ ”کیا خیال ہے وادی کے کنارے تک چلیں؟“

میں نے اس طرف دیکھا۔ ”ہاں اب دھند صاف ہو گئی ہے اور ممکن ہے نیچے کچھ نظر آ رہا ہو۔“

زینی خوش ہو گئی۔ ”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“

ہم دونوں باسو کو وہیں چھوڑ کر چٹانوں کے اوپر سے ہوتے ہوئے وادی کے کنارے کی طرف بڑھے۔ کھنڈر نما چٹانیں کئی سو گز تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہمیں مختلف چٹانوں کو پھلانگتے ہوئے جانا پڑ رہا تھا۔ بعض مقامات پر خلا خاصے بڑے تھے اور انہیں احتیاط سے پھلانگنا پڑ رہا تھا۔ ایسی ہی ایک جگہ زینی نے چھلانگ لگائی تو کنارے پر اس کا قدم ٹھیک سے نہیں آیا تھا اور وہ پھسل کر نیچے جانے لگی تھی۔ میں نے بروقت اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس کا سانس رک گیا تھا کیونکہ نیچے خاصی گہرائی تھی اور وہ تیس پینتیس فٹ کی بلندی سے گرتی تو یقیناً شدید چوٹ لگتی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ نہیں گر رہی ہے تو اس کی سانس بحال ہوئی۔ اس نے کہا۔

”تھینک یو۔“

”میری کم بختی۔“ میں آہستہ سے ہنسا۔ ”مجھے تمہارا چیلنج یاد ہے۔“

اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم اس قسم کے آدمی لگتے نہیں ہو۔“

”آدمی آدمی ہوتا ہے اس کی کوئی قسم نہیں ہوتی ہے۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وادی کا کنارہ کچھ ہی دور تھا۔ ہم ایک چٹان پر پہنچے تو اس کے نیچے دیوار سیدھی جا رہی تھی۔ دھند اب کم رہ گئی تھی لیکن چند سو فٹ سے زیادہ دور نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ نیچے دھند بدستور موجود تھی۔ مجھے یاد آیا کہ راجا عمر دراز نے بتایا تھا کہ مکمل دھند اسی صورت میں صاف ہوتی تھی جب آسمان پر چاند نہ ہو۔ صرف ستارے ہوں۔ اگر چاند ہو تو دھند پوری طرح صاف نہیں ہوتی تھی اور اس کا کچھ حصہ باقی ہوتا تھا۔ یعنی جب تک روشنی ہوتی تھی نیچے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا تھا اور جب روشنی ہوتی تب وادی اوپر سے دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات دن میں کچھ دیر کے لیے دھند ہٹ جاتی اور سورج کی روشنی بھی نظر آتی تھی مگر یہ بس چند منٹ کے لیے ہوتا تھا۔ اس کے بعد دھند نما بادل دوبارہ چھا جاتے تھے۔ شاید یہ وادی کا سیلف ڈیفنس سسٹم تھا جس کا مقصد اس وادی کو باقی دنیا کی نظروں سے دور رکھنا تھا۔ زینی میرے ساتھ نیچے دیکھ رہی تھی اور اس نے کہا۔

”یہاں تو کچھ نہیں ہے۔“

”یہاں نہیں ہے لیکن نیچے بہت کچھ ہے۔“

”یہاں بھی بہت کچھ ہے۔“ وہ اچانک بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا ہے۔“

”میں۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا اور مخمور لہجے میں بولی۔ ”میرا حسین وجود۔“

”دونوں باتوں میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن تم مجھے کیوں بتا رہی ہو۔“

”میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔“ اس نے اپنی

بھاری جیکٹ اتار دی۔ نیچے اس نے جسم پر چسپاں گرم ہائی نیک پہنی ہوئی تھی مگر یہ اتنی فٹ تھی کہ ایک ایک انگ نمایاں تھا۔

"تم بھول رہی ہو میں سب دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "جب تم نے مجھے غلام بنایا ہوا تھا۔"

اس نے حسرت سے مجھے دیکھا۔ "کاش کہ میں تمہیں اسی وقت حاصل کر لیتی۔"

"اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" میں ہنسا۔ "مہربانی کر کے جیکٹ پہن لو یہاں سردی اتنی بھی کم نہیں ہے۔"

"تمہارے ساتھ مجھے گرمی لگنے لگی ہے اور میرا دل کر رہا ہے کہ یہ بھی اتار دوں۔" اس نے شوخی سے کہا۔ "تم نے پہلے کیا کہا تھا؟"

"شوق سے اتارو۔" میں نے جواب دیا اور اسے محاورے کا مطلب سمجھایا۔ اس کی اردو اتنی اچھی نہیں تھی۔ پھر جانے کے لیے پلٹا تو وہ سامنے آگئی۔

"میں تمہیں ایسے جانے نہیں دوں گی۔"

"پھر کیسے جانے دو گی۔"

"مجھے ایک کس دینا ہوگا۔" وہ میرے پاس آگئی۔ میں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید پیش قدمی سے روکا۔

"بس اس سے آگے مت آنا۔"

اس سے پہلے وہ کچھ کہتی یا کرتی اچانک نیچے وادی سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جاندار بولا ہو۔ آواز ایسی تھی جیسے لکڑی چٹختی ہے۔ وہ چونک گئی۔ "یہ کیسی آواز ہے؟" میں فکر مند ہو گیا۔ "پتا نہیں جیکٹ پہنو ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔"

اس نے جلدی سے جیکٹ پہنی اس کا سارا رومانی موڈ ہوا ہو گیا تھا۔ اگلی بار آواز نزدیک سے آئی اور یوں لگا جیسے وہ چیز اوپر آگئی ہو۔ میں نے زینی کا ہاتھ تھام اور تیزی سے واپس جانے لگا۔ جب چٹانیں پھلانگنے کا مرحلہ آیا تو مجھے اس کا ہاتھ چھوڑنا پڑا تھا۔ ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے لگا جیسے کئی چھوٹے چھوٹے جاندار چٹانوں کے درمیان حرکت کر رہے ہوں اور تیزی سے ہماری طرف آرہے تھے۔ میں ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا لیکن ان کی تعداد خاصی زیادہ لگ رہی تھی۔ میں اور زینی ایک جگہ تھے۔ اس سے آگے دو چٹانوں کے درمیان خلا تھا۔ ہم اس طرف سے نہیں آئے تھے مگر جلدی میں واپسی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس سمت آنکلے تھے۔ خلا زیادہ تھا اور ہمیں اسے دوڑ کر کراس کرنا تھا۔ میں نے زینی سے کہا۔ "دوڑو اور رکنا مت۔"

"ایک ساتھ جاتے ہیں۔" اس نے کہا اور ہم دونوں ایک ساتھ بھاگے۔ جیسے ہی چٹان کے کنارے پر پاؤں رکھا اچانک وہ لرزا اور ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ چٹان کا یہ حصہ نیچے گیا اور ایسا لگا جیسے ہم کسی گہرے کنویں میں گر رہے ہوں مگر یہ تاثر لمحاتی تھا۔ کچھ نیچے جانے کے بعد چٹان کا یہ ٹکڑا کسی چیز سے ٹکرایا اور ہم اس سے اچھلتے ہوئے نیچے نرم برف پر گرے اور پھر اس میں دھنستے چلے گئے۔ زینی نے چیخ ماری تھی اور میرے منہ سے بھی آواز نکلی تھی۔ عقب میں آنے والے جاندار یقیناً ہماری سمت سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ ہماری خوش قسمتی کہ نرم برف کے اس ڈھیر کی وجہ سے ہمیں کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ حالانکہ ہم کوئی چالیس فٹ کی بلندی سے گرے تھے۔ یہ جگہ کسی کنویں جیسی تھی اور اس کی دیواروں میں کہیں کوئی رخنہ نظر نہیں آرہا تھا یعنی یہاں سے باہر جانے کا راستہ صرف چھت تھی۔ نرم برف کا ڈھیر صرف اسی حد تک تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ ہمارے لیے ہی یہاں بچھایا گیا ہو جب کہ کنویں کی باقی جگہیں برف سے خالی تھیں یا وہاں معمولی سی برف تھی۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی کہ آنے والے طوفان نے یہاں تک اثر ڈالا تھا اور ہواؤں نے برف کا یہ ڈھیر یہاں لا پھینکا تھا۔ زینی نے گر کر اٹھنا چاہا مگر میں نے اسے روک لیا اور پھر واپس دھکیل کر اس کے اور اپنے اوپر برف ڈالنے لگا۔ وہ مضطرب لہجے میں بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"ششش بولو مت۔" میں نے کہا اور اسے اتنا برف میں دفن کر دیا کہ بس اس کا منہ باہر رہ گیا۔ پھر میں نے اپنے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ چٹختی آوازیں اب یہاں تک آرہی تھیں اور ہمارے پیچھے آنے والے چھوٹے جاندار یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ راجا عمر دراز نے اپنی جو کہانی سنائی تھی۔ اس میں کچھ بندر نما جانوروں کا ذکر تھا جو اپنے مخصوص پنجوں اور ہلکی جسمانی ساخت کی وجہ سے وادی کے اوپر تک آجاتے تھے۔ یہ چھوٹے ہونے کے باوجود خونخوار تھے اور اپنے ناخنوں اور دانتوں سے آدمی کو ادھیڑ سکتے تھے اور اپنی زیادہ تعداد کی وجہ سے بڑے جانوروں پر بھی حاوی ہو جاتے تھے۔ جب راجا عمر دراز ولیم شا کے ساتھ یہاں آیا تو اس کا واسطہ سب سے پہلے ان ہی جانوروں سے پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وہی جانور تھے اور میں نے جو آخری منظر دیکھا تھا اس میں ایسے درجنوں جانور حرکت کرتے

محسوس ہو رہے تھے۔

''آواز مت نکالنا۔'' میں نے سرگوشی میں زینی سے کہا۔

اسی لمحے اوپر آہٹیں ہوئیں اور ٹوٹی چھت سے چھوٹے چھوٹے بے شمار سر نمودار ہوئے۔ وہ اندر جھانک رہے تھے اور ان کی زرد آنکھیں تاریکی میں چمک رہی تھیں۔ پھر ان میں سے کچھ نیچے اترنے کی راہ تلاش کرنے لگے۔ ان کے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں تھا وہ کھردری دیواروں پر پنجے گاڑھ کر نیچے آ سکتے تھے اور ایسا ہی ہوا۔ ایک نے نیچے آنے کا راستہ دریافت کیا اور اس کے پیچھے پوری پلاٹون اتر کر نیچے آ گئی اور گھوم کر ہمیں تلاش کرنے لگی۔ وہ لازمی ہمارے پیچھے آئے تھے۔ میں نے اور زینی نے سانس بھی روک لی تھی۔ میری ایک آنکھ برف سے باہر تھی اور ناک کا کچھ حصہ تھا مجھے خطرہ تھا کہ میں سانس لوں گا تو ہوا میں بھاپ بنے گی اور وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔ مگر زیادہ دیر سانس روکنا بھی ممکن نہیں تھا اس لیے میں بہت آہستہ سے سانس لینے لگا۔ ایسا ہی زینی بھی کر رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ یہ دفع ہو جائیں ورنہ ان سے ایک طویل جنگ کرنا پڑتی جس میں ہم بچ بھی جاتے تب بھی ہمارا حشر ہو جاتا۔

یہ کچھ عجیب سی مخلوق تھی جو بیک وقت بندر اور چمگادڑ کا مکسچر لگ رہی تھی۔ ان کے جسم چمگادڑ کی طرح پتنگ جیسے اور ہلکے سے تھے مگر سر اور منہ بندر جیسا تھا۔ ان کی ساخت دیکھ کر مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہوا میں گلائیڈ کرتے ہوئے اڑنے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے یعنی ہوا میں تیرتے ہوئے نیچے جا سکتے تھے۔ اوپر آنے کے لیے یہ اپنے نوکیلے اور مڑی ہوئی ساخت کے پنجوں کا سہارا لیتے ہوں گے اور ان کی واپسی بائی ائر ہوتی ہوگی۔ صدیوں سے یا شاید ہزاروں سال سے یہ مخلوق اس جگہ آ جا رہی تھی اور ارتقا کے قانون کے تحت ان کے جسم از خود ماحول کے مطابق ڈھل گئے تھے۔ ہو سکتا ہے شروع میں یہ بندروں یا چمگادڑوں کی کوئی قسم رہی ہو۔ چمگادڑ اتنی بلندی پر نہیں اڑ سکتی ہے۔ بلکہ کوئی پرندہ بھی اتنی بلندی پر نہیں آتا ہے۔ اندر آنے والے جانوروں کی تعداد تیس پینتیس سے زیادہ تھی اور وہ ہر جگہ گھس رہے تھے اور مکروہ سی چیخنے جیسی آوازیں نکال رہے تھے۔ یہ آوازیں کانوں کو چھو رہی تھیں۔

برف کا ڈھیر وسط میں تھا اور وہ اب تک اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ مگر کب تک بالآخر چند ایک ہماری طرف آئے۔ وہ زمین پر پھدک پھدک کر چل رہے تھے۔ شاید انہیں زمین پر چلنے کی عادت نہیں تھی وہ چٹانی دیواروں میں رہتے ہوں گے۔ میں نے سانس روک لیا اور زینی نے بھی ایسا ہی کیا تھا مگر بدقسمتی سے آنے والوں میں سے ایک نے سیدھا زینی کے منہ پر پاؤں رکھا اور اس نے ایسی دل خراش چیخ ماری کہ اس بندر کا تو ہارٹ فیل ہو گیا ہوگا جس نے اس کے منہ پر پاؤں رکھا تھا۔ وہ اچھل کر دور گیا اور باقی سب بھی چیختے چلاتے تتر بتر ہو گئے۔ اب لیٹے رہنا حماقت تھی۔ میں نے بھی ایک گرجدار آواز نکالی اور یوں اٹھا کہ برف اڑنے لگی تھی۔ کہا میں نے ''اوئے'' تھا اور انداز سلطان راہی مرحوم کا سا تھا۔ میرے اٹھتے ہی وہاں قیامت سی آ گئی تھی۔ کم سے کم ان بندروں نے واویلا ایسا ہی مچایا تھا۔ وہ بھاگ رہے تھے اور اوپر چڑھنے کی کوشش میں دیواروں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ کچھ اوپر پہنچنے میں کامیاب رہے۔ زینی نے اٹھتے ہی پستول نکال لیا تھا مگر میں نے اسے بروقت روکا۔

''تم کتنوں کو مارو گی۔''

''انہیں دور تو رکھوں۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میرے خدا کتنا گھناؤنا لمس تھا اس جانور کا۔ میں تو اسی وقت اسے شوٹ کر دیتی مگر وہ بھاگ گیا۔''

''ہاں مگر فائر کی آواز دور تک جائے گی اور اسے سن کر اب اگر ان کے بھی باپ آ گئے تو......؟''

زینی سمجھ گئی کہ میں برفانی آدمی کا ذکر رہا ہوں۔ بندروں کے شور میں ہمیں چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی وہ قائل ہو گئی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو ان کا شور خود ہمارے لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔''

''وہ سب خاصے اندر ہیں اور یہاں سے دور بھی ہیں ان تک یہ شور شاید ہی پہنچے۔'' میں نے کہا تو زینی نے یاد دلایا۔

''پاسو اوپر ہے اور اس کے پاس ریڈیو بھی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی میں پُر امید ہو گیا۔ کئی ناکام کوششوں کے بعد تمام ہی بندر واپس اوپر چلے گئے تھے اور اب وہیں سے شور کر رہے تھے۔ میں نے اور زینی نے اچھل کود کر اور چیخ چلا کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی۔ وہ ڈر بھی رہے تھے مگر جلد انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ چھت پر ہماری پہنچ سے دور ہیں۔ اس لیے ان میں سے چند ایک نے نیچے آنے کی کوشش کی تو میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے وہ نیچے آ سکتے تھے۔ میں نے ایک پتھر اٹھا لیا اور ایک بندر کو نشانہ

بنایا۔ وہ چیخ مار کر نیچے گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے جوتے تلے اسے دبا کر اوپر سے زور ڈالا تو وہ لمحوں میں فوت ہو گیا۔ وہ مرا تو باقی بندروں نے ایک بار پھر آسمان سر پر اٹھا لیا اور اس کے بعد انہوں نے وہ کیا جو ہم نے سوچا نہیں تھا۔ وہ کہیں سے چن کر چھوٹے پتھر لے آئے اور ہم پر برسانے لگے۔ چند لمحے کو ہم بوکھلا گئے تھے اور اپنے دفاع کی ناکام کوشش میں کئی پتھر کھا لیے۔ یہ چھوٹے پتھر تھے مگر چوٹ تو ان سے بھی لگ رہی تھی۔ زینی نے بوکھلا کر ایک فائر کیا اور ایک بندر اور مارا گیا۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ میں نے پتھروں سے بچتے ہوئے کہا۔ ”فائر مت کرو۔“

”تو کیا پتھر کھائیں؟“ وہ تیز لہجے میں بولی۔

”تم کتنوں کو مارو گی؟“ میں نے اپنی جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ”جیکٹ اتارو۔“

”کیوں تمہیں اب کچھ سوجھ رہا ہے؟“ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے جیکٹ اتار کر سر اور اوپری جسم کے سامنے کی۔

”اسے ڈھال کی طرح استعمال کرو۔“

بات زینی کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بھی اپنی موٹی جیکٹ اتار کر پتھروں کی بارش میں ڈھال کی طرح استعمال کرنا شروع کی۔ کچھ سے ذرا بڑے حجم کے پتھر جیکٹ سے ٹکرا رہے تھے اور اس کے پیچھے ہم بچے ہوئے تھے۔ جہاں سے جیکٹ پکڑی ہوئی تھی وہاں پر پتھر لگتا تب بھی معمولی سی چوٹ آتی تھی جو آدمی برداشت کر ہی سکتا ہے۔ اگر ہمارے پاس جیکٹیں نہ ہوتیں تو اب تک یہ پتھر مار مار کر ہمارا حشر کر چکے ہوتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ چند منٹ میں اگر مدد نہ آئی تو یہ جانور موقع سے فائدہ اٹھا کر نیچے آ سکتا تھا۔ اس کے بعد ہم جیکٹ کی ڈھال تلے بھی محفوظ نہ رہتے۔ زینی بھی شاید یہی سوچ رہی تھی اس نے کہا۔ ”اگر یہ نیچے آئے تو میں آسرا نہیں کروں گی بلکہ فائر کروں گی۔“

”اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ہم دیوار کے ایک ابھرے ہوئے حصے کی آڑ میں آ گئے تھے یہاں ہمیں تین طرف سے تحفظ تھا اور صرف سامنے سے بندر پتھر مار سکتے تھے۔ پھر ہمارا خدشہ درست نکلا۔ ہمیں محصور اور محدود کر کے بندر نیچے اترنے لگے۔ میں نے دیکھ لیا اور زینی سے کہا۔ ”وہ نیچے آ رہے ہیں۔“

زینی نے ایک فائر کیا۔ ان میں سے ایک گرا اور باقی سب دوبارہ اوپر کی طرف بھاگے۔ یوں ہم کچھ دیر کے لیے محفوظ ہو گئے تھے۔ اپنے چند ساتھیوں کے مرنے پر ان کا غم و غصہ ان کے لہجے اور چیخ و پکار سے جھلک رہا تھا۔ ساتھ ہی اب مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ اب تک کرنل اینڈ پارٹی کو ہماری مدد کے لیے آ جانا چاہیے تھا مگر ان کی طرف سے خاموشی تھی۔ اگر ان تک آواز نہیں پہنچی تھی تب بھی اوپر موجود باسو نے لازمی یہ شور اور فائرز کی آواز سنی ہو گی اس نے کرنل کو کیوں اطلاع نہیں دی؟ زینی نے یہی کہا۔ ”ان لوگوں کی طرف سے مکمل خاموشی ہے؟“

”مجھے باسو کی فکر ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے تبھی اطلاع اندر نہیں پہنچی ہے۔“

زینی بھی فکرمند ہو گئی۔ ”تب ان سے جان کیسے بچے گی۔“

”انتظار اور مزاحمت۔“ میں نے کہا۔ اسی لمحے مجھے لگا کہ بندروں کے شور اور پتھروں کی برسات میں کچھ کمی آئی ہے۔ میں نے ذرا خطرہ مول لیا اور جیکٹ کی آڑ سے جھانکا تو مجھے چھت پر موجود بندروں کی تعداد میں کچھ کمی نظر آئی اور جو تھے وہ بھی ہمارے بجائے اوپر کہیں متوجہ تھے۔ پتھر برسانے والے چند ایک ہی رہ گئے تھے۔ پھر ان کی تعداد تیزی سے کم ہونے لگی۔ زینی نے بھی یہ بات محسوس کر لی اور اس نے جیکٹ نیچے کی۔

”شاید کرنل اور دوسرے آ گئے ہیں۔“

میرا بھی یہی خیال تھا۔ اتنی سی دیر میں تمام ہی بندر مفرور ہو گئے تھے اور ان کی چیختی ہوئی مکروہ آوازیں دور جاتی سنائی دے رہی تھیں۔ میں منتظر تھا کہ کرنل یا کسی اور کی آواز سنائی دے تو میں بھی آگے سے بولوں۔ میں خود آواز دیتا مگر میری چھٹی حس نے شاید روک لیا تھا۔ اوپر سے اب تک کسی کی آواز نہیں آئی بلکہ اس کی بجائے ایک بھاری سی غراتی آواز آئی اور میں نے بےساختہ زینی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کیونکہ وہ بولنے جا رہی تھی۔ اسے خاموش کرانے کے ساتھ میں دیوار میں مزید دبک گیا۔ اسی لمحے دیوار پر جہاں چاند کی روشنی آ رہی تھی ایک طویل قامت سایا نمودار ہوا اور پھر اس نے جھکتے ہوئے اندر جھانکا تھا۔ اس کا سر کنارے سے نمودار ہوا۔ چاند خاصا اوپر آ گیا تھا اور کنواں اندر تک روشن ہو رہا تھا۔ برفانی آدمی کی سرخ دہکتی آنکھیں ہم پر آ ٹکی تھیں اور وہ وحشیانہ انداز میں غرایا۔ بندر نما جانور یقیناً اسے ہی دیکھ کر فرار ہوئے تھے۔ زینی کا پستول والا ہاتھ بلند ہوا اور پھر ایک فائر ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی برفانی آدمی قلابازی کھا کر اندر کودا تھا۔

(جاری ہے)

(سندس جمال کا جواب)

ارشد علی........ساہیوال

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے

سین الف........ملک وال

اندھیرا مانگنے آیا تھا روشنی کی بھیک
ہم اپنا گھر نہ جلاتے تو اور کیا کرتے

نورین طلعت........کراچی

اب کیا بیٹھے سوچ رہے ہو یہ تو اک دن ہونا تھا
جن کی صبح ہونا مشکل ان خوابوں نے کھونا تھا

(امجد اکرام بہاولپور کا جواب)

تسیم منظر........کراچی

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ گلاب لکھنا

ناز........شادی پور

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا

حباب جعفری........لاہور

ملا کرتی تھی جن سے زندگی کو روح بالیدہ
وہی قدریں اٹھا کے ہم نے رکھ دیں طاق نسیاں میں

(نازش سحر ملتان کا جواب)

محمد عزیز مئے........لڈن

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

(مہتاب فاطمہ کا جواب)

شیر نواز گل........پشاور

گلہ بھی ہم سے شکوہ بھی ہے
یہ عشق میں بندہ رسوا بھی ہے

(انتظار علی سیالکوٹ کا جواب)

محمد عرفان........حاصل پور

یہ جوانی تو ابھی مائل پیکار نہیں
یہ جوانی تو ہے رسوائے مے و جام ابھی

نیناں قیصرانی........کوٹ قیصرانی

یہ میرے چاروں طرف کس لیے اجالا ہے
تیرا خیال ہے یا دن نکلنے والا ہے

عباس علی........دبئی یو اے ای

یہ جہاں بارگہ رطل گراں ہے ساقی
اک جہنم میرے سینے میں تپاں ہے ساقی

(آصفہ بتول جھنگ کا جواب)

خلوص کی بارش سے کہو ذرا زور سے برسے
نفرت کے آئینوں پہ بہت دھول جمی ہے

(نصیر ممتاز ساہیوال کا جواب)

فیصل شہزادسی لکھوریا........لڈن

اشکوں کے سمندر میں سکوں پایا ہے میں نے
ہنستے ہوئے چہروں سے مجھے درد ملے ہیں

(قمر الحسن ساہیوال کا جواب)

شگفتہ مشتاق........لاہور

اس دشت میں قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہو
پیڑوں سے جہاں چھن کے ضیا تک نہیں آتی

(وارث علی خان لاہور کا جواب)

احمد جان........پشاور

کس مرحلے بے خبری میں ہے اب انساں
اپنے ہی خط و خال سے انجان ہیں چہرے

ذیشان اکبر........کوئٹہ

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں
وہ راز دل جو کہہ نہ سکے راز داں سے ہم

(شگفتہ مشتاق لاہور کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن........ لاہور

سر دیکھا نہ پتھر دیکھا
تیرے کوچے سے گزر کر دیکھا

انیس احمد........ ملتان

ننگے پیڑوں کی بھی شاخوں پہ لگائی ضربیں
کتنا بے رحم ہواؤں کا یہ طوفاں نکلا

(نسرین ملک جھنگ کا جواب)

فہمیدہ سلطان........ ابوظہبی

آج ہوا عجب چلی باغ وفا کی اک کلی
حسنِ خزاں سے آشنا جشنِ بہار تک گئی

عصمہ اکبر........ کراچی

آج اپنے ہی خط و خال سے مانوس نہیں
آئینہ ہم نے جو دیکھا تو بہت کم دیکھا

حمزہ علی سید........ کوئٹہ

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

(عابد علی عطاری میر پور خاص کا جواب)

کاظم علی کاظمی........ کوئٹہ

حسن نے شوق کے ہنگامے تو دیکھے تھے بہت
عشق کے دعوے تقدیس سے ڈر جاتا تھا

(نازش سحر ملتان کا جواب)

فہیم منظر........ کراچی

ہم پھر سے آگئے اسی کچے مکان میں
اونچے گھروں میں دشت کے آثار دیکھ کر

(اکبر رند کراچی کا جواب)

پیار کے سارے جلتے الاؤ چپکے چپکے سرد ہوئے
چہرہ آنچ سے کملایا تو دل پاپی بھی بہل ہی گیا

(فلک جہاں حیدر آباد کا جواب)

نزہت جہاں........ کراچی

جو کام کے نہیں ہے وہ اُمید گاہ ہیں
کنکر مری زمین کے اب مہر و ماہ ہیں

(نگار خورشید لاہور کا جواب)

وامق ترمذی........ ملتان

دل کے نزدیک تھی اک یاد سو باقی ہے مگر
سر جھکائے ہوئے بیٹھا ہو مسیحا جیسے

افروز جہاں........ گجرات

دیکھ سکتا ہوں جو آنکھوں سے وہ کافی ہے مجاز
اہلِ عرفاں کی نوازش مجھے منظور نہیں

(خورشید ممتاز الدین کا جواب)

اکبر توحید........ کراچی

تیری تقصیر ہی کیا تجھ سے شکایت کیسی
دوش میرا ہے کہ میں نے تجھے سمجھا کچھ اور

(جاوید الحسن مظفر گڑھ کا جواب)

محمد فرقان ملانکہ........ سوداگراں

وقت کے رنگین گلدستے کو یاد آئے گا ٹھنڈا ہاتھ
جب بکھیریں گے وہ گیسو تو مرجائے گا ٹھنڈا ہاتھ

(نگار قریشی حیدر آباد کا جواب)

ناعمہ تحریم........ کراچی

لوگ جو خاک وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

اشرف علی........ کراچی

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

(نصیر احمد ملتان کا جواب)

ناہید ممتاز........ فیصل آباد

وہ مصائب زیست کا عنوان تھے
جن کو جینے کی سزا سمجھے تھے ہم

حسنہ جعفری........ لاہور

وہ ترا دشمن ہے، مار آستیں ہے، غیر ہے
جس کے پیکر میں محبت کو نہاں سمجھا ہے تو

انور سجاد........ ساہیوال

وہ نقشہ ہائے وہ تیکھا سا نقشہ
نزاکت کے نئے معنی سمجھائے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام:

پتا:

علمی آزمائش 114
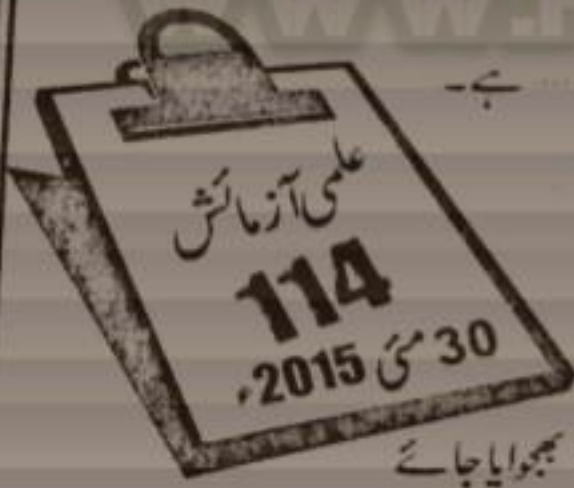
30 مئی 2015ء

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

اس کوپن کو کاٹ کر لفافے پر چسپاں کرکے جوابات مورخہ 30 مئی 2015ء تک علمی آزمائش 114 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ

بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم/ محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) 74

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 114

ادارہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک سطری سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مئی 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1889ء میں برنیو نام کے ایک قصبے میں پیدا ہوا۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی جنگ کا آغاز ہوا۔ کہتے ہیں اس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ملک سے ایک ایک یہودی کو ختم کر دے گا۔ اس کے حکم سے ایک ایک وقت میں دو دو ہزار یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

علمی آزمائش 112 کا جواب

یحییٰ خاں 14 فروری کو چکوال میں پیدا ہوئے۔ 1938ء میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے وقت اسٹاف کالج کے واحد مسلمان انسٹرکٹر تھے مگر بعد میں وہ تاریخ پاکستان کے سب سے متنازع کردار قرار دیے گئے۔

انعام یافتگان

1۔ زریاب خان، کوئٹہ　2۔ ملک ناصر، چکوال　3۔ انتصار حسین، جھنگ
4۔ نوشین چودھری، ملک وال　5۔ نیاز ملکانی، حیدر آباد

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عباس ٹالپر، عدنان اشرف، زہیب احمد، نسیم منظر، محمد ریحان، خادم حسین، ناعمہ تحریم، محمد برہان علی، سید عزیز الدین، ندیم افضل، ارشاد حسین، ناصر حسین ناصر، مخمور رند، زہیب کمال، انیس بھٹائی، کاشف اختر، ضیا قزلباش، نوشین کاظمی، عباس خان، منظر علی خان، آغا ظہیر، مرزا امداد حسین، قاسم جان، زنوبیہ خان، فرحت فاطمہ،

عائل حسین، کلیم اللہ حسن زئی، عطا محمد، زہیب خان، کاشان قریشی، نعمان قریشی، فرحت ندیم، یاسین جوکھیو، شاہد اسلام، شاہین ربانی، مرزا اختر بیگ، محمد سلیم، نادر نیازی، غیاث احمد، احمد علی، قیام احمد، فیضان اختر، ارشد علی۔ حیدرآباد سے تفسیر حسین، ثناء اللہ، اقبال جاوید، توقیر حسن زیدی، نوشین فاطمہ، حیات فاطمہ، رخسانہ حیات، نرگس علی سید، مریم کاشف۔ خانیوال سے سید حسان اسلم مشہدی۔ سکھر سے محمد اسلام بھٹو، عماد حسن، عباس علی، منور سلیم، ناصرہ جاہ، شفقت خاقان ٹالپر، حبیب الرحمن، کریم خان۔ شکار پور ذیشان اکبر، درخشان اقبال۔ آصفہ ہوتی، شگفتہ تحریم۔ میر پور خاص سے محمد فرقان، ضیا احمد، ناصر حسین، افتخار حسین، نوشین ملک۔ بھکر سے خوش بخت، نیاز ملتانی، فدا محمد، صاحب شاہ، نگار قریشی۔ ڈی آئی خان سے قمر الحسن، نازش سلطان، محمد وحید خان، نوازش علی۔ ڈی جی خان سے عبدالرحمن، اشفاق احمد، آفتاب علی نیازی۔ ملتان سے آصف علی قریشی، انیس امام، تبسم فرقان، اذان قریشی، سندس احمد، عرفانہ امام، ناصر اسلم، نصیر حسن، جمیل خان، انیس اقبال، نظیر حسین گیلانی، سندس احمد، صباحت عابدی، رانا کلیم، نسیم ضیائی، جاوید الحسن، مہتاب مرزا، سبب الملوک، فدا حسین، افضل خان، کاظم علی سید، نعمان بٹ۔ جھنگ سے فرقان شیخ، انیس احمد جاوید، امجد بخاری، عاصم سہیل، ثناء احمد، آس محمد، خالدہ فاروقی، ادریس محمد خان۔ شادی پور سے ہارون، نیاز بٹ، واثق علی، نورین اصغر۔ تلہ گنگ سے مرزا کلیم احمد، اختر عباس، صولت حیات، اشرف علی۔ فیصل آباد سے منور سلیم، عباس علی اصفہانی، دلاور حسن۔ بدین سے عباس علی ساند۔ کھاناں سے سلیم کا مریڈ۔ چکوال سے فرحین، عارف بٹ۔ بہاولپور سے مہناز اکرم ملک۔ بہاولپور سے کلیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، ہارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، نبیل خان، زاہد علی، طٰہٰ احسن، الیاس اختر بٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری بنگش، ناہید سلطانہ، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میر پور سے اے کے کاظم علی بھٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید۔ خان بیلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان جعفری، شگفتہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ میر پور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ میانوالی سے احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، عبدالخالق (کالاباغ)۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منکیرا، زبیر شاہ، تقی بخش۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھگیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، نعیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارچی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بٹ عرف چھوٹا پہلوان، ظفر الحسین، فیضان بٹ، اسرار علی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضانی، حق فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان خان، مغیث الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، اشرف علی ترمذی، نذر نیازی، ماہا خان، انیس احمد گل، رحمت اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، سرفراز بٹ، وسیع الدین ہمدانی، احمد نیاز، عقیب الدین، عابد الدین، گل فراز میمن، ناہید ابد، فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوحید، نوشاد گجر، محمد حسین، سلمان نیازی، مسرت بٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیا عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، سبطین ظفر، بدر بگٹی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عنبرین پلیجو، ضیا پلیجو، آفتاب بٹ، عنایت جعفری سید، مرزا دلدار حسین، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان عثمانی، بدر علی ادریس، حسین ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے نیلو شاہین۔

بیرون ملک سے [illegible] اللہ فاروقی (جدہ، سعودی عرب)، اشرف علی۔ سعادت علی خان (العین یو اے ای)، ملک ممتاز (مانچسٹر، یو کے)۔ اشرف سید (جرمنی)۔ ارباز خان (ٹورنٹو)۔

آوازِ دوست

جناب مدیر سرگزشت
سلام تہنیت
امید قوی ہے کہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ میں نے اپنی روداد کا عنوان "آوازِ دوست" دیا ہے جب کہ آواز کیا ہوتی ہے میں نے کبھی نہیں سنا، جی ہاں میں پیدائشی معذور سماعت ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے صورت شکل اچھی دی ہے مگر قوتِ سماعت نہیں دی مگر میں نے اپنی اس معذوری کو ترقی کے راستے میں آڑے آنے نہیں دیا اور ہر طوفان کے آگے سینہ سپر رہی۔ اگر میری آپ بیتی پسند آجائے تو شائع ضرور کریں۔

ناز گل
(کراچی)

دنیا سے پہلا رشتہ آنکھوں سے ہوا کیونکہ مجھے سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس لحاظ سے میری دنیا ساکن تھی یہاں آواز کی ہلکی سی لہر بھی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ سننا کیسا ہوتا ہے؟ آواز کیا ہوتی ہے؟ چڑیوں کی چہکار کیسی ہوتی ہے، بارش کی رم جھم کا شور کیسا ہوتا ہے؟ جب بادل گرجتے ہیں تو دل کیسے دہل جاتا ہے؟ ہوا کی سائیں سائیں کیسی لگتی ہے؟ میں نے بس دنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ امی ابو کو جلد پتا چل گیا کہ مجھے سنائی نہیں دیتا ہے۔ انہوں نے کئی ڈاکٹروں کو دکھایا اور میرے ٹیسٹ ہوئے جس کے بعد ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ میری سماعت میں ایسا کوئی پیدائشی نقص ہے جس کی وجہ سے میں ساری عمر سننے سے قاصر رہوں گی۔ یہ جان کر امی ابو دکھی ہو گئے۔ ایک لڑکی ہونے کے ناطے ان کا دکھ یوں بھی بڑھ گیا تھا کہ اب انہیں میرے حال کے ساتھ ساتھ مستقبل کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی کہ میری شادی کیسے ہوگی؟

دوسری طرف نہ سننا بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ مجھے اپنی محرومی کا پتا ہی نہیں تھا۔ انسان محرومی اس وقت محسوس کرتا ہے جب کوئی چیز اس سے چھن جائے۔ جو چیز شروع سے میرے پاس نہیں تھی مجھے اس کی محرومی کا بھلا کیا احساس ہوتا؟ میں اس میں خوش تھی جب اپنے ماں باپ اور دوسرے بہن بھائیوں کو منہ ہلاتے دیکھتی تو دل میں ذرا حیران ہوتی تھی اور پھر یہ دیکھ کر حیرانی بڑھی کہ جب کوئی ہونٹ ہلاتا ہے تو دوسرا اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے چاہے وہ اس کی طرف نہ دیکھ رہا ہو یا اس جگہ نہ ہو۔ میرے ننھے ذہن میں آتا کہ ایسا کیسے ہوتا ہے۔ اس کے باوجود مجھے معلوم نہیں تھا کہ آواز بھی کچھ ہوتی ہے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں بھی منہ ہلانے لگی۔ حالانکہ میں آواز نہیں نکال سکتی۔ میری قوت گویائی ٹھیک تھی مگر میں نے کبھی آواز سنی ہوتی تو میں بھی آواز نکالنے کی کوشش کرتی۔

ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ آسائش بہت کم تھی اور ضرورت بھی کھینچ تان کر پوری تھی۔ ابو نچلے درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ وہ کلرک تھے اور تنخواہ بھی کلرک والی تھی۔ مجھ سمیت چھ بچے تھے۔ ان سب کی تعلیم، خوراک اور دوسری ضروریات پوری کرنا آسان نہیں تھا مگر امی ابو کسی نہ کسی طرح یہ فرض پورا کرتے تھے۔ مجھ سے بڑے چار بہن بھائی تھے۔ وہ سب اسکول جاتے تھے۔ میری عمر بھی اسکول والی ہو گئی تھی مگر میری معذوری کی وجہ سے مجھے اسکول میں کیسے داخل کراتے۔ ایک سال بعد مجھ سے چھوٹا بھائی بھی اسکول جانے لگا۔ ایک دن امی کی ایک جاننے والی ان سے ملنے آئیں۔ انہوں نے مجھے گھر میں دیکھا تو امی سے کہا۔

"اسے اسکول میں داخل نہیں کرایا؟"

امی نے کہا۔ "کیسے کراؤں اسے سنائی نہیں دیتا ہے اور یہ اسکول میں کیسے پڑھے گی؟"

"بھئی ایسے خاص بچوں کے لیے خاص اسکول ہوتے ہیں۔ تم معلوم کراؤ بچی کو ایسے ہی مت چھوڑو۔

معذوری کوئی ایسی چیز نہیں ہے لیکن یہ جاہل رہ گئی تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

ان خاتون کی بات امی کے دل کو لگی۔ انہوں نے کچھ عرصے بعد آنا جانا چھوڑ دیا اور پھر ان کا انتقال ہوگیا تھا مگر میں آج بھی انہیں یاد کرتی ہوں تو میرے دل سے ان کے لیے دعا نکلتی ہے کہ انہوں نے امی کو میری تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ ورنہ شاید امی ابو کو اس کا خیال دیر سے آتا یا شاید سرے سے نہ آتا۔ امی نے ابو سے بات کی اور اتفاق کی بات ہے کہ دفتر میں ایک صاحب نے ایسے اسکول کا ذکر کیا جہاں اندھے گونگے اور بہرے بچوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ ابو نے ان صاحب سے ادارے کا نمبر لیا اور پھر وہاں کال کی۔ ابو نے میری بات کی تو دوسری طرف سے کہا گیا کہ وہ مجھے لے کر اسکول آئیں۔ ابو نے یہ ڈیوٹی امی کے سپرد کی کہ وہ مجھے لے کر اسکول جائیں۔ ہماری رہائش ائرپورٹ کے پاس تھی اور اتفاق سے یہ اسکول بھی ائرپورٹ کے پاس تھا۔ امی مجھے لے کر وہاں پہنچ گئیں۔

اسکول اچھا تھا۔ بڑا سا احاطہ اور اس کے تین طرف عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی عمارت ایڈمنسٹریشن بلاک کی تھی اور امی مجھے لے کر وہیں آئیں۔ انہوں نے اسکول کے پرنسپل سے بات کی۔ یہ کریو کٹ بالوں اور کلین شیو والے جوان اور خوش شکل آدمی تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس چھبیس برس تھی۔ وہ خوش اخلاقی سے ملے اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کا نام عرفان احمد تھا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھے لگے تھے۔ انہوں نے امی کو بتایا کہ یہ ایک ٹرسٹ اسکول ہے جو مکمل طور پر مخیر حضرات کی مدد سے چل رہا ہے اور یہاں پڑھنے والے بچوں سے کسی قسم کی فیس یا خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ حد یہ کہ کتابیں، بیگ اور یونیفارم تک اسکول مہیا کرتا ہے۔ صرف اسکول آنے جانے کا خرچ والدین کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چاہیں تو وہ خود پک اینڈ ڈراپ کرلیں یا پھر وین لگوالیں۔ انہوں نے امی سے کہا۔

"ہم کوشش کررہے ہیں کہ ہمیں اس معاملے میں بھی کسی کی مدد حاصل ہوجائے مگر فی الحال تو یہ بوجھ آپ کو ہی برداشت کرنا پڑے گا۔"

امی کے لیے تو یہ بھی بڑی خبر تھی کہ میری تعلیم پر انہیں کچھ خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ میرے سارے بہن بھائی نجی اسکول میں پڑھ رہے تھے اگرچہ اس وقت مہنگائی کی طرح

فیسیں بھی بے محابہ نہیں تھیں مگر پانچ بچوں کو پڑھانا آسان نہیں ہوتا ہے۔ ابو کیسے یہ خرچ برداشت کرتے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ گھر آ کر امی نے ابو کو بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئے۔ اسکول کی وین والا لانے لے جانے کے اس وقت دو سو روپے مانگ رہا تھا۔ اس وقت یہ دو سو بھی بڑی رقم تھی۔ ابو نے کہا۔ ''میں اسے جاتے ہوئے چھوڑ دیا کروں گا اور دوپہر میں جا کر تم لے آنا۔''

امی سوچ میں پڑ گئیں مگر پھر مان گئیں۔ بس کا کرایہ دو روپے تھا اور آنے جانے میں چار روپے اور مہینے کے سو روپے لگتے۔ میرا ٹکٹ معاف تھا کیونکہ بارہ سال سے کم عمر بچوں کا ٹکٹ نہیں لیا جاتا تھا۔ گویا سو روپے کی بچت ہو رہی تھی جو آج کل بچے چند منٹ میں کھا پی کر برابر کر دیتے ہیں۔ ہمارے لیے اس وقت یہ بہت بڑی رقم تھی۔ سو روپے کی خاطر امی زحمت کرنے لگیں کہ میری چھٹی سے ایک گھنٹا پہلے گھر سے نکلتی تھیں کہ بعض اوقات بس دیر سے ملتی اور وہ میری چھٹی سے پہلے اسکول پہنچ جانا چاہتی تھیں اور پھر مجھے لے کر واپس آتیں۔ دو دن بعد امی ابو پھر مجھے لے کر اسکول پہنچے اور داخلے کا پروسیس مکمل کیا۔ سر عرفان نے کہا کہ مجھے کل سے اسکول بھیجا جائے جب تک میرا یونیفارم سل کر نہیں آ جاتا۔ کتابیں، بیگ اور کاپیاں معہ اسٹیشنری کے مجھے دوسرے دن ہی دے دی گئی تھی۔ دو دن بعد میرا یونیفارم اور سائز کے جوتے آ گئے۔

اسکول پرائمری اور دو عمارتوں پر مشتمل تھا۔ پہلے پتھروں سے کھپریل کی چھت پر مشتمل یہ عمارتیں اصل میں پرانی بیرکس تھیں جنہیں اندر سے تقسیم اور رینو کر کے کلاس روم کی صورت دے دی تھی۔ اندر کا حصہ تو تقریباً نیا لگتا تھا۔ اچھا فرنیچر اور صاف ستھرے کلاس روم تھے۔ باہر سے بھی مرمت اور رنگ و روغن کے بعد عمارت اچھی لگ رہی تھی۔ سر عرفان نے یہ اسکول چند سال پہلے ہی قائم کیا تھا۔ زمین اور عمارتیں انہیں حکومت نے دی تھی۔ پھر انہوں نے کچھ مخیر حضرات کی مدد لی اور یہ اسکول کھولا۔ اب یہاں دو سو سے زیادہ بچے پڑھ رہے تھے اور اسکول کا اسٹاف پندرہ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک عمارت نابینا بچوں کے لیے تھی اور دوسرے میں گونگے اور بہرے بچے پڑھ رہے تھے۔ انہیں پڑھانے والے تمام ٹیچرز کوالی فائڈ اور تربیت یافتہ تھے۔ سر عرفان انہیں اچھی تنخواہیں دیتے تھے۔ بہرے اور گونگے بچوں کو سب سے پہلے اشاروں کی مخصوص زبان بولنا اور سمجھنا سکھائی جاتی تھی اس کے بعد ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی۔

یہاں صرف بچوں ہی نہیں بلکہ ان کے گھر والوں کو بھی یہ زبان سکھائی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے بچے سے ٹھیک سے بات کر سکیں۔ کچھ عرصے بعد امی بھی یہاں سیکھنے کے لیے آئیں اور اس کے بعد گھر میں کم سے کم ایک فرد میری بات سمجھنے والا ہو گیا تھا۔ ورنہ مجھے بہت مشکل ہوتی تھی۔ بڑوں کی کلاس ہفتے میں دو ہوتی تھی۔ جس دن امی کی کلاس ہوتی اس دن وہ میرے ساتھ ہی اسکول آتی اور جاتی تھیں۔ یہ زبان زیادہ مشکل نہیں ہے چند مہینے میں امی نے سیکھ لی اور پھر جو کسر رہ گئی وہ میں نے پوری کر دی۔ دوسرے سال جب میں پہلی کلاس میں گئی تب سر عرفان کے مشورے پر امی ابو نے پھر مجھے ڈاکٹر کو دکھایا کہ میری قوت گویائی میں مسئلہ ہے یا یہ ٹھیک ہے کیونکہ ان ہی دنوں ایک نئی ٹیچر آئی تھیں اور وہ ان بچوں کو بولنے کی تربیت دیتیں جن کی قوت گویائی ٹھیک تھی۔ خوش قسمتی سے میری قوت گویائی بھی ٹھیک نکلی اور میں بھی بولنے کی تربیت حاصل کرنے لگی۔ چند مہینے میں، میں نے اچھا خاصا بولنا شروع کر دیا۔

اگر میں کہوں کہ اس اسکول نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تو بے جا نہ ہوگا۔ میں حسرت سے اپنے بھائیوں کو اسکول جاتے دیکھتی اور سوچتی تھی کہ امی ابو مجھے کیوں نہیں اسکول بھیجتے۔ مجھے صبح سویرے یونیفارم پہن کر اور بیگ لے کر اسکول جانا اچھا لگتا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ عام اسکول میں پڑھنا میرے لیے کتنا مشکل کام ہے۔ اس لیے جب میں نے اس اسکول میں جانا شروع کیا تو میرے لیے پہلی بات تو یہ ہوئی کہ میری خواہش پوری ہو گئی۔ پھر اسکول کا ماحول اور وہاں پڑھانے والوں کا رویہ اتنا اچھا تھا کہ میں اسکول جانے کے لیے بے تاب رہا کرتی تھی۔ پڑھائی کے ساتھ کھیلوں کے مقابلے اور دوسری سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں۔ مہینے میں ایک بار ہمیں کہیں باہر لے جایا جاتا اور ہر دوسرے مہینے پکنک ہوتی تھی۔ ان دوروں کے لیے بچوں سے معمولی سی رقم لی جاتی تھی۔

تعلیم کا معیار اور پڑھانے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ اسکول کے بچے عام اسکولوں میں اسی کلاس کے بچوں سے زیادہ نالج رکھتے تھے اور پڑھائی میں زیادہ تیز تھے۔ یہاں بچوں اور خاص طور سے بچیوں کی پوری دیکھ بھال اور

حفاظت کی جاتی تھی۔ مارنے اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سر عرفان کی طرف سے ٹیچرز کو سخت ترین ہدایت تھی کہ بچوں کو سزا یا ڈانٹنے سے گریز کیا جائے اگر کوئی بچہ پڑھنے میں دل چسپی نہیں لے رہا ہے تو اسے نرمی سے سمجھایا جائے اور اس کے ماں باپ سے بات کی جائے۔ مہینے میں ایک بار پیرنٹس میٹنگ ہوتی تھی جس میں ماں باپ میں سے ایک کی شرکت لازمی ہوتی تھی اور اس میٹنگ کے موقع پر والدین کو ان کے بچوں کی پروگریس سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ والدین کے ساتھ ساتھ اسکول کے ڈونرز کو بھی اسکول بلایا جاتا تاکہ وہ خود دیکھ سکیں کہ ان کے دیئے فنڈز کہاں اور کیسے استعمال ہو رہے تھے۔

اسکول کی کامیابی اور انتظام کے پیچھے ایک ہی شخص سر عرفان تھے۔ انہوں نے یہ اسکول قائم کیا اور اب اسے بہت اچھی طرح چلا رہے تھے اور وہ یہ سب بلا کسی غرض کے کر رہے تھے۔ نہ تو وہ گھر گھر جا کر چندے مانگتے تھے اور نہ ہی اسکول کی طرف سے ایسے فنکشن ہوتے تھے جن میں لوگوں سے رقم کی اپیل کی جائے۔ حد یہ کہ عام طریقوں سے فنڈز کی اپیل بھی نہیں کی جاتی تھی جیسے اخبارات یا پرنٹ میڈیا اور ٹی وی پر اپیل کرنا۔ پمفلٹ اور بروشر چھپوانا وغیرہ اور نہ ہی بچوں یا ان کے والدین سے کہا جاتا تھا کہ وہ فنڈ ریزنگ میں مدد کریں۔ ڈونرز اگر اسکول کے دورے پر آتے تب بھی انہیں بچوں کی طرف سے کوئی استقبالیہ نہیں دیا جاتا۔ وہ ہماری کلاسز میں بھی نہیں آتے تھے بس باہر سے دیکھ کر چلے جاتے۔ سر عرفان ان سے کیسے رقم وصول کرتے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ بچے اور اسٹاف صرف اتنا جانتا تھا کہ اسکول اور ان کی تمام ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔

اس وقت میں بچی تھی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہمارے معاشرے میں کس حد تک خود غرضی اور سفاکی سرایت کر گئی ہے اور یہاں بیشمار ایسے جعلی ادارے کھلے ہوئے ہیں جو معذور افراد کے نام پر مخیر لوگوں سے پیسے بٹورتے ہیں اور یہ سارا پیسا ان کے پیٹوں میں جاتا ہے۔ ایسے میں سر عرفان کا اسکول اور ان کی ذات حیرت انگیز ہی تھی۔ اسکول کو ملنے والے ڈونیشن اور اس کے خرچ کا مکمل حساب رکھا جاتا تھا اور اس حساب کتاب کی کاپیاں باقاعدگی سے ڈونرز کو مہیا کی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ڈونرز نہ صرف خود دل کھول کر فنڈز دیتے تھے بلکہ وہ دوسروں کو بھی سر عرفان کے اسکول کے لیے رقم دینے پر آمادہ کرتے تھے۔ اصل میں وہی پبلسٹی بھی کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اسکول اتنی اچھی طرح چل رہا تھا۔ احاطے میں ایک طرف ایک نئی عمارت کی تعمیر بھی سست روی سے جاری تھی۔ اس کی تعمیر اس وقت کی جاتی تھی جب کچھ اضافی رقم آجاتی تھی۔ یہ عمارت آگے مڈل اور ہائی اسکول تک کی کلاسز کے لیے تعمیر کی جا رہی تھی۔

میں سات سال کی تھی جب میں پہلی کلاس میں آئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو میں اپنی عمر سے پیچھے تھی مگر میرے ساتھ پڑھنے والی تمام لڑکیاں اور لڑکے چھ سات سال کی عمر میں یہاں تک آئے تھے اس لیے مجھے محسوس نہیں ہوا۔ پڑھنے میں بہت تیز تھی جو سیکھتی ایک ہی بار میں یاد ہو جاتا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی کلاس کا امتحان ہونے سے بھی پہلے میں نے اردو پڑھنا شروع کر دی تھی۔ عام طور سے بچوں کو دوسری تیسری کلاس تک بھی ٹھیک سے اردو پڑھنی نہیں آتی ہے۔ اسی طرح میں انگریزی بھی پڑھنے لگی تھی اگرچہ یہ ورڈز تک محدود تھی مگر مجھے اچھے خاصے الفاظ پڑھنا اور بولنا آگئے تھے۔ یہ میری صلاحیت کے ساتھ ساتھ میری ٹیچرز کی محنت بھی تھی۔ ہمارے بارہ ٹیچرز میں سے نو خواتین ٹیچرز تھیں۔ چھوٹی کلاسز کو زیادہ خواتین ٹیچرز ہی پڑھاتی تھیں۔ میں پہلی کلاس میں اوّل آئی اور فیصد نمبروں کے حساب سے پورے اسکول میں دوسرے نمبر پر تھی۔ اس پر مجھے اسپیشل شیلڈ اور انعام بھی ملا تھا۔

امی ابو میری پروگریس سے خوش تھے اور وہ سر عرفان کو دعائیں دیتے تھے جن کی وجہ سے ان کی بیٹی معاشرے کا باصلاحیت حصہ بننے جا رہی تھی۔ اسکول میں دو سال کے دوران میں نے نہ صرف اشاروں کی زبان مکمل طور پر سیکھ لی تھی بلکہ لپ ریڈنگ بھی سیکھ لی تھی اور اب میں اپنے بہن بھائیوں سے بھی بات کر سکتی تھی جن کو اشاروں کی زبان نہیں آتی تھی۔ پہلے میں گھر کا مکمل حصہ نہیں تھی۔ جب امی ابو اور بہن بھائی آپس میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے تب میں صرف ان کو دیکھتی تھی مگر اب میں بات بھی کرتی تھی اور ان کی بات سمجھتی بھی تھی۔ پہلے مجھ سے بڑی بہنیں آپس میں مگن رہا کرتی تھیں اور اب میں ان کے گروپ کا حصہ بن گئی تھی۔ جیسے بہنیں آپس میں بے تکلف ہوتی ہیں ہمارے درمیان بھی ایسی ہی بے تکلفی آگئی تھی۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے بھائی محب تھے ان سے چھوٹی حرا آپا تھیں پھر مجیب بھائی اور پھر آئینہ باجی تھیں۔ ان کے بعد میں

تھی۔ جب تک میں چھوٹی تھی محلے میں نہیں نکلتی تھی کیونکہ بچے میرا مذاق اڑاتے تھے اگرچہ ان کی باتیں میں سن نہیں سکتی تھی مگر ان کے انداز میں استہزا محسوس کرتی تھی۔ اس لیے چند ایک بار کے بعد میں نے باہر نکلنا بند کر دیا اور گھر میں رہتی تھی۔ مگر اپنی معذوری کی وجہ سے گھر میں بھی سب سے کٹ کر رہتی تھی۔ میں ذہین تھی اس لیے پانچ چھ سال کی عمر میں ہی خاصا کچھ سمجھنے لگی تھی اور یہ سمجھداری میرے اندر مایوسی بڑھا رہی تھی۔

مجھے لگتا کہ میں بیکار ہوں اور میری کسی کو ضرورت نہیں ہے۔ میں دنیا سے ہٹ کر کوئی مخلوق ہوں۔ اگر شاید میں اسکول نہ جاتی تو یہ مایوسی میری فطرت کا حصہ بن جاتی اور میں ساری عمر اس سے نہ نکل پاتی۔ اسکول جاتے ہی میری زندگی میں تبدیلیاں آنے لگیں اور چند سال میں، میں تقریباً نارمل شخصیت بن چکی تھی۔ اب میں باہر آتی جاتی تھی۔ پہلے مجھے باہر جاتے ہوئے جھجک آتی تھی۔ جاتی اب بھی میں امی ابو اور بہن بھائیوں کے ساتھ تھی مگر مجھے جھجک نہیں ہوتی تھی اور میں اس سے بھی لطف اندوز ہوتی تھی۔ اس کی وجہ اسکول کی جانب سے ہمیں ہر مہینے باہر لے جانا تھا۔ دوسری کلاس میں آنے تک میں شہر کے تمام قابلِ ذکر مقامات دیکھ چکی تھی۔ کئی جگہوں پر ہم دو بار بھی گئے۔ بہت سے اچھے اسکولوں کے بچے بھی اتنا نہیں گھومتے جتنا میرے اسکول کے بچے گھومتے پھرتے تھے۔ چوتھی کلاس میں پہلی بار گرمیوں کی چھٹی میں اسکول کی طرف سے آل پاکستان ٹور پر گئے۔

یہ ٹور اسکول کی طرف سے تھا اور ہر کلاس سے پہلی دوسری اور تیسری پوزیشن والے بچوں کو چنا گیا تھا۔ ایک بڑی بس ہائر کی گئی اور اس میں کوئی تین درجن بچے اور نصف درجن اسٹاف گیا۔ ہم حیدر آباد، سکھر، ملتان، لاہور اور اسلام آباد سے ہوتے ہوئے مری تک گئے تھے۔ ہر جگہ خاص بچوں کے اسکولوں میں گئے۔ ہمارے اعزاز میں تقریبات ہوئیں اور اسلام آباد میں ہمارے لیے سرکاری تقریب بھی ہوئی تھی۔ دوسرے بچوں کے ساتھ میں نے بھی بہت مزے کیے اور جب میں جا رہی تھی تو میرے بہن بھائی رشک کر رہے تھے کہ انہیں کبھی یہ موقع نہیں ملا۔ ٹور پر خاصا خرچ آیا تھا۔ بس دس دن کے لیے بک کی گئی تھی اور پھر دوسرے اخراجات بھی تھے۔ جو سب کے سب اسکول کی طرف سے کیے گئے تھے۔ پہلی بار ابو بھی حیران ہوئے اور وہ امی سے بات کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس بیٹھی لپ ریڈنگ کر رہی تھی۔

''اس شخص کے پاس کتنا پیسا آ رہا ہے۔'' ابو نے کہا۔

''ہاں کیونکہ وہ نیک نیت ہے اور اس لیے اللہ غیب سے مدد کرتا ہے۔ دیکھو نا بھی ہم سے ایک روپیا نہیں لیا۔ اب تو بچوں کو اسکول لانے لے جانے کے اخراجات بھی اسکول کی طرف سے ہیں۔''

''یہی تو میں حیران ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اسکول کا ماہانہ خرچ ہی پانچ چھ لاکھ روپے ہے۔''

''دینے والے یہاں کروڑوں روپے اللہ کی راہ میں دیتے ہیں۔''

''ہاں مگر وہ ایسے اداروں کو دیتے ہیں جو پبلسٹی کرتے ہیں اور رقم دینے والوں کے نام بڑھا چڑھا کر میڈیا پریس کو بتاتے ہیں۔ یہاں تو کسی کو ادارے اور اسکول کا نام ہی نہیں معلوم ہے۔''

''بہت سے لوگ صرف اللہ واسطے دیتے ہیں۔ وہ نام نمود نہیں چاہتے ہیں۔ شاید عرفان صاحب کو بھی ایسے ہی لوگ دے رہے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے لیکن آج کے نفسانفسی کے دور میں ایسے بے لوث کہاں ہوتے ہیں جو بنا کسی غرض کے عام لوگوں کے لیے اتنا کریں۔ ماشاءاللہ ہماری حمیرا ذہین ہے مگر اس اسکول کا معیار بھی بہت اچھا ہے۔ اچھی خاصی فیس لینے والے اسکولوں میں اس معیار کی پڑھائی نہیں ہوتی ہے جو اس اسکول میں ہوتی ہے۔''

''ان لوگوں کی مثال سامنے ہے۔'' امی نے دوسرے بہن بھائیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''انہوں نے کب سب اتنی جلدی سیکھا تھا۔ بلال (مجھ سے چھوٹا بھائی) کہنے کو تو حمیرا سے آگے ہے مگر اسے اردو انگریزی کا ایک جملہ بھی ٹھیک سے پڑھنا نہیں آتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مگر اب حمیرا پانچویں میں آ گئی ہے اس کے بعد اسے کسی عام اسکول میں داخل کرانا پڑے گا۔''

''نہیں۔'' امی نے انکشاف کیا۔ ''میری اس کی ایک ٹیچر سے بات ہوئی ہے اس نے بتایا ہے کہ پرائمری کے بعد اسکول مڈل تک بڑھا دیا جائے گا۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔'' ابو خوش ہو گئے۔ ''شکر ہے

میری بچی مڈل تک یہیں پڑھے گی۔''

مجھے نہیں معلوم تھا اس لیے میں بھی خوش ہو گئی۔ میں نے امی ابو سے کہا۔ ''وہ جو نئی عمارت بن رہی ہے اس میں ہم پڑھیں گے۔''

''ہاں وہ عمارت مڈل اسکول کے لیے بنائی جا رہی ہے۔'' امی بولیں۔ ''اس کے لیے عرفان صاحب نیا اسٹاف بھی رکھ رہے ہیں۔''

''کیا بے لوث شخص ہے جو بنا کسی غرض کے اتنا بڑا کام کر رہا ہے۔''

''ابو سر مجھے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویسے ہمیں عرفان صاحب کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم ہے۔ ان کی فیملی بیک گراؤنڈ، خود کیا کرتے ہیں شاید کسی کو پتا نہیں ہے۔''

''ممکن ہے ان کے اسکول کے لوگ جانتے ہوں۔'' ابو نے کہا۔

امی ابو ٹھیک کہہ رہے تھے ہم روز ان سے ملتے تھے اور اسکول میں دیکھتے تھے مگر نہ تو کبھی ان سے متعلق کوئی فرد اسکول آیا اور نہ ہی ہم یہ جانتے تھے کہ وہ رہتے کہاں ہیں اور ان کے گھر میں کتنے افراد ہیں۔ کبھی ان کی بیگم کے بارے میں نہیں سنا اور نہ ہی بچوں کا سنا تھا۔ امی ابو کی بات سن کر مجھے تجسس ہونے لگا کہ سر عرفان کے بارے میں جانوں۔ ویسے میں ان سے متاثر تھی اور آدمی جس سے متاثر ہوتا ہے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ میری اسکول میں کئی سہیلیاں تھیں۔ ویسے تو لڑکے ساتھ ہی پڑھتے تھے مگر مجھے لڑکوں سے دل چسپی نہیں تھی اور میں نے کسی لڑکے کو دوست نہیں بنایا۔ حالانکہ اس وقت صنفی فرق کا بھی پتا نہیں تھا۔ میں نے سہیلیوں سے پوچھا مگر انہیں سر عرفان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اصل میں انہیں ان سے دل چسپی نہیں تھی اس لیے انہوں نے معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

ہماری ٹیچرز میں سب سے سینئر مس نازگل تھیں اور وہ ایک طرح سے سر عرفان کے بعد نائب تھیں۔ وہ ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں اور بہت پیاری سی تھیں۔ کیونکہ میں ہمیشہ اول آتی تھی اس لیے مس نازگل مجھ پر خاص توجہ دیتی تھیں اور میں ان سے سوال کر لیتی تھی۔ مگر سر عرفان کے بارے میں سب کے سامنے نہیں پوچھ سکتی تھی اس لیے میں موقع کی منتظر تھی کہ وہ مجھے اکیلے میں یا کہیں باہر ملیں تو میں ان سے پوچھوں اور کچھ عرصے بعد مجھے موقع مل گیا۔

اس روز ہمارا وین والا لیٹ تھا۔ بچوں کے ساتھ ٹیچرز بھی وین میں گھر جاتی تھیں۔ مس نازگل بھی اسی وین میں جاتی تھیں۔ ہم گیٹ کے پاس بنچوں پر بیٹھے وین کا انتظار کر رہے تھے کہ مجھے خیال آیا اور میں نے مس نازگل سے پوچھا۔

''مس میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتی ہوں؟''

''پوچھو۔'' وہ بولیں۔

''ہم سر عرفان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے ہیں۔ آپ تو ان کے بارے میں جانتی ہوں گی۔''

''کیا جاننا چاہتی ہیں آپ؟''

''یہی کہ وہ کون ہیں اور ان کے گھر والے کون کون ہیں۔ ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے ہیں۔''

مس نازگل مسکرائیں۔ ''ان کا کوئی نہیں ہے سوائے ایک بوڑھی والدہ کے اور انہوں نے شادی نہیں کی ہے۔''

''ان کا کوئی نہیں ہے۔'' میں حیران ہوئی۔ ''وہ کتنے اکیلے ہیں مس۔''

نہ جانے کیوں مس نازگل نے سرد آہ بھری۔ ''ہاں اکیلے ہیں مگر وہ اکیلے رہنا چاہتے ہیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔''

اس وقت میں بارہ سال کی تھی اور دیکھا جائے تو بچی تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ مس نازگل کی اس بات میں ان کا اپنا حوالہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے اس انداز میں کہا تھا۔ مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہو رہا تھا کہ سر عرفان اکیلے ہیں۔ نہ ان کی بیوی ہے اور نہ بچہ ہے۔ والدہ ہیں مگر وہ بوڑھی ہیں۔ میں نے مس نازگل سے پوچھا۔

''انہوں نے کہاں تک پڑھا ہے؟''

''انہوں نے اسپیشل کڈز ایجوکیشن میں ماسٹر کیا ہے۔ یہ ڈگری انہوں نے امریکا سے حاصل کی ہے۔''

میں حیران ہوئی۔ ''سر امریکا بھی گئے ہیں۔ مس پتا تو نہیں چلتا کہ وہ امریکا سے ہو کر آئے ہیں۔''

مس نازگل ہنسیں۔ ''جو امریکا سے آتا ہے اس کا پتا کیسے چلتا ہے؟''

''پتا نہیں مس پر سر عرفان تو بہت سادہ سے ہیں۔''

سر عرفان عام طور سے سادہ پینٹ شرٹ میں آتے تھے اور میں نے بہت کم ان کو اس لباس کے علاوہ دیکھا تھا۔ پینٹ شرٹ بھی سنگل کلر ہوتی تھی اور رنگ بھی گہرے یا ہلکے

ہوتے تھے میں نے کبھی انہیں کوئی شوخ رنگ لباس پہنے نہیں دیکھا۔ وہ عام طور سے صبح سویرے اسکول آجاتے تھے اور جب سب کی چھٹی ہو جاتی تو وہ اسکول سے جانے والے آخری فرد ہوتے تھے اور اگر انہیں اسکول کے سلسلے میں کسی سے ملاقات کرنی ہوتی تھی تو وہ اسکول میں اپنے دفتر میں ہی ملاقات کرتے تھے۔ ان کے پاس پرانے ماڈل کی سفید رنگ کی کار تھی۔ مگر وہ اسے بڑا صاف ستھرا اور سنبھال کر رکھتے تھے۔ میں نے مس نازگل سے اگلا سوال کیا۔

''آپ کبھی سر عرفان کے گھر گئی ہیں؟''

''صرف ایک بار جب ان کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی تعزیت کے لیے گئی تھی۔''

''وہ کہاں رہتے ہیں؟''

''بلوچ کالونی کے پاس پی سی ایچ ایس سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ وہاں ان کا بڑا سا گھر ہے۔''

میں نے اور سوال بھی کیے مگر مس نازگل کو ان کے جواب معلوم نہیں تھے۔ ان آدھی ادھوری معلومات سے میرا تجسس مزید بڑھ گیا تھا اور اب میرے ذہن میں اس قسم کے سوالات آرہے تھے کہ سر اکیلے کیوں تھے۔ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی تھی۔ یہی سوال میں نے مس نازگل سے کیا تو انہوں نے کسی قدر رکھائی سے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

اس وقت نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ انہیں معلوم ہے لیکن وہ مجھے بتانا نہیں چاہ رہیں۔ پھر وین آگئی اور ہم وین میں بیٹھ گئے۔ مس نازگل شاہ فیصل کالونی میں رہتی تھیں اور وین انہیں ان کے گھر چھوڑتی ہوئی بچوں کو ان کے گھر تک چھوڑتی جاتی تھی۔ میں اب چھٹی کلاس میں تھی۔ مڈل اسکول کے آغاز کے ساتھ یہاں پرائمری کا بیچ خود بہ خود چھٹی کلاس میں آگیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ساتویں کا آغاز بھی ہوا تھا اور اس کلاس میں باہر سے لڑکے اور لڑکیاں آئی تھیں۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں بڑی عمر کی تھیں اور وہ جوان لڑکیوں کی طرح گفتگو کرتی تھیں۔ میں ایک دو بار ان کے ساتھ بیٹھی تو مجھے ان کی کھلی ڈلی گفتگو پر غصہ آنے لگا اور میں پھر ان کے ساتھ نہیں بیٹھی۔ میری بہنیں مجھ سے بڑی تھیں مگر ہماری تربیت ایسی تھی کہ ہماری آپس کی گفتگو میں کبھی بے ہودگی یا جنس کا عنصر نہیں آیا تھا۔ البتہ ان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھنے کے دوران ایک بات ایسی ہوئی کہ وہ میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ ایک لڑکی نے سر عرفان کے بارے میں بات کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں سسکاری لے کر کہا تھا۔

''ہائے کیسے چارمنگ ہیں سر۔''

میں باقی سب باتیں تو بھول گئی مگر مجھے یہ لفظ چارمنگ یاد رہ گیا اور جب میں سر عرفان کو دیکھتی تو میرے ذہن میں یہی لفظ آتا تھا۔ شاید وہ مجھے اچھے لگتے تھے اس لیے ان کی تعریف بھی اچھی لگتی تھی۔ میں ابھی بالغ نہیں ہوئی تھی اور اگر ہوتی تب بھی مجھے خیال بھی نہ آتا کہ سر عرفان مجھے کسی اور معنوں میں اچھے لگ رہے ہیں۔ میں بچپن سے صحت مند تھی اور عمر کے ساتھ ساتھ میری بڑھوتری عام لڑکیوں سے تیز تھی اس لیے تیرہ سال کی عمر میں پندرہ کی لگتی تھی اور اپنی کلاس میں سب سے زیادہ جسامت میری تھی جب کہ اکثر لڑکیاں عمر میں مجھ سے بڑی تھیں مگر اپنی کم جسامت کی وجہ سے چھوٹی لگتی تھیں۔ بلوغت کے بعد میری بڑھنے کی رفتار میں تیزی آئی تھی اور جسمانی تبدیلیاں بھی نسبتاً جلدی آئی تھیں۔ حرا اور امینہ باجی بھی اچھی جسامت و قد رکھتی تھیں مگر وہ اتنی تیزی سے نہیں بڑھی تھیں۔ امی کسی قدر پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ابو سے کہا۔

''حرا اور امینہ پہلے ہی جوان ہیں اور گھر بیٹھی ہیں مگر یہ ان دونوں سے بھی آگے نکل رہی ہے۔''

امی ابو ذرا دور صحن میں بیٹھے آہستہ سے بات کر رہے تھے مگر وہ بھول گئے تھے کہ مجھے لپ ریڈنگ آتی ہے اور میں ان کی باتیں سمجھ رہی تھی۔ ابو نے کہا۔ ''فکر مت کرو جس اللہ نے پیدا کیا ہے اسی نے ان کا جوڑا بھی بنایا ہوگا۔''

''مگر تینوں کتنی بڑی لگتی ہیں اور حمیرا تو ان سب سے......''

''سمیہ کیوں ٹینشن لیتی ہو، تمہیں تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اتنی پیاری اور صحت مند بیٹیاں دی ہیں۔ صحت ہوگی تو آگے شادی شدہ زندگی کا بار اٹھائیں گی۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھا ہے سوکھی مریل ہو رہی ہوتی ہیں اور شادی کے بعد مشکل میں پڑ جاتی ہیں۔ ان سے نہ شوہر سنبھالا جاتا ہے اور نہ گھر بار اور بچے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' امی شرمندہ ہو گئیں۔ ''میں بھی تو کتنی صحت مند تھی جب میری شادی ہوئی اسی وجہ سے جلدی جلدی بچوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ ماشاءاللہ سب کو دیکھ لیا اور سنبھال لیا۔''

''بس تو یہ سوچ لو کہ ان کا مقدر تم نے نہیں اوپر

والے نے بنایا ہے اور وہ تم سے زیادہ قادر ہے۔"

حرا آپا اس وقت گریجویشن کر کے گھر بیٹھی تھیں۔ وقت گزاری کے لیے ٹیوشن پڑھاتی تھیں اور امی کے ساتھ مل کر سلائی کرتی تھیں۔ امینہ باجی بی اے کر رہی تھیں اور ساتھ ہی حرا آپا کے ساتھ مل کر ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ البتہ انہیں سلائی کڑھائی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ میں اسکول سے آنے کے بعد امی کا کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ شام میں اسکول کا پڑھتی تھی اور رات میں مطالعہ کرتی تھی۔ میں دوسری کلاس میں بچوں کے رسالے نونہال، آنکھ مچولی اور ساتھی وغیرہ پڑھنے لگی تھی۔ پھر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تو دوسری چیزیں بھی پڑھنے لگی۔ گھر میں ڈائجسٹ آتے تھے ان سے آغاز کیا اور پھر کتابوں پر آگئی۔ مجھے جو جیب خرچ ملتا تھا اس سے بچا کر میں امی اور بہنوں کے ساتھ جب مارکیٹ جاتی وہاں پرانی کتابوں کی دکانوں سے اپنی دل چسپی کی کتابیں تلاش کر کے لے آتی تھی۔

اردو کے علاوہ انگریزی کی چیزیں بھی لاتی اور پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس وجہ سے چھٹی ساتویں کلاس میں میری انگریزی بہت بہتر ہوئی تھی اور میں عام طور سے انگریزی میں نوے یا اسی نمبر حاصل کرتی تھی۔ مجھے امی ابو اور بہن بھائیوں سے بات کرنا اچھا لگتا تھا مگر سب سے اچھا مطالعہ لگتا تھا۔ پڑھنے سے مجھے جو سکون اور دلی خوشی ملتی تھی وہ کسی اور کام میں نہیں ملتی تھی۔ اسکول میں بھی فارغ اوقات میں جب لڑکے اور لڑکیاں کھیل کود اور کھانے پینے میں مگن ہوتے تھے میں ہاف ٹائم میں کہیں کوئی کتاب یا رسالہ لے کر بیٹھی ہوتی تھی۔ ایک دن میں ابن انشا کا ایک سفرنامہ پڑھ رہی تھی اور ظاہر ہے ہنس رہی تھی کہ اچانک مجھے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سر عرفان کو پا کر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے جواب دے کر پوچھا۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟"

میں نے کتاب آگے بڑھا دی۔ انہوں نے کتاب دیکھی اور کسی قدر حیران ہو کر بولے۔ "تمہیں ابن انشا پسند ہیں۔"

میں نے سر ہلایا۔ "جی سر تبھی تو ان کی کتاب پڑھ رہی ہوں۔"

"اور تم چھٹے درجے میں ہو؟"

"جی سر۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے اسکول میں اتنی ذہین بچی بھی ہے۔" انہوں نے کتاب مجھے واپس کی اور میرا سر تھپتھپا کر چلے گئے۔ ان کا انداز واضح شاباش والا تھا اور اس شاباشی پر میری روح تک سرشار ہوگئی۔ عام اسکولوں میں اور عام استاد اگر کسی بچے کو کوئی غیر نصابی کتاب پڑھتے دیکھ لیں تو بچے کی شامت آجاتی ہے۔ مگر عام استاد اور سر عرفان میں بہت فرق تھا۔ انہوں نے اعتراض نہیں کیا کہ ایک تیرہ سال کی لڑکی جو چھٹی کلاس میں ہے وہ ایسی کتاب کیوں پڑھ رہی ہے؟ پتا نہیں ہمارے ہاں اساتذہ اور گھر میں ماں باپ کا رویہ کتاب کے معاملے میں عجیب سا ہے۔ وہ بچوں کو ٹی وی، انٹرنیٹ اور موبائل سمیت ہر برائی بڑے شوق سے دیں گے اور بہ مشکل ہی اس پر اعتراض کریں گے مگر جہاں بچے کے ہاتھ میں کوئی رسالہ یا کتاب نظر آئی انہیں بچے کی دنیا اور عاقبت خطرے میں نظر آنے لگے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے استاد اور ماں باپ بھی ایسے ملے جنہوں نے میری مطالعے کی عادت پر اعتراض نہیں کیا بلکہ میری حوصلہ افزائی کی۔

جب میں ساتویں میں آئی تو اسکول مڈل تک مکمل ہو گیا تھا اور سر عرفان اسے میٹرک تک کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور انہوں نے بہت کوشش کر کے عین اس وقت اسکول کو میٹرک بورڈ سے رجسٹر کرالیا جب آٹھویں کے امتحان ہو گئے تھے اور رزلٹ بھی آگیا تھا اگر منظوری نہ ملتی تو بچوں کو کسی اور اسکول جانا پڑتا۔ مجھے فکر نہیں تھی کیونکہ میں ابھی آٹھویں میں آئی تھی۔ البتہ خوشی ہوئی کہ اب میں میٹرک اسی اسکول سے کر سکوں گی۔ اگلے سال میں نویں میں آئی اور جب میں میٹرک میں آئی تب مجھے خیال آیا کہ اب مجھے یہاں سے جانا ہوگا۔ صرف ایک سال باقی رہ گیا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں تیزی سے بڑھی تھی اور سولہ سال کی عمر میں انیس بیس سال کی جوان لڑکی لگتی تھی اور دیکھنے والا سمجھتا کہ شاید میں گریجویشن کر رہی ہوں حالانکہ میں میٹرک میں تھی۔

اس دوران میں اسکول نے اچھی خاصی ترقی کر لی تھی اور اب یہاں تین سو سے زائد بچے زیر تعلیم تھے۔ سر عرفان چاہتے تھے کہ اسکول کو انٹر تک کرلیا جائے مگر ایسا ہونا مشکل نظر آرہا تھا۔ میں نے نہایت پھٹیچر قسم کے پرائیویٹ اسکولوں میں بھی میٹرک کی کلاس ہوتے دیکھی تھیں مگر سر عرفان کے اسکول کا خاص بچوں کا اسکول ہونے کی وجہ سے

میٹرک کا درجہ بھی بہ مشکل ملا تھا۔ اس کے باوجود وہ کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹیچرز سے کہا کہ بچوں کو میٹرک کی ایسی تیاری کرائیں کہ بورڈ میں ہماری اسکول کی کوئی نہ کوئی پوزیشن آئے اور اس سے اسکول کو ہائی اسکول تک لے جانے میں مدد ملے۔ اس لیے ٹیچرز ہمیں خاص طور سے تیاری کرا رہی تھیں اور جو لڑکیاں اور لڑکے پڑھنے میں ذہین تھے ان پر خاص توجہ دی جا رہی تھی۔ عام طور سے اسکول امتحان سے پندرہ دن پہلے بند ہو جاتے ہیں مگر ہمیں پانچ دن پہلے چھٹی ملی۔ میں نے پیپرز کی بھرپور تیاری کی تھی اور میرے پیپرز بھی بہت اچھے ہوئے۔

پیپرز کے بعد گھر بیٹھی تو کچھ عجیب سا لگا تھا کیونکہ عام طور سے ایک کلاس کے امتحان کے فوراً بعد رزلٹ آتا اور ہم اگلی کلاس میں چلے جاتے۔ نائن میں بھی پیپرز کے فوراً بعد رزلٹ کا انتظار کیے بغیر میٹرک کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں صبح آٹھ سے دوپہر ایک بجے تک کا وقت اسکول میں گزرتا تھا۔ پھر ڈیڑھ پونے دو بجے گھر واپسی ہوتی۔ کھانا کھا کر ذرا دیر آرام کرتی اور پھر گھر کے کام شروع ہو جاتے تھے۔ حرا آپا کی شادی ہو گئی تھی اور امینہ باجی ٹیوشن پڑھاتی تھیں اس لیے چائے سے لے کر رات کے کھانے تک سب مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی مہمان آ جاتا تو اس کی خاطر تواضع بھی میری ذمے داری تھی۔ مگر اسکول کے بعد جب گھر بیٹھی تو وقت گزارے نہیں گزرتا تھا۔ سر عرفان اب تک اسکول کو ہائی اسکول تک لے جانے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے اور مجھے کسی اور کالج میں داخلے کے خیال سے الجھن ہو رہی تھی۔ مگر جب ان دنوں بوریت سے میں ایسی بوکھلائی کہ فوری فیصلہ کر لیا کہ رزلٹ آتے ہی کالج میں داخلہ لے لوں گی۔

خوش قسمتی سے ان ہی دنوں سر عرفان کی کال آئی کہ انٹر کلاسز کی اجازت مل گئی تھی اور ایک مہینے بعد اس کی کلاسز شروع ہو جائیں گی۔ میں یہ سن کر خوش ہو گئی تھی۔ مگر ایک مہینا کاٹنا دشوار لگ رہا تھا۔ ایک دن مجھے خیال آیا اور میں نے پہلے امی سے پوچھا۔ ''کیا میں اسکول میں پڑھا سکتی ہوں؟''

''تو جاب کرے گی؟'' امی نے حیرت سے کہا۔ ''تو جانتی ہے تیرے ابا لڑکیوں کی نوکری کے خلاف ہیں۔''

''امی میں جاب نہیں اسکول میں پڑھانے کی بات کر رہی ہوں۔ سر عرفان کے اسکول میں جہاں میں اب تک پڑھتی آئی ہوں۔''

''کیا عرفان صاحب نے کہا ہے؟''

''نہیں مجھے خیال آیا تو پہلے میں نے آپ سے پوچھا آپ اور ابو اجازت دیں تو پھر میں سر سے بات کروں گی۔''

''تو کیا پڑھائے گی وہاں؟''

''امی چھوٹی کلاسز کو پڑھا سکتی ہوں۔''

امی نے ابو سے بات کی اور ان کو اس میں کوئی اعتراض والی بات نظر نہیں آئی اس لیے انہوں نے اجازت دے دی۔ میں نے اسکول جا کر سر سے بات کی تو وہ خوش ہو گئے۔ ''یہ تو اچھی بات ہے اتفاق سے ہمیں ضرورت بھی ہے کیونکہ ایک ٹیچر چھٹی پر گئی ہیں۔''

میں جانتی تھی مس شائلہ میٹرنٹی لیو پر تھیں اور وہ کئی مہینے بعد واپس آتیں۔ سر عرفان مجھے ان کی جگہ رکھنا چاہ رہے تھے۔ میں تو رضا کارانہ پڑھانا چاہتی تھی کہ میری تعلیم کام آئے مگر سر نے مجھے تنخواہ دینے کا بھی کہا۔ سوائے تقریبات کے طلبہ اور طالبات یونیفارم پہن کر آتے تھے مگر وہ تقریبات ہوتی تھیں جن میں سر کسی پر انفرادی توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ مگر اس روز انہوں نے مجھے دیکھا تو ستائشی انداز میں بولے۔ ''ماشا اللہ حمیرا آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔''

''سچ میں۔'' میں نے شرما کر کہا۔

''کسی سے جھوٹ نہیں کہتا اور نہ ہی جھوٹی تعریف کرتا ہوں۔''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے سر کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ آپ جھوٹ بول سکتے ہیں۔''

انہوں نے بالکل عمومی اور کسی قدر بزرگانہ انداز میں میری تعریف کی تھی مگر مجھے بہت اچھا لگا۔ ''بس تو آپ کل سے آ رہی ہیں؟''

''جی سر۔''

میں نے اگلے دن سے اسکول جانا شروع کر دیا اور اب میری حیثیت طالبہ کی نہیں بلکہ ٹیچر کی تھی۔ میں مس شائلہ کی کلاسز لینے لگی۔ گھر میں اس ڈر سے تنخواہ کا نہیں بتایا کہ کہیں ابو اسے نوکری نہ سمجھیں اور مجھے منع کر دیں۔ میں نے سوچا کہ جب تنخواہ ملے گی تو امی کو تنخواہ دیتے ہوئے بتا دوں گی۔ بچے میرے جیسے تھے اس لیے مجھے ان کو

پڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ٹیچرز سے گھلنے ملنے میں کچھ جھجک ہوئی مگر چند دن بعد وہ بھی جاتی رہی اور مجھے لگا جیسے میں ہمیشہ سے یہاں پڑھاتی آئی ہوں۔ دو مہینے بعد میرا رزلٹ آگیا اور میں نے اے ون گریڈ لیا تھا مگر میں پوزیشن حاصل نہیں کرسکی تھی۔ میرے بیچ کے سارے ہی طلبا پاس تھے اور اکثر نے بہت اچھا گریڈ حاصل کیا تھا۔ اس دوران میں انٹر کلاسز کے لیے ٹیچرز ہائر کرلیے گئے تھے اور کلاسز شروع ہوگئیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ مس شائلہ ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ان کی طبیعت نہیں سنبھلی تھی اور انہوں نے مزید ایک مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ سر عرفان فکرمند ہوئے کہ اب کیا ہوگا تو میں نے ان سے کہہ دیا۔

''سر میں ایک مہینا اور پڑھادوں گی۔''

''اور آپ کا جو حرج ہوگا؟''

''میں اسے کور کرلوں گی۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

سر عرفان خوش ہوگئے۔ ''میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

''سر میں آپ کی احسان مند ہوں آپ کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔'' میں نے جذباتی ہوکر کہا۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے آپ یوں نہ کہیں۔''

یہ حقیقت تھی مجھے سر عرفان کے لیے کچھ بھی کرنا بہت اچھا لگتا۔ اس وقت بھی مجھے خیال نہیں آیا کہ میں ان سے اتنی متاثر کیوں ہوں۔ حالانکہ اٹھارہ سال کی جوان العمر لڑکی تھی۔ مجھے اس عمر کے نشیب و فراز کا علم تھا۔ میں بدستور پڑھاتی رہی اور اس دوران میں انٹر کلاسز کے نوٹس لے کر گھر میں تیاری کرتی رہی۔ میری سہیلیاں اپنے نوٹس مجھے دے دیتی تھیں۔ میں نے کامرس لی تھی اور آئی کام میں داخلہ لیا تھا۔ اسکول میں فی الحال کامرس اور آرٹس میں انٹر کی کلاسز کا آغاز ہوا تھا۔ سائنس کے لیے لیب اور اساتذہ کا بندوبست نہیں ہوسکا تھا اس لیے سر عرفان نے اسے آئندہ کے لیے ملتوی کردیا تھا۔ اس روز میں اسکول پہنچی تو پتا چلا کہ سر عرفان نہیں آئے ہیں۔ ان کی والدہ کی طبیعت خراب ہے اس لیے انہوں نے آج چھٹی کرلی تھی۔ میں نے ساتھی ٹیچرز سے کہا۔

''ہمیں سر کی والدہ کی عیادت کے لیے جانا چاہیے۔''

زیادہ تر مان گئیں اور کچھ جو نہیں مان رہی تھیں وہ بھی دکھاوے کے لیے راضی ہوگئیں۔ طے ہوا کہ اسکول کے

بعد سب ٹیچرز ساتھ جائیں گی اور سر عرفان کی والدہ کی عیادت کر کے پھر اپنے گھروں کو جائیں گی۔ سب نے اپنے اپنے گھر والوں کو اطلاع کر دی۔ میں نے فون کر کے امی کو بتایا اور انہوں نے جو جواب دیا وہ میری ساتھی نے سن کر مجھے بتایا۔ امی نے اجازت دے دی تھی۔ ہم چھٹی کے بعد نکلے اور بسوں میں سر کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت پبلک ٹرانسپورٹ کا آج جیسا برا حال نہیں تھا۔ بسیں چلتی تھیں اور حالت بھی بہتر ہوتی تھی۔ سر عرفان کا گھر بڑے سے پلاٹ پر اور پرانے انداز کا بنا ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی جس میں گھنے درخت اور پھولدار پودوں کے تختے تھے۔ برآمدے کے ستونوں پر بوگن ویلیا کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ کال بیل پر سر عرفان خود آئے تھے۔ مس نازگل نے انہیں اطلاع کر دی تھی۔ وہ ہمیں اندر ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ بڑا سا کمرا جو پرانے طرز کے بھاری اور عالی شان فرنیچر سے آراستہ تھا۔

گرمی کا موسم تھا انہوں نے ہماری ٹھنڈے شربت سے خاطر تواضع کی۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی والدہ اختلاج قلب کی مریضہ تھیں اور ڈاکٹر نے انہیں آرام اور سکون کا مشورہ دیا تھا۔ زیادہ لوگوں سے ملنے سے منع کیا تھا اس لیے ہم سب ایک ساتھ ان سے نہیں مل سکتے تھے۔ ہاں ایک ایک کر کے مل سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”سر آپ سے ان کی طبیعت معلوم ہو گئی میرا خیال ہے یہی کافی ہے۔ ٹیچرز کی طرف سے ہم میں سے کوئی ایک جا کر ان سے مل لیتا ہے۔ سمجھ لیں سب کی طرف سے عیادت ہو جائے گی۔“

”تم نے اچھی بات کہی ہے۔“ سر عرفان تحسین والے انداز میں بولے۔ میں لہجے کا اندازہ تاثرات سے کرتی تھی۔ ”ایسا کرو تم ہی ان سب کی طرف سے مل لو۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ سر نے مجھے کہا اور اس پر کچھ ٹیچرز کا منہ بن گیا تھا مگر میں نے پروا نہیں کی اور سر کے ساتھ اٹھ کر اندر آ گئی۔ ان کا گھر اندر سے بھی بہت بڑا اور خوب صورتی سے سجا ہوا تھا اگرچہ تقریباً تمام چیزیں پرانی اور پرانے انداز کی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”سر آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسے۔ ”میرے جاننے والے کہتے ہیں کہ میں میوزیم میں رہتا ہوں۔ مجھے پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔“

”مجھے بھی سر۔“ میں نے کہا۔ ”پرانی چیزوں اور پہلے کے لوگوں کی بات الگ ہوتی تھی۔ آج کل نہ چیزوں میں وہ بات ہے اور نہ لوگوں میں۔“

میری بات پر وہ کچھ دیر کے لیے مجھے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ سر کی والدہ بہت بوڑھی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ستر سے اوپر کی ہوں گی۔ بیماری کے باوجود ان کا چہرہ سرخ و سفید اور دمکتا ہوا تھا۔ پورے سفید بال صفائی سے چوٹی کی صورت میں بندھے تھے اور انہوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔ سر نے جھک کر ان سے آہستہ سے کہا۔ ”امی یہ میرے اسکول کی ایک ٹیچر ہیں سب کی طرف سے آپ سے ملنے آئی ہیں۔“

میں نے سلام کیا تو انہوں نے جواب دے کر ہاتھ اوپر کیا۔ میں نے سر جھکایا تو انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولیں۔ ”جیتی رہو۔“

”آپ کیسی ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے بہتر ہوں۔“ وہ بولیں۔ ”تم بیٹھو نا۔“

سر نے ایک کرسی بستر کے قریب رکھ دی اور میں بیٹھ گئی۔ وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگیں اور میں بتانے لگی۔ مگر نہ جانے کیوں میں ان کو نہیں بتا پائی کہ میں سن نہیں سکتی ہوں۔ سر باہر چلے گئے تھے۔ باتوں کے دوران اچانک ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نظر آئے اور انہوں نے کہا۔ ”پانی......“

میں نے جلدی سے انہیں گلاس میں پانی لے کر اور پھر انہیں سہارا دے کر پلایا۔ پانی پی کر ان کی حالت بہتر ہوئی اور انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت اچھی بیٹی ہو، اللہ تمہیں سکھی رکھے۔“

”آپ نے کوئی دوا لینی ہے؟“

”عرفان جانتا ہے کہ کس حالت میں کون سی دوا دینی ہے۔“

”میں ان کو بلاتی ہوں۔“ میں نے کہا اور باہر آئی تو وہ راہداری میں موجود تھے میں نے ان کو والدہ کی حالت بتائی تو وہ تیزی سے اندر آئے۔ انہوں نے ایک طرف شیلف میں رکھی دواؤں میں سے ایک شیشی نکالی اور ایک گولی نکال کر والدہ کو دی اور انہوں نے اسے منہ میں رکھ لیا۔ سر نے ان سے کہا۔

”اب آپ آرام کریں۔“

”میں چلتی ہوں۔“ میں نے کہا۔

"نہیں تم کچھ دیر رکو۔" سر کی امی نے کہا اور انہوں نے بھی سر ہلایا تو میں کرسی پر ٹک گئی۔ وہ اب خاموش لیٹی ہوئی تھیں۔ ذرا سا بولنے سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں واقعی آرام کی ضرورت تھی۔ سر بھی وہیں بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"امی ان کے ساتھ دوسری ٹیچرز بھی آئی ہیں اور انہیں گھر جانا ہے۔"

"اچھا بیٹا۔" انہوں نے میری طرف دیکھا۔ "تم جاؤ لیکن تمہارے آنے سے مجھے اچھا محسوس ہو رہا تھا۔"

"میں پھر آؤں گی آنٹی جلد چکر لگاؤں گی۔"

انہوں نے جانے سے پہلے مجھے پیار کیا۔ میں باہر آئی تو کچھ مجوب سی تھی۔ پتا نہیں آنٹی سب کے ساتھ ایسی تھیں یا صرف میرے ساتھ یوں پیش آئی تھیں۔ سر نے فوراً ہی بتا دیا۔ "حیرت انگیز طور پر امی تم سے اتنا اٹیچ ہو گئیں ورنہ وہ کسی سے اس طرح نہیں ملتی ہیں۔"

"مجھے بھی وہ بہت اچھی لگیں۔ ان کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔"

"ایک ملازمہ ہے وہ گھر کے کام بھی کرتی ہے اور امی کو بھی دیکھتی ہے، شام کو وہ چلی جاتی ہے تو پھر میں دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

"آپ دوسری ذمے داریاں بھی پوری کرتے ہیں۔" میں بے چین ہو گئی۔ "آپ آنٹی کے لیے چوبیس گھنٹے کے لیے دیکھ بھال کرنے والی کیوں نہیں رکھ لیتے۔"

وہ ہنسے۔ "ایسی دیکھ بھال کرنے والی یا تو بیٹی ہو سکتی ہے یا بہو اور وہ دونوں ہی نہیں ہیں۔"

میں پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیوں نہیں ہیں مگر میں جھجک کی وجہ سے نہیں پوچھ سکی۔ ٹیچرز میری منتظر تھیں اور بعض کے چہرے بگڑے ہوئے تھے۔ جب ہم باہر نکل رہے تھے تو ایک ٹیچر نتاشہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اندر کچھ زیادہ ہی دیر نہیں ہو گئی تھی۔"

اس وقت میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اس لیے دیکھ نہیں سکی۔ ہاں راستے میں سب کو بتاتی رہی کہ سر کی امی سے کیا باتیں ہوئی تھیں اور وہ مجھ سے کس طرح پیش آئی تھیں۔ اس پر نتاشہ نے پھر کہا۔ "لگتا ہے بڑی بی کا دل آ گیا ہے حمیرا بی بی پر۔"

"یہ ہے بھی ایسی کہ اس پر دل آ جائے۔" مس ناز گل نے میری حمایت کی۔ مجھے بعد میں میری دوست ٹیچر نے یہ سب بتایا۔ مجھے غصہ آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"لوگوں کی ذہنیت ایسی ہے ہر بات کو منفی معنوں میں لیتے ہیں۔"

مس شائلہ ایک کی بجائے ڈیڑھ مہینے بعد آئی تھیں اور تب میں نے ٹیچنگ چھوڑ کر دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میں جس دن یونیفارم میں آئی اس دن مجھے عجیب سا لگا تھا مگر چند دن بعد میں عادی ہو گئی اور پھر وقت کم تھا اس لیے نصاب سے پیچھے رہ جانے کی تلافی کرنے لگی۔ اکاؤنٹنگ اور کامرس کے دوسرے مضمون میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کو سمجھنے اور عبور حاصل کرنے کے لیے مجھے بہت جان مارنی پڑی تھی۔ ان دنوں پیپرز نزدیک تھے اور چند دن بعد ہمیں اسکول سے چھٹی مل جاتی اور ہم گھر میں تیاری کرتے۔ سر عرفان نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ جب سے میں دوبارہ طالبہ بنی تھی ان سے بس ایک دو بار بات ہوئی تھی اور وہ بھی عام سی۔ میں سوچ رہی تھی کہ انہوں نے کیوں بلایا ہے؟ میں ان کے دفتر میں آئی تو انہوں نے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔

"سوری حمیرا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں سر میں آپ کی شاگرد ہوں آپ کے اسکول میں پڑھتی ہوں آپ مجھے حکم دیں۔"

"میں جو کہنے جا رہا ہوں اس کا تعلق اسکول سے نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اسی لیے میں نے پہلے سوری کی ہے۔"

"حکم کریں سر۔"

"حکم نہیں درخواست ہے میری امی بہت عرصے سے تم سے ملنے کو کہہ رہی ہیں۔ اب تک میں انہیں ٹالتا رہا ہوں مگر اب ان کے اصرار میں شدت آ گئی ہے۔"

میں بے چین ہو گئی۔ "سر آپ کیوں ٹالتے رہے وہ بیمار ہیں آپ کو ان کی ہر بات ماننی چاہیے۔"

"اپنی ذات کی حد تک میں نے ان کی ہر بات مانی ہے مگر تم کوئی اور ہو۔"

میں نے سوچا نہیں اور نہ ہی مجھے خیال آیا مگر نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا۔ "سر میں کوئی اور نہیں ہوں، آپ مجھے اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھیں۔"

سر اور میں بھی چند لمحے کے لیے ششدر اور خاموش رہ گئے تھے۔ شاید میرے تاثرات نے انہیں بتا دیا کہ میں نے بے ساختہ کہا ہے۔ اس لیے انہوں نے کمال مہارت

سے بات سنبھال لی اور نارمل لہجے میں بولے۔ ''تو آپ راضی ہیں۔''

''جی سر جس وقت آپ کہیں۔'' میں نے بھی خود کو سنبھال لیا۔

''میں آپ کو ساتھ لے چلوں گا اور پھر گھر چھوڑ دوں گا۔''

میں ہچکچائی۔ ''نہیں سر میں گھر سے آؤں گی۔ امی کو بتانا ہوگا۔''

''بلکہ پہلے آپ ان سے پوچھ لیں۔''

''سر میری امی اور ابو مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں کیونکہ میں نے کبھی کوئی کام ان سے پوچھے بغیر نہیں کیا۔ اب بھی پوچھوں گی اور وہ مجھے اجازت دے دیں گے۔''

میں نے امی سے پوچھا۔ انہوں نے اجازت دے دی مگر وہ چونک گئی تھیں کہ سر کی امی نے مجھے بلایا ہے۔ میں نے پہلے بھی امی کو بتایا تھا کہ وہ مجھ سے کتنے پیار سے ملی تھیں۔ میں اسکول سے آنے کے بعد بلال کے ساتھ سر کے گھر گئی۔ میں نے ان کو بتا دیا تھا اور وہ گھر پر تھے۔ جب ہم ان کے گھر کے پاس پہنچے تو بلال نے کہا۔ ''باجی یہاں میرا ایک دوست رہتا ہے جب تک آپ سر کے ہاں ہیں میں اس سے مل آؤں؟''

''چلے جانا لیکن پہلے سر سے مل لینا اور دوست کے پاس سے جلدی آجانا۔ میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔'' میں نے کہا۔ بلال نے سر سے سلام دعا کی اور باہر سے چلا گیا۔ میں سر کے ساتھ اندر آئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''سر خیریت آنٹی کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''پھر کیا بات ہے سر آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

انہوں نے اپنے کسی قدر بڑھ جانے والے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔ ''وجہ ہے۔''

''کیا مجھ سے متعلق ہے؟''

میرے سوال پر انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''شاید...... اینی وے تم امی سے مل لو مگر ان کی باتوں پر زیادہ دھیان مت دینا۔''

سر کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں آنٹی کی بات پر کیوں دھیان نہ دوں۔ یہی سوچتے ہوئے میں آنٹی کے کمرے میں آئی تو وہ بستر پر خاموش لیٹی ہوئی تھیں مگر مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی اور وہ اٹھ بیٹھیں۔ ''میری بچی کب آئیں۔''

''ابھی آئی ہوں آنٹی۔'' میں نے سلام کر کے کہا۔ ''آپ کیسی ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔'' انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''بس تمہاری بہت یاد آرہی تھی۔''

''تم امی کے پاس بیٹھو۔'' سر نے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کچھ لاتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے منع کرنا چاہا مگر وہ کمرے سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں کرسی کھینچنے لگی تو آنٹی نے منع کر دیا۔

''یہاں میرے پاس آجاؤ۔'' انہوں نے بیڈ کے سرہانے اشارہ کیا اور پھر اصرار کر کے مجھے بٹھا لیا۔ انہوں نے تازہ پھل رکھے ہوئے تھے وہ کاٹنے لگیں۔ میں نے منع کیا اور پھر خود ان سے لے لیا۔

''سر بتا رہے تھے کہ آپ نے کئی بار مجھ سے ملنے کو کہا تھا۔''

''میں تو اسی دن سے کہہ رہی ہوں جس دن تم مل کر گئی تھیں۔ مگر یہ ٹال رہا تھا۔ کہہ رہا تھا تم اسکول میں بہت معروف ہو۔''

''جی معروفیت واقعی رہی لیکن اگر سر مجھ سے کہہ دیتے تو میں ضرور آتی۔''

''مجھے معلوم ہے تمہیں پتا ہوتا تو تم ضرور آتیں۔'' وہ بولیں۔ ''جب سے تمہیں دیکھا ہے دل تمہاری طرف کھنچتا ہے۔''

''یہ آپ کی محبت ہے آنٹی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں۔''

''میں جتنی اچھی ہوں یہ مجھے معلوم ہے لیکن میرا بیٹا سچ مچ بہت اچھا انسان ہے۔'' انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ ہر حال میں بیٹا ہونے کا حق ادا کرتا ہے لیکن میں نے ماں ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔''

''نہیں آنٹی آپ بھی بہت اچھی ہیں تب ہی تو سر اتنے اچھے ہیں۔''

''عرفان اچھی فطرت کا فرماں بردار لڑکا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ورنہ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مجھے چھوڑ کر چلا جاتا میری صورت بھی نہ دیکھتا۔''

میں ان کی بات پر حیران ہوئی اور پھر جھجک کر پوچھا۔ ”آنٹی آپ نے ایسا کیا کیا ہے؟“

انہوں نے سرد آہ بھری۔ ”مجھے بتاتے ہوئے شرم آرہی ہے لیکن یوں سمجھ لو کہ آج میرا بچہ میری وجہ سے اکیلا ہے۔ اس کی زندگی ویران اور سونی ہے تو اس کی ذمے دار میں، اس کی ماں ہوں۔“

اب میں کسی قدر سمجھ رہی تھی۔ شاید سر کہیں پسند کی شادی کرنا چاہتے ہوں اور آنٹی نے منع کر دیا ہو اور اس کے بعد سر نے دل برداشتہ ہو کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ کیونکہ آنٹی نے کہہ دیا تھا کہ انہیں بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے اس لیے میں نے اس پر مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگیں اور میں اپنی فیملی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ حرا آپا کی شادی اور امینہ باجی کی منگنی کا سن کر انہوں نے میرے بارے میں پوچھا۔ ”تمہاری کہیں بات ہوئی ہے؟“

میں شرما گئی۔ ”نہیں آنٹی۔“

”تمہاری عمر کتنی ہے؟“

”اس سال جنوری میں پورے اٹھارہ سال کی ہوئی ہوں۔“

وہ کسی قدر حیران ہوئیں۔ ”اچھا دیکھنے میں تم ماشااللہ بڑی لگتی ہو؟“

میں مسکرائی۔ ”ہم سب بہن بھائی ذرا بڑی جسامت کے ہیں اور میں سب سے زیادہ تیزی سے بڑھی ہوں۔ مگر میرا فٹ اور وزن اب بڑھنا بند ہو گیا ہے۔ میں پانچ پانچ قد اور پینسٹھ کے جی کی ہوں۔“

”ہاں مگر جسم بھاری نہیں ہے بس ذرا بڑی لگتی ہو۔“ انہوں نے جلدی سے وضاحت کی اور میری بلائیں لیں۔ ”ویسے تو ماشااللہ بہت پیاری ہو۔“

میں پھر شرمائی۔ ان کا انداز کچھ الگ سا تھا۔ پھر وہ دوبارہ سر کی باتیں کرنے لگیں کہ وہ کتنے پڑھے لکھے اور اعلیٰ کردار کے انسان ہیں۔ میں ان کی تائید کر رہی تھی۔ بے شک وہ جو کام کر رہے تھے ہمارے معاشرے میں ایسا کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسا ادارہ چلا رہے ہیں جس کی ہمارے ہاں مثال نہیں ملتی ہے۔ جب میں نے ان کی پُرجوش انداز میں تائید کی تو وہ خوش ہوگئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ بس عمر ذرا زیادہ ہے۔ تم جنوری کی پیدائش ہو وہ مئی میں پیدا ہوا ہے۔ اس سال مئی میں سینتیس برس کا ہو جائے گا۔“

میں سمجھی نہیں کہ انہوں نے عمر کا ذکر کیوں کیا ہے۔ ”جی آنٹی میں جانتی ہوں وہ سینتیس کے ہو جائیں گے مگر جو ان کی اصل عمر نہیں جانتے وہ تو انہیں تیس کا بھی نہیں سمجھتے ہیں۔“

یہ حقیقت تھی کہ سر کے بالوں میں سفید تار نہ ہونے کے برابر تھے جب کہ اس عمر میں بہت سے لوگوں کا آدھا سر سفید ہو جاتا ہے۔ بے داغ اور چمکتی ہوئی جلد اور بالکل فٹ جسم کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں کم لگتے تھے۔ اچانک آنٹی نے پوچھا۔ ”حمیرا بیٹے یہ بتاؤ کہ عرفان تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

میں اس وقت بھی ان کی بات کا مفہوم نہیں سمجھی اور میں نے سادگی سے کہا۔ ”اچھے لگتے ہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہو۔“ وہ خوش ہو کر بولیں اور پھر بولتے بولتے رک گئیں۔ ان کی نظر میرے عقب میں گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر سر موجود تھے۔ وہ اندر آئے اور اس وقت وہ سنجیدہ لگ رہے تھے انہوں نے مجھ سے کہا۔

”حمیرا آپ میرے ساتھ آئیں۔“

”یہ میرے پاس بیٹھی ہے۔“ آنٹی نے کہا۔ اتفاق سے اسی وقت میں نے ان کی طرف دیکھا تو لپ ریڈنگ سے سمجھ لیا۔

”آپ آرام کریں آپ کی طبیعت پھر نہ خراب ہو جائے۔“ سر نے کہا اور مجھے اشارہ کیا تو میں کھڑی ہو گئی۔

”اچھا آنٹی میں پھر آؤں گی۔“ میں جھک کر ان کے گلے لگی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں بے تاب ہو گئی اور ان کی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”آنٹی میں ضرور آؤں گی خود سے آؤں گی۔“

”میں انتظار کروں گی۔“ انہوں نے کہا اور میں سر کے ساتھ باہر نکل آئی۔ وہ مجھے نشست گاہ میں لائے یہاں انہوں نے چائے اور دوسری چیزوں کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ پہلے آنٹی کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور پھر سر مجھے اس طرح وہاں سے تقریباً زبردستی لے آئے تھے۔ جبر انہوں نے میرے ساتھ نہیں اپنی ماں کے ساتھ کیا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھ لیا۔

”آپ نے مجھے آنٹی کے پاس بیٹھنے کیوں نہیں دیا؟“

''میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس کیفیت میں وہ بعض اوقات عجیب باتیں بھی کر جاتی ہیں۔''

''لیکن میرے سامنے تو انہوں نے ایک بھی عجیب بات نہیں کی۔ بالکل ٹھیک بات کر رہی تھیں۔''

''ہاں مگر ان کا وقت آگیا تھا میں بروقت پہنچا ورنہ تم شاید ان کی باتیں سن کر حیران رہ جاتیں۔ خیر چھوڑو، یہ سموسے لو بالکل تازہ ہیں۔''

میں نے پہلے انہیں پلیٹ میں سموسے نکال کر دیئے اور پھر اپنے لیے نکالے۔ ''سر آنٹی نے ایک بات ضرور ذرا ہٹ کر کی کہ انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے اور اسی وجہ سے آپ......'' میں بولتے بولتے رک گئی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اب میں ان کی ماتحت نہیں بلکہ طالبہ تھی اور ان سے میرا رشتہ کہیں زیادہ احترام والا تھا۔ ''سوری سر مجھے پوچھنے کا حق نہیں ہے۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''کوئی اور ہوتا تو میں اسے یہ حق کبھی نہ دیتا مگر تم نے میری خاطر اتنا کیا، یہاں چلی آئیں اس لیے تم پوچھ سکتی ہو۔''

میں اندر سے خوش ہوئی تھی اور میں نے پوچھ لیا۔ ''سر وہ آپ کی تنہائی کا ذمے دار خود کو قرار دیتی ہیں۔''

''شاید وہ ایسا ہی سمجھتی ہیں لیکن اللہ گواہ ہے میں نے کبھی انہیں ذمے دار نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اپنے مقدر کو ذمے دار سمجھا۔''

میں جھجکی اور پھر پوچھ لیا۔ ''سر وہ کوئی لڑکی تھی جس سے آپ شادی کرنا چاہتے تھے؟''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''ہاں وہ میرے ساتھ یونیورسٹی میں تھی۔''

اس بار میں نے ہچکچائے بغیر پوچھ لیا۔ ''آنٹی نہیں مانیں۔''

''یہ بھی سچ ہے مگر میں انہیں قصوروار نہیں سمجھتا۔''

میں نے لپ ریڈنگ سے سر کا جواب دیکھا مگر اس پر غور نہیں کیا۔ میرا ذہن تو اس لڑکی میں الجھ گیا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''وہ چلی گئی؟''

''ہاں اس کی شادی ہوگئی تھی۔''

میں نے نہ جانے کیوں اطمینان کا سانس لیا۔ ''پھر سر آپ نے اسکول کھول لیا۔''

''ہاں میں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے اسکول کھولا تھا مگر اب یہ میرا مشن ہے۔''

''سر آپ اسے مشن سے بڑھ کر چلا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے میرے امی ابو اور اب میں حیران ہوتی ہوں کہ آپ اس کے اخراجات کیسے پورے کرتے ہیں۔''

''میرے پاس کچھ ڈونرز ہیں جو اس اسکول کے لیے سب کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ان کے دیئے پیسوں کی مدد سے میں اسے یہاں تک لے کر آیا ہوں۔''

انہوں نے سموسے کے بعد ہاتھ روک لیے اس لیے میں نے ان کے لیے چائے بنائی۔ وہ مجھ سے مستقبل کے بارے میں پوچھنے لگے کہ انٹر کے بعد میرا کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ میں پہلے گریجویشن کروں گی اور اس کے بعد اگر امی ابو نے اجازت دی تو شاید ماسٹرز بھی کروں۔ انہوں نے کہا۔ ''تمہیں آفر ہے انٹر کے بعد جب تمہارا دل چاہے تم میرا اسکول جوائن کر سکتی ہو۔ میں تمہیں اچھا پیکیج دوں گا۔''

''رئیلی سر۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''تب تو شاید میں گریجویشن پرائیویٹ کرلوں۔ دوسرے مجھے کالج میں وہ سہولت نہیں ملے گی جو اس اسکول میں ہے۔ یہاں میں خود کو معذور محسوس نہیں کرتی ہوں۔''

''تم ہو بھی نہیں۔'' سر نے یقین سے کہا۔ ''معذور وہ ہوتا ہے جو خود کو کسی کام سے معذور سمجھے۔''

جب تک میں کھا پی کر چائے سے فارغ ہوئی بلال آگیا اور میں سر سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آئی۔ گھر آکر میں نے امی کو ساری روداد سنائی اور یہ بھی بتایا کہ سر کی شادی ان کی امی کی وجہ سے نہیں ہوئی کیونکہ انہوں نے ان کی پسند کو مسترد کر دیا تھا۔ امی سوچ میں پڑ گئی تھیں جو بات میرے ذہن میں نہیں آئی وہ ان کے ذہن میں آگئی۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی اور جانتی تھیں کہ کسی بیٹے کی ماں کب کسی غیر شادی شدہ لڑکی سے اس قسم کی باتیں کرتی ہے جیسی آنٹی نے مجھ سے کی تھی۔ انہوں نے مجھ سے کرید کرید کر سوال کیے اور خاص طور سے سر کے بارے میں پوچھا کہ جب وہ مجھ سے بات کر رہے تھے تو ان کا کیا انداز تھا؟ میں سادگی میں بتاتی گئی۔ جب میں خاموش ہوئی تو امی نے بھی وہی سوال کیا جو آنٹی نے کیا تھا۔ ''تجھے سر عرفان کیسے لگتے ہیں۔''

اس بار میں چونک گئی۔ آنٹی نے یہ سوال کیا تو

میں نے اسے عام فہم معنوں میں لیا تھا مگر جب امی نے یہ سوال کیا تو میں اسے اس طرح نہیں لے سکتی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''بس پوچھ رہی ہوں تو جواب دے۔''

''اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا مگر اس وقت مجھے اپنا چہرہ تپتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ''آنٹی نے بھی یہی سوال کیا تھا اور آپ بھی یہی پوچھ رہی ہیں۔''

''اس کی وجہ ہے۔'' امی نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ عرفان صاحب تم سے عام سے انداز میں پیش آتے ہیں یا تمہارے ساتھ ان کا رویہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔''

اب میں سمجھنے لگی کہ امی کی باتوں کا مفہوم کیا ہے اور وہ بات کس سمت لے جا رہی ہیں۔ میں نے بے بسی سے امی کی طرف دیکھا۔ ''امی پلیز... آپ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ سر میرے لیے قابلِ احترام ہیں۔''

''ہر شخص جو اچھی نیت رکھتا ہو قابل احترام ہی ہوتا ہے۔'' امی نے کہا۔ ''میں عرفان صاحب کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسی لیے تم سے یہ باتیں پوچھ رہی ہوں۔ میں تمہاری ماں ہوں اور تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔''

''نہیں میں نے کبھی ان کے انداز میں اپنے لیے الگ سے کچھ محسوس نہیں کیا، وہ شروع سے مجھ سے جس طرح پیش آتے تھے اب بھی اسی طرح پیش آتے ہیں اور جب انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھانے کی پیشکش کی تب بھی ان کا انداز نارمل ہی تھا۔''

''اچھی بات ہے۔'' امی نے کہا۔ ''اب ان کی امی تجھے بلائیں تو پہلے مجھے بتانا۔''

''کیوں امی؟''

''میں تیرے ساتھ چلوں گی۔''

''نہیں آپ نہیں جائیں گی اور نہ ہی اب میں وہاں جاؤں گی۔'' میں نے کہا اور امی کے پاس سے اٹھ گئی۔ نہ جانے کیوں مجھے امی کے ردِعمل پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی پُرجوش ہو گئی تھیں۔ ٹھیک ہے آنٹی کا انداز بھی ایسا ہی تھا مگر سر نے مجھ سے بالکل نارمل انداز میں بات کی تھی اور ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اگر ان کی امی کے ذہن میں کچھ تھا تو انہیں اس میں ذرا بھی دل چسپی نہیں تھی۔ جب انہیں ہی دل چسپی نہیں تھی تو میری اور ان کی امی کیوں اتنی دل چسپی لے رہی تھیں۔ پیپرز کے لیے انٹر کلاسز کو چھٹیاں دے دی گئی تھیں اور اب میں گھر پر تیاری کر رہی تھی۔ چند دن بعد امی نے پھر مجھ سے کہا۔

''عرفان صاحب کی امی نے تجھے پھر نہیں بلایا۔''

''امی میرے ایک سوال کا جواب دیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا میں آپ پر بھاری ہوں؟''

''کیسی باتیں کر رہی ہے۔'' امی بے چین ہو گئیں۔ ''تم میری اولاد ہو اور اولاد ماں باپ پر بھاری نہیں ہوتی ہے۔''

''تب ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہیں۔ ''میری بچی میں کیا کروں ماں ہوں نا، جب یہ خیال آتا ہے کہ یہاں تو اچھی خاصی لڑکیاں گھر بیٹھی ہیں ان کے لیے رشتے نہیں ہیں اور پھر تجھے دیکھتی ہوں تو......''

''میں بھی گھر بیٹھی رہوں گی۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''بیٹیاں جتنی جلدی گھر کی ہو جائیں اتنا اچھا ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن جس نے لینا ہے یہاں میرے گھر آئے، نہ میں کہیں جاؤں گی اور نہ آپ کہیں جائیں گی۔''

امی نے میرے لہجے سے سمجھ لیا کہ میں ان کی یہ بات

انسائیکلوپیڈیا (Encyclopaedia)

یونانی لفظ۔ اس سے مراد ایسی کتاب ہے جو ابجدی ترتیب کے علاوہ موضوع وار بھی دنیا بھر کی مختلف اشیا اور علوم وفنون
کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ اردو میں اسے دائرہ معارف کہتے ہیں۔ دنیا کی پہلی انسائیکلوپیڈیا، ارسطو کے عہد
میں، یونانی علماء نے مرتب کرنے کی کوشش کی تھی۔ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں۔ عرب دانشوروں نے جن کا نام اخوان
الصفا تھا اسے عملی شکل دی۔ اس انسائیکلوپیڈیا کی 52 جلدیں یا رسائل تھے۔ خرد دشمنی کے اس دور میں تنگ نظر مذہبی علماء ان
دانشوروں کی یہ جسارت برداشت نہ کر سکے اور ان کے حکم پر اس بیش بہا مخزن علوم وفنون بغداد میں برسرِ عام جلا دیا گیا۔
اٹھارویں صدی کے وسط میں چند فرانسیسی اہلِ علم نے ایک انسائیکلوپیڈیا مدون کی لیکن تنگ نظر مذہبی رہنماؤں کے ہاتھوں اس
کا بھی حشر ہوا جو اخوان الصفا کے انسائیکلوپیڈیا کا ہوا تھا۔ دنیا کی پہلی انسائیکلوپیڈیا جو جدید سائنسی بنیادوں پر مرتب کی گئی
انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا (Encyclopaedia Britanica) ہے۔ انگلستان 1767ء میں تجربہ کار ایڈیٹروں کی ایک
جماعت بنائی گئی جس نے تین سال کے عرصے میں یہ انسائیکلوپیڈیا تالیف کی۔ یہ انگریزی کے تمام انسائیکلوپیڈیاؤں سے
زیادہ مستند اور معلومات افزا سمجھی جاتی ہے اور معلومات کا تقریباً پورا ذخیرہ اس میں قلمبند ہے۔ اردو کی پہلی انسائیکلوپیڈیا
1962ء میں شائع ہوئی۔ جسے فیروز سنز نے شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 1967ء، تیسرا 1984ء اور چوتھا 2004ء
میں شائع ہوا۔ ازاں بعد جامعہ پنجاب نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے نام پر 88-1987ء میں 23 جلدوں پر مشتمل
انسائیکلوپیڈیا شائع کی۔ اسے یکبارگی شائع نہیں کیا گیا۔ اسی اثناء میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اردو جامع انسائیکلوپیڈیا
زاہد حسین انجم کی نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد 1988ء میں شائع کی۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ سید قاسم محمود نے شاہکار اسلامی

نہیں مانوں گی اس لیے وہ چپ ہو گئیں۔ میں بوجھل دل کے ساتھ پیپرز کی تیاری میں لگ گئی۔ مجھے سر اور ان کی امی سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی مگر امی کے اس رویے سے تکلیف ہوئی تھی کہ کیا میں ان پر ایسی بوجھ تھی جو وہ صرف ایک معمولی سے اشارے پر دوڑی جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔ پیپرز ہوئے اور بہت اچھے ہوئے۔ اس کے چند دن بعد میں نے پھر اسکول جانا شروع کر دیا۔ سیکنڈ ائر کی کلاسز شروع ہو گئی تھیں۔ ان دنوں سر عرفان نے اسکول کے پرائمری سیکشن میں دوپہر کی شفٹ کا آغاز کیا تھا۔ کیونکہ داخلے کے لیے آنے والے بچوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور صبح کی شفٹ ان کے لیے ناکافی ہو گئی تھی اس لیے انہوں نے دوپہر کی شفٹ شروع کی اور مجھے اس میں پڑھانے کی پیشکش کی۔

میں نے امی ابو سے پوچھا اور ان کی اجازت پا کر ہاں کر دی۔ مجھے کل تین کلاسز لینا ہوتی تھیں اور میں چار بجے چھٹی کر کے گھر جاتی تھی۔ شروع میں بس میں جانا پڑا کیونکہ شام کے لیے وین نہیں تھی پھر وین لگی تو میں اس میں جانے لگی۔ میرے انٹر کے امتحانات کے فوراً بعد امینہ باجی

کی شادی کر دی گئی۔ محب بھائی کی شادی بھی ساتھ ہی ہوئی تھی اور کیونکہ گھر میں گنجائش نہیں تھی اس لیے انہوں نے شادی سے پہلے ہی الگ مکان کا بندوبست کر لیا اور بھابی رخصت ہو کر وہیں آئی تھیں۔ محب بھائی شادی سے پہلے گھر کے اخراجات کے لیے امی کو کچھ رقم دیتے تھے مگر جب شادی ہوئی تو انہوں نے یہ بھی دینا بند کر دی۔ مجیب بھائی نوکری کر رہے تھے مگر ان کا رویہ عجیب سا تھا وہ اپنی تنخواہ میں سے گھر میں کچھ نہیں دیتے تھے۔ ابو نے کبھی بیٹوں کی کمائی پر نظر نہیں رکھی اور ہمیشہ اپنے بل بوتے پر گھر چلایا مگر اب وہ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ عرصے بعد ریٹائر ہو جاتے۔ بلال ڈپلومے کے پہلے سال میں تھا اور ابھی اسے تین سال پڑھنا تھا تب کہیں جا کر وہ کہیں ملازمت کے قابل ہوتا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے دو بڑے بھائیوں کا رویہ دیکھ کر امی ابو کو اس سے بھی کوئی اُمید نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں امی ابو کو سپورٹ کی ضرورت ہے۔ میں کما رہی تھی اور جو تنخواہ ملتی وہ امی کو لا کر دیتی تھی۔ مگر اس سے گھر کو زیادہ سپورٹ نہیں مل سکتی تھی۔ اس لیے میں نے انٹر کے بعد فل ٹائم ٹیچر بننے کا فیصلہ کیا اور آگے پرائیویٹ پڑھنے کا سوچا۔ سر نے مجھے

انسائیکلو پیڈیا کے نام سے انسائیکلو پیڈیا شائع کی۔ 1991ء میں مقبول اکیڈمی نے انسائیکلو پیڈیا قائداعظم مرتبہ زاہد حسین انجم طبع کی۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے حوالے سے ایک ضخیم انسائیکلو پیڈیا شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اسی طرح سندھی ادبی بورڈ نے 1996ء میں انسائیکلو پیڈیا کی اشاعت کا اعلان کیا۔ 1996ء میں چینی زبان میں پہلی اسلامی انسائیکلو پیڈیا بیجنگ سے شائع ہوئی۔ یہ انسائیکلو پیڈیا 80 مسلم دانشوروں کی چھ سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں تین سو سے زائد موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اور اسے اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا میں اہم اسلامی تاریخی واقعات پر مشتمل ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ 1997ء میں سید قاسم محمود نے پاکستانیکا شائع کی۔ چیمبرز، ہچنسن نیو ٹوئنٹیتھ سنچری، کولمبیا اور کامپٹن مشہور یک جلدی انسائیکلو پیڈیا بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ امریکانا، بریٹینکا انسائیکلو پیڈیا کے بعد دوسری بڑی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ عربی زبان میں پہلی عالمی انسائیکلو پیڈیا الموسوعہ العربیہ العالمیہ شائع ہوئی یہ تیس جلدوں اور 162200 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ انسائیکلو پیڈیا ایک لاکھ بیس ہزار عنوانات اور ایک جامع عربی انگریزی لغت 18000 تصاویر پر محیط ہے۔ انسائیکلو پیڈیا کی تیاری میں ایک ہزار کے لگ بھگ اہل قلم و دانش نے حصہ لیا اور یہ سات سال میں مکمل ہوئی۔ انسائیکلو پیڈیا میں پانچ ہزار کے لگ بھگ اہم شخصیات کی سوانح شامل کی گئی ہیں۔ 1997ء ہی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مبارک پر بارہ جلدوں پر محیط عربی زبان میں انسائیکلو پیڈیا طبع ہوئی۔ انسائیکلو پیڈیا کو چالیس دانشوروں نے سات سال کی شبانہ روز محبت سے مدون ہوئی۔ یہ انسائیکلو پیڈیا چھ ہزار صفحات اور 360 عناوین پر مشتمل ہے۔ اس کی تیاری پر 20 لاکھ ڈالر لاگت آئی۔ اس کے اردو، فرانسیسی، انگریزی، ترکی، فارسی اور دیگر زبانوں میں تراجم تیار کرانے اور اسے انگریزی میں انٹرنیٹ پر لانے کا منصوبہ بھی بنایا ہے۔

مرسلہ: زاہد شیخ۔ چنیوٹ

پہلے ہی پیشکش کی تھی مگر میں نے پھر بھی ان سے تصدیق کر لی کہ کیا وہ مجھے کل وقتی ٹیچر رکھیں گے اور جب انہوں نے ہاں میں جواب دیا تو میں نے امی سے کہا۔ ''اب میں ٹیچنگ کروں گی اور پرائیویٹ پڑھوں گی۔''

''پر تو تو کالج میں جانا چاہتی تھی۔''

''ہاں لیکن اب میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔''

امی سمجھ رہی تھیں کہ میں کیوں جاب کرنا چاہ رہی ہوں۔ گھر کی حالت میرے سامنے تھی۔ محب بھائی کے الگ ہونے سے کئی مسائل کھڑے ہو گئے تھے اور ابو اس سے اکیلے نہیں نمٹ سکتے تھے۔ بلال کے ڈپلومے کی فیسیں اور دوسرے اخراجات بھی اچھے خاصے تھے۔ میں نے کل وقتی جاب شروع کی اور گریجویشن کے لیے یونیورسٹی میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر داخلہ لیا۔ پیپرز کے بعد میں کل وقتی ٹیچر بن گئی اور صبح سے پڑھانا شروع کیا۔ جب مجھے پہلی تنخواہ ملی جو اچھی تھی اور میں نے امی کے ہاتھ پر رکھی تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔

☆☆☆

سر نے مجھے دفتر میں بلایا۔ ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ انہوں نے کیوں بلایا ہے۔ انہوں نے بیٹھنے کو کہا اور پھر ہچکچا کر بولے۔ ''حمیرا آج پھر تم سے درخواست ہے۔''

''آنٹی نے بلایا ہے۔''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''آئی ایم سوری مگر وہ بہت ضد کر رہی ہیں۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''سر شرمندہ تو میں ہوں ان سے وعدہ کیا تھا کہ خود سے آؤں گی مگر میں نہیں جا سکی۔''

''تم کب آؤ گی یا میں تمہیں لے چلوں چھٹی کے بعد۔''

''سر میں وعدہ نہیں کر سکتی کیونکہ پہلے مجھے امی سے پوچھنا ہوگا ان کی اجازت ہوگی تو میں آؤں گی۔''

''میرا خیال ہے تمہیں اجازت مل جائے گی۔''

''اس صورت میں، میں خود آ جاؤں گی۔'' میں نے واضح کیا کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اس صورت میں کوئی نہ کوئی دیکھتا اور اگلے دن سارے اسکول کو پتا چل جاتا اور اس کے بعد میرے بارے میں قیاس آرائیاں شروع ہو جاتیں جو میں ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

''تم اپنی امی سے کب پوچھو گی؟''

''آج ہی سر اور کل آپ کو بتا سکوں گی۔''

''تمہارے پاس موبائل ہے؟''
اس زمانے میں موبائل عام ہو گیا تھا مگر بہت زیادہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اب تک موبائل نہیں لیا تھا حالانکہ امی نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ میں موبائل لے لوں۔ تاکہ گھر سے باہر بھی مجھ سے رابطہ کیا جاسکے۔ ایس ایم ایس سے میں باآسانی رابطہ کر سکتی تھی۔ مگر میری گنجائش نہیں ہو رہی تھی کہ مہنگا موبائل خرید سکوں۔ ''نہیں سر میرے پاس موبائل نہیں ہے لیکن میں جلد لے لوں گی۔''
''میں چاہتا ہوں کہ کل تمہیں دفتر نہ بلاؤں تم میرے موبائل پر ایک ایس ایم ایس کر کے بتا دینا نیچے اپنا نام بھی لکھ دینا میں سمجھ جاؤں گا۔'' انہوں نے کہتے ہوئے ایک چٹ میری طرف بڑھائی۔ ''یہ میرا نمبر ہے۔''
''جی سر۔'' میں نے ان سے چٹ لی اور باہر نکل آئی میں سوچ رہی تھی کہ سر کیوں مجھے کل دفتر نہیں بلانا چاہتے تھے۔ اس کا کسی قدر اندازہ مجھے اسی دن چھٹی کے وقت ہو گیا جب مس نازگل نے مجھے باہر روکا۔
''حمیرا آج تمہیں سر نے کیوں بلایا تھا؟''
میں ان کے سوال پر حیران ہوئی اور میں نے جوابی سوال کیا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''
''میں تم سے سینئر ہوں پوچھ سکتی ہوں۔'' وہ سخت انداز میں بولیں۔
''مس نازگل سر آپ کو دفتر کیوں بلاتے ہیں۔''
''اسکول کے کام سے۔''
''اسی لیے مجھے بھی بلایا تھا۔''
''تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔ ''سر کی امی نے تمہیں بلایا ہے اور سر نے یہی کہنے کے لیے تمہیں دفتر بلایا تھا۔''
''جب آپ یہ بھی جانتی ہیں تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟''
''تم بہت ہوشیار بن رہی ہو لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گی۔''
میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں اور میرا کیا مقصد ہے۔''
وہ ذرا نزدیک ہوئیں اور اس بار زیر لب کہا۔ ''عرفان کسی کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے پیچھے جانا بے سود ہے۔''
وہ کہتے ہی چلی گئیں اور میں ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا اور نہ ہی ایسا چاہا تھا۔ حد یہ کہ جب امی نے ڈھکے چھپے انداز میں مجھ سے سر کے لیے بات کی تب بھی میرے ذہن میں یہ بات نہیں آئی۔ ٹھیک ہے وہ مجھے اچھے لگتے تھے مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں ان کا ساتھ چاہنے لگتی اور وہ بھی اس صورت میں جب کہ مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے کسی اور سے محبت کی تھی اور انہیں مجھ سے یا کسی بھی دوسری عورت سے دل چسپی نہیں تھی۔ پھر مس نازگل نے مجھ سے ایسی بات کیوں کی۔
ان کے لہجے کا عناد بتا رہا تھا کہ انہیں اس معاملے سے کوئی ذاتی تکلیف ہے۔ اب مجھے کسی قدر سمجھ میں آیا کہ سر نے مجھ سے کیوں موبائل کے ذریعے ایس ایم ایس کرنے کو کہا تھا اور دفتر آنے سے منع کیا تھا۔ میں نے گھر آ کر امی کو بتایا کہ سر کی امی نے مجھے بلایا ہے کیا میں ان سے ملنے جا سکتی ہوں؟ امی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ مجھے لگا کہ وہ انکار کر دیں گی مگر پھر انہوں نے اجازت دے دی۔
''ٹھیک ہے چلی جانا۔''
امی نے خود چلنے کو نہیں کہا یعنی انہیں میرا ردعمل یاد تھا۔ مگر انہوں نے اور بھی کچھ نہیں کہا۔ مجھے لگا کہ اب انہیں میرا جانا پسند نہیں آیا تھا مگر انہیں مجھ پر اعتماد تھا اس لیے انہوں نے منع بھی نہیں کیا۔ میں نے امی کے موبائل سے سر کو ایس ایم ایس کر کے بتا دیا کہ میں کل ان کے گھر آؤں گی مگر اسکول کے بعد۔ سر نے جواب میں ویلکم لکھا۔ اگلے دن میں اسکول سے گھر آئی اور کچھ دیر بعد بلال کے ساتھ نکلی۔ سر گھر پر منتظر تھے۔ اس بار بلال بھی اندر آیا۔ سر ہمیں نشست گاہ میں لے آئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''میں بلال کے ساتھ ہوں تم امی کے پاس چلی جاؤ وہ بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ حالانکہ میں نے انہیں بتایا بھی تھا کہ تم اسکول کے بعد اور ذرا دیر سے آؤ گی۔''
میں آنٹی کے کمرے تک آئی اور دروازہ کھول کر اندر آئی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں اور بہت کمزور لگ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کا ردعمل حیران کن تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں۔ اس دوران میں وہ کچھ کہہ رہی تھیں مگر میں ہونٹ نہ دیکھنے کی وجہ سے سن نہ سکی۔ اس لیے انہیں تھپکتی اور سہلاتی رہی۔ پھر وہ الگ ہوئیں تب میں نے پوچھا۔ ''آنٹی کیا ہوا ہے آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔''
''اس لڑکے کی طرف سے۔'' انہوں نے میرے

ہاتھ تھام لیے اور مجھے بیڈ پر لے آئیں۔ ''میں بول بول کر تھک گئی ہوں مگر وہ مان نہیں رہا ہے؟''

''شادی کے لیے......'' میں نے بے ساختہ کہا تو وہ چونک گئی۔

''تم جانتی ہو؟''

''آپ ہی نے تو کہا کہ آپ ان کی شادی کرنا چاہتی ہیں مگر اب وہ نہیں مان رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' انہوں نے سرد آہ بھری۔ ''ایک وقت تھا جب میں نہیں مان رہی تھی اور اب وہ نہیں مان رہا ہے۔''

سر کیوں نہیں مان رہے تھے یہ تو میں جان گئی تھی لیکن آنٹی کیوں نہیں مانی تھیں اب مجھے اس کا تجسس ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔ ''آنٹی آپ نے بتایا نہیں تھا کہ آپ نے کیوں منع کیا تھا۔ کیا سر کی پسند آپ کو پسند نہیں آئی تھی۔''

''نہیں وہ بہت اچھی تھی۔'' وہ کہتے ہوئے بے چین ہو گئیں۔ ''بہت پیاری سی اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے کے باوجود ذرا بھی آزاد خیال نہیں تھی۔ خاندان بھی بہت اچھا تھا۔''

''پھر کیا وجہ تھی کہ آپ نے انکار کر دیا؟''

''وہ گونگی بہری تھی۔'' انہوں نے ایک اور سرد آہ کے ساتھ بتایا اور میں ششدر رہ گئی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔

''آپ نے صرف اس لیے انکار کر دیا۔''

''ہاں عرفان میں کوئی کمی نہیں ہے اس لیے میں چاہتی تھی کہ اس کی دلہن میں بھی کوئی کمی نہ ہو۔''

مجھے ان کی بات سن کر دھچکا لگا تھا۔ جب سے میں سر کے اسکول میں آئی تھی میرے اندر اعتماد آ گیا تھا کہ مجھ میں کوئی کمی نہیں ہے اور میں خود کو مکمل محسوس کرتی تھی۔ اس کے بعد بھی بہت کم ایسا ہوا کہ کسی کی بات نے مجھے اس حوالے سے متاثر کیا ہو۔ مگر آنٹی کی بات نے مجھے شدت سے احساس دلایا کہ معذور ہونا کیسا ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب سامنے والا آپ کو اسی وجہ سے مسترد کر دے۔ میں نے بہت دیر بعد کہا۔ ''آنٹی یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اسی لیے سر شادی نہیں کر رہے ہیں۔''

''ہاں میری بچی اچھا نہیں کیا مگر اب میں اس کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''میں نے اس کے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔'' انہوں نے میرے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ''مگر وہ مان نہیں رہا ہے۔''

مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی اور میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ مان نہیں رہے ہیں تو پھر آپ کے دیکھنے کا فائدہ۔''

''اگر وہ لڑکی اس سے بات کرے تو وہ مان جائے گا۔ میں جانتی ہوں وہ اسے پسند کرتا ہے۔ اگرچہ اس انداز میں پسند نہیں کرتا ہے جس طرح کوئی مرد کسی عورت کو پسند کرتا ہے مگر وہ اسے پسند ضرور کرتا ہے۔''

''تو آپ اس لڑکی سے بات کر کے دیکھیں۔''

''اسی سے تو بات کر رہی ہوں۔'' انہوں نے کہا تو میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''ہاں میری بچی وہ تجھے پسند کرتا ہے اور تیری بات نہیں ٹالے گا۔ بس تو ایک بار بات کر لے۔'' وہ منت پر اتر آئی تھیں۔ ''وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔ شادی پر مان جائے گا۔''

مجھے لگا جیسے میں کسی گہری کھائی میں گرتی جا رہی ہوں۔ بے شک میں نے کوئی خوش فہمی نہیں پالی تھی اور نہ ہی میرے ذہن میں خیال آیا تھا مگر آنٹی کے رویے نے مجھے غلط فہمی میں ضرور مبتلا کر دیا تھا۔ جیسے میری امی غلط بھی تھیں۔ اصل میں آنٹی نے کسی اور لڑکی کو پسند کیا تھا اور اب میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہ رہی تھیں۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے آنٹی میں ان سے بات کر لیتی ہوں لیکن صرف ایک بار آپ دوبارہ مجھ پر یہ بوجھ نہیں ڈالیں گی۔''

''بس ایک بار کر لے میں پھر تجھ سے یا کسی سے بھی یہ بات نہیں کہوں گی۔''

''میں بات کرتی ہوں۔'' میں کھڑی ہو گئی۔ ''آنٹی اب میں نہیں آسکوں گی آج بھی مشکل سے اجازت ملی ہے اور مجھے جلدی جانا ہے۔''

''ایسا کیوں حمیرا۔'' وہ بے قرار ہو گئیں۔ ''چل تو بات کر لے پھر میں خود تیرے گھر آؤں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے آنٹی۔'' میں نے کہا اور کمرے سے نکل آئی۔ نشست گاہ تک آئی تو سر بلال کے ساتھ بات کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''آپ کو آنٹی بلا رہی ہیں۔''

سر اٹھ کر آئے تو میں نے ان کو آنٹی کے کمرے سے

پہلے روک لیا۔ ”سوری سر میں نے غلط کہا تھا، میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں، آنٹی نے میرے توسط سے آپ کے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔“

وہ حیران ہوئے۔ ”تمہارے توسط سے...... یہ امی کو کیا ہو گیا ہے؟“

”پلیز سر۔“ میں نے کہا۔ ”میری بھی خواہش ہے کہ آپ گھر بسا لیں یوں اکیلے نہ رہیں۔“

انہوں نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ”شاید میں امی کی بات مان لوں مگر وہ جو چاہ رہی ہیں میرے لیے وہ بہت مشکل ہے۔“

”کیوں سر؟“

”تم جانتی ہو وہ میری شادی کس سے کرنا چاہتی ہیں؟“

”نہیں سر لیکن وہ کوئی اچھی لڑکی ہی ہوگی۔“

”وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور وہ تم ہو؟“

مختصر سی مدت میں میرے لیے یہ تیسرا شاک تھا۔ جس بات کو میں غلط فہمی سمجھ کر اپنے دل سے نکال چکی تھی وہی درست نکلی تھی۔ پھر میں نے بے ساختہ کہا۔ ”ان کو بتا دیجیے گا کہ میں بہری ہوں مجھے سنائی نہیں دیتا ہے وہ پھر آپ سے نہیں کہیں گی۔“

میں کہتے ہی ان کی طرف دیکھے بغیر نشست گاہ میں آئی اور بلال سے کہا۔ ”چلو بلال۔“

سر پیچھے آئے تھے مگر بلال کے سامنے انہوں نے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ہمیں چھوڑنے باہر تک آئے تھے میں ان کی یا کسی کی طرف بھی دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ شاید اس وقت میں دیکھ بھی نہیں پاتی کیونکہ میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا رہی تھیں۔ میں گھر آئی تو میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ رات تک مجھے بخار بھی چڑھ گیا اور میں دو دن اسکول نہیں جا سکی۔ امی سے چھٹی کا کہلوا دیا تھا۔ دو دن بعد میری طبیعت کسی قدر بہتر ہوئی تھی۔ امی کے اصرار پر میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدل کر بال بنائے۔ میں اپنا کمرا خود ٹھیک کرتی تھی مگر دو دن سے امی ٹھیک کر رہی تھیں۔ میں بال بنا کر چیزیں سیٹ کرنے لگی۔ اس دوران میں کال بیل بجی اور کوئی آیا مجھے پتا نہیں چلا۔ پھر کوئی میرے کمرے میں آیا اور جب مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا تو میں دیکھ کر پھر ششدر رہ گئی وہ سر کی امی تھیں۔

”آپ......“

”ہاں میری بچی۔“ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر بولیں۔ ”تم کہہ کر گئی تھیں کہ اب تم نہیں آؤ گی اور میں نے کہا تھا کہ اب میں آؤں گی۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے سنائی نہیں دیتا ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا تو وہ شرمندہ ہو گئیں۔

”خدا کے لیے میری بچی میں پہلے ہی اپنی نظروں میں رسوا ہوں۔ اللہ گواہ ہے اس سے کتنی بار معافی مانگ چکی ہوں اس لڑکی سے بھی معافی مانگی ہے اور اس نے مجھے معاف بھی کیا ہے۔ اللہ اسے اپنے گھر میں خوش رکھے۔ میں تم سے ملنے سے پہلے جانتی تھی کہ تمہیں سنائی نہیں دیتا ہے۔“

”تو آپ کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا؟“

”ہاں کیونکہ میں جان گئی ہوں، تم ہی وہ لڑکی ہو جو میرے بچے کی زندگی سنوار سکتی ہو اس کا گھر بسا سکتی ہو۔“

اس کے بعد سب بہت تیزی سے ہوا۔ آنٹی اسی دن امی اور ابو سے بات کر کے گئیں اور ایک ہفتے بعد امی ابو نے میری رضامندی سے ہاں کر دی۔ دو مہینے بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی اور میں رخصت ہو کر عرفان کے گھر آ گئی۔ میں بہت خوش تھی بس ایک خلش تھی کہ شاید میں سر کی پسند نہیں ہوں۔ وہ صرف آنٹی کے کہنے پر شادی کے لیے راضی ہوئے تھے مگر انہوں نے میرا گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے کہا۔ ”حمیرا میں جانتا ہوں تم مجھ پر اعتماد کرتی ہو اور اسی اعتماد کی وجہ سے میں قسم کھائے بغیر کہہ رہا ہوں کہ جب امی نے تمہیں پسند کیا تو میرے خیالات اور جذبات تمہارے لیے بدل گئے تھے اور تم صرف امی کی پسند نہیں رہیں تھیں۔ میری پسند بھی ہو گئی تھیں۔“

آج میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔ شادی کے بعد میں نے تعلیم جاری رکھی اور گریجویشن کے بعد میں نے بھی اسپیشل کڈز ایجوکیشن میں ماسٹر کیا اور اب اسکول کا پرائمری سیکشن میں دیکھتی ہوں۔ اسکول کے بعد میرا گھر اور میرے تین بچے ہوتے ہیں جب تک میں اسکول میں ہوتی ہوں ان کی دادی انہیں دیکھتی ہیں۔ آنٹی کی صحت بہتر ہوئی ہے اللہ انہیں لمبی عمر اور صحت دے اور ان کا سایا ہمارے سروں پر دیر تک قائم رکھے۔ آمین۔

سیدھا راستہ

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
السلام علیکم
یہ واقعہ جسے میں نے کہانی کے انداز میں لکھا ہے ہمارے اپنے علاقے کا ہے۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو بھی پسند آئے گی کہ انسان کو جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ محبت میں بھی نہیں۔

شیریں بی بی
(پارا چنار)

سردار یوسف نے گہری نگاہوں سے اس شخص کا جائزہ لیا جس کو اس کی اوطاق میں لاکر تخت پر لٹادیا گیا تھا۔ وہ ایک جوان شخص تھا۔ سردار یوسف کے خیال میں اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس وقت وہ زخمی تھا۔ اس کا لباس یہ ظاہر کررہا تھا کہ اس کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے۔ اسے گہری چوٹیں آئی تھیں۔ اس کے جسم سے نکلنے والے خون نے اس کے لباس کو سرخ کردیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سانسیں لے رہا تھا۔

سردار یوسف نے سوالیہ نگاہوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو اس نوجوان کو اتار کر اس کی اوطاق میں لے آئے تھے۔

''سردار! یہ آدمی اس طرف ریت پر بے ہوش پڑا ہوا ملا تھا۔'' ایک شخص نے بتایا۔ ''پہلے تو ہم نے یہ سمجھا کہ یہ کوئی لاش ہے۔ لیکن جب قریب پہنچے تو اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ پھر ہم اس کو یہاں اٹھا کر لے آئے ہم نے کوئی غلط تو نہیں کیا سردار۔''

''نہیں بہت اچھا کیا۔'' سردار یوسف کی آواز گونجی۔ ''یہ آدمی ہمارے علاقے میں بے ہوش ہوا ہے۔ یہ ہمارا مہمان ہے۔ یہ ہماری پناہ میں آچکا ہے۔''

''یہ بہت زخمی ہے سردار۔'' دوسرے نے کہا۔

''ہاں وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی آرینہ آجائے تو اس کو دیکھ لے گی۔''

آرینہ سردار یوسف کی بیٹی کا نام تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی اور شہر کے ایک اسپتال میں اس کی ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔

سردار یوسف عام سرداروں سے بہت مختلف انسان تھا۔ بہت روشن خیال۔ ہمدرد۔ اس نے کبھی آرینہ کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کرتا رہا تھا۔

آرینہ کو بچپن ہی سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ جب سردار سے کہا کرتی۔ ''بابا مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔''

''کیوں نہیں۔ میری بیٹی ضرور ڈاکٹر بنے گی۔''

اس وقت سردار کی بیوی یعنی آرینہ کی ماں کہا کرتی۔

''سردار! تم کیوں ابھی سے اس کا دماغ خراب کررہے ہو۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم والیم نہیں دی جاتی۔''

''وہ سب پرانی باتیں ہیں۔'' سردار یوسف کہا کرتا۔ ''آج لڑکی، لڑکا سب برابر ہیں۔ تعلیم پر سب کا حق ہے۔ پھر آرینہ ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ ہمیں ہر حال میں اس کی خواہش پوری کرنی ہے۔''

پھر سردار یوسف ہی کی توجہ سے آرینہ ڈاکٹر بننے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

سب کچھ تھا اس کے پاس۔ سردار نے آرینہ کو ایک گاڑی خرید کر دے دی تھی۔ وہ اس گاڑی کو خود ہی ڈرائیو کر کے اسپتال جایا کرتی، جو وہاں سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔

آرینہ کو میڈیکل کالج میں داخلہ دلواتے وقت سردار یوسف نے اس سے صرف یہ کہا تھا۔ ''دیکھو بیٹا ہم نے بچپن سے لے کر اب تک تمہاری ہر خواہش پوری کی ہے۔ اب ہم بھی اس کے بدلے میں کچھ چاہتے ہیں۔''

''بتائیں بابا، میں کیا کرسکتی ہوں۔''

''بابا کی جان۔ تمہارا بابا صرف یہ چاہتا ہے کہ تم ہر حال میں اپنی روایات کا خیال رکھو۔''

''یہ یاد دلانے کی بات نہیں ہے بابا۔'' آرینہ نے کہا۔ ''اول تو آپ کی بیٹی ان روایات کو پامال نہیں کرے گی اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی جرأت بھی کی تو خود اس کو پامال کر کے رکھ دے گی۔''

''شاباش۔'' سردار یوسف نے آرینہ کو گلے لگا لیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں بیٹا۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔''

سردار یوسف نے زخمی کو نوکر کے حوالے کردیا تاکہ آرینہ آکر اس زخمی نوجوان کو دیکھ لے۔ کیوں کہ اس کا کام ہی یہی تھا۔

سردار کے کہنے پر زخمی نوجوان کو ایک دوسرے کمرے میں منتقل کردیا گیا اور جب آرینہ اسپتال سے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے واپس آئی تو وہ بے ہوش زخمی نوجوان اس کے حوالے کردیا گیا۔

☆......☆

سردار اپنی بیٹھک میں تھا جب آرینہ نے آکر خبر سنائی۔ ''بابا جانی اسے کوئی گہرا یا جان لیوا زخم نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے زخم ہیں البتہ اس کا خون بہت بہہ گیا ہے۔ اس لیے کمزوری ہوگئی ہے۔ دس بارہ دنوں میں بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔''

''ہاں بابا کی جان! اس کا بچنا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے وہ ہمارے علاقے میں ہوا ہے۔''

''میں نے اسے گہری نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔'' آرینہ نے بتایا۔ ''دوائیں بھی دے دی ہیں۔ اس کی غذا کا خیال رکھنا ہوگا۔ پھر وہ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''واہ میری بیٹی تو بہت ہوشیار ہوگئی ہے۔ بہت دھیان دے رہی ہے اس پر۔''

''یہ تو میرا فرض ہے بابا۔ مجھے تو ہر مریض پر اسی طرح دھیان دینا پڑتا ہے۔'' آرینہ نے کہا۔ ''اب آپ ایسا کریں میں نے کچھ دوائیں لکھی ہیں جو میرے پاس نہیں ہیں۔ شہر سے منگوانی ہوں گی۔''

آریبہ نے غلط نہیں کہا تھا کہ یہ ڈاکٹر کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے مریض پر دھیان دے لیکن یہ مریض۔ یہ تو اس کے لیے مریض سے بڑھ کر کچھ اور ہونے لگا تھا۔

آریبہ نے جب اسے دیکھا تو اس وقت اس کے اندر جیسے ہلچل مچ گئی۔

یہ ایسی کیفیت تھی۔ جس کا تجربہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک بے نام سی خلش حالانکہ وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کی سانسیں بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ اس کے باوجود اس کے بے حس بدن سے کوئی انرجی سی نکل کر آریبہ کو چھو رہی تھی۔

اس نوجوان کے زخموں کی ڈریسنگ کرتے ہوئے اسے بہت کرب کا احساس ہوا۔ یہ بھی پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس نے نہ جانے کتنے زخمیوں کی ڈریسنگ کی ہو گی۔ گہرے گہرے زخموں کو دیکھا ہوگا۔

لیکن اس وقت وہ صرف ایک ڈاکٹر ہوتی تھی اور اس کے سامنے ایک مریض ہوتا تھا۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اس مریض کے ساتھ تو اپنائیت کا احساس ہونے لگا تھا۔

اور اپنائیت کا یہ احساس اچانک ہی نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ اس زمانے کی بات تھی جب اس نے کالج میں داخلہ لیا تھا اور پہلے ہی دن اس سے ملاقات ہوگئی تھی۔

یوں تو کالج میں بہت سے لڑکے، لڑکیاں تھے لیکن کچھ لوگ پہلی بار ہی پوری شدت کے ساتھ اپنی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔ ان سے نکلنے والی مقناطیسی لہریں دل اور ذہن کے ساتھ میچ کر جاتی ہیں۔

خرم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

آریبہ اور خرم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ہی وقت دونوں کے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ یہ ایک اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔ جو یہ کہہ رہی تھی کہ اجنبی تم اجنبی ہونے کے باوجود میرے لیے غیر نہیں ہو۔ ہم تمہیں جانتے ہیں آج سے نہیں برسوں سے، شاید صدیوں سے۔

پھر وہ دونوں ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔

اس کے اندازے کے مطابق خرم ایک مہذب انسان ثابت ہوا تھا۔ وہ احترام کرنا جانتا تھا۔ اس کی باتیں بہت خوب صورت اور دل پر اثر کرنے والی ہوا کرتیں۔

آریبہ نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا لیکن صرف سوچ ہی تک محدود رہی تھی۔ اس کی روایات، اس کا خاندان اور علاقائی پس منظر اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے ذہنی طور پر بے انتہا قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوا کرتے تھے۔

ایک بار خرم نے اس سے کہا تھا۔ ''آریبہ کیوں نہ میں سوالی بن کر تمہارے بابا کے پاس پہنچ جاؤں۔''

''وہ کیوں؟''

''تمہارے بابا سے تم کو مانگنے کے لیے۔'' اس نے کہا۔ ''دیکھو میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند یا ناپسند کرنے کے مرحلے سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ بلکہ لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ تمہارے بغیر میری شخصیت ادھوری رہ جائے گی اور ایسا احساس زندگی میں پہلی بار ہو رہا ہے۔ پہلی بار تم کو دیکھ کر بھرپور طمانیت کا احساس ہوا تھا اور اس احساس میں شدت ہی آتی جارہی ہے۔''

''میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہے خرم۔'' آریبہ دھیرے سے بولی۔ ''تم پہلی نظر میں میرے دل کے آس پاس بھٹکنے لگے تھے۔ اس کے باوجود میں تمہاری طرف دستِ طلب نہیں بڑھا سکتی۔ کیوں کہ میں اپنی خاندانی روایات سے واقف ہوں۔ ہمارے یہاں پیدا ہونے والے بچے کے کان میں اذان نہیں دی جاتی بلکہ اپنی روایات کے بول دہرائے جاتے ہیں۔''

''ہم کوشش تو کر سکتے ہیں نا؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی رائیگاں کوشش کا۔''

''جب یہ سب نہیں ہو سکتا تو ہم کیوں ایک دوسرے کے قریب آئے تھے۔'' خرم نے جھنجلا کر کہا۔

''ہم کسی پلاننگ کے تحت ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے تھے خرم، ہمیں انجانی طاقت کھینچ لائی تھی۔''

''کیا تمہاری روایتیں اس انجانی طاقت سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں؟''

''ہاں، کہیں زیادہ۔ ان روایتوں تک تو دعاؤں کی بھی پہنچ نہیں ہوتی۔''

اس کے بعد خرم نے بددل ہو کر کالج ہی چھوڑ دیا تھا۔

آریبہ نے بے چین ہو کر اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا پتا نہیں چل سکا۔ وہ نہ جانے کہاں

غائب ہو گیا تھا۔
اور جب اتنے برسوں کے بعد وہ زخمی حالت میں اچانک اس کے سامنے آیا تو آرینہ کے اندر ایک ہلچل سی برپا ہوگئی۔
اس کے سامنے والا زخمی نوجوان اس کے لیے صرف ایک مریض ہی نہیں تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا۔ وہ اس کی کھوئی ہوئی محبت تھا۔ وہ اس کا پہلا پیار تھا۔ پہلی خواہش تھا۔
ملازمہ نے آکر بتایا کہ سردار نے اسے یاد کیا ہے۔
آرینہ خرم پر ایک نظر ڈالتی ہوئی اس کمرے سے باہر آگئی جس کمرے میں خرم کو رکھا گیا تھا۔
اس کا باپ سردار یوسف دوسرے کمرے میں اس کا انتظار کررہا تھا۔ ”ہاں بابا کی جان، کیا حال ہے تمہارے مریض کا۔“
آرینہ نے اس وقت اپنی آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ ”ٹھیک ہے بابا۔ اتنے گہرے زخم نہیں ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس کا یہ حال کس نے کیا۔“
”وہ ہوش میں آئے تو خود ہی بتائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے علاقے میں جو ڈاکو دندناتے پھر رہے ہیں یہ ان ہی کی کارستانی ہے۔“
”ان کے لیے کچھ کرنا ہوگا بابا۔“
”ہاں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ بہت سر اٹھانے لگے ہیں۔ ویسے تم اس زخمی پر دھیان رکھو۔ وہ بے چارہ ہمارے علاقے میں آیا تھا مہمان ہے ہمارا۔ ہم نے اسے پناہ دی ہے۔“
آرینہ کا دل چاہا کہ وہ بتا دے کہ وہ اس زخمی کو جانتی ہے۔ مہینوں اس کا ساتھ رہا ہے۔ یہ زخمی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا شخص ہے۔ اس کی پہلی اور آخری محبت ہے لیکن وہ یہ سب اپنے بابا کو نہیں بتا سکتی تھی۔

☆......☆

دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔
خرم اب ٹھیک ہو چلا تھا۔ اس کے زخم بھرنے لگے تھے۔ توقع کے مطابق اس کے ساتھ وہی ہوا تھا جو سردار یوسف نے بتایا تھا۔
کچھ ڈاکو اسے لوٹ کر اور زخمی کر کے ریگستان میں پھینک گئے تھے۔
”لیکن خدا کے بندے تمہیں اس طرف آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟“ آرینہ نے پوچھا۔ ”اس طرف آنے والوں کے ساتھ کسی مقامی کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔“
”بس یار کچھ نہ پوچھو۔“ خرم نے ایک گہری سانس لی۔ ”کیا تم یقین کرو گی کہ تمہاری محبت مجھے اس طرف کھینچ لائی تھی۔“
”اتنے دنوں کے بعد؟“
”ہاں اتنے دنوں کے بعد۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہو رہا تھا لیکن کوئی آواز مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جاؤ آرینہ کے پاس جاؤ۔ تم کیوں اپنی زندگی سے اتنی دور چلے آئے ہو۔ جاؤ اس کے پاس۔ دیکھو اس کی آنکھوں میں تمہارے خواب جگمگا رہے ہیں۔ جاؤ ان خوابوں کو تعبیر دے دو۔ بس پھر میں ایک جنون کی کیفیت میں اس طرف نکل پڑا۔“
”اور اس حال کو پہنچ گئے۔“ آرینہ مسکرا دی۔
”ہاں اس حال کو پہنچ گیا۔“
”اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ آرینہ نے پوچھا۔
”وہی جو پہلے تھا۔ تمہارے بابا سے کہنا ہے کہ جس طرح آپ نے بدن کے زخموں کو ٹھیک کرنے کے لیے آرینہ کی ڈیوٹی لگائی ہے اسی طرح میری روح کے زخموں کو بھی آرینہ ہی ٹھیک کر سکتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور یہ محبت آج سے نہیں بلکہ برسوں سے ہے۔“
آرینہ کچھ کہنے والی تھی کہ کمرے سے باہر قدموں کی آواز آنے لگی۔ دونوں محتاط ہو کر بیٹھ گئے کہ سردار یوسف کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔
خرم نے اسے دیکھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ سردار یوسف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”نہیں نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے بیٹھو۔ ابھی کمزور ہو تم۔“
”جی بابا۔“ آرینہ نے کہا۔ ”دو چار دن اور لگیں گے۔“
”ہاں نوجوان کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟“
خرم نے ایک بار پھر وہی داستان دہرا دی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس علاقے میں کیوں آیا تھا۔ سردار یوسف نے بھی یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔
”نوجوان تم کسی پریشانی کے بغیر جب تک دل چاہے یہاں رہ سکتے ہو۔ جب بدن میں جان واں آ جائے تو پھر چلے جانا۔“
”جی، جی ہاں۔“ خرم نے سعادت مندی سے گردن

جھکا دی۔

"بیٹا۔" سردار یوسف نے آرینہ کی طرف دیکھا۔ "ایک بندہ شہر کی طرف جا رہا ہے، اپنے مریض کے لیے کوئی دوا چاہیے تو بتا دو۔"

"جی بابا ایک دوا چاہیے تو ہے میں لکھ کر دے دیتی ہوں۔"

☆......☆

خرم کے لیے وہ بہت عجیب سی رات تھی۔

وہ مایوسی اور اُمیدوں کے درمیان کھڑا تھا۔ شاید سب کچھ ٹھیک ہو جائے یا شاید کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے آرینہ سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔

وہ اس علاقے میں آرینہ ہی کے لیے آیا تھا۔ اس نے آرینہ سے مایوس ہو کر کالج تو چھوڑ دیا تھا لیکن آرینہ کی یاد اپنے دل اور اس کا خیال اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا تھا۔

اس نے کالج چھوڑ دیا تھا۔ وہ شہر چھوڑ دیا تھا۔ کہیں اور چلا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دور جا کر آرینہ کی یادوں سے نجات پا لے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ ایک کشش اسے واپس لے آئی تھی۔ اس کی واپسی کئی برسوں کے بعد ہوئی تھی۔ اس دوران آرینہ ڈاکٹر بن چکی تھی۔

وہ ایک اسپتال میں تھی۔ ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ خرم نے واپس آ کر یہ سب معلوم کر لیا تھا۔ اس نے سوچا بھی کہ وہ اسپتال جا کر آرینہ سے مل لے۔ اس سے ایک بار پھر اپنی محبت کی بات کرے لیکن اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

آرینہ اپنے اصول اور روایات کی بات کرے گی۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ براہِ راست آرینہ کے بابا سے مل لے۔

وہ یہی سب سوچ کر اس علاقے میں آیا تھا لیکن ڈاکوؤں نے اسے راستے ہی میں لوٹ لیا تھا اور زخمی کر کے ایک طرف پھینک گئے تھے۔

اور یہ بھی شاید قدرت ہی کی طرف سے کوئی انتظام تھا کہ اسے کچھ لوگ اٹھا کر آرینہ اور اس کے بابا ہی کے پاس لے آئے تھے۔

شاید قدرت کی طرف سے یہ کوئی اشارہ تھا۔

خرم کے لیے وہ رات بہت اضطراب کی تھی۔ آرینہ

آپ نے اکثر، ٹرکوں، رکشوں، یا بسوں کے اوپر لکھا ایک شعر ضرور پڑھا ہوگا

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

مصرع اول میں لفظ عقاب کی وجہ سے اکثر حضرات اسے علامہ اقبال سے منسوب کرتے ہیں جب کہ یہ شعر اقبال کا نہیں بلکہ صادق حسین صادق کا ہے، آپ شکر گڑھ، سیالکوٹ کے رہنے تھے آپ کی ولادت یکم اکتوبر 1898ء شکر گڑھ اور وفات 4 مئی 1989ء شکر گڑھ، سیالکوٹ ہے، دیکھیے؛ برگِ سبز؛ صادق حسین صادق فروری 1970ء۔

(ذرہ حیدر آبادی کے مضمون سے اقتباس)

پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ خرم نے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پہلے سے کہیں زیادہ اپنائیت محسوس کی تھی۔

اس نے جب بخار دیکھنے کے لیے خرم کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو خرم کو پروین شاکر کا شعر یاد آ گیا تھا۔

"اس نے جلتے ہوئے ماتھے پر جو ہاتھ رکھا۔ روح تک پھیل گئی تاثیر مسیحائی کی۔"

آرینہ تو پہلے بھی اس کے لیے بہت کچھ تھی اور اب سب کچھ ہو گئی تھی۔ وہ تو پہلے بھی اس کے بغیر نہیں رہ پا رہا تھا اور اب تو اس تجدید ملاقات کے بعد امکان ہی نہیں رہا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اس نے اپنے دوست انور علی کو فون کیا جو شہر کا ایک مشہور اور معروف وکیل تھا۔ انور اس کی آواز سنتے ہی برس پڑا تھا۔ "خدا کے بندے تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہم تو تمہاری طرف سے مایوس ہی ہو چکے تھے۔ تمہارا موبائل بھی بند مل رہا تھا۔ کہاں ہو تم، کس حال میں ہو؟"

"یار تم نے تو ایک سانس میں پچاس سوالات کر ڈالے۔" خرم نے کہا۔ "میں زندہ ہوں اور خیریت سے ہوں۔ میرے ساتھ کیا گزری۔ یہ میں واپس آ کر بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ میں آرینہ کے پاس ہوں۔ اس کے گھر میں ہوں۔"

"اوہو تو گویا میرے مجنوں نے اپنی منزل پا لی ہے۔"

''نہیں یار، منزل تو ابھی بہت دور ہے۔ میں تو ابھی صرف اس راستے پر آیا ہوں۔ جو راستہ منزل کی طرف لے جائے گا۔''

''بات آگے بڑھی؟''

''ابھی نہیں۔ آرینہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی تو دلی تمنا ہی یہی ہے کہ ہم ایک ہو جائیں لیکن مسئلہ اس کے بابا کا ہے اور ان روایات کا ہے جن کی زنجیریں ان کے پیروں میں پڑی ہوئی ہیں۔''

''یہی تو سب سے بڑی پرابلم ہے میری جان۔ یہ زنجیریں صدیوں سے ہیں اور صدیوں تک رہیں گی۔ تم ان زنجیروں کو کاٹ نہیں سکتے۔''

''دیکھو کوشش کر کے دیکھوں گا۔'' خرم نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے میرا جنون یہ زنجیریں کاٹ ہی دے۔''

☆......☆

خود آرینہ بھی ایک کرب ایک آزمائش میں مبتلا ہو گئی تھی۔

اس کی محبت اس کے سامنے تھی۔ اس نے جس شخص سے محبت کی تھی۔ وہ اس کے لیے میلوں کا سفر طے کر کے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

خرم نے اپنے حصے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اب خود آرینہ کو کچھ کرنا تھا لیکن کیا کرے۔ وہ یہ جانتی تھی کہ اس کے یہاں شادیاں صرف برادریوں میں ہوتی ہیں۔ باہر کے کسی شخص کو اپنانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہ ہزاروں برسوں کی ایسی روایت تھی جس کی پاسداری پوری سختی کے ساتھ کی جارہی تھی۔ رشتے آپس میں طے ہوتے تھے اور جو باہر نکلنے کی کوشش کرے اس کے لیے صرف ایک سزا تھی موت۔ صرف موت۔

وہ بابا سے اس موضوع پر بات کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ بابا کا جواب کیا ہوگا۔ کیوں کہ ان معاملات میں سردار یوسف اس کا بابا نہیں ہوتا صرف سردار رہ جاتا۔ سردار یوسف جس کو اپنی روایات کی حفاظت کرنی ہوتی ہے۔

ایک ماں رہ جاتی تھی۔ اس سے دل کی بات کہی جاسکتی تھی لیکن ماں بھی اپنے شوہر سردار یوسف کے سامنے بے بس ہی ہو جاتی۔

اوّل تو خود اس کی ماں بھی ان ہی روایات کی امین تھی۔ اس نے اسی ماحول میں جنم لیا اور اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔

وہ سوچتی رہی۔ بالآخر اس نے ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ انکار کر دیتی۔ لیکن کم از کم آرینہ تو اپنے دل کی بات بتا ہی دیتی۔

محبت کا حق تو یہی تھا کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اب حاصل ہونا یا نہ ہونا یہ دوسری بات تھی۔

اس کی ماں اس وقت اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔

آرینہ نے اس کے پاس پہنچ کر اس کا سر دبانا شروع کر دیا۔ ماں مسکرا دی۔ وہ آرینہ کی اس عادت سے واقف تھی۔ اسے جب بھی اپنی کوئی بات منوانی ہوتی وہ اس طرح پہلے ماں کو راضی کرتی۔ پھر ماں سردار یوسف سے بات کرتی۔

''ہاں جی، لگتا ہے کوئی فرمائش آنے والی ہے تمہاری طرف سے۔'' ماں نے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ کیا میں تمہاری خدمت نہیں کرتی۔''

''ہاں ہاں سب جانتی ہوں میں، بتاؤ کیا فرمائش ہے۔''

''ماں پہلے وعدہ کرو کہ میری فرمائش پوری ہوگی۔''

''ارے پاگل۔ کیا تمہارے بابا نے کبھی تمہاری فرمائش پوری کرنے سے انکار کیا ہے؟'' ماں نے کہا۔

''پہلے تو نہیں کیا لیکن اب ضرور کر دیں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ یہ فرمائش کوئی عام فرمائش نہیں ہے۔ یہ ایک اجنبی کو حاصل کرنے کی فرمائش ہے اور ہماری برادری میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' ماں جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔ ''ایسی کون سی فرمائش ہے جو ہماری برادری میں نہیں کی جاتی۔''

''میں اس اجنبی کی بات کر رہی ہوں جو زخمی حالت میں ہمارے پاس آیا ہے اور جس کا میں علاج کر رہی ہوں۔''

''کیا ہوا اس اجنبی کو؟''

''وہ میرا پرانا جاننے والا ہے ماں۔'' آرینہ نے

بتایا۔ ''کالج میں ہمارے ساتھ ہوا کرتا تھا اور ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔''

''اوہ اب بھی تو شاید وہ تمہارے ہی لیے اتنی دور یہاں آیا ہے۔''

''ہاں ماں۔ میرے لیے، پڑھا لکھا ہے اور میں بھی ایک ڈاکٹر ہوں۔ تعلیم نے ہم دونوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اگر ہم ایک دوسرے کو اپنا لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

ماں بہت دیر تک آرینہ کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں غصے اور مہربانی دونوں کی کیفیات تھیں۔ آرینہ نے اپنی گردن جھکا لی تھی۔ اب چاہے جو بھی ہو اس نے اپنی بات آگے پہنچا دی تھی۔

''آرینہ کیا تو جانتی ہے کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔''

''اس لیے تو آپ سے کہہ رہی ہوں کہ آپ میری ماں ہیں۔'' آرینہ نے کہا۔ ''اس کے علاوہ ایک عورت بھی۔ اور عورت ہی عورت کے دکھ کو سمجھ سکتی ہے۔ آپ سمجھ سکتی ہوں گی کہ میں نے دل کے ہاتھوں کتنی مجبور ہو کر آپ سے یہ بات کی ہے۔''

''میں تیری ماں ہوں بیٹی۔ اس لیے تجھ سے کہہ رہی ہوں کہ اگر تیرے دل میں کوئی ایسا جذبہ جاگ رہا ہے تو اس کا گلا گھونٹ دے۔ یہ بات کسی اور کو معلوم نہ ہونے پائے۔ ورنہ ایک قیامت کھڑی ہو جائے گی، تو یہاں کی روایتوں سے واقف نہیں ہے؟''

''واقف ہوں ماں۔ اس لیے تو بابا سے بات نہیں کی۔ ایک ماں سے بات کی ہے۔ ایک عورت سے بات کی ہے۔''

''نہیں بیٹا۔ یہ عورت، یہ ماں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ بہتر یہی ہے کہ تو اسے بھول جا۔ ہمیں زندہ تو رہنا ہے لیکن اپنی روایات کے ساتھ۔ ان سے ہٹ گئے تو پھر ہماری کوئی زندگی نہیں ہوگی۔''

☆......☆

خرم اپنے دوست سے فون پر بات کر رہا تھا۔ ''یار! میں اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں۔ اب میں اچھی طرح چل پھر بھی سکتا ہوں۔''

''تو آجاؤ واپس، وہاں کیا کر رہے ہو۔'' انور نے کہا۔

''یار! آرینہ کے بغیر کیسے واپس آجاؤں۔''

''تو پھر کیا کرو گے۔''

''تم ہی مشورہ دو۔ تم تو دیکھتے ہو۔ تمہارے پاس تو کئی راستے ہوں گے۔''

''ہاں ایک راستہ تو ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ آرینہ بھی سنجیدہ ہے۔''

''بہت زیادہ اس لیے مجھے اپنے خوابوں میں بسا رکھا ہے۔ شاید وہ مجھ سے، مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔''

''تو بس تم اسے لے کر شہر آجاؤ۔ وہ عاقل ہے، بالغ ہے، پڑھی لکھی ہے، خود مختار ہے، تم دونوں کورٹ میں شادی کر سکتے ہو۔ یہ شادی میں کروا دوں گا۔''

''کیا ایسا ہو سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہاں دن بھر میں ایسی درجنوں شادیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بشرطیکہ لڑکی بھی اتنی ہی سیریس ہو۔''

''ہاں ہاں وہ بہت سیریس ہے۔''

''تو بات کر لو اس سے وہ گھر سے نکلتی تو ہوگی۔''

''کیوں نہیں۔ روز اسپتال جاتی ہے۔'' خرم نے بتایا۔

''تو بس اس کے اسپتال جانے کے بعد تم بھی اس گھر سے اجازت لے کر نکلو اور اسپتال سے اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤ پھر سب میں دیکھ لوں گا۔''

''شکریہ میرے دوست۔ پھر ہم بہت جلد تمہارے پاس آ رہے ہیں۔''

خرم کو اب آرینہ کا انتظار تھا۔ وہ اسپتال جانے سے پہلے اس سے ملنے اور اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے پاس ضرور آیا کرتی تھی۔

کچھ دیر بعد آرینہ بھی اس کے پاس آگئی۔

آج وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ اس کی آنکھیں اس طرح سرخ ہو رہی تھیں جیسے رات بھر یا تو روتی رہی ہو یا پھر جاگتی رہی ہو۔

خرم اسے دیکھ کر کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ ''خیریت تو ہے۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو۔''

''کرم میرا خیال ہے کہ ہمارا سفر اب یہیں پر ختم ہو گیا ہے۔'' آرینہ نے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم واپس چلے جاؤ۔''

''بات کیا ہوئی ہے؟''

''میں نے ماں سے بات کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں پہلے ان کو راضی کر لوں پھر وہ بابا کو راضی کر لیں گی۔ لیکن پہلے ہی مرحلے میں ناکامی ہو گئی۔ ماں نے روایات سے ہٹ کر میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔''

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی اندیشہ تھا۔" خرم نے کہا۔ "لیکن تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ سفر ختم ہو گیا ہے۔ نہیں آرینہ۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہمارا سفر تو اب شروع ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے تم سے اپنے ایک وکیل دوست کی بات کی تھی۔"

"ہاں تم نے کہا تو تھا۔"

"میں نے اس سے مشورہ مانگا تھا۔ اس نے کہا ہے کہ میں تمہیں لے کر آ جاؤں۔ وہ کورٹ میں ہماری شادی کروا دے گا۔ کیوں کہ ہم دونوں بالغ، سمجھ دار اور پڑھے لکھے ہیں۔ دونوں ہی خود مختار ہیں۔ ہمارے ایک ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

آرینہ خرم کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"کیا بات ہے۔ کیا دیکھ رہی ہو۔ ہمارے پاس سوچنے کا وقت نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے سوچنا ہے خرم۔" آرینہ نے کہا۔ "یہ سوچنا ہے کہ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں کبھی ایسا بھی کر سکتی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"خرم! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تم سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ آج سے نہیں برسوں سے۔ تمہارے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ اس کے علاوہ میں بالغ ہوں۔ خود مختار ہوں۔ تم نے جو راستہ بتایا ہے وہ بہت آسان ہے۔ ہم اس پر چل کر ایک دوسرے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم ایک ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف میں خود بھی اپنی برادری کے ایسے فرسودہ قوانین اور اصول سے بے زار ہو چکی ہوں اس کے باوجود......!"

"اس کے باوجود کیا؟"

"اس کے باوجود میں اس معاملے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" آرینہ نے کہا۔ "کیوں کہ یہ معاملہ صرف میری برادری کے اصول اور قانون کا نہیں ہے بلکہ پورے سماج کا مسئلہ ہے۔ پوری اسلامی معاشرت کا مسئلہ ہے۔ میں اس بات کے حق میں تو ہوں کہ برادری کے اس فرسودہ سسٹم کو ختم کر دیا جائے لیکن اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ لڑکیاں والدین کی رضامندی کے بغیر گھروں سے نکل کر عدالتوں میں شادیاں کرنے لگیں۔ خرم یہ معاملہ میری برادری کا نہیں بلکہ پورے سماج کا ہے اور میں پورے سماج کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ سوری تم مجھے بھول جانے کی کوشش کرلو۔ یہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔"

☆......☆

یہ اتفاق تھا کہ سردار یوسف اس زخمی نوجوان کی مزاج پرسی کے لیے اس کمرے کی طرف آیا تھا اور اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔

اس کے تاثرات کچھ عجیب ہو رہے تھے۔

کبھی اس کے چہرے کی سرخی بڑھ جاتی۔ کبھی اس کی آنکھیں دہکنے لگتیں اور کبھی ان آنکھوں میں نرمی اور محبت کی شعائیں پیدا ہو جاتیں۔

آرینہ کی باتیں سن کر اس کے چہرے پر پیار اور شفقت کے عکس جھلملانے لگے تھے۔ اس کا چہرہ سردار یوسف کا نہیں بلکہ ایک ایسے باپ کا چہرہ تھا جسے اپنی بیٹی پر بے انتہا پیار آرہا ہو۔

وہ دروازے پر دستک دینے ہی والا تھا کہ پھر کچھ سوچ کر وہ اپنی بیٹھک کی طرف چل پڑا۔ اس کے ماتھے کی تنی ہوئی رگیں یہ بتا رہی تھیں کہ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہے۔

بیٹھک میں آکر اس نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

ملازم اس کی آواز پر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"جاؤ مفتی صاحب کو بلا کر لاؤ۔" سردار یوسف نے کہا۔

اس علاقے کے مفتی اس علاقے کی اکلوتی مسجد کے پیش امام بھی تھے اور پورے علاقے میں نکاح پڑھوانے کی ذمے داری بھی ان ہی کی تھی۔

دس منٹ کے اندر مفتی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی سردار یوسف کی بیٹھک میں جمع ہو چکے تھے۔

"وہ جو مہمان ہے ناں اس کو بلا کر لے آؤ۔" سردار یوسف نے ملازم سے کہا۔

کچھ دیر بعد خرم بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ "بابا! اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" سردار یوسف نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہوں جناب۔" خرم نے جواب دیا۔ "آپ کی مہربانی سے دوبارہ صحت ہو گئی ہے۔"

"نہیں بابا، مجھ سے زیادہ میری بیٹی کی مہربانی ہے۔ اس نے تمہارا بہت خیال رکھا ہے۔"

"جی جناب اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔"

"بیٹھ جاؤ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

خرم بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''نوجوان بات یہ ہے کہ ہمارے یہ مفتی صاحب اس بات کے گواہ ہیں کہ اب سے ایک سال پہلے ان کی باتوں نے میرے اندر کیسی ہلچل مچائی تھی۔ ہم صدیوں سے اپنے قبائلی اور برادری کے اصولوں پر چل رہے تھے۔ ہمارا سسٹم یہ تھا کہ ہم غیروں میں شادیاں نہیں کرتے اور اگر کوئی ایسا کرنے کی ہمت بھی کرے تو ہم اس کو جان سے مار دیتے تھے۔ یہ ہمارے قبائلی سسٹم کا حکم تھا۔''

''پھر میں نے ایک اور حکم سنا یہ حکم ہمارے قبائلی سسٹم کے حکم سے کہیں بڑا کہیں قابلِ احترام اور کہیں زیادہ معتبر تھا۔ جانتے ہو وہ کس کا حکم تھا۔''

''نہیں جناب۔ آپ بتائیں۔''

''وہ حکم آقائے کائنات کا حکم ہے۔ وہ حکم ہے کہ کسی کو رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر کسی اور پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہ سب جاہلانہ رسومات ہیں۔ ایک شخص کی فضیلت دوسرے پر اس کے تقویٰ کی بنیاد پر ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کوئی رنگ نہیں، کوئی نسل نہیں، کوئی زبان نہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟''

''جی جناب! بالکل سمجھ گیا ہوں اور یہی اسلام ہے۔'' خرم نے کہا۔

''مفتی صاحب اس بات کے گواہ ہیں کہ جس دن میں نے یہ بات سنی۔ میں نے اس دن یہ قسم کھالی تھی کہ چاہے برادری کا سسٹم کچھ بھی ہو میں اس اصول پر چلوں گا میرے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی کہ کون کہاں کا ہے۔ کون سی زبان بولتا ہے۔''

خرم کے چہرے پر اطمینان کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس لیے اور آرینہ کے راستے میں جو سب سے بڑا مسئلہ تھا قدرت نے اسے ذرا سی دیر میں حل کردیا تھا۔

''پھر یہ ہوا نوجوان کہ اتفاق سے تم ہمارے یہاں زخمی حالت میں آگئے۔ میں نے تمہیں پناہ دی اور اپنی بیٹی آرینہ کو تمہاری دیکھ بھال پر لگا دیا۔ صرف اس لیے نہیں کہ تم پناہ لینے آئے تھے تم مجبور تھے بلکہ اس لیے کہ میں نے دیکھتے ہی تم کو پسند کرلیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم ایک پڑھے لکھے اور شریف خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ میں یہ چاہتا تھا کہ تم جب ٹھیک ہو جاؤ تو میں خود تم سے تمہارے حالات معلوم کرکے تمہارے گھر والوں سے رابطہ کروں۔''

خرم سر جھکائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بیٹھک کے لوگ بھی پوری طرح سے سردار یوسف کی طرف متوجہ تھے۔ جس کی بھاری بھرکم آواز پوری بیٹھک میں گونج رہی تھی۔

''پھر مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ آرینہ بھی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔'' سردار یوسف نے کہا۔ ''وہ جس انداز سے تمہارا ذکر کرتی تھی اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی نظر میں تمہاری کیا اہمیت ہے۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ نہ صرف میں نے تمہیں پسند کرلیا تھا بلکہ آرینہ کو بھی اس رشتے پر اعتراض نہیں ہوگا۔''

''جی جناب۔'' خرم نے کہا۔ وہ اس سے زیادہ کیا بول سکتا تھا۔

''سب کچھ ٹھیک تھا کہ اچانک مجھے ایک حکایت یاد آگئی وہ حکایت حضرت علیؓ سے منسوب ہے۔ وہ ایک بار مسجد میں نماز کے لیے جارہے تھے ان کے پاس گھوڑا تھا۔ انہوں نے ایک بدو سے فرمایا کہ تو میرے گھوڑے کی نگرانی کر۔ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں آپ نماز کے لیے چلے گئے۔ اس دوران بدو نے گھوڑے کی زین اتاری اور دو درہم میں لے جاکر فروخت کردی۔ آپ نے اس بدو کو پکڑ کر کہا۔ ''افسوس تو نے غلط راستہ اختیار کیا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ نماز سے جب واپس آؤں گا تو تجھے انعام کے طور پر دو درہم دوں گا لیکن تیری قسمت میں رزق حلال نہیں تھا رزق حرام تھا۔''

خرم اب سناٹے کی کیفیت میں تھا۔

''میری بات سمجھ رہے ہونا۔'' سردار یوسف نے کہا۔

''میں نے تو خود سوچ لیا تھا کہ آرینہ سے تمہاری شادی کردوں گا لیکن تم نے وہ راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی جس راستے پر وہ بدو چل پڑا تھا۔ یعنی ناجائز راستہ اور میں اپنی روایات کی بات نہیں کررہا۔ پورے سماج کی طرف سے یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں یا آرینہ کو اس راستے پر چلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' سردار یوسف نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا۔ ''جاؤ اس شخص کو خیر و خوبی کے ساتھ اس علاقے سے باہر چھوڑ آؤ۔''

خرم کے لیے اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر اس طرف دیکھا۔ جس کے پیچھے اسے آرینہ کی جھلک دکھائی دی تھی۔ پھر خاموشی سے سردار یوسف کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھک سے باہر آگیا اور دروازے کے پیچھے کھڑی ہوئی آرینہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

حقیقت

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
ہمارے معاشرے میں ایک وبا سی پھیل گئی ہے۔ ہم لڑکیوں کی ظاہری خوب صورتی دیکھ کر زندگی کا ہم سفر بناتے ہیں۔ کردار اور سلیقہ پر توجہ تک نہیں دیتے۔ میرا دوست زبیر بھی اسی وبا کا شکار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت سامنے آئی تو وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔ یہ زبیر کی آپ بیتی ہی نہیں ہر ایک کے لیے سبق ہے۔ اسی وجہ سے سرگزشت کو ارسال کررہا ہوں۔

محمد عارف محمود
(ملتان)

آج کل میں جب بھی دفتر پہنچتا ساتھی ورکر فیس بک کی بات کررہے ہوتے۔ دفتر میں موجود سب ہی دوستوں کی فیس بک آئی ڈی تھی اگر نہیں تھی تو صرف میری۔ جب بھی دو چار افراد کہیں اکٹھے ہوتے یہی باتیں چل پڑتیں کہ کل میں نے اس تصویر پر جو کمنٹس دیے ہیں وہ پڑھے جانے کے قابل ہیں، جو تصویر میں نے شیئر کی ہے وہ بھی کمال کی ہے۔ سب ہی لوگ اس کی تعریف کررہے ہیں۔ کچھ کہتے کہ میں نے فلاں لڑکی کو بذریعہ نیٹ دوست بنایا ہے تو کچھ اس سے بھی بڑھا چڑھا کر قصے بیان کرتے۔ میں ان کے درمیان میں ہوتے ہوئے بھی محسوس کرتا کہ جیسے وہاں پر موجود نہیں ہوں۔ بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اگر سب کے ساتھ چلنا ہے تو میری بھی آئی ڈی ہونا چاہیے اپنی باتیں بھلے ان کو نہ بتانی پڑیں، کم از کم ان کے اور دنیا جہان میں موجود لوگوں کے بارے میں لحہ بہ لحہ معلومات تو ملتی رہیں گی۔ دفتری کام بھی ساتھ کے ساتھ ہوتا رہے گا جیسے کہ دوسرے لوگ کرتے ہیں۔ میں نے اپنے سب سے قریبی دوست حارث کو کہا کہ یار میری بھی آئی ڈی بنادو۔

"اس میں کون سی دشواری ہے ابھی لو۔" اور پھر چند ہی لمحوں میں حارث نے میری بھی آئی ڈی بنادی۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہاری فوٹو بھی اس پر لگا دیتے ہیں جو کہ موبائل سے کھینچ کر کمپیوٹر میں ٹرانسفر کردوں گا۔"

"مگر میں اپنے چہرے اور رنگ کے بارے میں زیادہ خوش فہمی کا شکار نہ تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ میری صورت اچھی تو کیا قبول صورت بھی نہیں ہے۔ اس کو دیکھ کر نئے دوست تو کیا بنتے ڈر تھا میری فوٹو پر ہی سب کمنٹس نہ دینا شروع کردیں اور ابتداء میں ہی سب کے مذاق کا نشانہ بن جاؤں۔ یہ بات میں نے حارث سے تو نہ کہی البتہ اس سے کہا کہ میرے علاوہ کسی اداکار کی تصویر لگادو۔"

حارث نے یہ کام بھی منٹوں میں کر دکھایا اور ایک مشہور فلم اسٹار کی فوٹو میری آئی ڈی پر لگا دی۔ اب میں روزانہ دفتر آنے کے بعد اپنے کاموں سے ایزی ہوکر اپنا آئی ڈی کھول کر بیٹھ جاتا اور اس انتظار میں رہتا کہ کوئی انجانا لڑکا یا لڑکی مجھ سے دوستی کرے اور میں اپنی گفتگو سے اس کو اپنا گرویدہ بنالوں کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ بھلے میری شکل وصورت اچھی نہیں مگر میں باتیں ایسی کرسکتا ہوں کہ جس سے دوسرا بندہ بور نہ ہو خواہ موضوع کوئی بھی ہو۔ اس دوران میں کئی لوگوں اور لڑکیوں کو فرینڈ شپ ریکوسٹ بھیج چکا تھا۔ کئی نے تو قبول بھی کرلی تھی مگر بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یعنی کسی سے بھی گفتگو نہ ہوئی اگر وہ لوگ آن لائن ہوتے تو اس وقت میں دفتر نہ ہوتا اور اگر میں آن لائن ہوتا تو وہ موجود نہ ہوتے۔ اس دوران مجھے نیٹ کے بارے میں نت نئی چیزیں پتا چلنے لگیں کہ لوگ کیسے چیزیں شیئر کرتے ہیں اور وہ کس طرح کی ہوتی ہیں۔ ان میں تصویریں بھی ہوتی تھیں۔ وڈیو کلپس بھی۔ میں نے بھی اپنی دریافت کردہ چیزوں کو شیئر کرنا شروع کردیا۔ لوگ ان پر کمنٹس دینے لگے۔ میں بھی ان کی چیزوں پر جملے کسنے لگا مگر اس انجانے دوست کا انتظار اب بھی تھا جو کے طویل ہوتا جارہا تھا۔ بالآخر ایک روز دفتر آنے کے بعد جب میں آئی ڈی کو کھول کر بیٹھا تو پتا چلا کہ ایک نوشین نام کی لڑکی نے فرینڈ شپ ریکوسٹ بھیجی ہے جس کو میں نے فوراً قبول کرلیا مگر وہ لڑکی فی الحال دستیاب نہ تھی البتہ اس کی شیئر کی گئی چیزیں موجود تھیں۔ ان میں خاص طور پر شعر تھے جن کا انتخاب انتہائی اچھا تھا اور میرے مزاج سے بہت مطابقت رکھتا تھا۔ یہ سب چیزیں مجھے بہت پسند آئیں۔

ان پر میں نے کمنٹس بھی دیے۔ جو کہ سب کے سب تعریف پر مبنی تھے۔ تعریف بھی ایسی کی کہ اس کے قلابے آسمان سے ملا دیے کیوں کہ یہ بات تو میں بخوبی جانتا تھا کہ تعریف لڑکیوں کی کمزوری ہوتی ہے اور وہ اس کی بھوکی ہوتی ہیں۔ میں دوستی صرف لڑکیوں سے ہی کرنا چاہتا تھا اور اس ہاتھ آئی لڑکی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگلے روز اس نے بھی میری شیئر کی گئی چیزوں، خاص کر شعر و شاعری کو پسند کیا تھا۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی چیزوں کو پسند کرنے لگے اور دن گزرتے رہے مگر ڈائریکٹ بات ابھی بھی نہیں ہوئی تھی کیوں کہ جب میں آن لائن ہوتا تو وہ موجود نہ ہوتی اور اسی طرح اس کے ساتھ بھی ہوتا۔ انتظار اب بھی تھا اور اس میں دن بہ دن شدت آتی جا رہی تھی۔ آخر کار ایک دن میرے دوران ڈیوٹی وہ آن لائن ہو ہی گئی میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کو سلام کیا جس کا اس نے فوری جواب دیا۔ میری جان میں جان آئی اور پھر آہستہ آہستہ ہماری گفتگو آگے بڑھنے لگی اور پھر جھجک بھی جاتی رہی۔ میں اس کے انتخاب کی تعریف کرتا رہا اور پھر اس کی ذہانت کی جس میں یہ اچھوتے خیالات آتے تھے اور وہ ان کو سب سے شیئر کرتی تھی۔ تھوڑی بہت گفتگو کے بعد پتا چلا کہ یہ سب شعر خود اس کے اپنے ہیں۔ یہ پڑھ کر اور اچھا لگا کہ نوشین تقریباً میری ہم مزاج اور آئیڈیل ہے۔ جیسی لڑکی میں اپنی زندگی کی ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی ہے اور پھر وقت آیا ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کا۔ نوشین نے بتایا کہ وہ بھی ایک دفتر میں ملازم ہے۔ دن کو وہاں پر ڈیوٹی دیتی ہے جب کہ گھر میں اس کا ایک شادی شدہ بھائی اس کی بیوی اور ان کے دو چھوٹے بچے ہیں۔ ماں باپ کا کچھ عرصے پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ اپنے بھائی اور بھابی کے ساتھ رہتی ہے۔ بھابی ویسے تو مجھے پسند نہیں کرتیں مگر میرے نوکری کرنے کی وجہ سے برداشت کرتی ہیں کیوں کہ گھر کا کافی حد تک خرچا میں بھی اٹھاتی ہوں۔ گھر پر بھائی نے انٹرنیٹ کیبل لگوائی ہوئی ہے جس کو وہ استعمال کرتے ہیں جب کہ رات کو میں بھی اس سے فائدہ اٹھالیتی ہوں اور اپنی چیزیں لوگوں سے شیئر کر لیتی ہوں۔ آج طبیعت کی خرابی کے باعث دفتر نہ جا سکی گھر پر بور ہو رہی تھی تو سوچا آن لائن ہی ہو جائے۔ میری کہانی بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ میرے بھی والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدین کے چھوڑے ہوئے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ دور

پرے کے چچا، چچی اور خالو، خالہ تھے جن سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ایک میں تھا اور میری تنہائی تھی۔ میں ایک اچھے دفتر میں کافی اچھی تنخواہ پر ملازم تھا۔ گفتگو چلتی رہی جس میں ایک دوسرے کو مزید جاننے کا موقع ملا اور بالآخر میرا ڈیوٹی ٹائم ختم ہو گیا۔ میں نے نوشین سے پوچھا کہ اب ہماری گفتگو کیسے ہوا کرے گی تو اس نے کہا کہ رات میں ہی ہو سکتی ہے۔ دن میں تو میں دفتر میں ہوتی ہوں اور پھر میں اس کو اللہ حافظ کہہ کر گھر آ گیا۔ گھر آنے کے بعد میں اس کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ سارا دن ہونے والی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں اور پھر میں نوشین کے سراپے کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کیسی ہو گی، باتیں تو دلچسپ کرتی ہے۔ دیکھنے میں بھی لاجواب ہوں گی۔ بڑی بڑی آنکھیں ہوں گی سرخ و سفید رنگ ہو گا۔ ہرنی کی طرح بل کھا کے چلتی ہو گی، میں تو بدصورت ہوں اگر میری اور اس کی دوستی ہو گئی تو کیا وہ قریبی تعلق میں بدل جائے گی؟ کیا وہ مجھے بھی پسند کرنے لگے گی؟ مگر دل نے کہا ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ پہلے اس کو اپنی باتوں کا نشہ چکھاؤ پھر بات کو آگے بڑھائیں گے۔ یہ نہ ہو کہ وہ بدزن ہو جائے۔

نوشین نے بھی اپنے آئی ڈی پر میری طرح فوٹو نہیں لگائی تھی جس نے میرے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا۔ ویسے بھی لڑکیاں اپنی فوٹو اس طرح عام کرنے کو اچھا نہیں سمجھتیں۔

جیسے تیسے رات گزری صبح دفتر پہنچا سب کام ختم کرنے کے بعد سیٹ پر بیٹھتے ہی آن لائن ہو گیا۔ دل میں یہ ہی خیال تھا کہ شاید نوشین آج بھی دفتر نہ گئی ہے اور نیٹ پر موجود ہو مگر نوشین آج موجود نہ تھی۔ دل نے کہا کل بھی تو وہ بارہ بجے تک آن لائن ہوئی تھی۔ ابھی تو ساڑھے دس ہی ہوئے ہیں، کچھ اور انتظار کر لیتے ہیں۔ باقی سارا دن انتظار میں گزر گیا مگر وہ نہ آئی۔ اگلے دن بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے کچھ چیزیں شیئر کی تھیں ان کی تعریف کی مگر دل کو تسلی تو بات کرنے سے ہوتی تھی جو کہ نہیں ہو پا رہی تھی۔

ذہن سارا سارا دن اور رات گئے تک اس ہی کے بارے میں سوچتا رہتا مگر صرف سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب عملی طور پر کچھ کرنا تھا اور پھر میں نے گھر میں بھی کمپیوٹر رکھنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ رات میں نوشین کے آن لائن ہونے پر اس سے گفتگو کی جائے۔ اس بار بھی حارث ہی کام آیا اور اس نے ایک دکان سے اچھی حالت کا کمپیوٹر خرید کر دیا اور اسی نے گھر جا کر سیٹ بھی کر دیا۔ ایک علاقائی نیٹ کیبل والے سے کنکشن بھی دلوا دیا۔ حارث میں اپنا آئی ڈی کھول کر بیٹھ گیا مگر یہ کیا وہ ساری رات نہ آئی جب کہ میں ساری رات اسی کے انتظار میں رہا۔ نوشین کو کیا پتا تھا کہ میں اس سے بات کرنے کے لیے کس قدر بے چین ہوں مگر میں یہ بات اس کو بتاتا بھی تو کیسے بتاتا۔ وہ رابطے میں ہوتی تو تب ہی نا۔

اگلے دن دفتر پہنچا تو رات کی نیند کا خمار تھا۔ طبیعت میں بھی چڑچڑا پن تھا جس کو دوستوں نے بھی محسوس کیا۔ دو روز اسی طرح گزر گئے بالآخر تیسرے دن نوشین آن لائن ہو ہی گئی۔ دل تھا کہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔ دل کو کنٹرول کیا اور ہمت کر کے اس سے بات چیت شروع کی کہ کہیں وہ چلی ہی نہ جائے۔ ایک دوسرے سے سلام دعا اور حال چال پوچھنے کے بعد باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ نوشین نے رات کو میرے آن لائن ہونے کے بارے میں پوچھا تو میں نے اس کو بتایا کہ میں کافی عرصے سے گھر پر کمپیوٹر رکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سو وہ اب لے لیا ہے۔ اب میں رات کو بھی دوستوں سے رابطے میں رہوں گا۔ اس پر نوشین بھی خوش ہوئی کیوں کہ اس کو بھی اپنا ہم خیال مل گیا تھا اب ہر روز ہم دونوں کی باتیں ہونے لگیں۔ ان سب باتوں کے بعد تو میں نوشین کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔ مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب وہ بھی مجھ سے بات کیے بنا نہیں رہ پاتی۔ ایک دوسرے سے موبائل نمبرز کا بھی تبادلہ ہو گیا تھا۔ اب تو جب ہم دونوں میں سے کوئی فری رہتا دوسرے کو فون ملا کر بیٹھ جاتا، باتیں تھیں کہ گھنٹوں ختم نہ ہوتیں۔ دونوں ہی ہر موضوع پر بلا تھکان بولتے۔ اس کے خیالی سراپے کی طرح اس کی آواز بھی بڑی دل نشین تھی جو کہ کانوں میں رس گھولتی تھی اور میں خود کو دوسرے دفتری دوستوں کی نسبت اعلیٰ سمجھنے لگا جو کہ میرے حساب سے ابھی صرف جھک ہی مار رہے تھے جب کہ میں منزل سے صرف دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نہ صرف ایک نوجوان لڑکی سے دوستی کر چکا تھا بلکہ اس لڑکی کو اپنا دیوانہ بھی بنا چکا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا بذریعہ نیٹ بھی ایک دوسرے کو فوٹو نہیں بھیجی تھی۔ اب تجسس تھا کہ اپنی حدوں کو چھو رہا تھا۔ ہم دونوں دن میں سارے ہی جہاں کی باتیں کرتے مگر ملنے والی بات نہ جانے کیوں گول کر جاتے۔ میں تو اپنی شکل کے باعث ایسا کرنے سے کتراتا تھا مگر وہ نہ جانے کیوں اس طرف نہ آتی تھی یا پھر لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ چاہتی تھی کہ ایک دوسرے کو دیکھنے کا مطالبہ پہلے میں کروں۔ ہمارے خیالات ایک دوسرے سے اس قدر ملتے تھے کہ اگر ہم ایک دوسرے کو اپنا آئیڈیل کہتے تو بے جا نہ ہوتا۔

دن گزرتے رہے۔ اس دوران میں نے محبت کا اظہار بھی کر دیا جس کو شرفِ قبولیت بھی مل گئی۔ کئی وعدے بھی کرلیے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم دونوں نے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ طے یہ پایا کہ چھٹی والے دن ملتے ہیں اور کسی اچھے سے ہوٹل میں شام کا کھانا کھاتے ہیں۔ فون پر ہی ہوٹل اور ملنے کا دن مقرر ہو گیا۔

اب مجھے اگر انتظار تھا تو صرف اور صرف چھٹی والے دن کا۔ جس دن میں اپنے سپنوں میں بسی اس سندر ناری کا دیدار کرتا تھا جس کے بارے میں کئی دن اور کئی راتیں صرف اور صرف سوچتے ہوئے گزار دی تھیں۔

چھٹی والے دن میں نے خاص اہتمام کیا۔ ایک عدد نیا سوٹ خریدا جس پر مہنگا پرفیوم کئی بار چھڑکا اور شیو کرنے کے بعد موٹر سائیکل لے کر نکل پڑا۔ شکل کو لے کر دل میں وسوسے بھی تھے مگر دماغ کہتا تھا کہ لڑکی اب کہیں نہیں جائے گی کیوں کہ وہ "گوڈے گوڈے" میرے عشق میں ڈوب چکی ہے۔

آج نوشین نے کہا تھا کہ وہ ہلکا سرخ رنگ کا سوٹ پہن کر آئے گی۔ پھر کیا تھا سوچیں تھیں اور بے چینی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی، انہی سوچوں میں گم میں اس جگہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر ہمیں ملنا تھا اور طویل بے قراری کو قرار آجانا تھا۔ اس حسین نازنین نے دل پر بجلیاں گرانی تھیں اور مجھے اس کی خوشبو سے مہک جانا تھا۔

آخر کار وہ وقت آگیا۔ چوک پر ایک ٹیکسی آکر رکی۔ اس میں سے ایک لڑکی اتری۔ مگر جو لڑکی ٹیکسی سے اتری تھی وہ کوئی حسینہ عالم نہ تھی۔ بے ڈول سا جسم تھا، کہیں سے بہت زیادہ موٹا اور کہیں سے بدوضع، چہرہ بھی نا تو چندے آفتاب تھا اور نہ ہی چندے ماہتاب، گول اور سپاٹ سا چہرہ تھا جب کہ اس پر بھی ایک موٹے عدسے والی نظر کی عینک رکھی تھی۔ دل نے کہا کہ یہ وہ نہیں ہو سکتی جو میرے جسم و جاں پر حکومت کرتی تھی۔ پھر دماغ نے کہا اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس نے کپڑے کیوں ہلکے لال رنگ کے پہنے ہوئے ہیں۔ نوشین بھی ٹیکسی والے کو فارغ کرنے کے بعد میری طرف اجنبی نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ جیسے اس کے بھی سپنے ٹوٹ کر ہوا میں بکھر گئے ہوں۔

میں تھکے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا اور نیم دلی سے پوچھا۔ کیا آپ کا نام نوشین ہے۔

اس نے بھی نیم دلی سے ہی کہا۔ "ہاں۔"

میرے سپنوں کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔ اس کو بھی مجھ سے مل کر لگتا تھا کہ دکھ ہوا ہے مگر میرا دکھ اس سے لاکھ درجے زیادہ تھا۔ کیوں کہ میں خود کو بدصورت تو سمجھتا تھا مگر اب ایسا بھی نہیں تھا کہ میں کسی ایسی ویسی سے شادی کر لیتا۔ کم از کم اب نوشین سے تو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے جذبات نہ جانے کہاں چلے گئے جو اس کے بارے میں سوچتے تھے۔ اب مجھے خود پر بھی بہت غصہ آرہا تھا اور میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے نوشین سے ملنے کا اصرار کیا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو زندگی کتنی اچھی گزر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک حسین سپنا ہے جو ٹوٹ گیا ہے اور اب مجھے حقیقی دنیا میں آجانا چاہیے۔

میں خاموش تھا وہ بھی خاموش تھی۔ میں نے اس کو موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی چپ چپ بیٹھ گئی۔ ہم مقررہ ہوٹل پر پہنچے اور ایک ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ویٹر کو کھانا لانے کا کہا وہ جو ہم نیٹ پر اور فون پر گھنٹوں باتیں کرتے تھے آج نہ جانے کیوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونے پر بھی خاموش تھے۔ میری طرح وہ بھی شاید اس ملاقات کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ نہ اس نے میری تعریف کی اور نہ ہی میں نے۔ کھانا بھی اچھا نہ لگا یا پھر شاید ذائقے کا راستہ بھی دل سے ہو کر گزرتا ہے جو کہ فی الحال مرجھایا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے کہا کہ میں اب چلتی ہوں۔ میں نے کہا کہ آئیں میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ بولی نہیں میں ٹیکسی سے ہی چلی جاؤں گی اور پھر وہ چلی گئی۔

میں گم صم سا بیٹھا رہ گیا اور پھر میں بھی ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر واپس آگیا۔ موبائل اور بتیاں بند کیں اور بستر پر لیٹ گیا۔ بار بار خود کو کوستا رہا اور سوچتا رہا کہ میں شکل و صورت سے برا ہوں مگر اتنا بھی نہیں کوئی اور ڈھونڈ لیں گے اب طریقہ واردات تو پتا چل ہی گیا ہے مگر دل تھا کہ اس کو آرام نہیں آرہا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ اس سے نیند کوسوں دور تھی۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ اگلے دن سر بہت بھاری ہو رہا تھا اور دفتر جانے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ دفتر فون کر کے چھٹی کی اطلاع دی اور پھر سے اندھیرے کمرے میں بستر پر گر گیا۔ دو روز تک دفتر جانے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔ تیسرے دن دفتر پہنچا۔ ساتھی ورکروں نے وجہ پوچھی تو طبیعت کی خرابی کا کہہ کر ٹال دیا۔ اب ان کو میں کیا بتاتا کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ اگر بتا دیتا وہ میرے دکھ میں شریک ہونے کی بجائے میرا مذاق بناتے۔ اب میں تھا دفتر تھا گھر اور نہ ختم ہونے والی سوچیں۔ بار بار نوشین سے فون

پر کی گئی باتیں یاد آتیں اور ان باتوں سے جڑی حسین یادوں میں کھو جاتا، لاکھ کوشش کرتا کہ وہ دل و دماغ سے نکل جائے مگر میرا آئیڈیل ازم میرے سامنے آجاتا۔ نوشین کی سب ہی باتیں، خیالات اور شعر و شاعری اچھی تھی۔ میں شکل کو لے کر اتنا جذباتی کیوں ہورہا تھا۔ میں بھی تو کوئی ہیرو نہیں تھا۔ مجھے اس کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور نوشین جیسی حسین سوچ والی لڑکی کو ہی اپنا شریکِ حیات بنانا چاہیے تھا۔ تقریباً ایک ماہ بعد میں پھر سے نوشین کے سحر میں گرفتار ہوچکا تھا اور دل نے کہا کہ اس کو فون کر کے سوری کیا جائے اور پھر نوشین سے خوب لڑا جائے کہ اگر میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا تو اس کو تو مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ فون ملایا تو پتا لگا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ پھر ملایا مگر جواب ایک ہی موصول ہوتا رہا۔ نیٹ پر چیک کیا تو پتا لگا کہ نوشین نے گزشتہ ایک ماہ سے نیٹ پر کچھ بھی تو نیا شیئر نہیں کیا ہے۔ اب میری حالت بن پانی کے مچھلی جیسی ہونے لگی کبھی موبائل سے نوشین کا نمبر ڈائل کرتا اور کبھی نیٹ پر چیک کرتا۔ دونوں پر میں نے اس کے لیے میسج چھوڑا کہ جیسے ہی اس کو ملے مجھ سے رابطہ کرے مگر دوسری طرف سے یکسر خاموشی تھی۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ بے قراری بڑھتی رہی۔ اس دوران انٹرنیٹ پر کچھ نئے دوست بنے جن میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سے باتیں بھی کیں مگر یا تو وہ بہت جلد بور ہوجاتیں یا پھر مجھے چپ لگ جاتی اور میں سب کچھ بند کردیتا۔ آہستہ آہستہ نوشین سے رابطے کی اُمید ختم ہوتی جارہی تھی کیوں کہ میں نے نہ تو اس کے گھر کا پتا لیا تھا اور نہ ہی یہ معلوم کیا تھا کہ وہ کہاں کام کرتی ہے۔ اگر اب رابطہ کرنا تھا تو صرف اور صرف نوشین کو ہی کرنا تھا۔ مزید 4 ماہ یوں ہی گزر گئے اور ایک دن اچانک اس کا فون آگیا۔ میں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔ ہیلو اس نے بھی ہیلو کہا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر میں نے کہا نوشین تم کہاں چلی گئی تھیں کوئی رابطہ نہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اتنے عرصے میں کس کرب سے گزرا ہوں۔ تمہاری یادیں تھیں کہ مجھے سونے نہیں دیتی تھیں۔ تمہیں میرا ذرا خیال نہیں آیا۔ کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ اگر ہو تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔ خدارا مجھے معاف کردو۔ میں مسلسل بولتا رہا اور نوشین سے بچوں کی طرح معافی مانگتا رہا۔

میرے خاموش ہونے پر وہ بولی۔ تم نے بھی تو اس روز ملاقات کے بعد مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے گھر آنے کے بعد تمہارا نمبر ملایا تھا مگر وہ بند جارہا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ میں شکل و صورت کی اور جسامت کی اچھی نہیں ہوں مگر ہمارا اور بھی تو تعلق تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے وعدے کیے تھے۔ محبت کا اقرار کیا تھا۔ اس روز میں تم سے ملتے وقت بہت ڈری ہوئی تھی کہ کہیں تم بھی حسن پرست نہ ہو مگر ایسا ہی ہوا اور تمہارے اس رویے کی وجہ سے میں جلد ہی اٹھ کر چلی آئی۔ تم نے بھی نہیں روکا۔ اس دن کے بعد میں نے کچھ روز تمہارے فون کا انتظار کیا اور پھر بالآخر غصے میں اپنی سم بند کردی۔

یہ سب سننے کے بعد میں نے کہا۔ ”میں اپنی غلطی مانتا ہوں اور تم سے معافی مانگتا ہوں اور کہتا ہوں کہ سب کچھ دیا ہی کردو اور میں تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

نوشین بولی۔ ”نہیں زبیر اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی اور یہی بات بتانے کے لیے میں نے تم سے رابطہ کیا ہے کہ میں کسی اور سے شادی کررہی ہوں۔“

یہ سننا تھا کہ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ کافی دیر بعد خود پر کنٹرول کرکے نوشین سے پوچھا کہ کون ہے وہ؟

وہ بولی ”ہمارے دفتر کے جنرل منیجر صاحب ہیں۔ ان کی ایک سال قبل انتہائی خوب صورت لڑکی سے شادی ہوئی تھی ویسے تو وہ خود بھی بہت اسمارٹ ہیں مگر ان کی بیوی کسی اور کے لیے ان کو چھوڑ کر اور طلاق لے کر چلی گئی۔ جنرل منیجر صاحب کو بہت بری ٹھوکر لگی اور وہ بہت اداس رہنے لگے اور پھر ایک دن انہوں نے اچانک مجھے شادی کی آفر کردی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس قدر ہینڈسم اور مالی لحاظ سے مضبوط ہیں تو پھر مجھ ہی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہیں جب کہ میں آپ کے ساتھ بالکل بھی میل نہیں کھاتی تو انہوں نے کہا خوب صورتی شکلوں میں نہیں ہوتی بلکہ دل میں ہوتی ہے اور تم دل کی بہت اچھی ہو۔ اس وجہ سے میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان کی اس والہانہ محبت کے آگے ہار گئی۔ عورتیں تو ویسے ہی محبت کرنے والا شوہر ڈھونڈتی ہیں جو کہ مجھے بغیر ڈھونڈے ہی مل گیا ہے اور کچھ عرصے بعد ہم دونوں شادی کرلیں گے۔“

یہ سب کچھ سن کر میں جس قدر رو سکتا تھا رویا اور خود کو خوب برا بھلا کہا کہ ایک آئیڈیل لڑکی کو چھوڑ دیا۔ نوشین کا وہ آخری جملہ مجھے آج بھی یاد ہے جو اس نے میرے منہ پر مارا تھا کہ زبیر اب تم کو پتا چل ہی گیا ہے کہ میری عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ ”اب تیرا کیا بنے گا کالیا......!“

بہروپ

جناب مدیر سرگزشت

السلام علیکم

میں نے دوسروں کی کہانیاں بہت لکھی ہیں لیکن اپنی کہانی پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ اس کہانی میں اپنا نام میں نے بدل دیا ہے۔ جو نام لکھا ہے پلیز اسی کو بطور مصنف استعمال کریں۔

انجم فیروز

(کراچی)

بات صرف اتنی تھی کہ وہ لڑکی مجھے پہلی نظر میں پسند آ گئی تھی۔

اس محفل میں اس کا انداز ہی مختلف تھا۔ خوب صورت، اسمارٹ اور انتہائی قیمتی لباس میں ملبوس۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے جو بیگ اٹھا رکھا تھا وہی کم از کم لاکھ ڈیڑھ کا ہوگا۔

اس کی ہر ادا چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ اس کا تعلق کسی دولت مند گھرانے سے ہے۔ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو کم از کم میرے پاس نہیں تھا۔

اس کو دیکھ کر میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ میرے پاس کرتہ شلوار کے صرف دو عدد سوٹ تھے۔ جن میں سے ایک میں نے اس وقت پہن رکھا تھا۔

جوتوں کی صرف ایک جوڑی تھی۔ جن پر اتنی دفعہ پالش ہو چکی تھی کہ اس کا چمڑا تک فریاد کر چکا ہوگا۔ یہ دولت
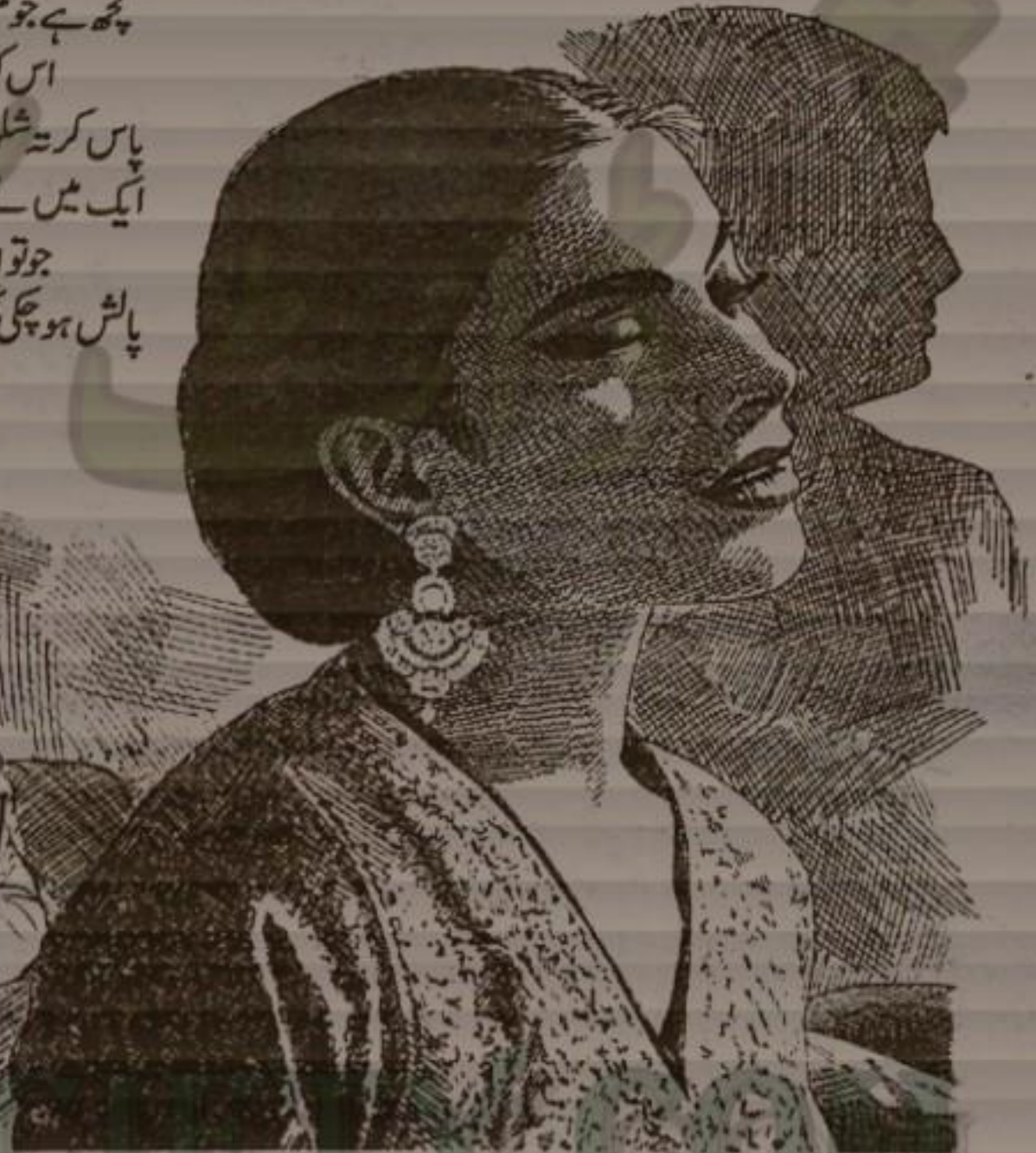
مندوں کی محفل تھی اور یہاں مجھ جیسے مفلس شخص کو محض اس لیے مدعو کیا گیا تھا کہ میں ایک مشہور آدمی تھا۔

بہت مشہور نہ سہی۔ لیکن اچھی خاصی شہرت تھی، کیوں کہ میں ایک شاعر تھا اور کسی حد تک دانش ور بھی سمجھا جانے لگا تھا۔

کبھی کبھی کوئی ٹی وی چینل مجھے اپنے کسی ٹاک شو میں بھی بلا لیتا۔ اس لیے لوگ مجھے جاننے لگے تھے۔ ورنہ ایسی محفلوں میں مجھ جیسوں کو کون پوچھتا ہے۔

بہرحال میں نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو دل سے یہی دعا نکلی کاش میں کسی طرح اس کو حاصل کرسکوں۔ کیوں کہ وہ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی دکھائی دے رہی تھی۔

ذہانت کا اپنا الگ انداز ہوا کرتا ہے۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اور باتیں کرنے کا انداز بتا دیتا ہے کہ یہ شخص ذہین ہے یا نہیں ہے۔

تو وہ مجھے ذہین بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس لیے میں نے ایسی خواہش کی تھی۔ کیوں کہ ذہانت شروع سے میری کمزوری رہی ہے۔

میں کسی کند ذہن آدمی سے مسابقت پیدا ہی نہیں کر سکتا۔

نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی کہ میری دعا اس وقت قبول ہوگئی۔ وہ لڑکی سیدھی تیر کی طرح میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

وہ اس وقت بہت پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

''آپ انجم فیروز صاحب ہیں ناں؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں میں ہی وہ خوش قسمت ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اپنے آپ کو خوش قسمت نہیں کہہ رہا کہ میں انجم فیروز ہوں بلکہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ جیسی خاتون مجھ سے میرے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔''

''خوب۔'' وہ مسکرا دی۔ ''اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جس خاتون نے آپ سے یہ پوچھا ہو وہ آپ سے زیادہ خوش قسمت ہو۔''

''کیوں نہیں۔'' میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''اس کا اندازہ تو آپ کو دیکھ کر ہی ہو رہا ہے۔''

''انجم صاحب مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔'' اس نے کہا ''میں آپ کی شاعری کی فین ہوں۔ بہت اچھی شاعری کرتے ہیں آپ۔''

''اور میں اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اس زمانے میں آپ جیسی لڑکیاں بھی موجود ہیں جن کو شاعری کا شوق ہے۔''

''کیوں نہیں۔ یہ تربیت تو گھر سے ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے ڈیڈ ایک صنعت کار ہونے کے باوجود ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا نام ہے آپ کے ڈیڈ کا۔ ہوسکتا ہے کہ میں انہیں جانتا ہوں۔''

''ان کا نام اکرم شیروانی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ۔ اکرم شیروانی۔ وہی تو نہیں شیروانی کاٹن مل والے۔''

''جی ہاں وہی۔''

''وہ تو واقعی باذوق آدمی ہیں۔ آپ کی فیکٹری میں ہر سال سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ میں بھی ایک بار شریک ہو چکا ہوں۔''

''مجھے پتا چلا تھا لیکن اس وقت میں انگلینڈ میں تھی۔ اس لیے مشاعرہ میں شریک نہیں ہو پائی تھی۔'' اس نے بتایا۔

اسی دوران میں ایک اور لڑکی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

وہ لڑکی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ اسی کی طرح قیمتی لباس میں ملبوس، اسمارٹ اور خوب صورت۔

''یہ میری دوست ہے۔'' اس نے تعارف کروایا۔ ''شاہینہ فرقان، آپ نے ان کے ڈیڈی کا نام بھی سنا ہوگا۔ فرقان باریجہ۔''

''کیوں نہیں۔ بہت بڑے جاگیردار ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر اس لڑکی سے پوچھا۔ ''آپ نے اپنی دوست اور ان کے ڈیڈ تک کا تو نام بتا دیا لیکن اپنا نام نہیں بتایا۔''

''ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''میں زرین شیروانی ہوں۔''

''Let us have a seat dear'' اس کی دوست شاہینہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کب تک کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہیں گے۔''

ہم ایک طرف آکر بیٹھ گئے۔

زندگی میں پہلی بار اس بات پر فخر اور خوشی ہو رہی تھی کہ میں ایک شاعر اور تھوڑا بہت دانش ور ہوں اور کبھی کبھی کسی ٹاک شو میں حصہ لے لیتا ہوں۔ ورنہ ایسی لڑکیاں کب میرے پاس آتی تھیں۔ میرے اور ان کے درمیان کلاس کا

فرق تھا۔

ہم نے باتیں شروع کر دیں۔

اس وقت میں بہت خوب صورت باتیں کر رہا تھا۔ ان دونوں کے انداز.... بتا رہے تھے کہ میری باتوں نے انہیں چت کر دیا ہے۔

دونوں ہی جذباتی ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنی گفتگو خوب صورت، اعتدال اور خوب صورت اشعار سے سجا کر ان کے سامنے پیش کر دی تھی۔

آخر کار بہت دیر بعد وہ مجھ سے اجازت لے کر کسی اور طرف جانے لگیں تو مجھ سے بہت خوش اور مرعوب ہو چکی تھیں۔ زرین نے مجھے اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں اس لیے نہیں دے رہی ہوں کہ آپ اسے رکھ کر بھول جائیں بلکہ اس لیے دے رہی ہوں کہ یاد کر لیا کریں۔''

''اور میں اس لیے لے رہا ہوں کہ شاید اب میرے پاس اور کوئی کام نہ رہے۔''

دونوں ہنس پڑیں۔

محفل ختم ہوئی۔ میں ان کے ہال سے نکلنے سے پہلے باہر آ کر ایک طرف چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں اپنی اپنی شاندار گاڑیوں میں روانہ ہو گئی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے بھی اپنی وہی پرانی سواری رکشا لیا اور اپنے فلیٹ واپس آ گیا۔

وہ رات میرے لیے بہت خوب صورت خوابوں کی رات تھی۔

نہ جانے کیا کیا دیکھتا رہا۔ یہ اتفاق تھا کہ ان خوابوں میں مجھے زرین اور شاہینہ دونوں ہی دکھائی دیتی رہیں۔ کبھی زرین میرے ساتھ ہوتی اور کبھی شاہینہ۔

اور کبھی وہ دونوں ساتھ ہی نظر آتیں۔ دل ان سے ملنے کو بے تاب تھا۔

ایک ہفتے بعد اُمید کی ایک کرن نمودار ہو ہی گئی۔ زرین کا فون آ گیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس نے فون پر نہیں بتایا تھا کہ اسے کیوں مجھ سے ملنا ہے لیکن معاملہ جو بھی ہو اہمیت اس بات کی تھی کہ اس نے مجھے فون کیا تھا۔

ہماری یہ ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میں نے جب اس ملاقات کا سبب معلوم کیا تو وہ مسکرا دی۔ ''کیا ضروری ہے کہ کوئی ضروری بات ہو۔ ملاقات برائے ملاقات بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''پھر تو میں اس دور کا خوش قسمت ترین انسان ہوا ناں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' وہ مسکرا دی۔ ''جناب عالی آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ میں نے آپ کی شاعری پڑھی تو ہے لیکن سنی نہیں ہے۔''

''کیا سننا چاہتی ہو۔''

''خود آپ سے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اپنے اشعار سنائیں۔''

''شاعری سمجھ میں آتی ہے؟''

''شاعر سمجھ میں آتے ہی شاعری آ جاتی ہے۔''

یہ بھی ذہانت بھرا جواب تھا۔ میں نے اسے اشعار سنانے شروع کر دیے۔ وہ بہت سلیقے کے ساتھ داد دیتی رہی تھی۔

اس کے بعد اس سے اور ملاقاتیں بھی ہوئیں اور ہر ملاقات ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی رہی۔ اس دوران میں اس کی دوست شاہینہ سے بھی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بھی اس کی طرح باذوق تھی۔ بلکہ دونوں میں بہت سی باتیں ایک جیسی تھیں۔ دونوں کی پسند ناپسند ایک تھی۔ دونوں اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں دونوں دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور دونوں ہی اپنے اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔

میں ہر روز ان کے خواب دیکھتے دیکھتے نیند سے بیدار ہوتا۔ اس دن زرین بھی اپنے گھر میں اکیلی تھی اور شاہینہ بھی۔

صبح دیر سے سو کر اٹھا۔ آج مجھے اپنے میگزین کے آفس جانا تھا۔ میں ہفتے میں ایک بار جایا کرتا تھا۔ کیوں کہ اب وہاں کوئی خاص کام نہیں رہا تھا۔

الیکٹرونک میڈیا کا آسیب پرنٹ میڈیا کو تباہ کر گیا تھا۔

دفتر پہنچا تو ایڈیٹر صاحب بہت اداس موڈ میں تھے لیکن انہوں نے حسبِ روایت چائے ضرور پلائی تھی۔

''کیا بات ہے کومل صاحب۔'' میں نے پوچھا۔

''خیریت تو ہے بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں۔''

کومل صاحب صرف نام کے کومل تھے ویسے پہاڑ جیسا جسم پایا تھا۔

''بیٹھ جاؤ بھائی۔'' کومل صاحب نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' میں نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''بھائی فیروز، تسیم اور وسیم مجھے ایک بار پھر دھوکا دے

گئے۔'' کومل صاحب نے بتایا۔

''کومل صاحب اوّل تو میں یہ نہیں جانتا کہ نسیم اور وسیم کون ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ انہوں نے پہلی بار کب دھوکا دیا تھا۔''

''کئی بار دے چکے ہیں۔'' کومل صاحب کی آواز میں دکھ تھا۔ ''کم بخت جڑواں بھائی ہیں۔ بالکل ایک جیسے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ نسیم کون ہے اور وسیم کون ہے۔ میں نے اس بار پورے دو ہزار روپے ادھار دیے تھے۔''

''دونوں میں سے کس کو دیے تھے۔''

''بس یہی تو ساری گڑبڑ ہے۔'' کومل صاحب نے کہا۔ ''نسیم سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے وسیم کو دیے تھے اور جب وسیم سے پوچھتا ہوں تو وہ نسیم کا نام لیتا ہے۔''

''یہ تو بہت دل چسپ پچویشن ہے۔'' میں نے کہا۔

''دل چسپ تمہارے لیے ہوگی۔ میرے لیے تو دو ہزار کے نقصان کی پچویشن ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کس سے وصول کروں۔ پہلے بھی اس چکر میں دھوکا کھا چکا ہوں۔''

''کیا وہ واقعی ایسے ہیں کہ آپ پہچان نہیں پاتے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھائی بالکل ایک جیسے۔ کم بختوں کی آوازیں بھی ایک ہیں۔''

اور اچانک ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آگیا۔ بہت ہی ٹیڑھا خیال تھا لیکن اگر ہوشیاری سے کام لیا جاتا تو کامیابی یقینی تھی۔

میں کومل صاحب کو دلاسہ دے کر اپنے فلیٹ میں واپس آگیا۔ ایک پلاننگ میرے ذہن میں آنے لگی تھی بشرطیکہ دوسری طرف سے بھی حوصلہ افزا کوئی جواب مل جاتا۔ اگر میری پلاننگ کامیاب ہو جاتی تو ہر حال میں زرین میری ہوتی۔

ایک دن زرین نے مجھ سے کہا۔ ''فیروز میں اب روز روز کی ایسی ملاقاتوں سے تنگ آچکی ہوں۔''

''تو پھر کیا مجھ سے ملنا نہیں چاہتیں؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں یا تو میں تم سے کبھی نہ ملوں یا پھر ہمیشہ ملتی رہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''مطلب یہ کہ یا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھی بن جائیں یا پھر ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیں۔''

''زرین تم کو اندازہ ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

''ہاں اندازہ ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ تم میرے ڈیڈ سے نہیں ملے وہ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ بہت وسیع دل و دماغ کے انسان ہیں۔ ان کے نزدیک کلاس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''نہیں زرین۔ میرے لیے یہ صرف ایک خواب ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''کیوں کہ مجھ میں اور تم میں بہت فرق ہے۔ خدا نے تم کو بہت کچھ دیا ہے جب کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''فالتو بات، میرے نزدیک ذہنی ہم آہنگی سب سے زیادہ ضروری ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''اور میں نے اتنے دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔''

''تم نے تو مجھے خواب دکھا دیے ہیں زرین۔''

''ان خوابوں کی تعبیر بھی تم حاصل کر سکتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ڈیڈ تمہیں کوئی بہت بڑا بزنس سیٹ کر کے دے دیں۔''

''تاکہ میں ہمیشہ ان کے آگے گردن جھکائے رکھوں۔''

''نہیں، میں نے کہا نا کہ وہ اس مزاج کے نہیں ہیں۔ تم قرض کے طور پر لو اور بعد میں واپس کر دو۔''

''یہ مرحلہ تو اس وقت ہوگا نا جب بات آگے بڑھے گی۔''

''بڑھ جائے گی بات، تم ایک بار ڈیڈ سے مل تو لو۔''

''چلو بتاؤ کب ملنا ہے۔''

''کل شام کو میرے گھر آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''ڈیڈی بھی گھر پر مل جائیں گے۔''

میں دوسری شام اس کے شاندار گھر پر پہنچ ہی گیا۔ یہ تو جانتا تھا کہ اس کے ڈیڈ گھر پر مل جائیں گے لیکن مان جائیں گے اس کی کوئی امید نہیں تھی لیکن ایک حیرت انگیز بات ہوگی۔

اس کے ڈیڈی نے مجھ سے کہا۔ ''انجم فیروز تم مجھے پسند آئے ہو۔ کیوں کہ تمہارا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے اور اس قسم کے لوگ عام طور پر شریف ہی ہوا کرتے ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں ہے جناب۔ اس معاشرے میں میری اپنی ساکھ ہے۔ شہرت ہے۔ میں نے

ابھی تک اپنے آپ کو بہت سنبھال کر رکھا ہے۔''

''گڈ۔'' اس کے ڈیڈی نے گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''سنا ہے تم شاعر بھی ہو۔''

''جی جناب۔''

''یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ کیوں کہ شاعر اور ادیب قسم کے لوگ عام طور پر سمجھوتا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کے مزاج میں چاہے دوسری خرابیاں ہوں لیکن انسانی ہمدردی اور پیار کی خوبیاں ضرور ہوتی ہیں۔ عام طور پر شاعروں کی بیویاں اس بات کا رونا روتی رہتی ہیں کہ ان کی زندگی مفلسی میں گزر رہی ہے لیکن تمہارے ساتھ یا میری بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔''

''وہ کیوں جناب؟''

''اس لیے کہ تم ایک بہت بڑا پبلشنگ ہاؤس قائم کرو گے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بزنس تمہارے مزاج کے مطابق ہو گا۔''

''بالکل جناب سو فیصد۔'' میری آواز خوشی سے لرزنے لگی تھی۔ ''یہ تو میرا بہت پرانا خواب ہے جناب۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس بزنس کے لیے میرے ذہن میں بے شمار آئیڈیاز بھی ہیں۔''

''ضرور ہوں گے۔ کیوں کہ تمہاری فیلڈ بھی یہی ہے۔ بہرحال اب یہ بتاؤ تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے۔ کتنے لوگ ہیں تمہارے خاندان میں، میں ان سے ملنا چاہوں گا۔''

''جناب بزرگوں کے طور پر تو صرف میں ہی رہ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ میرا ایک جڑواں بھائی ہے۔ وسیم فیروز۔'' یہ جڑواں بھائی والی پلاننگ وہی تھی جو میں نے ایڈیٹر کومل صاحب کی کہانی سن کر اپنے ذہن میں بنا لیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اگر شیروانی صاحب کمزور پڑیں تو اس گوٹ کو چل کر بازی اپنے حق میں کرلوں۔

''گڈ۔'' زرین کے ڈیڈی کی دل چسپی بڑھ گئی تھی۔

''کیسا ہے تمہارا جڑواں بھائی۔''

''بالکل میری طرح ہے جناب۔'' میں نے بتایا۔

''آپ پہچان ہی نہیں سکتے۔ کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھ رہا ہوں۔''

اس گفتگو کے موقع پر زرین بھی وہیں موجود تھی۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

''لیکن آپ نے تو اپنے جڑواں بھائی کے بارے

میں کچھ نہیں بتایا تھا۔'' اس نے کہا۔
''اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور ویسے بھی وہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والا انسان ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ہے اس کی کوکنگ کی صلاحیت۔''
یہ صلاحیت میں نے اپنی بیان کی تھی کیوں کہ مجھے کوکنگ کا بے پناہ شوق تھا۔ اکیلے رہنے کی وجہ سے خود کوکنگ کی عادت پڑ گئی تھی اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میرے ہاتھوں میں بہت ذائقہ ہے۔
''کوکنگ کی صلاحیت۔'' خالد صاحب نے پوچھا۔
''جی جناب، دنیا بھر کی ڈشز بنا لیتا ہے۔ امریکن، فرنچ، اٹالین اور نہ جانے کیا کیا۔ جب کہ میرا یہ حال ہے کہ میں صرف چائے بنانی جانتا ہوں۔''
''کسی دن ملوانا اپنے بھائی سے۔''
''کیوں نہیں جناب۔ وہ خود ہی ٹہلتا ہوا آ جائے گا وہ اس مزاج کا آدمی ہے۔''
''چلو تو خیر، تمہارے اور زرین کے حوالے سے ہم اس سے بات کریں گے۔ کسی دن اسے لے کر آ جاؤ۔''
''بلکہ ایسا کریں کل ہی بھیج دیں۔'' زرین اچانک بول پڑی۔ ''ان سے ملنے کا شوق ہو گیا ہے۔''
''بھیج کیا دیں۔ لے کر آ جاؤ۔'' خالد صاحب نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ یہ کام جتنی جلد ہو جائے اتنا اچھا ہے۔ کیوں کہ اگر معاملات Settle ہو گئے تو میں چھ سات مہینوں کے لیے یورپ چلا جاؤں گا۔ میں وہاں اپنا بزنس Set کرنا چاہ رہا ہوں۔''
''یہ تو بہت اچھا آئیڈیا ہے جناب۔''
کچھ دیر کے بعد میں اس گھر سے باہر آ گیا اور اب مجھے اپنا جڑواں بھائی پیدا کرنا تھا۔ پیدا کیا کرنا تھا اس کو سلیقے سے Manage کرنا تھا۔ کیوں کہ وہ جڑواں تو خود میں ہی تھا۔
میں نے بازار سے ایک عدد پینٹ شرٹ خرید لی۔
کیوں کہ میں نے ہمیشہ کرتہ شلوار استعمال کیا تھا۔ کرتہ شلوار سلیپنگ سوٹ کے طور پر بھی استعمال کرتا تھا لیکن خود کو وسیم فیروز ظاہر کرنے کے لیے پینٹ قمیص استعمال کرنی تھی۔
میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کا اسٹائل تبدیل کرنے کی مشق کی۔ ایک تکیہ کلام بنا لیا۔ ونڈر فل۔ ان تیاریوں کے بعد میں وسیم فیروز بننے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔
دوسری شام پورے اعتماد اور پوری تیاریوں کے ساتھ زرین کے گھر پہنچ گیا۔
زرین اور خالد صاحب دونوں بہت حیرت سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ ''کمال ہے تم میں اور انجم میں تو کوئی فرق ہی نہیں ہے۔''
''جی جناب کبھی کبھی ہمارے والدین بھی دھوکے کھا جاتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''بس کچھ عادتیں ہیں جو تھوڑی سی مختلف ہیں۔ جیسے میں پینٹ قمیص پہنتا ہوں اور وہ کرتہ شلوار، میں پرفیوم استعمال کرتا ہوں اور اسے عطر کا شوق ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں اور وہ شاعر ہے۔''
''لیکن انجم خود کیوں نہیں آئے؟'' زرین نے پوچھا۔
''ان کے کسی شاعر دوست پرواز خیالی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ اس کی عیادت کے لیے گئے ہیں۔''
''آپ ان سے میری بات کروا دیں۔'' رعنا نے کہا۔
''کیوں نہیں۔'' میں نے اپنی جیب سے دوسرا موبائل نکال لیا۔ یہ موبائل سیٹ میرے پاس بہت دنوں سے فالتو ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس پر نمبر ملایا۔ ظاہر ہے دوسری طرف سے انگیج کی ٹون آنی تھی۔ وہ آتی رہی۔ اس طرح وقتی طور پر یہ معاملہ ٹل گیا۔
اب سوال یہ تھا کہ آخر مجھے خود کو وسیم فیروز ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ زرین کے ڈیڈی تو انجم فیروز کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے پھر کیا ضرورت تھی مجھے خود کو جڑواں ظاہر کرنے کی۔
تو اس کی ضرورت یہ تھی کہ میری پلاننگ کچھ اس انداز کی تھی۔
مجھے زرین کی دوست شاہینہ سے بھی شادی کرنی تھی۔
انجم فیروز کی شادی زرین سے ہو جاتی اور وسیم فیروز کی شادی شاہینہ سے۔ حالانکہ یہ بہت الجھا ہوا اور لمبا کھیل ہوتا۔ اس روپ بہروپ کو نبھانا کتنا مشکل ہو جاتا لیکن میرے ذہن میں پوری پلاننگ تھی۔ مجھے اپنی یہ چال شطرنج کے کسی ماہر کھلاڑی کی طرح چلنی تھی۔
مجھے امید تھی کہ شاہینہ بھی وسیم فیروز کو پسند کر لیتی۔

کیوں کہ وہ زرین کے مزاج کی لڑکی تھی۔
اور میں ایک دن وسیم فیروز بن کر زرین کے پاس پہنچ گیا۔
وہ مجھے انجم ہی سمجھی تھی (ظاہر ہے کہ میں انجم ہی تھا) اس کو یقین دلانا مشکل ہو گیا تھا کہ میں وسیم فیروز ہوں۔
''خدا کی پناہ۔ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنے ملتے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''اگر تم دونوں ایک ساتھ سامنے آجاؤ تو پھر میں تو بے ہوش ہی ہو جاؤں۔''
''کیا میں آپ کو بھابی کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے پوچھا۔
وہ شرما گئی۔ ''ہاں کیوں نہیں۔'' اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔
''بھابی یہ مسئلہ صرف آپ کے ساتھ نہیں ہے اوروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارے خونی رشتے دار تک پہچان نہیں پاتے۔''
''ایسا ہی ہوگا۔'' اس نے گردن ہلائی۔ ''تم دونوں حیرت انگیز ہو۔''
''ونڈر فل۔'' مجھے وہ تکیہ کلام یاد آگیا جو میں نے وسیم فیروز کے لیے سوچا تھا۔ ''ونڈر فل بھابی۔ دیکھ لیں قدرت بھی کیسے کیسے کھیل دکھایا کرتی ہے۔''
''اچھا یہ بتاؤ۔ انجم کیوں نہیں آئے؟'' زرین نے پوچھا۔
''وہ تو میرے ساتھ ہی آرہا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے کہا ونڈر فل۔ میں آج خود جا کر اپنی ہونے والی بھابی سے ملوں گا۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ ونڈر فل کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''یہ میرا تکیہ کلام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بھابی اگر آپ ہم دونوں کو پہچاننا چاہتی ہوں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ونڈر فل پر دھیان رکھیں۔ جو ونڈر فل کہہ رہا ہے وہ وسیم فیروز ہے اور جو نہیں کہہ رہا وہ انجم فیروز ہے۔''
''خدا کی پناہ بس اتنا ہی فرق ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔
''جی ہاں ونڈر فل بس اتنا ہی فرق ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہر حال مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ میرے بھائی کے لیے بالکل مناسب ہیں۔''
''وسیم ایک بات بتاؤ۔ کیا تم نے اپنی شادی کے لیے

بمبئی کے انگریزی روزنامہ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے میری جائداد کی ضبطی کی خبر پڑھ کر مجھے فوراً بلایا اور یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی جائداد کی ضبطی کی بھی خبر اسی اخبار میں جلی حرفوں میں نمایاں طور پر شائع کی گئی تھی۔ علیک سلیک کے بعد وہ مجھ سے بغیر کچھ کہے سنے زور سے قہقہہ مار کر ہنسے، میں نے محسوس کیا کہ اس قہقہے میں ایثار، صبر، قناعت اور راضی بہ رضا ہونے کے جذبات مذکور تھے۔ میں اپنی شرط کے ساتھ آٹھ مہینے سے ملک کی اعزازی خدمت کر رہا تھا۔ اب نواب زادہ صاحب کو مجھے چھیڑنے کا موقع ہاتھ آیا، انہوں نے سوالیہ انداز میں فرمایا ''کہیے اب بھی تنخواہ لیں گے یا نہیں؟'' میں نفی میں کیسے جواب دیتا خود ہی فرمایا ''جوائنٹ سیکریٹری کی ماہانہ تنخواہ ساڑھے تین ہزار روپے ماہ بہ ماہ وصول کیجیے۔'' مگر میرے اصرار پر کہ مجھے اور میرے بیوی بچی کو پیٹ بھر روٹی کھانے اور صاف ستھرا کپڑا پہننے کے لیے ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار کافی ہوں گے۔ میری اتنی ہی تنخواہ مقرر کی۔

اقتباس: بے تیغ سپاہی از نواب صدیق علی خان

کچھ سوچا۔'' زرین نے پوچھا۔
''نہیں ابھی نہیں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ تلاش میں ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اگر کوئی آپ جیسی مل جائے تو فوراً شادی کرلوں۔''
''چلو تمہارے لیے میں تلاش کرتی ہوں۔'' زرین نے کہا۔ ''ویسے میری ایک سہیلی ہے شاہینہ۔ یہ سمجھو کہ بالکل میرے ہی مزاج کی ہے۔''
''وہ مارا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میں جو چاہ رہا تھا وہ خود بہ خود سامنے آنے لگا تھا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے بھابی۔'' میں ذرا بے نیازی سے بولا۔ ''آپ ہی دیکھ لیجیے گا مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔''
کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد میں اس سے اجازت لے کر آگیا۔
میرا آدھا کام ہو گیا تھا۔ میں اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں انجم فیروز نہیں بلکہ وسیم فیروز ہوں۔
ایسی الٹ پھیر شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ جیسی الٹ

پھیر میں کرنے جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے زرین کو فون کیا۔ اب میں انجم فیروز بن کر فون کر رہا تھا۔ وہ بہت پُر جوش اور حیران ہو رہی تھی۔ ''انجم تمہارا بھائی تو بالکل تم جیسا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کمال ہے تم دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں ہے۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ کوئی فرق نہیں ہے۔ سوائے ونڈر فل کے۔'' میں نے کہا۔

''اگر تمہارا بھائی وسیم ونڈر فل نہ بولا کرے تو پہچاننا ہی ناممکن ہو جائے۔''

''اس لیے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ خدا کے بندے میرے سامنے بھی ونڈر فل بولتا رہ۔ تاکہ تجھے پہچان سکوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''اور سنو۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ شاہینہ کو اس سے ملوا دوں۔''

''وہ کیوں؟''

''اس کو بھی تو کسی مناسب لڑکی کی تلاش ہے نا اور شاہینہ سے بہتر اور کون ہوگا۔''

''نہیں زرین ایسا مت کرنا۔''

''وہ کیوں؟''

''زرین، تمہاری بات اور ہے۔ تم ایک بڑے دل کی لڑکی ہو اور تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں اور دوسری طرف ہم دونوں بھائی غریب ہیں۔ ہمارے پاس وہ سب کچھ نہیں ہے جو تمہارے پاس ہے۔ کیا ضروری ہے کہ جس طرح تمہارے والدین اعلیٰ ظرف کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اس طرح شاہینہ کے گھر والے بھی ہوں۔ خواہ مخواہ وہ اس بے چارے کی بے عزتی کر بیٹھیں گے۔''

''پاگل ہو تم۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''شاہینہ کے گھر والے بھی بالکل ہمارے گھر والوں کی طرح ہیں انہیں میں راضی کر لوں گی۔''

''ایسے نہیں پہلے ان دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات تو ہو لینے دو۔''

''جب کہو میں کل ہی بندوبست کر دیتی ہوں بلکہ ایسا کرو میں کل شاہینہ کو اپنے ہاں بلا لیتی ہوں اور تم بھی اپنے بھائی کو لے کر آ جانا۔''

''میرا آنا کیا ضروری ہے؟'' میں نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''ضروری ہے۔ ہم دونوں آؤٹنگ پر نکل جائیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس دوران میں وہ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہیں گے۔ ایک دوسرے کو سمجھ لیں گے۔ اب بتاؤ آ رہے ہو نا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ ہم آ جائیں گے۔''

میں نے اس سے وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اپنا جڑواں بھائی وسیم فیروز کہاں سے پیدا کرتا۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں وسیم فیروز بن کر پہنچ جاؤں گا۔

دوسری شام میں وسیم فیروز بن کر زرین کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں زرین کے ساتھ شاہینہ بھی موجود تھی۔

''ونڈر فل۔'' میں نے شاہینہ کو دیکھ کر کہا۔ ''بھابی نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔''

''انجم کہاں ہیں؟'' زرین نے پوچھا۔

''وہ راستے میں ہے۔ آ رہا ہوگا۔'' میں نے بتایا۔ ''اسے کسی کام سے ایک جگہ جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا آئے گا۔''

''میں نے بھی آپ کے بھائی کو دیکھا ہے۔'' شاہینہ نے کہا۔ ''اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس حیرت انگیز مماثلت کو کیا نام دیا جائے۔''

''ونڈر فل۔ کیا ضرورت ہے نام دینے کی۔ بس یوں ہی کام چلاتی رہیں۔''

''واقعی میں تو دیکھ دیکھ کر پاگل ہو رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں بہت سے جڑواں لوگ دیکھے ہیں لیکن اس طرح کی مشابہت آج تک نہیں دیکھی۔ لگتا ہے ایک ہی سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ سانچہ تو ایک ہی ہے۔''

اس دوران میں زرین کسی کام کا بہانہ کر کے اندر کمرے میں چلی گئی جب کہ میں اور شاہینہ اکیلے رہ گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ اپنے بارے میں بتاتا رہا۔ اپنے اور اپنے بھائی انجم فیروز کے بارے میں۔ میں نے شاہینہ کے سامنے بھی اپنی شوخیٔ گفتار کا عظیم الشان مظاہرہ کیا تھا۔ وہ مجھ سے بہت متاثر اور بہت خوش ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد زرین ملازم کے ساتھ آ گئی۔ ملازم ناشتے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں زرین نے پھر پوچھا۔ ''وسیم تمہارے بھائی کہاں رہ گئے؟''

اس دوران اتفاق سے میرے موبائل کی گھنٹی بج

اٹھی۔ یہ دفتر کے ایک کولیگ کا فون تھا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ میں نے بغیر اسٹاپ کے بولنا شروع کر دیا۔

"کمال کرتے ہو تم۔ کہاں رہ گئے۔ یہاں بھابی اور شاہینہ دونوں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ ونڈر فل۔ کیا کہا سیڑھیوں سے گر گیا۔ اچھا اچھا تم اسے لے کر چلو میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

میں موبائل آف کر کے کھڑا ہو گیا۔ "معاف کرنا لیڈیز، مجھے فوراً اسپتال پہنچنا ہے۔ انجم بھی وہیں گیا ہوا ہے۔ ہمارا ایک کزن سیڑھیوں سے گر کر بری طرح زخمی ہو گیا ہے۔"

"ہم ساتھ چلیں۔" زرین نے پوچھا۔

"نہیں نہیں آپ لوگ کہاں جائیں گی۔" میں جلدی سے بولا۔ "ہم نمٹا لیں گے اس معاملے کو۔" پھر میں نے شاہینہ کی طرف دیکھا۔ "تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہم پھر ملیں۔ ونڈر فل۔"

"ضرور۔" وہ ہنس پڑی۔ "ہم ضرور ملیں گے ونڈر فل۔"

اس شام تو بچت ہو گئی تھی لیکن کیا یہ ڈراما زیادہ دنوں تک چل سکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ دونوں ماڈرن گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکیاں تھیں۔ کسی بھی وقت میری حقیقت ان پر کھل سکتی تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب ہم دونوں میں سے صرف ایک ہی سامنے ہوتا۔ دوسرے کو میں کس کس بہانے چھپائے رکھ سکتا تھا۔

اس لیے بہتر یہی تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو مار دیا جائے لیکن کس کو انجم فیروز کو یا وسیم فیروز کو۔ زرین اور شاہینہ دونوں ہی بہت اچھی تھیں۔

اگر انجم فیروز زندہ رہتا تو شاہینہ ہاتھ سے چلی جاتی اور اگر وسیم فیروز زندہ رہتا تو زرین سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔

بہرحال بہت سوچ کر میں نے شاہینہ سے جدا ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ویسے بھی شاہینہ سے ابھی اتنی قربت نہیں ہو سکی تھی۔ جتنی قربت زرین سے تھی۔

میں نے پہلے تو وسیم فیروز کو کسی کام سے اسلام آباد روانہ کروا دیا اور چار پانچ دنوں کے بعد اس کا ایکسیڈنٹ کروا دیا۔ اس کی موت واقع کروا دی تھی۔

بے چاری دونوں ہی یہ سن کر بہت پریشان اور اداس ہو گئی تھیں۔

کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد میں زرین کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت میری اداکاری عروج پر تھی۔

"دفنا دیا بے چارے کو۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "بہت برا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ میری تو دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔"

"ظاہر ہے وہ تمہارا جڑواں بھائی تھا۔" زرین نے کہا۔

"بھائی نہیں بلکہ دوست بھی تھا۔" میں دھیرے سے بولا۔ "اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر مجھے تمہارا سہارا نہیں ملا ہوتا یا تمہاری محبت حاصل نہیں ہوتی تو میں تو مر چکا ہوتا۔"

"مجھے بہت افسوس ہے انجم لیکن زندگی تو اسی قسم کے حادثوں کا نام ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ دو حادثے ہو جائیں گے۔"

"میں نہیں سمجھا۔ دوسرا حادثہ کون سا ہو گیا۔"

"انجم تم نے جس محبت کو اپنا سہارا سمجھا ہوا ہے وہ محبت اب تم سے جدا ہونے والی ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔"

"ہاں انجم، نہ جانے کیا ہوا کہ ڈیڈی نے میری شادی کہیں اور طے کر دی ہے۔ حالانکہ وہ بہت براڈ مائنڈڈ ہیں۔ انہوں نے تم کو پسند بھی کر لیا تھا۔ اس کے باوجود اچانک ان کا ارادہ بدل گیا۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ "اور تم...... تم نے کیا کہا۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ مجھے مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کاش تمہارا بھائی وسیم فیروز زندہ ہوتا تو اس کی شادی شاہینہ سے ہو جاتی۔"

"تو مجھے اس سے کیا ہوتا۔" میں نے جل کر پوچھا۔

"کم از کم اس سے مل کر تسلی تو ہو جاتی کیوں کہ مرحوم تو بالکل تمہاری طرح تھا۔ اس کو دیکھ کر سکون مل جایا کرتا لیکن اب تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"خیر، تو میری اس کہانی کا انجام تو سمجھ میں آ ہی گیا ہو گا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ زرین کی شادی کسی اور سے ہو گئی اور وسیم فیروز کو خود میں نے مار دیا تھا۔

نہ زرین ملی، نہ شاہینہ اور میں وہی انجم فیروز ہوں۔ پرانا والا۔

کیا کروں

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
آپ کے پاس ہر روز طرح طرح کی آپ بیتیاں آتی ہوں گی۔ میں بھی اپنی آپ بیتی بھیج رہا ہوں مگر یہ اور قسم کی ہے۔ واقعی میں سمجھ نہیں پارہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ خودکشی کرلینا چاہیے؟
کامران بٹ
(کراچی)

دو سال بعد سب کچھ ویسا ہی تھا۔
لیکن نہیں سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ بہت کچھ بدل چکا تھا۔ سوائے ایک خواہش کے اور وہ تھی موت کی خواہش اور دو سال کے بعد آج تو یہ خواہش اور مزید ہوگئی تھی۔

میں اپنی یہ داستان اسپتال کے بستر پر بیٹھا ہوا اس لیے لکھ رہا ہوں کہ شاید کسی کے کام آجائے۔ اس کہانی کو پڑھ کر شاید کسی کو عقل آجائے۔
اس کہانی کی ابتدا اب سے دو برس پہلے ہوتی ہے۔

میں خودکشی کرنے سمندر کی طرف گیا تھا۔ بہت پختہ ارادہ تھا میرا۔ کیوں کہ زندگی نے اب تک سوائے ناکامیوں اور مایوسیوں کے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔

جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ جس لڑکی کو پسند کیا اس کی شادی کہیں اور ہو گئی۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ ایسی بے کار زندگی سے جان ہی چھڑا لوں۔

جان چھڑانے کا طریقہ تھا خودکشی لیکن کس طرح مجھے غیر شاعرانہ اور اَن رومانٹک قسم کی موت پسند نہیں تھی۔ یعنی گولی سے مر گئے۔ یا زہر کھا لیا۔ یا ریل کی پٹڑی پر جا کر لیٹ گئے۔ نہیں مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ صرف ایک طرح کی موت رہ جاتی تھی اور وہ تھی سمندر میں ڈوب کر مرنے کی موت۔

عظیم الشان سمندر۔ ایک حیرت انگیز کائنات۔ طرح طرح کے بھید۔ کچھ دیر کی کشمکش۔ اس کے بعد ایک ٹھنڈی سی موت۔

لہٰذا میں خودکشی کرنے سمندر کی طرف آیا تھا۔ میں نے پانی میں اترنا شروع ہی کیا تھا کہ کسی نے مجھے آواز دی۔

"میاں ذرا بات سننا ایک منٹ۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک بڑے میاں تھے۔ کرتہ شلوار میں ملبوس۔ ہاتھ میں چھڑی لیے ہوئے۔ وہ اشارے سے مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ "میاں ذرا ایک منٹ کے لیے بات سن جاؤ۔"

میں نے سوچا کہ ویسے بھی مرنا ہی تو ہے۔ دو چار منٹ لیٹ سہی۔ اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ "جی قبلہ فرمائیں۔"

"میاں پانی میں کیا کرنے جا رہے تھے؟" بڑے میاں نے پوچھا۔

"یوں ہی ذرا خود کو بھگونے جا رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں میاں بھگونے نہیں جا رہے تھے، بلکہ بات کچھ اور لگتی ہے۔" بڑے میاں نے کہا۔

"کیا بات لگتی ہے؟"

"میاں لگتا ہے خودکشی کرنے جا رہے تھے۔ یہ تمہارے چہرے پر لکھا ہے۔ ایسے پھٹکار زدہ اور منحوس چہرے والے لوگ صرف خودکشی ہی کر سکتے ہیں۔"

دل چاہا کہ اس تبصرے پر بڑے میاں کی گردن دبا دوں۔ اس کے بعد سمندر میں کود جاؤں۔ مرنا تو ویسے ہی تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم میری بات کا برا مان گئے۔" بڑے میاں نے کہا۔ "دیکھو یہ جو زندگی ہوتی ہے نا، یہ خدا کی امانت ہوتی ہے۔ خدا ہر گناہ معاف کر دیتا ہے لیکن خیانت کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ تم اس کی دی ہوئی زندگی میں خیانت کر رہے ہو۔ اس لیے تمہارا یہ جرم وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

اب بڑے میاں کی باتوں نے مجھے پگھلانا شروع کر دیا۔ میرے آنسو نکلنے لگے تھے۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

ان کے خلاف میرا جو غصہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ "قبلہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر قسم کی جدوجہد کر کے تھک چکا ہوں۔"

"یہی تو پرابلم ہے کہ آج کل کے نوجوان بہت جلد مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیا دکھ ہے تمہارے ساتھ۔ بتاؤ مجھے، شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔"

"جناب! میں ایک ناکام انسان ہوں۔" میں نے بتانا شروع کیا۔ "اکیلا ہوں۔ میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔ کسی قسم کا روزگار بھی نہیں ہے میرے پاس۔"

"بس اتنی سی بات کے لیے اپنی جان دینے چلے ہو؟"

"تو کیا کروں۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" بڑے میاں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تمہارے دکھوں کا مداوا ہو سکتا ہے بشرطیکہ تم حوصلے اور صبر سے کام لو۔"

"بہت مشکل ہے جناب میرا کچھ نہیں ہونے والا۔"

"ارے آؤ بھی۔ تم تو بہت بودے نوجوان ثابت ہو رہے ہو۔ آؤ چلو۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بڑے میاں کے پاس گاڑی بھی ہو گی اور گاڑی بھی اچھی حالت میں تقریباً نئی تھی۔ بڑے میاں خود ہی ڈرائیونگ کرنے لگے تھے۔ میں بھی تن بہ تقدیر ہو کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کو مجھ پر ترس آگیا ہو۔ اس نے میری بہتری کے لیے بڑے میاں کو میرے پاس بھیج دیا ہو۔

"ہاں میاں! اپنا نام تو بتاؤ۔" بڑے میاں نے پوچھا۔

"جناب میرا نام کامران ہے۔" میں نے بتایا۔

''واہ اتنا اچھا نام ہے کامران اور چلے ہو خودکشی کرنے۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''ویسے میرا نام سکندر شاہ ہے۔''

''جی جناب، اچھا نام ہے۔''

''میں عام طور پر ساحل کی طرف شام کو آتا ہوں لیکن آج خدا جانے کیوں وقت سے بہت پہلے آگیا۔ شاید خدا نے تمہارے لیے میری ڈیوٹی لگادی تھی۔''

''یہی ہوسکتا ہے جناب۔''

''میاں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ یہ لو میرا گھر آگیا۔''

سکندر شاہ کا گھر بھی بہت خوب صورت تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑے میاں پیسے والے انسان ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

سب کچھ بہت شاندار، خوب صورت اور قیمتی تھا۔ ڈرائنگ روم کی سجاوٹ میں بے پناہ سلیقہ نظر آرہا تھا۔

''یہ ساری ڈیکوریشن میری بیٹی نے کی ہے۔'' سکندر شاہ نے فخریہ طور پر بتایا۔

''جی جناب بہت ہی آرٹسٹک قسم کی ڈیکوریشن ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''اس کو بس اسی قسم کا شوق ہے۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''چلو پہلے بیٹھ جاؤ کچھ کھا پی لو اس کے بعد تم سے باتیں ہوں گی۔''

بڑے میاں اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ملازم کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ملازم کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ہوئی ایک ٹرالی دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔

''لو میاں شروع ہو جاؤ۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔''

کھانے پینے کے دوران خاموشی رہی۔ ویسے ہی میں سوچ رہا تھا کہ اس دور میں بھی ایسے مہربان اور نیک لوگ پائے جاتے ہیں جو بے غرض ہو کر کسی کے دکھ کا مداوا کرنے کی کوشش کریں۔

جب میں نے چائے کی پیالی ختم کرلی تو بڑے میاں نے کہا۔ ''ہاں میاں اب ذرا تفصیل سے اپنے حالات بتاؤ۔ کس خاندان سے تعلق ہے، کیا بیک گراؤنڈ ہے وغیرہ وغیرہ۔''

''ارے جناب مختصر یہ ہے کہ میں ایک ناکام انسان ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پھر وہ بات۔'' بڑے میاں نے بڑی اپنائیت کے ساتھ ڈانٹ دیا۔ ''بتاؤ کیا صورت حال ہے۔''

اتنے ہمدرد اور مہربان آدمی کے سامنے یہی مناسب تھا کہ میں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں۔ لہٰذا میں نے سب کچھ بتا دیا۔ اپنا گھریلو پس منظر۔ اپنی جدوجہد، اپنی ناکامیاں، میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔

''واقعی۔ دکھ بھری داستان ہے تمہاری۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''لیکن اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ٹھیک ہوگا۔''

''ایک ساتھ نہیں۔ آہستہ آہستہ۔'' بڑے میاں مسکرا کر بولے۔ ''پہلے مرحلے میں تو تمہاری جاب کا بندوبست ہوگا تم آج آرام کرو۔ کل سے میرے دفتر میں کام شروع کر دینا۔''

''آپ کے دفتر میں جناب؟'' میں اب واقعی اس سے مرعوب ہونے لگا تھا۔

''ہاں ایک چھوٹا سا دفتر ہے میرا۔ تم کل وہاں اپنی ذمے داریاں سنبھالو گے۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''اب تم جا کر آرام کرو تمہارے لیے کمرا ٹھیک کر دیا گیا ہے۔''

ان کی مہربانیوں سے میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔

انہوں نے ملازم کے ساتھ مجھے ایک کمرے میں بھیج دیا۔ یہ بھی بہت خوب صورت اور نفیس فرنیچر سے سجا ہوا کمرا تھا۔ اے سی سے لے کر ٹی وی تک سب کچھ اس کمرے میں موجود تھا۔

ایسی آرام دہ رات تو میں نے کبھی نہیں گزاری ہوگی۔ بڑے میاں تو میرے لیے فرشتہ بن کر کہیں سے آگئے تھے۔ میں بہت دیر تک سوچتا ہی رہا کہ خدا کس طرح راستہ نکال دیتا ہے۔

یہ بالکل خلیفہ ہارون الرشید اور نورالحسن والی کہانی تھی۔ جب سو کر اٹھے تو دنیا ہی بدلی ہوئی دکھائی دی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے لیکن میرے ساتھ ہو رہا تھا۔

دوسری صبح ملازم ناشتے کی ٹرالی کمرے میں لے آیا تھا۔

''صاحب جی جلدی سے ناشتا کرلیں۔ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

سب کچھ خوابوں کے جیسا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور ملازم کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ بڑے میاں میرا انتظار ہی کر رہے تھے۔ ''میاں اب تمہیں میرے ساتھ دفتر چلنا ہے۔''

میں تو سراپا شکر گزار بنا ہوا تھا۔ فوراً ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس بار ایک ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔

''تمہیں ایک ہفتے تک کام سمجھایا جائے گا۔'' بڑے میاں نے بتایا۔ ''اس کے بعد تم باقاعدہ اپنا کام شروع کردو گے۔''

''جی جناب۔'' میں نے انکساری سے گردن ہلا دی۔

دس منٹ کے سفر کے بعد سکندر شاہ صاحب کا دفتر بھی آ گیا۔ یہ کلیئرنگ فارورڈنگ کا ایک بڑا دفتر تھا۔ بڑے میاں نے اپنے منیجر کو میرے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔

اس طرح اس دفتر میں میری ٹریننگ کا آغاز ہو گیا۔

بہت دیر بعد بڑے میاں نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ ''میاں تمہارا اپوائنٹمنٹ لیٹر تیار ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''فی الحال تمہاری سیلری چالیس ہزار مقرر کی گئی ہے، ٹھیک ہے؟''

''ارے صاحب!'' میں حیرت اور مسرت کی وجہ سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا وہ میری توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ ''بالکل...... بالکل مناسب ہے جناب۔''

''جاؤ اپنا کام شروع کرو۔ گڈ لک، اور ہاں جب تک تمہارے لیے کسی فلیٹ کا بندوبست نہیں ہو جاتا ہمارے یہاں ہی رہو گے۔''

''صاحب آپ تو مجھے جیسے خرید چکے ہوں۔''

''اونہوں، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔''

اس کے بعد یہ میرا معمول ہو گیا۔ صبح کو بڑے میاں کے ساتھ دفتر آنا اور شام کو ان کے ساتھ واپس چلے جانا۔ اس دوران انہوں نے مجھے آدھی سیلری ایڈوانس دلوا دی تھی جو میرے لیے بہت بڑی رقم تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے وہاں ان کے اور ملازم کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی اور بیٹی بھی ہیں۔

بیوی تو ایک دو بار دکھائی دی تھیں۔ خاصی معقول قسم کی خاتون تھیں لیکن ان کی بیٹی کبھی میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ ظاہر ہے میں اس کے باپ کے در پر پڑا ہوا ایک ناکارہ سا انسان تھا۔ اس لیے اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

پھر ایک رات ایک عجیب بات ہوئی۔ بڑے میاں خود میرے کمرے میں آ گئے۔ حالانکہ وہ کبھی نہیں آیا کرتے۔ ان کو دیکھ کر میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''بیٹھ جاؤ۔ تم سے کچھ ضروری بات کرنے آیا ہوں۔''

''جی فرمائیں۔'' میں سراپا انکساری کا پیکر بنا ہوا ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''میاں میں نے تمہارے لیے ایک بات سوچی ہے بشرطیکہ تم کو اعتراض نہ ہو۔'' بڑے میاں نے کہا۔

''جناب آپ کے اتنے احسانات ہیں آپ جو حکم دیں میں ماننے کو تیار ہوں۔''

''بیٹا جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میرے لیے اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جناب یہ تو فطری بات ہے۔ ہر باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے۔''

''میں یہ چاہتا تھا کہ شادی کے بعد بھی وہ میری نگاہوں کے سامنے رہے۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی ایسا لڑکا ہو جو شادی کے بعد ہمارے ساتھ رہے۔''

میں ان کی اس بات کا مطلب اگرچہ سمجھنے لگا تھا پھر بھی میں نے اپنی خاموشی برقرار رکھی۔

''بیٹا! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اسے اپنا ہم سفر بنا لو۔'' بڑے میاں نے کہا۔ ''حالانکہ ایک باپ کو اس طرح کوئی بات نہیں کہنی چاہیے لیکن تمہارے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ تم اکیلے ہو۔ تمہیں خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہے۔ تم پر کوئی زور نہیں ہے۔ کوئی جبر نہیں ہے۔ تم دو چار دنوں میں اچھی طرح سوچ سکتے ہو۔''

''ارے جناب، کیا سوچنا، کیوں سوچنا میں آپ کو دیکھ چکا ہوں۔ اندازہ لگا چکا ہوں کہ آپ کیسے آدمی ہیں۔ آپ کی صاحب زادی بھی ایسی ہی ہوں گی میں تیار ہوں جناب۔''

''خدا خوش رکھے۔'' وہ مسکرا دیے۔ ''اب تیاری

شروع کردو۔ بلکہ تم کیا کرو گے تمہاری طرف سے ساری تیاری اس گھر سے ہوگی۔"

بڑے میاں تو چلے گئے لیکن اس رات خوشی کی وجہ سے ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ خدا جب دیتا ہے اسی طرح بے حساب دے دیتا ہے۔

سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی کبھی اس طرح بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔ میں تو اپنی جان دینے کے ارادے سے سمندر کی طرف گیا تھا اور وہاں یہ صاحب مل گئے۔

بس اس کے بعد ایسا ہوا جیسے کسی جادوگر نے جادو کی چھڑی گھما کر سارا منظر ہی بدل دیا ہو۔

دفتر سے مجھے پچاس ہزار ایڈوانس کے طور پر بھی مل گئے۔ تاکہ میں شادی کی تیاریاں کرسکوں۔ اگرچہ میں نے اب تک بڑے میاں کی صاحب زادی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

وہ ایک دولت مند گھرانے کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

پندرہ دنوں کے بعد شادی بھی ہوگئی۔ اسی مکان سے برات آئی اور اسی مکان کے ایک کمرے میں نکاح ہوگیا۔ میں نے اس تقریب میں اپنے کچھ دوستوں کو بھی بلایا تھا۔ وہ سب میری قسمت پر رشک کرنے لگے تھے۔

"یار تیرے تو مزے آگئے۔ بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل رہا ہے تجھے۔"

"ہاں یار، خدا کی مہربانی شامل حال ہو تو ناممکن بھی ممکن ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا۔

میں نے دوستوں کو اصل بات نہیں بتائی تھی۔ یعنی انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میں خودکشی کرنے جارہا تھا۔ بتانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ بھیانک خواب تو گزر چکا تھا۔ اب ایک خوب صورت سنہری تعبیر میرے سامنے تھی۔

رات ہوئی۔ دوست رخصت ہوئے اور میں اپنے اس نئے کمرے میں آگیا جسے حجلہ عروسی کے طور پر سجایا گیا تھا اور جس کمرے میں میری بیوی میرا انتظار کررہی تھی۔

اور اس بیوی کو دیکھ کر میرے تو ہوش اڑ گئے۔ وہ ایک بیوی نہیں بلکہ چار بیویوں کا مجموعہ تھی۔ اتنی موٹی لڑکی میں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔

بستر پر بیٹھی ہوئی ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی بھینس کو دلہن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیا گیا ہو۔ میں اپنے سر کو پیٹتا

توانائی بچایئے، اپنے لیے قوم کے لیے۔ جی ہاں جناب یہی وہ مشہور و معروف سات حرفی جملہ ہے جو ہم نے نہ جانے کب سے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہیں مگر بھلا ہو ہماری اس نامراد عقل بے کمال کا کہ ہم اپنی تمام تر ذاتی قسم کی توانائی کا بے دریغانہ خرچہ کرنے کے باوجود بھی اس جملے کا مفہوم آج تک نہ سمجھ پائے۔ اب بات بھی تو کچھ ایسی ہی ہے۔ دیکھیں نا، آپ ہی انصاف کریں کہ آج کے اس عالم نفسانفسی میں اگر کوئی توانائی بچانے کا مشورہ صرف اپنے لیے دے تو کچھ سوچا بھی جائے اب بھلا یہ دم چھلہ قوم کے لیے آخر کیوں؟ ہم بے چارے قوم کی فکر میں گھلنے والے بھلا کون؟ خدانہ کرے کیا ہم بھی کوئی قوم کے نام نہاد سیاسی لیڈر ہیں جو قوم کا غم تو زبانی کلامی خوب پیٹ بھر بھر کر کھائیں اور موقع ملتے ہی صرف اور صرف اپنی توانائیاں بڑھائیں۔

اقتباس: توانائی اور بچت از سیما ناز صدیقی

اور اپنی قسمت کو روتا ہوا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

بڑے میاں نے اگرچہ مجھے اس کا نام بتا دیا تھا ارجمند۔ پہلے... میں نے اس کی آواز سننے کے لیے اس سے دریافت کیا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"یہ لو آپ کو میرا نام ہی نہیں معلوم۔ پھر شادی کیوں کرلی۔ اتنے دنوں سے اس گھر میں پڑے ہوئے ہو تو میرا نام بھی نہیں معلوم ہوا ہے۔ حد ہوگئی۔"

میں تو بری طرح بوکھلا کر رہ گیا۔ کیا زبان تھی اس کی اور آواز تو ایسی تھی جیسے کانوں کے قریب ریل کی کرخت سیٹیاں بج رہی ہوں۔

میرے ہوش غائب ہونے لگے تھے۔ "دیکھو میں نے گفتگو کا آغاز کرنے کے لیے تمہارا نام پوچھ لیا تھا اور تم خوامخواہ ناراض ہونے لگیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا میں خواہ مخواہ ناراض ہوتی ہوں۔ پاگل ہوں، دیوانی ہوں، مجھے کالے کتے نے کاٹا ہے کہ خواہ مخواہ ناراض ہوں گی۔"

"خدا کے لیے اب بس کرو۔ میرے باپ کی توبہ میں اب کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

"کیوں نہیں پوچھیں گے۔ کیا میاں بیوی کے درمیان باتیں نہیں ہوتیں۔ جب آپ ہی نہیں پوچھیں گے تو کون پوچھے گا۔ کوئی محلے والا آکر خیریت معلوم کرے گا۔"

پتا نہیں میں کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ میں نے پھر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی مخاطب کیا۔ "اب کیا ہوا؟ پہلے تو اتنا پٹر پٹر بولے جا رہے تھے اب چپ کیوں سادھ لی ہے۔ کیا میں اچھی نہیں لگی ہوں؟"

"نہیں ارجمند تم بہت اچھی ہو۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ "میں نے آج تک تم جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔"

"کیوں نہیں دیکھی۔ کیا روڈ پر آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں جو لڑکیاں دکھائی نہیں دیتیں۔"

"ارے بابا۔" میں زچ ہو گیا تھا۔ "میں تو تمہاری تعریف میں کہہ رہا تھا۔"

"اچھا اچھا چلیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں منہ دکھائی کیا دے رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تمہارا منہ دیکھنے کی ہمت کس میں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا میں اتنی بدصورت ہوں کہ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔"

"ایسی بات نہیں ہے ارجمند۔" میں نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔ "میں نے تو یوں ہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

"آئندہ سے یوں ہی والی کوئی بات مت کیجیے گا۔" اس نے کہا۔ "آپ کو نہیں معلوم کہ میں کتنی نرم و نازک لڑکی ہوں۔ ذرا سی بات سے میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔"

"ہاں وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ تم کتنی نرم و نازک ہو۔" میں جل کر بولا۔

وہ کم بخت ہی ہی کر کے ہنسنے لگی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ اس کی ہنسی اتنی زبردست تھی کہ پورا بستر زور زور سے ہلنے لگا تھا۔

خدا غارت کرے بڑے میاں کو۔ انہوں نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ اتنی ساری مہربانیاں کر کے ایک بلا میرے گلے میں ڈال دی تھی۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں اس کمرے سے نکل بھاگا۔

باہر نکلا تو بڑے میاں ناشتے کی میز پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ "آؤ میاں تمہیں مبارک باد دوں۔"

"کس چیز کی مبارک باد۔"

"ارجمند جیسی بیوی پانے والا خوش قسمت ہوتا ہے۔" بڑے میاں نے کہا۔ "ورنہ تم اس قابل کہاں تھے۔"

"جی ہاں اس میں کیا شک ہے۔ یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ آپ نے ارجمند جیسی لڑکی سے میری شادی کروا دی۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میرا مطلب ہے کہ میری قسمت جاگ گئی۔"

"ہاں میاں جوڑے اسی طرح آسمانوں پر لکھے ہوتے ہیں۔" بڑے میاں نے کہا۔ "میری ارجمند کے لیے کیسے کیسے رشتے آئے۔ لیکن اسے تو تمہارے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔"

دل تو چاہ رہا تھا کہ بڑے میاں سے کہوں کہ کیا قسمت کی خرابی میرے ہی نصیب میں لکھی تھی اور جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا اسے کس حساب سے خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے۔

ایسی مردانہ وار قسم کی لڑکی تو میں نے اپنے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔

دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیاں بھی وا ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ بلا کی خوش خوراک تھی۔ ہم نے ویسے تو اس گھر میں رہنا شروع کر دیا تھا اور کھانا بھی ہم بڑے میاں اور ان کی بیگم کے ساتھ ہی کھایا کرتے تھے لیکن ارجمند کے لیے باہر سے کھانے پینے کی چیزیں لانا میری ذمے داری تھی۔

وہ بلا کی چٹوری تھی۔ آئس کریم، کیک، پیٹیس، چپس، پھل اور نہ جانے کیا کیا ہر وقت کھائے چلی جاتی۔

مجھے تنخواہ کے جو پچاس ہزار ملتے تھے اس میں سے بیس ہزار روپے صرف اس کے چٹورے پن پر خرچ ہو جاتے۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ "ارجمند تم یہ باہر کی چیزیں اس طرح مت کھایا کرو۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

بس میرا اتنا کہنا تھا کہ جیسے قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ اس نے چیخ چیخ کر پورا گھرا سر پر اٹھا لیا۔ "ارے جب اتنی حیثیت نہیں تھی کھلانے کی تو پھر مجھ جیسی لڑکی سے شادی کیوں کی تھی۔ میں کوئی بیمار تو نہیں ہوں کہ دن بھر بھوکی رہوں۔"

اس نے اتنا شور مچایا کہ میں کمرے سے باہر بھاگ

آیا۔ جہاں بڑے میاں اپنی بیگم کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا بے بی کو؟'' بڑے میاں نے خوف ناک انداز میں پوچھا۔ ''کیوں پریشان کیا ہے اس کو۔''

''نہیں جناب، میں نے کوئی پریشان نہیں کیا۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔ وہ اتنے ٹھنڈے مزاج کی لڑکی ہے۔ آج تک اس نے اونچی آواز میں بات نہیں کی کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے اس کے ساتھ۔ یاد رکھو تم نے اگر ہماری بے بی کو ستایا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔''

اور اس وقت میں نے وہ فیصلہ کرلیا جو اب سے دو سال پہلے کر چکا تھا۔ یعنی خودکشی کا فیصلہ۔ اپنی جان دینے کا فیصلہ۔

میں تو دو سال پہلے ہی اس قسم کے جھنجٹوں سے آزاد ہو چکا ہوتا لیکن برا ہو اس بڑے میاں کا۔ جو مجھے زندگی کی طرف کھینچ لائے تھے اور موت کا فرشتہ میرے پیچھے لگا دیا تھا۔

میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ بڑے میاں شور کرتے رہ گئے لیکن میں ان کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ میرا رخ سمندر کی طرف تھا۔ ان کا مکان سمندر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس لیے میں دوڑتا ہوا چلا گیا۔

اب سمندر میرے سامنے تھا۔ وہی منزل آگئی تھی۔ جو دو سال پہلے آنے والی تھی۔ میں سمندر میں اتر گیا۔ آگے بڑھتا گیا اور اس وقت کسی کی آواز سنائی دی۔ ''میاں ذرا بات سنو، ایک منٹ۔''

میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک دوسرے بڑے میاں تھے۔ جو مجھے ڈوبتے دیکھ کر ہانپتے کانپتے میرے پاس پہلے آئے تھے۔

''میاں کیا ارادے ہیں تمہارے۔ کیا خودکشی کا ارادہ ہے۔''

''نہیں جناب بس یوں ہی ذرا نہانے کے لیے اترا تھا۔''

''نہیں میاں تم نہانے کے لیے نہیں اترے۔ بات کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔''

اور اس وقت میں نے بڑے میاں کو اپنے بازوؤں میں لے کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ یہ شخص پھر میری راہ کھوٹی کرنے ٹپک پڑا تھا۔

بڑے میاں چیختے چلاتے رہ گئے لیکن میں نے ان کی جان نہیں چھوڑی ان سے چمٹا ہی رہا۔ پانی کی ایک تیز لہر آئی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا کہ میرے ساتھ کیا گزری تھی۔

جب ہوش آیا تو میں اسپتال کے ایک بستر پر تھا۔ دو ڈاکٹرز، دو نرسیں اور کچھ لوگ میرے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ ایک پولیس والا بھی تھا مجھے یہ بتایا گیا کہ بڑے میاں تو ڈوب گئے تھے لیکن مجھے بچا لیا تھا۔

دیکھنے والوں نے یہ بیان دیا تھا کہ شاید وہ بڑے میاں ڈوب رہے تھے اور میں ان کو بچانے کے لیے سمندر میں کود پڑا تھا۔

میں بھی اس بیان پر قائم رہا۔

وہاں لوگوں نے اور خود پولیس والے نے بھی میری ہمت کی داد دی۔ ان سبھوں کا یہ خیال تھا کہ اس نوجوان نے تو بڑے میاں کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔ اب خدا کی یہی مرضی تھی۔ ان کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ بچ نہیں سکے۔

کچھ دیر بعد میرا بیان لے کر وہ لوگ چلے گئے۔ پھر ایک اور بڑے میاں میرے بستر کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ ''میاں میں روم نمبر پندرہ کا مریض ہوں۔ تمہارے کمرے کے برابر والے کمرا ہے۔''

''جی جناب فرمائیں۔''

''میاں نہ جانے کیوں مجھے اس کہانی پر یقین نہیں آرہا ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے خودکشی کا ارادہ تمہارا ہو اور بے چارے بڑے میاں نے تمہیں بچانے کی کوشش کی ہو۔''

''تو پھر۔''

''پھر یہ کہ تم یہ میرا کارڈ رکھ لو۔'' بڑے میاں نے ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔ ''یاد رکھو زندگی خدا کی امانت ہے۔ اس کا اس طرح خاتمہ نہیں کرتے۔ تم مجھ سے ضرور مل لینا۔''

اور اس بار میں نے یہ سوچ لیا کہ میں خودکشی تو ضرور کروں گا لیکن سمندر کی طرف نہیں جاؤں گا کوئی اور طریقہ اختیار کروں گا۔

اور اس سے پہلے اپنی یہ داستانِ الم لکھ جاؤں گا۔ تاکہ لوگ میری بدنصیبی پر ماتم کرتے رہیں۔

کوما

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
زیرنظر سرگزشت ایک پیغام ہے، بغور ملاحظہ کریں تو انسپکٹر صاحب کی باتیں جراح کا نشتر ہے۔ امید ہے سرگزشت کے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

امین بھایانی
اٹلانٹا(یو ایس اے)
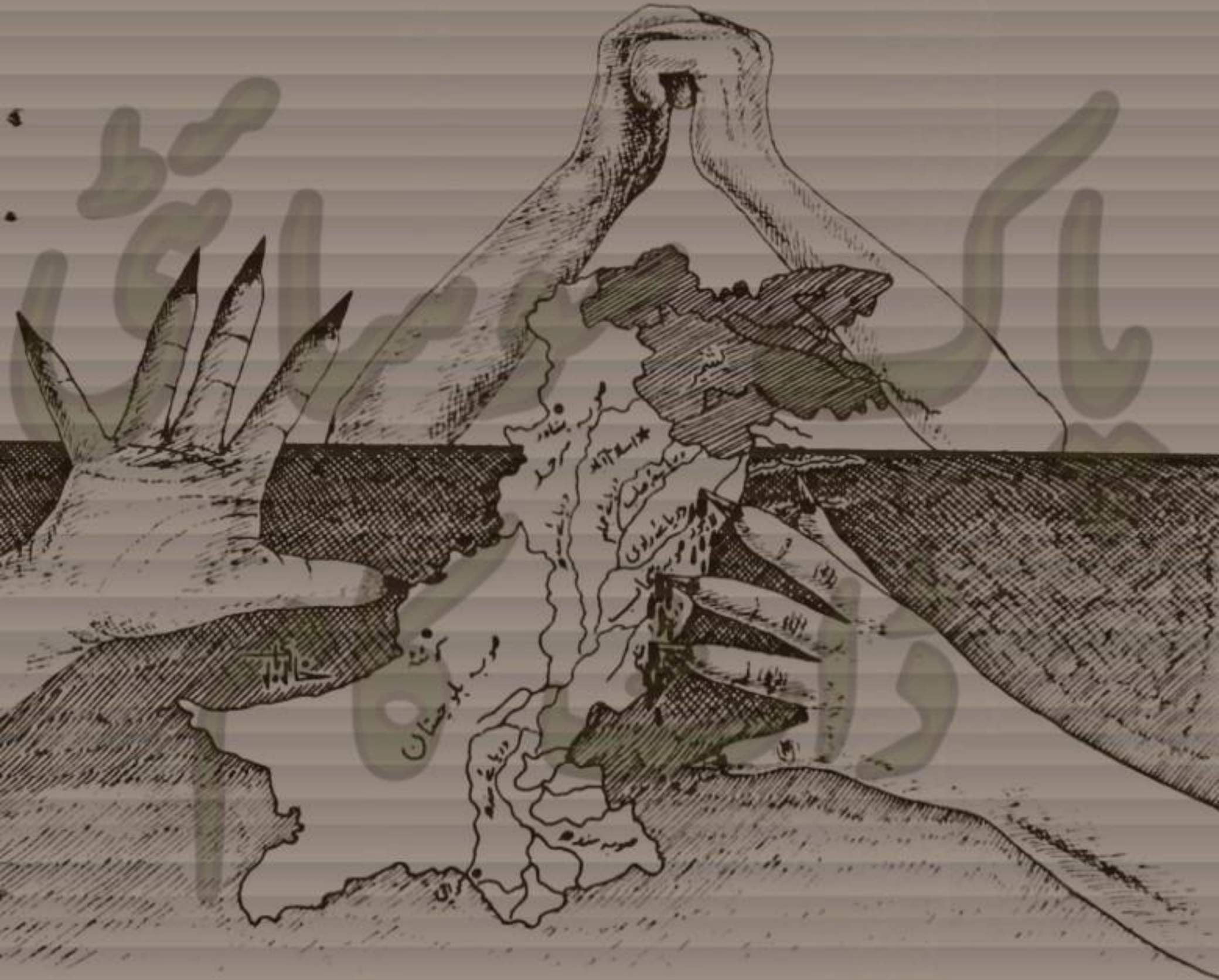
آج کئی سال گزر جانے کے بعد بھی مجھے وہ دن کل ہی کی طرح سے یاد ہے۔ اس روز میں بہت خوش تھا کیونکہ وہ بطور سب انسپکٹر محکمہ پولیس میں میری ملازمت کا آخری دن تھا۔ لیکن اس کے یادگار ہونے کی یہ واحد وجہ نہ تھی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ میں اپنی بتیس سالہ ملازمت کے بعد بطور سب انسپکٹر ریٹائر ہونے پر بے پناہ خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا؟ محکمہ پولیس کی ملازمت کا وہ عرصہ میں نے کیسے گزارا تھا وہ میرے اور میرے خدا کے سوا کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے

کہ تلوار کی دھار پر ایک سفر تھا۔ جگر مراد آبادی صاحب نے کہا ہے نا:

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اگر میں یہ کہوں تو ہرگز مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ میرے لیے وہ ملازمت اک آگ کا دریا ہی اور میں نے ڈوب کر ہی تو اسے پار کیا تھا......!

حالانکہ میرے بہت سے ساتھیوں نے مجھ سے کہا بھی کہ ”بھائی کسی سے کچھ کہہ سن کر اپنی مدت ملازمت میں اضافہ کروالو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو چلے ہو ریٹائر ہونے“۔

بلاشبہ بات تو ان کی درست ہی تھی۔ میں کوئی بائیس برس ہی کا تو تھا جب میں نے کرمنالوجی میں ایم اے کرنے کے بعد بطور سب انسپکٹر ملازمت اختیار کی تھی۔ جی ہاں! سب انسپکٹر۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ شخص بتیس برس پہلے بطور سب انسپکٹر بھرتی ہوا اور اب بھی اسی عہدے پر رہتے ہوئے ریٹائر ہو رہا ہے۔ لیکن میں تو اس بات پر بھی شاکر ہوں کہ اب بھی سب انسپکٹر ہی ہوں کہیں تنزلی کا شکار ہو کر ہیڈ کانسٹیبل یا کوئی معمولی سنتری نہیں بنا۔ اب یہ اور بات ہے کہ دو بار مجھے انسپکٹر کے عہدے تک رسائی حاصل بھی ہوئی لیکن میری ”اعلیٰ کارکردگی“ اور متعلقہ تھانوں کے اسٹاف کی ”مداح سرائیوں“ کے سبب افسران بالا نے جلد ہی واپس اپنے عہدہ دیرینہ پر ”بحال“ کردیا۔

الغرض میرے لیے وہ دن کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی بچے کے لیے عید سے قبل کی رات۔ ایک ننھا بچہ جس بے چینی کے ساتھ صبح ہونے کا انتظار کرتا ہے ویسے ہی میں بیتابی کے ساتھ اپنی ملازمت کے اس آخری روز کے پورے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اس روز میں ابھی اپنی معمول کی گشت سے واپس ہی آیا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی ہیڈ کانسٹیبل نے اپنا روایتی سیلوٹ جھاڑا اور بولا ”شاہ جی، نیشنل اسپتال سے ڈاکٹر محی الدین کا آپ کے لیے دو تین بار فون آچکا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جیسے ہی شاہ صاحب آئیں، انہیں فوری طور پر مجھے فون کرنے کا کہہ دیں۔“

”اوہ ڈاکٹر محی الدین......!“

میں سیدھا اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ میز پر رکھے ٹیلی فون انڈسٹری آف پاکستان کی ہری پور ہزارہ فیکٹری میں سن پچاس کی دہائی کے بنے سیاہ ٹیلی فون سیٹ کا بھری بھرکم چونگا اٹھا کر کان سے لگایا اور تیز تیز نمبر ڈائل کرنے لگا۔ سلسلہ فوری مل گیا اور پھر ڈاکٹر محی الدین نے جو بات بتائی وہ میرے لیے تھی تو ناقابلِ یقین لیکن میں اس خبر کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ فون رکھ کر بھاگتا ہوا اپنے کمرے سے نکلا اور ہیڈ کانسٹیبل کو آگاہ کیا کہ میں اپنے کسی نجی کام سے کچھ دیر کے لیے نیشنل اسپتال جا رہا ہوں۔ ہیڈ کانسٹیبل کو حیران و پریشان چھوڑ کر بے خیالی میں اپنی سرکاری جیپ میں سوار ہونے لگا لیکن پھر یاد آیا کہ یہ تو قطعی غیر سرکاری نوعیت کا کام تھا لہٰذا سرکاری جیپ کا استعمال ناجائز ہوگا اور یہی تو ہیڈ کانسٹیبل کی حیرت کی وجہ تھی کہ ناممکن ہے جو میں نے کبھی ڈیوٹی کے دوران اپنا نجی کام کیا ہو۔

تھانے کی عمارت سے باہر آیا۔ خوش قسمتی سے ایک خالی ٹیکسی کھڑی نظر آئی اور اگلے ہی لمحے میں اسپتال کی جانب رواں دواں تھا۔ ٹیکسی کی رفتار کسی وحشی گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑتے کرائے کے میٹر کا ساتھ بھلے ہی نہ دے پا رہی ہو لیکن میٹر کی رفتار کسی طور بھی میری سوچوں سے زیادہ نہیں ہو سکی تھی۔

میں وہ دن بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہ 1977ء کے اوائل کی ایک اداس سی شام تھی۔ کراچی کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ ”قومی اتحاد“ نے انتخابات میں دھاندلی کا نعرہ لگا کر پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف ایک ملک گیر احتجاج کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ ملک جہاں سیاسی ابتری کا شکار تھا، وہیں امن و امان کی صورت حال بھی شدید مخدوش تھی۔ میں اس روز تھا تو اپنی معمول کی گشت پر لیکن ہمیں اطلاع دی گئی تھی کہ مظاہرین کا کوئی بھی متشدد ٹولہ کسی وقت بھی سرکاری و نجی املاک کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بنا سکتا ہے۔

میں اپنی سرکاری جیپ میں چند مسلح سپاہیوں کے ہمراہ بندر روڈ پر نشاط و ناز سینما کے قرب و جوار ہی میں گشت پر تھا کہ اچانک کچھ ہی دور میں نے سیاہ دھویں کے مرغولے دیکھ کر ڈرائیور کو اس جانب پیش قدمی کرنے کے ساتھ ساتھ جیپ میں موجود تمام سپاہیوں کو چوکنا رہنے کے لیے کہا۔ سپاہیوں نے بندوقوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ چند فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے جیپ وہاں پہنچی تو پولیس کو دیکھ کر تمام بلوائی اِدھر اُدھر آس پاس کی گلیوں میں دوڑ گئے۔ میں فوراً جیپ سے اترا تو ایک سرکاری نمبر پلیٹ والی کار الٹی پڑی تھی۔ اس کا زخمی ڈرائیور اپنی نشست میں پھنسا بچاؤ بچاؤ کی صدائیں لگا رہا تھا۔ دو سپاہیوں نے فوراً آگے بڑھ کر الٹی ہوئی گاڑی کو کسی

قدرا اونچا کیا اور دوسرے دو سپاہیوں نے بدقت تمام گاڑی کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے کھینچ کھانچ کر اسے باہر نکالا۔ باہر آتے ہی وہ درد کی شدت سے کراہتے ہوئے بولا "میرے صاحب کو تو نکالو۔"

اب جو ہم نے جھک کر دیکھا تو الٹی ہوئی گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک شدید زخمی شخص بیہوشی کی حالت میں نظر آیا۔ لیکن اب کی بار معاملہ قدرے گھمبیر تھا۔ گاڑی کے الٹنے کے سبب اس کے تمام دروازے جام ہو چکے تھے۔ باوجود بھرپور کوشش کے بھی کوئی دروازہ کھل نہیں رہا تھا۔ اسی اثنا میں گاڑی کے ٹیڑھے میڑھے بونٹ کی درزوں سے برآمد ہونے والا کالا دھواں کچھ اور زیادہ گہرا ہو گیا اور پھر کچھ ہی لمحوں میں انجن نے آگ پکڑ لی اور آگ کی نارنجی لپٹیں مزید تیز سیاہ دھواں کے ساتھ انجن کے نچلے حصے سے برآمد ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ صورت حال دیکھ کر چاروں سپاہی فوری طور پر کار سے دور ہو گئے۔ اب اگر جلد ہی کوئی قدم نہ اٹھایا جاتا تو ممکن تھا کہ کار ایک دھماکے سے پھٹ سکتی تھی۔ میں نے فوراً ہی ایک سپاہی سے اس کی بندوق لی اور اس کا بھاری بھرکم دستہ گاڑی کے پچھلے شیشے پر زور زور سے مارنا شروع کر دیا۔ مجھے ایسا کرتے دیکھ ان سپاہیوں کو بھی شرم آئی اور انہوں نے میری تقلید شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں پورا شیشہ ٹوٹ گیا۔ لیکن گاڑی کے اندر جانے کے لیے ڈگی والی جگہ سے نیچے زمین پر لیٹ کر اندر جانا پڑتا اور وہاں ہر طرف ٹوٹا ہوا شیشہ بکھرا پڑا تھا۔

میں نے سپاہیوں کو چھت کے بل الٹی گاڑی کو ایک طرف سے دھکا لگانے کو کہا۔ گاڑی نصف دائرہ بناتی ہوئی گھوم گئی جس سے ڈگی کے عین نیچے پڑے سارے شیشے کے ٹکڑے قدرے صاف ہو گئے۔ اب ڈگی اور زمین کے درمیان والی جگہ سے میں اور ایک دوسرا سپاہی سینے کے بل زمین پر جھک کر سرکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ اندر کا منظر دہشت زدہ کر دینے والا تھا۔ زخمی شخص خون میں نہایا ہوا بے ہوش پڑا تھا۔ غالباً سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور سر سے خون بہہ بہہ کر سارے چہرے پر اس طرح سے پھیل گیا تھا کہ چہرے کے نقوش خون میں چھپ گئے تھے۔ اس کے جسم سمیت چاروں طرف ٹوٹا ہوا شیشہ بکھرا ہوا تھا۔ بڑی مشکلوں سے اسے گھسیٹ کر گاڑی کے پچھلے شیشے والے راستے سے باہر نکالا لیکن اس کوشش میں وہ شخص جا بجا پڑے شیشوں سے مزید زخمی ہو گیا اور محفوظ ہم بھی نہ رہ سکے۔ ہمارے جسم میں شیشوں کی کرچیاں چبھ گئیں اور کئی جگہوں سے خون جاری ہو گیا۔

دو سپاہیوں کو جائے وقوع پر ہی چھوڑ کر زخمی اور ڈرائیور کو جیپ میں سوار کر کے قریبی اسپتال چل پڑے۔ اتنی دیر میں انجن میں لگی آگ نے ساری گاڑی کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں ساری گاڑی سوکھی لکڑی کی طرح دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔

اسپتال پہنچنے پر دو زخمیوں کے ساتھ دو زخمی پولیس والوں کو دیکھ کر اسپتال کا عملہ فوری طور پر حرکت میں آیا۔ ہم دونوں پولیس والوں اور ڈرائیور کے زخموں کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے مرہم پٹی کر دی گئی۔ ڈرائیور کے ایک پاؤں کی ہڈی میں فریکچر تھا لہٰذا ضروری ایکسرے کے بعد پلاسٹر بھی چڑھا دیا گیا۔

بے ہوش زخمی کو آتے ساتھ ہی آئی سی یو میں لے جایا گیا تھا مگر دو گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اس کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ میں نے ڈیوٹی ڈاکٹر سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آئی سی یو میں ہی ہے۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آنے کے سبب اب بھی وہ بے ہوشی کی حالت میں ہی ہے۔ اگر اسے لانے میں مزید دیر کر دی جاتی تو زائد خون بہہ جانے کے سبب اس کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔

ڈرائیور نے ہوش ٹھکانے آنے پر بتایا کہ بلوائیوں نے سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر کے گاڑیوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ چونکہ گاڑی پر سرکاری نمبر پلیٹ نصب تھی لہٰذا اس اندیشہ کے تحت کہ کہیں انہیں اور گاڑی کو نقصان نہ پہنچے، اس کے صاحب جسیم الدین نے رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے گزر جانے کا حکم دیا۔ لیکن تیز رفتاری اور رکاوٹوں کے سبب گاڑی الٹ گئی۔

ہمارے جانے تک تو جسیم الدین کو ہوش نہ آیا لیکن اگلے روز جب میں اپنے زخموں کی پٹی بدلوانے کے لیے دوبارہ اسپتال گیا تو معلوم ہوا کہ جسیم الدین دراصل بے ہوش نہیں ہوا بلکہ کوما میں چلا گیا ہے۔ کچھ روز تو جسیم الدین کو آئی سی یو میں رکھا گیا۔ جس کے دوران اس کے دماغ کے دو انتہائی پیچیدہ آپریشن بڑے ہی ماہر و نامور نیورو سرجنوں نے کیے جو کہ ان کے بقول بے حد کامیاب بھی رہے تھے۔ پھر جب دھیرے دھیرے اس کی جراحی کے زخم بھی مندمل ہوتے گئے تو اسے آئی سی یو سے اسپتال ہی میں قائم شعبہ طویل مدتی طبی نگہداشت میں منتقل کر کے لائف سپورٹ سسٹم پر ڈال دیا گیا۔

اس دوران میرے اندر ایک تجسس سا پیدا ہو گیا۔ میں جسیم الدین کی خیر و عافیت کی خبر رکھنے لگا۔ یوں تو جسیم الدین خیر سے اعلیٰ سرکاری بیوروکریٹ تو تھا ہی لیکن اس کا سارا خاندان ہی بیوروکریسی سے منسلک تھا۔ لہٰذا اس کے علاج معالجے میں تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی تھی لیکن نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا، سال پہ سال بیتتے چلے گئے لیکن وہ کوما سے باہر نہ آ سکا۔

اب پورے تیس سالوں کے بعد اسے ہوش آیا تھا۔ میں سیدھے ڈاکٹر محی الدین کے کمرے میں پہنچا جہاں پہلے ہی جسیم الدین کے رشتہ داروں کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ ان تیس سالوں کے دوران اس کے رشتہ داروں کی دو نسلیں بشمول خود اس کے اپنے بچے یا تو جوان ہو چکے تھے یا خود والدین کے درجے پر فائز ہو گئے تھے۔ پرانی نسل والے تو مجھ سے جسیم الدین کو اپنی جان پر کھیل کر بچانے والے پولیس افسر کی حیثیت سے بخوبی واقف تھے اور ان کی توسط سے نسل نو بھی مجھ سے آشنا تھی۔

کافی دیر بعد جب جسیم الدین کے رشتہ داروں کا مجمع چھٹا تو ڈاکٹر محی الدین جن کا شمار اسپتال کے سینئر ترین ڈاکٹر کے طور پر ہوتا تھا اور شروع دن سے ہی یہ کیس انہی کے ہاتھوں میں تھا، سیدھے میری طرف آئے اور بولے۔ "مبارک ہو احمد علی شاہ صاحب، آپ کے مریض کو ہوش آ گیا"۔

وہ ہمیشہ جسیم الدین کو "آپ کا مریض" کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے اور بقول ان کے اس کی زندگی خدا کی مہربانی کے بعد میری حسن تدبیر ہی کی مرہون منت تھی۔

"شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ اس سے قبل امریکی ریاست فلوریڈا کی ایک خاتون ایلین ایسپوسیٹو 37 سال اور 111 دن کوما میں رہی تھی۔ جب وہ 6 سال کی تھی تو اسے 1941ء میں اپینڈکس کے آپریشن سے قبل اینستھزیا دے کر بیہوش کیا جا رہا تھا تب تو وہ کوما میں چلی گئی اور مسلسل 37 سال 111 دن کوما میں رہنے کے بعد 1978ء یعنی جسیم الدین کے کوما میں جانے کے ایک سال بعد انتقال کر گئی"۔

اوہ تو کیا جسیم الدین اب بھی خطرے میں ہے؟ میں نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا۔

"ارے نہیں شاہ صاحب، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا تھا کہ اس خاتون کا تو برین ڈیمیج ہو گیا تھا۔ جسیم الدین بھی شدید دماغی چوٹ ہی کا شکار ہوا تھا لیکن ابتداء ہی میں دو اہم جراحیوں کے ذریعہ مکمل طور پر اس چوٹ کا علاج کر دیا گیا تھا۔ ان تیس سالوں کے دوران بارہا ایکسریز اور ایم آر آئی کی رپورٹس ایک مستند میڈیکل بورڈ کے سامنے پیش کی جاتی رہی ہیں اور ہر بار بورڈ نے عمل جراحی کی کامیابی پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔"

"تو آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جسیم الدین اب ایک مکمل نارمل انسان بن چکا ہے؟" میں نے قدرے غیر یقینی کے ساتھ دریافت کیا۔

"نہیں اب ایسا بھی نہیں۔ گزشتہ تیس سالوں سے مسلسل بستر پر پڑے رہنے سے جسیم الدین کے جسم کے تمام تر پٹھے اور جوڑ اکڑ چکے ہیں۔ اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ چل پھر سکے۔ ہمیں اسے ایک بھرپور فزیو تھراپی کے پروگرام سے گزارنا ہوگا۔ میری رائے میں اسے اپنے پیروں میں کھڑے ہونے میں دو تین سال تو باآسانی لگ جائیں گے۔" ڈاکٹر محی الدین نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"کیا میں جسیم الدین سے مل سکتا ہوں؟"

"نہیں ابھی تو نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو اسے دور سے ضرور دیکھ سکتے ہیں۔"

اس روز کمرے کی کھڑکی سے ڈینٹیلیز اور دیگر دہشت زدہ کردینے والی طبی مشینوں کی تاروں سے لپٹے ہوئے جسیم الدین کو دیکھ کر میں واپس تھانے چلا آیا۔

اسی دن میں نے اپنی منصبی ذمہ داریوں کا چارج چھوڑ کر اپنی ریٹائرمنٹ کے کاغذات پر دستخط کردیئے۔ میں اپنے آپ کو پھول کی طرح سے ہلکا محسوس کررہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ جسیم الدین کے ہوش میں آنے کی دوہری خوشی بھی تھی۔

اب میں ایک آزاد منش انسان تھا۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری دونوں ہی بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم ازدواجی زندگیاں گزار رہی تھیں۔ لہٰذا ہم دونوں میاں بیوی کے سر کوئی ذمہ داری نہ تھی لیکن وہ جو منیر نیازی نے کہا ہے نا کہ۔

ایک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اس شعر کا درست مفہوم مجھے اس روز سمجھ میں آیا جب میں نے اپنی پینشن اور دیگر واجبات کی وصولی کے لیے چکر کاٹنا شروع کیے تو بس پھر چکر پہ چکر کاٹتے کاٹتے خود مجھے ہی چکر آگئے۔

اپنی بتیس سالہ ملازمت کے بعد اپنا حق حاصل کرنے کے لیے مجھ سے اسی حرام شے کا تقاضہ کیا گیا جسے میں نے اپنی پوری ملازمت کے عرصے میں کبھی بھولے سے بھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔ لیکن میں بھی ڈٹ گیا۔ ریٹائرمنٹ کے اگلے روز سے میرے پاؤں میں جو چکر پڑا تو کم و بیش کوئی چھ ماہ کے عرصے تک چلتا ہی رہا لیکن کسی مرد مومن نے وہ جو کہا ہے نہ کہ ہمت مرداں مدد خدا کے مصداق میں نے کسی بھی ناجائز مطالبہ کو پورا کیے بغیر بڑی ہی مستقل مزاجی، ہمت، حوصلہ اور پامردی کے ساتھ اپنا حق حاصل کرکے ہی دم لیا۔ لیکن اس کے لیے مجھے ہر روز صبح و شام مختلف دفاتر کی خاک چھاننا پڑی۔ تنگ آکر ایک روز تو میں نے افسر بالا کو اس کے دفتر میں جاکر دھمکی دے دی کہ اگر میری پینشن اور دیگر واجبات کی فوری ادائیگی نہ کی گئی تو میں اخبارات اور میڈیا کے دفاتر کے باہر مظاہرہ کروں گا۔ میرے کڑے تیور دیکھ کر متعلقہ افسر نے محکمہ پولیس سے میرے بارے میں معلومات حاصل کیں اور وہاں سے ملنے والے ریمارکس سے اسے یہ کماحقہ اندازہ ہوگیا کہ یہ اللہ کا بندہ اپنا حق وصول کیے بغیر ٹس سے مس ہونے والا نہیں۔ اگر کہیں جو اس نے اپنی دھمکی کو عملی جامعہ پہنادیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

اس سارے بکھیڑے کے دوران میں جسیم الدین کو بھی دیکھنے نہ جاسکا۔ لیکن پھر اگلے ہی روز میں جب اسپتال گیا تو جسیم الدین اپنے کمرے میں نہ تھا۔ میں پوچھتا ہوا شعبہ فزیو تھراپی پہنچا تو دو فزیو تھراپسٹ ایک ہموار میز پر لٹا کر بہت سارے آلات کی مدد سے اسے ورزش کروا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے تمام پٹھوں اور جوڑوں کی مالش بھی کرتے جارہے تھے۔ میں کچھ دیر کمرے کے باہر کھڑا کھڑکی کے شیشوں سے دیکھتا رہا اور پھر ڈاکٹر محی الدین کے کمرے کی جانب چل دیا۔

"ارے بھئی احمد علی شاہ صاحب، آپ اتنا عرصہ کہاں رہے۔" ڈاکٹر محی الدین مجھے دیکھتے ہی بولے۔

میں نے اختصار سے پینشن والے مسئلے سے آگاہ کرنے کے بعد جسیم الدین کے بارے میں دریافت کیا۔

"یوں تو سب ٹھیک جارہا ہے لیکن جسیم الدین کے پٹھے اور جوڑ تین دہائیوں تک ایک ہی حالت میں پڑے رہنے کے سبب اس قدر اکڑ چکے ہیں کہ ابھی تک کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نظر نہیں آرہی۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں اور مجھے اللہ کی ذات سے امید واثق ہے کہ دھیرے دھیرے جسیم الدین کے اکڑے ہوئے پٹھے اور جوڑ کام کرنا شروع کردیں گے۔"

"کیا میں اس سلسلے میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں؟" میں نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا۔

"بات یہ ہے کہ جسیم الدین کو ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔ اتنے سالوں بعد اب نہ اس کا کوئی دوست رہا اور اس کے گھر والے بھی اپنی زندگیوں میں معروف ہیں۔ ان گزشتہ تیس سالوں کے دوران جسیم الدین تو جیسے تھا ہی نہیں۔ اس دوران صرف وہ ہی کوما میں نہ تھا بلکہ اس کی زندگی کے تمام تر معمولات بھی کوما میں چلے گئے تھے جبکہ اس کے دوست

توبہ کا ایک طریقہ

علامہ یافعیؒ نے الترغیب والترہیب میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک نوجوان نہایت بدکار تھا جب وہ گناہ کا ارتکاب کرتا اسے کاپی میں نوٹ کر لیتا۔ ایک دفعہ ایک عورت جس کے بچے تین دن سے بھوکے تھے۔ اپنے بچوں کی خاطر اس نے اپنے پڑوسی سے ایک عمدہ ریشم کا جوڑا ادھار لیا اور اسے پہن کر نکلی تو اس نوجوان نے اسے اپنے پاس بلایا۔ جب اس کے ساتھ بدکاری کا ارادہ کیا تو وہ عورت رونے لگی اور کہا کہ میں بچوں کی پریشانی کی وجہ سے اس طرح نکلی ہوں، تم نے بلایا تو مجھے خیر کی اُمید ہوئی۔ اس نوجوان نے اسے کچھ درہم دے کر چھوڑ دیا اور خود رونے لگا اور گھر آ کر اپنی والدہ کو پورا واقعہ سنایا۔ اس کی والدہ اس کو معصیت (برائی) سے روکتی تھی۔ آج یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور کہا بیٹا تو نے زندگی میں یہی ایک نیکی کی ہے اس کو بھی اپنی کاپی میں نوٹ کر لینا۔ بیٹے نے کہا کاپی میں اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ والدہ نے کہا کاپی کے حاشیے پر نوٹ کر لے چنانچہ اس نے حاشیے پر نوٹ کر لیا اور سو گیا۔ جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ پوری کاپی سفید ہے۔ کوئی چیز لکھی ہوئی باقی نہیں رہی۔ صرف حاشیہ پر جو آج کا واقعہ نوٹ کیا تھا وہی باقی ہے اور کاپی کے اوپر کے حصے میں یہ آیت لکھی ہوئی تھی۔ (سورۂ ہود: 114) ترجمہ (بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں) اس کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی اور اسی پر قائم رہا۔

مرسلہ: زویا فرہاد، جہلم

احباب اپنی زندگیوں کے معمولات کو لے کر بہت آگے بڑھ گئے۔" ڈاکٹر محی الدین کی آواز میں ایک یاسیت سی تھی۔

"وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بے حد سلجھا ہوا انسان ہے۔ ہر ممکن طور پر اپنی زندگی کے اس مشکل سچ کو اپنانے کی تگ ودو میں مصروف ہے۔ اس بیچ ہوئے ملکی و عالمی واقعات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے وہ جتنا ممکن ہو سکے مطالعے میں مشغول رہتا ہے۔ اور ہاں وہ اپنے محسن یعنی آپ سے ملنے کے لیے بھی بہت بے چین ہے۔"

پھر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس کے پاس لے جا کر یہ کہہ کر ملوایا "ان سے ملیے، یہ ہیں آپ کے محسن، احمد علی شاہ۔"

بڑی دیر تک وہ ایک ہلکی احسان مندانہ سی مسکراہٹ اور متشکرانہ نگاہوں سے مجھے تکتا رہا اور پھر سر ہلا کر دھیرے سے محض اتنا ہی بولا۔ "شکریہ"

اس روز کے بعد میں نے کم و بیش ہر دوسرے روز ہی اس کے پاس جانا شروع کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ہم دونوں میں دوستی ہونے لگی۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔ کوئی دو سال کے عرصے میں وہ اب اس قابل ہو چکا تھا کہ پہلے واکر اور پھر لاٹھی کے سہارے تھوڑا تھوڑا چل لیتا تھا۔ اسپتال سے تو اسے ایک سال پہلے ہی فارغ کر دیا گیا تھا لیکن وہ اب بھی فزیو تھراپی کے لیے بلاناغہ اسپتال اپنی ذاتی گاڑی میں ڈرائیور کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔

میری اب اس کے ساتھ کافی بے تکلفانہ قسم کی دوستی ہو چکی تھی۔ گو کہ وہ ہر ممکن طور پر اپنی زندگی کے تیس سالہ طویل خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن میں نے اکثر یہ بھی محسوس کیا کہ ایک بے نام سی اداسی اس کے سارے وجود کو گھیرے ہوئے رہتی۔ وہ مجھ سے ملک کی موجودہ صورتِ حال بشمول کرپشن، لا اینڈ آرڈر، سیاست اور سیاستدانوں کے حوالے سے مسلسل سوالات کرتا رہتا۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ جیسے میرے جوابات سے اس کی تشفی نہ ہوتی تھی۔

ایک روز ہم یونہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اس نے مجھ سے کہا "شاہ جی، میں نے اپنی تیس سالہ طویل کوما کے بارے میں بہت سوچا ہے اور اب مجھے کچھ کچھ اس کی وجہ سمجھ میں آنے لگی ہے۔"

"اچھا تو تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" میں نے بڑے ہی تجسس کے ساتھ دریافت کیا۔

"شاید خدا مجھے میرے گناہوں کی اصل تصویر دکھانا چاہتا تھا" جسیم الدین کی مدھم آواز بدلی بدلی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"کون سے گناہ؟" میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

لیکن میں نے محسوس کیا کہ جسیم الدین نے جیسے میری بات سنی ہی نہ ہو وہ بس دور کہیں خلاؤں میں گھورتا رہا۔ "آج نسل تو جو فصل کاٹ رہی ہے اس کا بیج ہماری نسل کے مجھ جیسے لوگوں ہی نے بویا تھا۔"

"کیا مطلب میں کچھ سمجھا نہیں؟"

جسیم الدین میرے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے یوں ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا جیسے کسی عدالت میں کوئی مجرم اپنی رضا

سے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر کوئی اقبالِ جرم کر رہا ہو۔

"سقوط ڈھاکا کے سانحے کے کچھ ہی عرصے بعد میں سول سروس میں شامل ہو گیا تھا۔ میں اس سانحے کے بعد ٹریننگ سے فارغ ہونے والے اولین گروپ میں شامل تھا۔ وطن عزیز پر ایک قیامت گزر گئی تھی۔ ہم سب ساتھیوں کا جوان خون ملک کی خدمت کی امنگ سے جوش مار رہا تھا۔ دو ایک سال تو ہم سب پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی کو نبھاتے رہے۔ پھر کچھ عرصے بعد آفیسرز کلب میں ہر شام جمع ہوتے تو دبے دبے لفظوں میں پیسا بنانے کے سنہرے مواقعوں کو خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دینے جانے پر ہم سب اکثر دبے دبے سا شکوہ کیا کرتے۔ پھر ہم نے یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو دلاسہ دیا کہ ہم عہد کرتے ہیں کہ کوئی ایسا کام نہ کریں گے جو ملک کی سلامتی اور بقا پر اثر انداز ہو، باقی معاملات کی خیر ہے۔ ہمارے گروپ میں ہر شعبہ ہر محکمہ سے تعلق رکھنے والے افسران شامل تھے۔ ہم نے باہم مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اپنے زیر انتظام محکمے میں ایک دو سپروائزر اور ہیڈ کلرک کی سطح کے لوگوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے سارا کام ان سے کروائیں گے۔ ہر آسامی سے رقم۔ وصول کریں گے اور اس سلسلے میں پوری پوری احتیاط برتی جائے گی۔ نہ تو محکمے کے دفتر میں کسی بھی آسامی سے کوئی مطالبہ کیا جائے گا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی وصولی ... کی جائے گی۔ یہ سارے معاملات دفتر سے باہر کہیں طے کیے جائیں گے۔ ہمارا کام صرف متعلقہ فائل پر دستخط کر کے اسے منظور کرنا ہوگا۔"

وہ بولے جا رہا تھا میں دم سادھے اسے ٹکر ٹکر دیکھتا جا رہا تھا۔

"ہم جب بھی آفیسرز کلب میں ملتے تو ایک دوسرے کو اپنی کارگزاریوں سے آگاہ کرتے۔ میرے دفتر کا ہیڈ کلرک منظور بڑا ہی کائیاں شخص تھا۔ جو بھی سائل آتا، پہلے تو وہ اس کی فائل ہی گم کر دیتا۔ دو چار دھکے کھا کر جب سائل بیزار ہو چکتا تو وہ اسے خاموشی سے سب کی نظریں بچا کر کاغذ کا پرزہ دیتا جس پر ایک فون نمبر کے ساتھ شام کے وقت فون کرنے کی ہدایت درج ہوتی۔ جب سائل فون کرتا تو اسے مطلوبہ رقم کے ساتھ کسی چائے خانے میں بلایا جاتا جہاں سارا لین دین ہو جاتا۔ اگلی صبح جب میں اپنا فولڈر کھولتا تو نیلے رنگ کے مارکر سے مخصوص نشان زدہ فائلوں پر... دستخط کر کے انہیں اپروو کر دیتا البتہ دیگر تمام پر کوئی نہ کوئی اعتراض لگا کر متعلقہ سیکشن میں واپس بھجوا دیتا۔ منظور ہر اختتام ہفتہ میرے گھر آ کر اس کے حصے کی پہلے ہی سے طے شدہ رقم نکال کر ایک موٹا سا رقم سے بھرا لفافہ دے جایا کرتا تھا۔ میں رقوم فکس ڈیپازٹ کی اسکیموں میں لگا دیا کرتا۔ سارا کام مکمل خاموشی سے اس طرح سے کیا جاتا کہ پورے محکمہ میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور یہ سلسلہ میرے حادثے تک یونہی چلتا رہا۔"

اتنا کہہ کر وہ رکا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن پھر تمہارے گناہوں کا انجام کیسے تمہارے سامنے آیا؟"

"کاش کہ میں نے اور میرے گروپ میں شامل اعلیٰ سرکاری عہدیداران نے خاموش کرپشن کا اس وقت آغاز ہی نہ کیا ہوتا تو شاید آج معاشرے میں یہ سر چڑھ کر بولتے، چیختے چنگھاڑتے کرپشن کے عفریت نے یوں اپنے پنجے نہ پھیلائے ہوتے۔ ہمارے زمانے میں سرکاری اداروں میں اس قدر کرپشن تو نہ تھی جتنی میں اب دیکھ رہا ہوں۔ پی آئی اے، اسٹیل ملز، ریلوے، سوئی گیس، بجلی اور پانی وغیرہ جیسے عوامی اداروں کا تو بس بوریا بستر ہی گول ہو چکا ہے۔ امن و امان کی صورت حال کس قدر مخدوش ہے۔ ہر روز بم دھماکوں میں انگنت لوگ مارے جا رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اگر تم لوگ اپنے دور میں خاموش کرپشن کا آغاز نہ کرتے تو ہمارے معاشرے میں کرپشن کا جو یہ ننگا پن آج ہے شاید نہ ہوتا۔ لیکن میرے بھائی پاکستان میں کرپشن کا آغاز تو اسی دن ہو گیا تھا جب قیام پاکستان کے بعد کسی نے ملکیت کا پہلا جعلی کلیم داخل کیا تھا۔ کیا ہمارے سیاستدان، جرنیل، عدلیہ وغیرہ دودھ کے دھلے ہیں اور کون سا دور ایسا نہیں گزرا جب کرپشن نہیں ہوئی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ کرپشن آج کے دور کی کرپشن کے سامنے ایسی ہی ہے جیسے کسی ڈائنا سور کے سامنے کوئی بکری کا بچہ۔"

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آئی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہی ہو لیکن دیکھو میں تم کو سمجھاتا ہوں۔ اگر ایک شخص ٹریفک کا اشارہ توڑتا ہے تو بظاہر تو یہ ایک معمولی سا جرم دکھائی دیتا ہے لیکن بار بار اس معمولی سے جرم کو کر کے اس کا جی چوڑا ہو جاتا ہے۔ پھر اب وہ اس سے کوئی بڑا جرم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر یونہی بڑے سے بڑا جرم کرتا چلا جاتا ہے۔ اس شخص کو تو پھر بھی یہ ڈر ہوتا کہ وہ شاید آج نہیں تو کل پکڑا جائے۔ لیکن ہم جیسے اہم قومی عہدوں پر فائز لوگ کہ جن کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کرپشن کو روکیں۔ لیکن جب ہم ہی اس میں ملوث ہو جاتے ہیں تو ہمیں یہ پورا یقین ہوتا ہے کہ

کوئی ہمارا کچھ بھی تو نہیں بگاڑ سکتا۔ ہمارے دور میں "انڈر دی ٹیبل" کی اصطلاح رائج تھی لیکن اب تو یہ کھلے عام "اوور دی ٹیبل" کا ایک معاملہ بن چکا ہے جو کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ہمارے وقتوں میں تو راشی انسان کو اس کے گلی محلے، دوست احباب اور عزیز واقربا حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ معاشرے میں اگر کسی کی عزت ہے تو ایسے ہی لوگوں کی۔ ہم جیسوں کا بویا ہوا خاموش کرپشن کا وہ بیج آج کس قدر تناور اور مضبوط ہو گیا ہے"۔

بولتے بولتے وہ کچھ دیر کو رکا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہوا "میں اور میرے ساتھی اس ملک میں خاموش کرپشن کے جدامجد نہ سہی لیکن وہ ہمارا پروردہ تو ضرور تھا۔ ہم نے اسے پال پوس کے نئی نسلوں کو منتقل کر دیا اور اب وہ نہ خاموش رہا ہے اور نہ ہی درپردہ اور جانتے ہو شاہ جی، آج میرے تینوں بیٹے، میرے دو چھوٹے بھائی اور ان کے بیٹے جو ملکی بیورو کریسی کے اہم ترین مہرے گردانے جاتے ہیں، ہر آتی جاتی حکومتوں کا اُلو سیدھا کرنے کے لیے ہر ممکن اور ناممکن حد پار کر جانے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کی یہ سرگرمیاں کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں۔ سچ تو یہ ہے ہر دور میں ہی وطن عزیز کا متاع کارواں خود میر کارواں کے ہاتھوں ہی لٹتا رہا ہے......!"

"واہ یہ خوب رہی کہ جب منصب پر تھے تو خوب کھیل کھیلتے رہے اور اب پارسا بنے پھرتے ہیں" میرے لہجے میں شدید طنز تھا۔

"دیکھو شاہ جی، جب ایک بچہ والدین کے سامنے پل بڑھ رہا ہوتا ہے تو انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ کب کتنا بڑھا۔ لیکن باہر والے جو اسے ہر روز نہیں دیکھتے انہیں اس کی بڑھت صاف نظر آتی ہے۔ اسی طرح سے میرے لیے تو گویا وہ تیس سالہ عرصہ ایک ایسی ہی نیند تھی جیسی تم ہر رات کیا کرتے ہو۔ جب میں اپنی تیس سالہ نیند سے جاگا تو سارا آوے کا آوا ہی بدلا ہوا ہے، بلکہ حد سے زیادہ بگڑا ہوا ہے۔ میرے لیے تو میری دنیا کی کایا ہی کلپ ہو گئی ہے۔ بالکل ایسا ہی سمجھ لو کہ جیسے کوئی مالی اپنے باغ میں رات کو کوئی تخم خار، فصل ثمردار کی امید پر بوئے اور صبح جب اس کی آنکھ کھلے تو برخلاف اُمید وہ بیج ایک اونچی فصل خاردار کی صورت اختیار کر لے۔"

اس روز گفت وشنید کے بعد جب میں گھر پہنچا تو رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ اگلی صبح میری بیوی کو ہلکا سا انجائنا کا درد اٹھا۔ میں اسے فوراً جناح اسپتال لے گیا۔ جہاں پہلے اس کی انجیو گرافی اور پھر ڈاکٹروں نے انجیو پلاسٹی کر کے دل کی ایک شریان میں موجود خون کے بہاؤ کی رکاوٹ کو بڑی کامیابی کے ساتھ دور کر دیا۔ اسے ہفتہ بھر اسپتال میں گزارنا پڑا اور پھر مکمل بیڈ ریسٹ بھی تجویز کیا گیا۔ میں دو ماہ تک ایسا مصروف ہوا کہ جسیم الدین سے میرا کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ ہو سکا۔ اس مسئلے سے فراغت پا کر جب میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ مجھ سے ملنے سے کترا رہا تھا۔ جب مسلسل دو چار بار ایسا ہوا تو پھر میں بھی اس سے ملنے کی کوشش ترک کر کے اپنی بیوی کی دیکھ بھال اور باقی وقت مطالعہ میں مصروف رہنے لگا۔

کوئی دو برس بعد اچانک اطلاع ملی کہ جسیم الدین کا انتقال ہو گیا جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے اس کے جنازے میں بھی شرکت کی۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد مجھے جسیم الدین مرحوم کے وکیل کی کال موصول ہوئی۔ اس نے مجھ سے میرے گھر آ کر ملنے کی استدعا کی۔ میں بڑا حیران ہوا کہ بھلا اس کے وکیل کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟ بہرحال میں نے اسے کسی وقت بھی آ جانے کا کہہ دیا۔

وکیل حشمت اللہ شہر کا بہت بڑا وکیل تھا۔ آتے ہی اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک سیل بند لفافہ نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ جسیم الدین مرحوم کا وصیت نامہ ہے جس کے مطابق انہوں نے اپنی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو فروخت کر کے اس رقم کو ایک ٹرسٹ کی شکل دے دی تھی اور آپ کو اس ٹرسٹ کا چیف ٹرسٹی مقرر کر گئے ہیں"۔ وکیل صاحب نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ٹرسٹ؟" میں نے شدید حیرت کے شکار لہجہ میں کہا۔

"جی مرحوم اس ٹرسٹ کے اغراض ومقاصد اور قواعد وضوابط طے کر گئے تھے۔ یہ ٹرسٹ فلاحی مقاصد اور بطور خاص غریب بچوں کے تعلیمی اخراجات کی مد میں امداد فراہم کرے گی"۔

اتنا کہہ کر وکیل حشمت اللہ کاغذوں کا ایک پلندہ اور جسیم الدین کی فلاحی ٹرسٹ کی ذمہ داری مجھے تھما کر عمر بھر کے لیے حیرت اور سوچوں کے ایک لامتناہی بھنور میں ڈال کر چلتا بنا۔ لیکن آج بھی میرے ذہن میں جسیم الدین کے کہے الفاظ روز اول ہی کی طرح سے گونجتے ہیں۔

"سچ تو یہ ہے ہر دور میں ہی وطن عزیز کا متاع کارواں خود میر کارواں کے ہاتھوں ہی لٹتا رہا ہے......!"

فیصلہ

جناب مدیر سرگزشت

السلام علیکم

ایک چھوٹی سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ اگر پسند آجائے تو اسے شاملِ اشاعت کرلیں۔

ارشد علی ارشد
(سعودی عربیہ)

وہ اسماء کو حیران و پریشان نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اسماء نے اسے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اسماء کی باتیں سن کر اسے ماضی بعید کے مناظر پھر سے یاد آنے لگے تھے۔ اسے لگا جیسے تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے۔ کل اس نے اپنے والدین سے ایک فیصلہ مانگا تھا، آج اس کی بیٹی اس سے فیصلہ مانگ رہی تھی۔ ماضی میں والدین کی خاموشی پر اس نے ازخود فیصلہ لیا جس نے اس کی زندگی کا ڈھانچا بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی اس کی چپ پر کیا آج اسماء خود فیصلہ لے گی۔

اور وہ بھی؟ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ نہیں۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔

"کک کیا ہوا مما۔" اس نے بھاگ کر ماں کو سنبھال لیا۔

وہ اسماء کی بات پر چونک پڑی۔ اسماء کی موجودگی کا احساس اب جاگا تھا۔ اس نے اسماء کا پھولوں جیسا چہرہ ہاتھوں کے پیالوں میں بھر کر کہا۔

"اسماء میری بچی لوٹ آ، آگے نہ بڑھ، آگے تباہی ہے، ہولناک تباہی جسے سنبھالنا نہ تیرے بس میں ہے نہ میرے بس میں۔" اس نے ہزیانی انداز میں کہا۔ اسماء کی حیران نگاہوں میں الجھن بھرا سوال تھا۔ وہ ماں کے ہاتھ تھام کر بولی۔

"مما میں کہاں آگے نہ بڑھوں؟ آپ کس تباہی کی بات کر رہی ہیں؟"

"ان راہوں سے پلٹ آ بیٹی جن پر تو چل رہی ہے کیونکہ تباہی ان راہوں کے مسافروں کا مقدر ہوتی ہے۔"

"مما پلیز پہیلیاں مت بجھوایئے۔" وہ تڑپ اٹھی۔ "آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔" اس کا لہجہ ہنوز الجھن زدہ تھا۔

"اسماء تو جانتی ہے بیٹی میرا تیرے سوا اور تیرا میرے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔" وہ لحظہ بھر رک کر بولی۔ "بیٹی کل رات جو کچھ تم نے مجھے بتایا وہ ممکن نہیں ہے۔"

اسماء ماں کی بات سن کر کھڑی ہو گئی۔ ماں کا دل دھک دھک کرتا ہوا جیسے پسلیوں میں چلا آیا۔ وہ جانتی تھی جوانی اتھری گھوڑی کی طرح منہ زور ہوتی ہے جسے سنبھالنا دشوار ہوتا ہے۔ اناڑی سوار منہ کے بل گر کر تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔

اسے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسماء کو سمجھانا تھا۔ وہ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "اسماء میری جان مجھے پتا ہے میری بات سن کر تجھے تکلیف ہوگی۔"

"مما آپ جانتی ہیں پھر بھی دکھ دینے والی باتیں کرتی ہیں۔" اسماء کے لہجے میں دنیا جہان کا شکوہ تھا۔ اس نے اسماء کو دونوں بازوؤں سے دبوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹی اس لیے کہ یہ دکھ نہیں، تکلیف ہے جس کا اثر سطحی ہے۔ مگر وہ دکھ اور درد جو تیری بات مان کر تجھے ملیں گے وہ ان مٹ ہوں گے۔ اسماء میں......"

"سیدھی طرح بتایئے مما آپ مجھ پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہتی ہیں۔" اسماء نے اس کی بات کاٹ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اسماء کے لہجے نے اس کے دل پر جیسے گھونسا دے

مارا تھا۔

''آج تک ایسا نہیں ہوا بیٹی تو اب کیوں کر ہوگا؟''

''ایسی بات ہے تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔ اور مما میں کوئی بچی نہیں ہوں میں نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ سوچ سمجھ کر کہا ہے۔'' اسماء آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے اسماء کو شانے سے پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں بیٹی تم پڑھی لکھی، سمجھدار اور ذہین لڑکی ہو۔ مگر بیٹی تم نے ابھی زندگی کو سمجھا نہیں۔ یوں سمجھو ابھی تم نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا ہے۔ ابھی زندگی کی ایک بڑی مسافت باقی ہے جسے کاٹ کر ہی انسان کو اصل سمجھ بوجھ عطا ہوتی ہے۔'' اس نے اسماء کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا۔

''مما آپ کالج میں ماشاءاللہ لیکچرار رہی ہیں۔ میں آپ کی باتوں کا اصل منبع تو نہیں سمجھ سکی پر اتنا یقین دلاتی ہوں مجھے اتنی سمجھ ضرور ہے کہ میں اچھے اور برے کی تمیز کر سکوں۔'' اسماء نے دھیرے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

اس نے خود کو بے بسی کی چادر میں لپٹا محسوس کیا۔ بات طول نہ پکڑے اس غرض سے وہ بولی۔ ''بیٹی ایک بار ٹھنڈے دل سے پھر سوچو۔''

''اگر پھر بھی میری بات برقرار رہی مما تو آپ کا فیصلہ کیا ہوگا۔''

''بیٹی پھر یہ فیصلہ مجھے نہیں تمہیں کرنا ہوگا۔''

''مجھے، میں نے بھی نہیں؟'' اسماء نے حیران لہجے میں کہا۔

''سب سمجھ جاؤ گی بیٹی۔ فی الحال ہمیں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنی۔ دو دن بعد جب تم اچھی طرح سوچ بچار کے بعد میرے پاس آؤ گی تبھی سارے بھید کھلیں گے۔''

''ٹھیک ہے مما، مگر ابھی سے بتا دیتی ہوں دو دن سوچ لوں یا دو ہزار دن میرا فیصلہ وہی ہوگا جو کل رات آپ کو بتایا ہے۔'' اسماء حتمی لہجے میں کہتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔ بے شمار، لاتعداد سوچیں اس کے حوالے کر کے اسماء جا چکی تھی۔

اس کے ذہن میں بے تحاشہ سوچیں امڈ آئیں۔ گزرے ہوئے ماہ و سال ہتھوڑے کی طرح برس پڑے تھے۔ اس کا بدن جون کی کڑکتی دھوپ جیسا تپ رہا تھا۔ ماضی کے سارے غم پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ کمرے میں حبس بھر گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر کھڑکیوں کے سارے پردے ایک طرف

دس منٹ میں کینسر

سائنسدان نے دعویٰ کیا تشخیص کرنے والا الہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسا سستا اور ہاتھ میں تھامنے والا آلہ تیار کیا ہے جو کسی بھی قسم کی بیماری مثلاً ٹی بی، ملیریا، ایچ آئی وی انفیکشن یا کینسر کا صرف دس منٹ میں سراغ لگا سکتا ہے۔ q.poc مشین کی قیمت صرف 500 پاؤنڈ ہے۔ یہ مشین ٹیومرز یا رسولیوں کا انتہائی گہرائی تک تجزیہ کرسکتی ہے اور امراض کی جینیاتی شناخت کا پتا چلا سکتی ہے۔ جس کے بعد مریض کے لیے بہترین قسم کی دواؤں کا انتخاب آسان ہوجاتا ہے۔

مرسلہ: انیلہ نعمان خان، کراچی

سرکا دیے۔ دسمبر کے فرحت بخش موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ اسے ایک اور طوفان کے آنے کا ڈر ستا رہا تھا۔ پچھلے طوفان کو سنبھالتے ہوئے اس نے تمام حیات جیسے پتھروں پہ رگڑ ڈالی تھی۔ سارے خاندان کو سولی پہ لٹکا کے چترال جیسے دور افتادہ علاقے کو مسکن بنالیا، یہ سوچ کر کہ حادثات اس کا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ مگر آج اسے معلوم ہوا حادثے کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے یہ سدا انسان کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ اسماء میں آج اسے اپنی جوانی کی جھلک نظر آئی۔ اس نے آج اسماء کو دو دن دیے تھے سوچنے کو، کل اسے دو ہفتے ملے تھے مگر کیا ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

''مم۔ میں اسماء کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ہاں سب کچھ سچ بتا دوں گی۔'' وہ دور کہیں ان دیکھی دنیا میں کھو کر خود کلامی کر رہی تھی۔ دو دن پر لگا کر اڑ گئے۔ اسماء پھر سے اس کے روبرو تھی۔ وہ بولی۔

''اسماء بیٹی کیا سوچا تم نے؟''

''مما مجھے نہیں آپ کو سوچنا تھا۔ میں تین دن پہلے آپ کو اپنی سوچ سے آگاہ کرچکی ہوں۔''

''میں نے کہا تھا بیٹی اگر دو دن بعد بھی تم اپنی بات پر بضد رہیں تو پھر مجھے نہیں تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں واضح کرب تھا۔

''مما میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکی۔ میں اپنا فیصلہ تو سنا چکی ہوں۔ پھر......''

''نہیں بیٹی وہ تمہارا نہیں بلکہ تمہارے دل کا فیصلہ ہے۔ میں آج جو کچھ تمہیں بتانے جا رہی ہوں وہ سن کر جو بھی تم فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہوگا، کیونکہ وہ تمہارا فیصلہ ہوگا تمہارے دل کا نہیں۔''

''بتائیے مما ایسی کون سی بات ہے۔'' وہ بے انتہا بے چین ہوگئی۔

''اسماء تم نے جب بھی اپنے پاپا کے بارے میں پوچھا میں پھر کبھی کہہ کر ٹال دیا کرتی ہوں جانتی ہو کیوں؟''

''کیوں مما۔''

''اس لیے کہ اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ مگر آج سے بہتر موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔'' وہ خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ اسماء کو چپ لگ گئی تھی۔

جبار میرے کالج کا پروفیسر تھا، محبت میں پہل اس نے کی آخر میں نے کردی۔ میں نے اسے خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود اپنانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے ابو نے کہا تھا۔ ''مہرین جس دن تمہاری جبار کے ساتھ شادی ہوئی ہمارے رشتے کا وہ آخری دن ہوگا۔'' میں نے ان کی ہر بات کو ہوا میں اڑا دیا۔ محبت اندھی، بہری اور گونگی ہوتی ہے۔ میری محبت نے نہ کسی رشتے کو دیکھا نہ کسی کی بات سنی اور نہ لب کشائی کی بس من مانی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جبار مجھے تیری صورت میں اپنی نشانی دے کر راستہ بدل گیا۔ ''جانتی ہو جبار کون ہے؟'' اس نے اسما کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نن نہیں مما۔''

''جس شخص سے تم شادی کرنے چلی ہو اس کا باپ جبار ضیاء۔''

''کک۔ کیا؟''

''ہاں عمار ضیاء، تمہارے باپ جبار ضیاء کی دوسری بیوی سے ہے۔'' وہ کہہ کر کھڑی ہوگئی۔ ''بیٹی اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے منظور ہے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ بیڈ روم میں آکر اس نے خلا میں تکتے ہوئے جیسے وہاں تصویر ہو۔ تصویر کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''جبار ضیاء آج میں نے تجھ سے تیری بے وفائی کا بدلہ لے لیا ہے۔'' کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ بیٹی سے جھوٹ بولنے کی کسک نے آنکھوں میں پانی بھر دیا تھا کیونکہ وہ اسماء کے باپ جبار ضیا مرحوم سے بھی شرمندہ تھی جس کا نام اس جبار ضیاء سے مل رہا تھا۔

جوکر انکل

ڈیئر ایڈیٹر
سلام مسنون
میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں مگر سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ زیرِ نظر کہانی کی ایک اہم کردار میں بھی ہوں کیوں کہ وہ جوکر آج میری زندگی میں بھی خوشیاں بکھیر رہا ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ
(کراچی)

گڑیا نے پھر اس کا راستہ روک لیا۔
"نو پاپا دس از رونگ۔"
"ارے کیا ہو گیا۔" سعید پیار اور شرارت سے مسکرا دیا۔
"پاپا آپ کی ٹائی کی ناٹ ہمیشہ غلط ہوتی ہے۔" گڑیا نے کہا۔
"وہ اس لیے غلط ہوتی ہے کہ میری گڑیا اسے ٹھیک کردے گی۔ کیوں گڑیا؟"
"یس پاپا۔" گڑیا ایک صوفے پر کھڑی ہو گئی۔
"اب قریب آجائیں۔"
سعید، گڑیا کے پاس پہنچ گیا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ سعید جان بوجھ کر ٹائی کی ناٹ غلط لگاتا اور گڑیا اسے درست کردیتی۔
فوزیہ کے لیے وہ لمحہ بہت خوشی اور سرشاری کا ہوتا جب وہ باپ اور بیٹی کے اس پیار کو دیکھا کرتی۔
وہ کہا کرتی۔ "سعید! آپ نے اس کی عادتیں خراب کردی ہیں۔"
"وہ کیوں بھئی؟"
اس کا اسکول ہمارے گھر کے گیٹ کے سامنے ہے۔ میں اپنے گیٹ پر کھڑے رہ کر اس کو اسکول کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہوں لیکن آپ ہر صبح اسے اسکول کے گیٹ تک پہنچانے چلے جاتے ہیں۔
"ارے بابا یہی تو میری چھوٹی چھوٹی سی خوشیاں ہیں۔ ایک تم اور ایک گڑیا ورنہ ہم جیسے پولیس والوں کی زندگی میں خوشیاں کہاں آتی ہیں۔"
"اگر آپ کا بس چلے نا تو آپ اس کو اسکول سے واپس بھی لے آیا کریں۔"
"یہی تو پرابلم ہے کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔" سعید

ایک مصنوعی سی گہری سانس لیتا۔ ''اس لیے میں نے یہ کام تمہارے حوالے کر دیا ہے۔''

فوزیہ مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔

وہ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ میڈیکل میں اس کا شعبہ تھیلیسیمیا کا تھا وہ مرض جو بچوں کو آہستہ آہستہ کھینچتا ہوا موت کی طرف لے جاتا ہے۔

وہ ایک فلاحی ادارے کے اسپتال میں تھی۔ اس نے گڑیا کے لیے اپنی ڈیوٹی کے اوقات دو بجے کے بعد مقرر کروائے تھے۔

وہ ایک بجے گڑیا کو اسکول سے لے کر آتی۔ اسے کھانا کھلاتی اور اپنی بہن کے یہاں چھوڑ کر ڈیوٹی پر چلی جاتی۔

پھر سعید یا فوزیہ میں سے جو بھی پہلے آتا وہ گڑیا کو اپنے ساتھ لے کر آ جاتا۔

اس چھوٹے سے گھر میں خوشیاں تھیں اور سکون تھا۔ یہ گھر ان کے حسین خوابوں کی تکمیل تھا۔ یہاں انہیں محسوس ہوتا کہ باہر کے دکھ سکھ اور پریشانیاں گیٹ سے باہر ہی رہ جاتی ہیں۔ اندر آ کر انہیں ڈسٹرب نہیں کرتیں۔

سعید اور فوزیہ نے محبت کی شادی کی تھی۔

اور ان کی محبتوں کا سفر جاری تھا بلکہ ہر دن گزرنے کے ساتھ ان کی محبتیں اور بھی شدید ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتے کہ زندگی شاید اس کا نام ہے کہ محبت کرنے والے ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے اپنی زندگی گزار دیں۔

سعید شادی سے پہلے ہی پولیس آفیسر بن چکا تھا۔ جب کہ فوزیہ نے اپنی پریکٹس بعد میں شروع کی تھی۔ اس نے ایک بڑے اسپتال میں دو سال ہاؤس جاب کی تھی۔ اس کے بعد فلاحی ادارے کے اسپتال میں آ گئی تھی۔ جہاں تھیلیسیمیا کے مریض بچے ہوا کرتے۔

وہ بہت نازک احساسات اور نازک جذبوں کی عورت تھی۔ وہ جب کسی بچے کو زیادہ کرب میں دیکھتی تو گھر آ کر رونے لگتی تھی۔

اس موقع پر سعید اسے سمجھایا کرتا۔ ''خدا کی بندی جب تم سے بچوں کے دکھ دیکھے نہیں جاتے تو کسی اور اسپتال میں اپنا ٹرانسفر کروا لو۔''

''نہیں سعید! یہ بہت مشکل ہے۔ بچے مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ بس میرا دل ایسا ہے کہ میں بچوں کی تکلیف دیکھ کر خود بے چین ہو جاتی ہوں۔''

''میری جان! تمہارا یہ جذبہ اچھا بھی ہے اور بہت برا بھی ہے۔'' سعید کہا کرتا۔ ''اچھا تو ان بچوں کے لیے ہے۔ تم جن کا علاج کرتی ہو جن کی دیکھ بھال کرتی ہو لیکن برا خود تمہارے اپنے لیے ہے۔ کیونکہ تم ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتی ہو۔''

''میں جانتی ہوں سعید لیکن میں مجبور ہوں۔''

☆......☆

اس بچے کا نام جلال تھا۔

ایک محنت کش کا بچہ۔ جس کو تھیلیسیمیا کے آسیب نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ آہستہ آہستہ موت کی وادی کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے کہانیاں سنی تھیں ایسی وادیوں کی۔ جہاں کی جھیلوں میں پریاں نہایا کرتیں۔ جن کے سینوں پر سنہری کشتیاں چلا کرتیں۔

ایک خوب صورت شہزادی اور ایک خوب صورت شہزادہ ہوا کرتا، جادوگر ہوتے۔ پھر شہزادہ اس جادوگر کا خاتمہ کر دیتا اور اس وادی میں ہر طرف سکون ہی سکون ہوتا۔

شاید موت کی وادی میں بھی یہی سب کچھ ہوا کرتا ہو گا۔ جلال کے باپ کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنے بیٹے کا اتنا مہنگا علاج کرا سکے۔ اس کے کچھ خیراتی اداروں نے اس کے علاج کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ اس اسپتال میں تھی جہاں جلال اور جلال جیسے دوسرے بچے زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے۔ یہ بچے مسکراہٹوں سے محروم تھے۔

ان کی آنکھوں میں اداسی ہوا کرتی۔ جب کچھ بولتے تو اتنی آہستگی سے کہ ان کی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔

موت کے خوف، دکھ اور جان لیوا بیماری نے ان کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ ان کے سرخ و سفید چہروں کے رنگ زرد کر دیے تھے۔

فوزیہ کو جلال بہت اچھا لگتا تھا۔

جلال کی باتیں بہت بھولی بھالی ہوا کرتیں۔ اس بچے نے ابھی دنیا ہی کہاں دیکھی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خواب تعبیر کی منزل سے بہت دور تھے۔

ایک بار اس نے فوزیہ سے پوچھا۔ ''آنٹی آپ نے پریاں دیکھی ہیں؟''

''نہیں تو میں نے تو نہیں دیکھیں۔''

''میں نے دیکھی ہیں۔'' اس نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''واہ تم نے کہاں سے دیکھ لیں۔''

"میرے خوابوں میں آتی ہیں۔ مجھ سے کہتی ہیں میرے ساتھ چلو۔ آنٹی کیا میں ان کے ساتھ چلا جاؤں۔"

فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

فوزیہ جب اسپتال سے گھر واپس آکر اپنی گڑیا کو دیکھتی تو اسے اپنے سینے سے لگالیتی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے۔

یہ آنسو اپنے خدا سے تشکر کے احساس کے ہوتے۔ گڑیا ہر لحاظ سے ایک صحت مند بچی تھی۔

ایک دن جب وہ ڈیوٹی ختم کرکے گھر واپسی کا ارادہ کررہی تھی تو ایک نرس نے آکر بتایا۔ "میڈم! کوئی شخص آپ سے فون پر بات کرنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے......!"

"اس نے کہا تھا کہ کسی ذمے دار سے بات کرواؤ۔ اس وقت آپ ہی ہیں۔ آپ بات کرکے پوچھ لیں۔ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟"

فوزیہ نے ریسیور اٹھالیا۔ "ہیلو"

"کیا میں اسپتال کی انتظامیہ کے کسی ذمے دار فرد سے بات کرسکتا ہوں۔" دوسری طرف سے کسی کی مہذب آواز سنائی دی۔

"جی فرمائیں۔ میں ڈاکٹر فوزیہ ہوں۔"

"میڈم! میں آپ کے مریض بچوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دینا چاہتا ہوں انہیں۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" فوزیہ نے کہا۔ "ہمارا اسپتال تو آپ ہی جیسے مخیّر لوگوں کی مدد سے چل رہا ہے۔"

"تو دو چار دنوں میں، میں خود حاضر ہوجاؤں گا۔"

"نام کیا ہے آپ کا؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"حاتم طائی۔" دوسری طرف سے بتایا گیا۔

"کیا!" فوزیہ حیران رہ گئی تھی۔ "کیا بتایا آپ نے؟ حاتم طائی!"

"جی ہاں وہی حاتم طائی تاریخ کا مشہور کردار۔ یہ سمجھ لیں کہ حاتم طائی دوبارہ زندہ ہوکر واپس آکر بچوں کی مدد کرنا چاہتا ہے۔"

"بہت شوق سے حاتم طائی صاحب۔" فوزیہ مسکرا دی۔ "جب جی چاہے تشریف لے آئیں۔"

فوزیہ نے ریسیور رکھ دیا۔ پاس کھڑی ہوئی نرس نے پوچھا۔ "کون تھا میڈم کیا کہہ رہا تھا۔"

"پتا نہیں کچھ عجیب سا بندہ تھا۔ اپنا نام حاتم طائی بتا رہا تھا۔"

☆......☆

دونوں بھائی ناشتا ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔

ساجد بڑا تھا۔ ماجد اس سے چھوٹا۔ ماجد ایک ذمے دار پولیس آفیسر تھا۔ جب کہ ساجد کہانیاں لکھا کرتا۔ اس کی لکھی ہوئی کہانیاں بہت مقبول تھیں۔

ان کہانیوں میں زندگی اپنی سچائی کی پوری شدت کے ساتھ دکھائی دیتی۔ اس نے بیرون ملک جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

ابتداء ہی سے اس کے اندر ایک فن کار پوشیدہ تھا۔ ساجد کو پینٹنگ سے دل چسپی رہی تھی۔ ڈرامے سے دل چسپی رہی تھی۔ اس نے براڈوے تھیٹر میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے تھے۔

اس نے ویژول آرٹ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ باہر ہی ایک خوب صورت لڑکی ماریہ سے اس کی شادی ہوگئی۔ ماریہ بھی اس کی طرح آرٹ کی جنونی تھی۔

مغرب کی اس لڑکی میں مشرق کی کسی لڑکی کی روح شامل تھی۔ شادی کے بعد اس نے ساجد سے اتنی ٹوٹ کر محبت کی کہ ساجد بھی حیران ہوگیا تھا۔ ایسی چاہت بہت کم کو نصیب ہوا کرتی ہے۔

ان کے دو بچے بھی ہوئے، بہت پیارے پیارے خوب صورت سے لیکن کچھ عرصے کے بعد پتا چلا کہ ساجد کے دونوں بچے تھیلیسیمیا کے مریض ہیں جو آہستہ آہستہ موت کے منہ کی طرف جارہے ہیں۔

ساجد اور ماریہ نے دونوں بچوں کے علاج کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اپنے آپ کو بھی داؤ پر لگادیا۔

ساجد تھیٹر میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ دن میں ملازمت بھی کیا کرتا۔ یہی حال ماریہ کا تھا۔ وہ بھی پاگل ہوئی جارہی تھی۔

دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی سوال تھا کہ اگر ان کے بچوں کو کچھ ہوگیا تو پھر کیا ہوگا۔

پھر وہی ہوا۔ جو ان کے اندیشے تھے۔ دونوں بچے ایک سال کے اندر اندر اپنے پیدا کرنے والے کے پاس چلے گئے۔

ماریہ اور ساجد کے لیے یہ صدمہ برداشت کے قابل ہی نہیں تھا۔ خاص طور پر ماریہ، اس پر ایک دیوانگی کی حالت رہتی۔

وہ جنونی کیفیت میں ساجد کا گریبان تھام کر جھٹکے دینے لگتی ''بتاؤ کیوں ہوا ایسا۔ میرے بچوں نے تو ابھی دنیا بھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر خدا نے انہیں اپنے پاس کیوں بلا لیا۔ خدا کو ان سے کیا کام پڑ گیا تھا۔ وہ تو بہت چھوٹے تھے۔ وہ جب سے پیدا ہوئے تھے وہ کبھی کھل کر مسکرا بھی نہیں سکے۔ ان کی بیماری، ان کی تکلیف ان کو مسکرانے کا ٹائم بھی نہیں دیتی تھی۔ میرے بچے تو ہر دم تڑپتے ہی رہتے تھے کیا مقدر تھا ان کا۔'' ساجد ماریہ کو تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتا تھا۔

پھر بہت دیر بعد دونوں نڈھال ہو کر خاموش ہو جاتے۔ بچوں کے اس حادثے نے ماریہ کا ذہنی توازن بگاڑ دیا تھا۔

اس کیفیت میں ایک دن اس نے اپنے بچوں کے نام لیتے ہوئے سڑک پر دوڑ لگا دی اور ایک گاڑی سے ٹکرا کر مر گئی۔

ساجد کے گھر کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اب اس ملک میں اس کے لیے سوائے یادوں کے اور کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے وطن واپس آ گیا۔

وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس لیے ایک آرٹ کالج میں اسے لیکچرر شپ مل گئی اور وہ ماریہ اور دونوں بچوں کی یادوں کو سینے سے لگائے زندگی گزارنے لگا۔

اس کے چھوٹے بھائی ماجد کی کہانی ذرا مختلف تھی۔

اس نے ساجد جیسے دکھ نہیں دیکھے تھے۔ وہ پولیس آفیسر بننا چاہتا تھا اور اپنی محنت اور لگن کے ذریعے بن بھی گیا۔

والدین بھی نہیں تھے۔ اس کے لیے صرف ساجد ہی سب کچھ تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ ساجد شادی کر لے لیکن ساجد نے پھر شادی نہیں کی تھی۔

☆......☆

سعید نے پھر ٹائی کی ناٹ غلط لگائی تھی۔

''اوہو پاپا، آپ ڈیلی ناٹ غلط کیوں لگاتے ہیں۔'' گڑیا نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''صرف اس لیے کہ میری گڑیا اپنے پیارے ہاتھوں سے اس کو ٹھیک کر دے۔''

''اچھا اچھا آئیں ٹھیک کر دیتی ہوں۔''

فوزیہ پاس ہی کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔ یہ روزانہ کی زندگی تھی۔ روزانہ کا معمول تھا۔ یہ سب کچھ روزانہ ہی ہوا کرتا۔

لیکن آج نہ جانے کیوں فوزیہ کو یہ سب کچھ پھیکا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ وہ اندر سے بہت اداس اور بے چین ہو رہی تھی۔

لیکن اس بے چینی اور اداسی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا ہوتا آیا ہے۔

سورج اسی طرح چمک رہا تھا۔ گھر سے باہر سڑک پر گاڑیوں کا آنا جانا معمول کے مطابق تھا۔ بچے اسکول جا رہے تھے۔ زندگی نے ہر طرف اپنے جال بچھا رکھے تھے۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ لیکن کچھ ایسا ضرور تھا جو فوزیہ کے سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی۔ ایک بے مہری خاموشی۔

گڑیا نے اپنے پاپا کی ٹائی کی ناٹ سیدھی کی۔

دونوں نے فوزیہ کو خدا حافظ کہا۔ فوزیہ نے ہمیشہ کی طرح گڑیا کو پیار کیا اور جب وہ دونوں گاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے تو فوزیہ، سعید کے سامنے آ گئی۔ اس کی نگاہیں سعید پر جمی ہوئی تھیں۔

''سعید۔'' اس کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

''ہاں کہو۔''

''سعید پتا نہیں آج مجھے کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج آپ آفس نہ جائیں۔''

''کیا ہو گیا خیریت تو ہے۔'' سعید ہنس پڑا۔

''پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔'' فوزیہ نے بے بسی سے کہا۔ ''کچھ عجیب سا محسوس ہو رہا ہے۔''

''سب ٹھیک ہے۔'' سعید نے پیار سے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''ایسا کبھی کبھی ہونے لگتا ہے۔ اس کو سیریس مت لو۔''

سعید نے تو سب ٹھیک ہے کہہ دیا تھا لیکن سب ٹھیک نہیں تھا۔ شام کو آفس سے گھر آتے ہوئے سعید کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور اسپتال جاتے جاتے سعید کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔

☆......☆

ناشتے کے دوران ماجد اپنے بھائی ساجد کو بتا رہا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اتنے بے رحم اور خود غرض کیوں ہو گئے ہیں۔ میں تو کل رات سے سویا نہیں ہوں بھائی۔ انتہا ہو گئی۔ اس بات کا بھی احساس نہیں رہا کہ وہ کیا

کر رہے ہیں۔"

"کیوں بھائی ایسی کیا بات ہو گئی؟" ساجد نے پوچھا۔

"بھائی ایک اسپتال ہے اس کو ایک فلاحی ادارہ چلا رہا ہے۔ اس اسپتال میں تھیلیسیمیا کے مریض بچوں کا علاج ہوا کرتا ہے۔ میں تو ان بچوں کو دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔"

"کیوں تم وہاں کیوں گئے تھے؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔ اس اسپتال کی نگراں ہیں ڈاکٹر فوزیہ۔ انہوں نے رپورٹ دی تھی کہ کوئی بے رحم شخص ان مرتے ہوئے بچوں کی دوائی چوری کر کے کہیں فروخت کر رہا ہے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہے۔"

"ہاں بھائی اس سے زیادہ بے رحمی اور کیا ہو گی۔ غریب بچوں کی جان بچانے والی دوائی بھی چوری ہو رہی ہیں۔ بہر حال چور تو پکڑا گیا ہے۔ لیکن میں نے وہاں جو کچھ دیکھا اس نے مجھے دکھی کر دیا ہے بھائی۔ وہاں کے بچے آنے والی موت کے خوف سے ہر وقت سہمے رہتے ہیں۔ میں بہت دیر تک وہاں رہا لیکن میں نے کسی بچے کو مسکراتے یا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بچے زندہ لاش کی صورت ہیں بھائی۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔" ساجد نے ایک گہری سانس لی۔ "کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ آخر کیوں صرف دکھ دینے کے لیے انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔ اتنی بڑی کائنات تھی۔ فرشتے تھے۔ تو کیا ضروری تھا کہ انسان صرف اس لیے پیدا کیا جائے کہ وہ بیماریوں اور پریشانیوں کے ہاتھوں تڑپ تڑپ کر مرتا رہے۔ آخر کیوں۔ کیا ضرورت تھی اس پورے کارخانے کی۔ میرے بچے بھی اسی طرح مر گئے تھے ماجد اور میں ایک باپ ہوتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ نہیں کر پایا تھا۔ ان کے مرنے کا تماشا ہی دیکھتا رہ گیا۔"

"سوری بھائی! میں نے آپ کے دکھوں کو تازہ کر دیا۔"

"یہ دکھ تو ہر وقت تازہ ہی رہتے ہیں۔" ساجد کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "میں نے تو کبھی ان دکھوں کو مرجھایا ہوا نہیں پایا۔"

"بھائی میں تو کہتا ہوں کہ آپ اپنے لیے کوئی ایکٹی ویٹی تلاش کریں۔" ماجد نے کہا۔ "تا کہ آپ کا دل بہلا رہے۔"

"ہاں۔" ساجد نے دھیرے سے کہا۔ "فکر مت کرو۔ ایک ایکٹی ویٹی ہے میرے ذہن میں۔"

☆......☆

اسپتال کی پہلی منزل کے برآمدے میں کھڑی فوزیہ کو اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ بارش نے اس کو بھگونا شروع کر دیا ہے۔

بارش ہوتے ہی وہ برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ موسم اسے اور سعید دونوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ دونوں کافی کے مگ لیے ٹیرس میں آ کر بیٹھ جاتے اور برستے ہوئے پانی کو دیکھتے رہتے۔

اس وقت پورے ماحول میں مٹی، گھاس اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو رچی ہوتی۔ فوزیہ اپنا سر سعید کے شانے سے لگا دیتی اور دونوں بہت دیر تک اس عالم میں بیٹھے رہتے۔

لیکن اب یہ سب خواب ہو کر رہ گیا تھا۔ اچھے دن ہمیشہ اسی طرح بہت تیزی سے گزر جاتے ہیں اور دکھوں کی ایک ایسی طویل لکیر چھوڑ جاتے ہیں جو زندگی بھر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

سعید کے انتقال کو دو مہینے ہو چکے تھے۔ دو مہینے ساٹھ دن ساٹھ برس ساٹھ دکھ دینے والی صدیاں۔ گڑیا کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کے پاپا اسے چھوڑ کر کہیں جا بھی سکتے ہیں۔ وہ فوزیہ سے پوچھا کرتی۔ "ماما اب پاپا اپنی ٹائی کی ناٹ کیسے ٹھیک کرتے ہوں گے۔"

فوزیہ اسے سینے سے لگا لیتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گڑیا اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ سکے۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جب ایک نرس نے آ کر یادوں کے اس سلسلے کو ختم کر دیا۔

"میڈم! کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" نرس نے بتایا۔

"کون ہے؟" فوزیہ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"آپ خود دیکھ لیں میڈم۔" نرس ہنس پڑی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اس میں ہنسنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اب کیا بتاؤں میڈم آپ خود دیکھ لیں۔" نرس نے اپنی بات دہرائی۔

فوزیہ کو اس نامعقولیت پر غصہ آنے لگا تھا لیکن وہ نرس کے ساتھ دفتر کی طرف چل پڑی۔

اور دفتر میں جو آدمی اس کے انتظار میں تھا اس کو دیکھ کر خود فوزیہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ وہ ایک جوکر تھا مکمل جوکر۔ سر سے پاؤں تک وہی دھاریدار لباس جو جوکر پہنا کرتے ہیں۔ پورے چہرے کو رنگ برنگے رنگوں سے سجایا

گیا تھا۔ ناک پر ایک خول چڑھا ہوا تھا۔

اس جوکر کے ایک ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا۔

فوزیہ اسے دیکھ کر بھڑک اٹھی تھی۔ ''کیا بکواس ہے۔ کون ہو تم؟ یہ اسپتال ہے۔ کوئی سرکس نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں میڈم کہ یہ سرکس نہیں ہے۔'' جوکر نے کہا۔ ''اسپتال ہی سمجھ کر آیا ہوں۔''

''لیکن کیوں آئے ہو؟''

''کچھ دینے کے لیے۔'' جوکر نے بتایا۔ ''آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے فون پر بھی بات کی تھی اور میں نے اپنا نام حاتم طائی بتایا تھا۔''

''اوہ تو تم ہو حاتم طائی۔''

''جی ہاں، آپ کو فون کرنے کے بعد کچھ معاملات میں الجھ گیا تھا۔ اس لیے آپ کے پاس نہیں آسکا۔''

''لیکن آج بھی کیوں آئے ہو؟''

''بچوں کو کچھ دینے کے لیے۔'' جوکر نے بتایا۔

''کیا دو گے بچوں کو۔''

''مسکراہٹیں۔'' جوکر نے کہا۔ ''ان بچوں کے لیے دوائیں آتی ہوں گی۔ طرح طرح کے پھل آتے ہوں گے لیکن مسکراہٹیں کوئی نہیں لاتا ہوگا۔ ان کے ہونٹ مسکرانے کو ترس گئے ہوں گے۔ یاد رکھیں میڈم مسکراہٹیں اور قہقہے جینے کی امنگ پیدا کردیتے ہیں۔ میں ان بچوں میں یہ امنگ جگانے آیا ہوں۔''

فوزیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ جوکر جو کچھ کہہ رہا تھا وہ واقعی ایک بے رحم سچائی تھی۔ مریض بچے ہنسی کو ترس گئے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مسکراہٹیں ہونٹوں پر کس طرح آتی ہیں۔

''کیا سوچ رہی ہیں میڈم! اجازت دیں مجھے۔'' جوکر نے کہا۔

''ٹھہر جاؤ میں انتظامیہ سے بات کرلوں۔''

''ضرور بات کریں۔ لیکن انہیں یہ بتا دیں کہ کوئی جوکر موت کی طرف جاتے ہوئے بچوں کو زندگی کا ٹانک دینے آیا ہے۔''

''تم بیٹھ جاؤ میں ابھی آتی ہوں۔''

فوزیہ کی واپسی دس پندرہ منٹ میں ہوئی تھی۔ وہ بہت پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ ''ٹھیک ہے اجازت مل گئی ہے لیکن تم وارڈ میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں رہو گے۔''

اور اس دن پہلی بار اسپتال کا پورا عملہ مرجھائے ہوئے بچوں کے چہروں پر خوشیاں دیکھ رہا تھا۔ بچے جوکر کی الٹی سیدھی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور ایک طرف کھڑی فوزیہ یہ سوچ رہی تھی کہ جوکر بچوں کو وہ تحفے دے رہا ہے جو کسی نے نہیں دیا ہوگا۔

☆......☆

ساجد کی وہی زندگی تھی۔

وہی شب و روز لیکن اب اتنا فرق ہوا تھا کہ ماجد کے کہنے پر اس نے زندگی کے معاملات میں دل چسپی لینی شروع کردی تھی۔

وہ اپنے پرانے دوستوں سے ملنے چلا جایا کرتا۔ اس کی واپسی کبھی جلدی ہو جاتی۔ کبھی دیر سے ہوتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ اب آہستہ آہستہ پرانے زخموں کو بھولتا جا رہا تھا۔

ایک دن ماجد نے اس سے کہا۔ ''بھائی آپ کو یاد ہے میں نے آپ سے بچوں کے ایک اسپتال کا ذکر کیا تھا۔''

''ہاں یاد ہے۔ وہی اسپتال نا، جہاں سے دوائیں چوری ہوتی ہیں۔'' ساجد نے کہا۔

''ہوتی نہیں ہوتی تھیں وہ شخص تو پکڑا گیا ہے۔''

''خیر، تو کیا ہوا ہے وہاں؟''

''بھائی وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر ہے فوزیہ۔ جو پورے اسپتال کی انچارج ہے۔'' ماجد نے بتایا۔

''تو پھر۔''

''بھائی اس بے چاری کے ساتھ بہت عجیب ٹریجڈی ہوئی ہے۔'' ماجد نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''کچھ عرصہ پہلے اس کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ جس میں اس کا انتقال ہوگیا اب وہ انہی بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔''

''میرے بھائی دنیا میں اس قسم کے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔'' ساجد نے کہا۔ ''کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا پل ہمارے لیے کیا لے کر آرہا ہے۔ اس لیے اس قسم کے واقعات کو اپنے ذہن میں بٹھا لینا ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ انسان دن رات اس کے بارے میں سوچتا رہ جائے اور خاص طور پر ایک پولیس آفیسر کو۔''

''ہاں بھائی۔'' ماجد نے گہری سانس لی۔ ''واقعی ہم لوگوں کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے اس پروفیشن میں آکر غلطی کی ہے۔''

''نہیں میرے بھائی۔ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔'' ساجد نے پیارے بھائی کے سینے پر سر رکھ دیا۔ ''تم ایک

ایماندار اور حساس پولیس آفیسر ہو۔تم کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔ ہمارے ملک اور ہمارے شہر کو تم ہی جیسوں کی ضرورت ہے۔''

''آپ نے یہ نہیں پوچھا بھائی کہ میں نے ڈاکٹر فوزیہ کا ذکر کیوں کیا؟''

''کیا ضرورت تھی پوچھنے کی۔'' ساجد مسکرا دیا۔ ''چلو اب بتا دو۔''

''بھائی میں یہ سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر فوزیہ آپ کے لیے بہت اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔'' ماجد نے کہا۔

''نہیں بھائی۔'' ساجد اداس ہو گیا تھا۔ ''تم تو جانتے ہو کہ ماریہ کے ساتھ میرا کیسا رشتہ تھا۔ انتہا درجے کے پیار کا۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اگر کسی سے شادی کی تو بیوی مل جائے گی لیکن وہ دس برس کہاں سے واپس آئیں گے جو میں نے ماریہ کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ مجھے کون دے گا۔ نہیں مجھے میری یادوں کے ساتھ رہنے دو۔ یہ زندگی جس طرح گزر رہی ہے وہی ٹھیک ہے۔''

''لیکن میں تو آپ کو تنہا نہیں دیکھ سکتا۔ اس گھر میں کسی کی ضرورت ہے۔'' ماجد نے کہا۔

''وہ ضرورت تمہاری شادی سے پوری ہو جائے گی۔'' ساجد مسکرا دیا۔

''میری شادی!''

''ہاں جب تم مجھے شادی کا مشورہ دے سکتے ہو تو کیا میں تمہیں شادی کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔''

☆......☆

جوکر انکل اس اسپتال کے لیے ایک لازمی جز بن کر رہ گیا تھا۔

وہ ہفتے میں دو دن بچوں کے لیے چاکلیٹ لے کر آیا کرتا۔ جن کو بچوں میں تقسیم کرتے ہوئے وہ الٹی سیدھی حرکتیں کیا کرتا اور بچے ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے۔

وہ اس لمحے بھول جاتے کہ موت ان کے سامنے بالکل سامنے کھڑی ہے۔ پورا وارڈ جوکر انکل جوکر انکل کی صداؤں سے گونجتا رہتا۔

بچوں کے والدین اس جوکر کو جھولیاں بھر کر دعائیں دیا کرتے۔ جس نے ان کے بچوں کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر تبسم کی لکیریں کھینچ دی تھیں۔

اسپتال کا عملہ بھی اس جوکر انکل سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ اس نے پورے اسپتال پر احسان کیا تھا۔ فوزیہ اس کے لیے چائے اور بسکٹ وغیرہ تیار رکھتی۔

جوکر اس کے کمرے میں بیٹھ کر چائے پیتا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا پھر کسی نرس کی ہمراہی میں کھلونوں کا تھیلا اٹھا کر بچوں کی طرف نکل جاتا۔

اس کے بعد بہت دیر تک بچوں کے قہقہے وارڈ میں گونجتے رہتے۔

ایک بار جوکر جب معمول کے مطابق اپنا تماشا دکھانے سے پہلے ڈاکٹر فوزیہ کے کمرے میں آیا تو فوزیہ کے ساتھ ایک پیاری سی بچی بھی بیٹھی تھی۔

وہ بچی جوکر کو دیکھ کر چہک اٹھی تھی۔

''حاتم طائی صاحب یہ میری بیٹی ہے گڑیا۔'' فوزیہ نے تعارف کروایا۔

''اوہ یہ تو واقعی گڑیا جیسی ہے۔'' جوکر نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

گڑیا نے جھجکتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا۔

''حاتم طائی صاحب! میں نے جب اس سے آپ کا تذکرہ کیا تو یہ بھی آج میرے ساتھ چلی آئی۔'' فوزیہ نے بتایا۔ ''شاید۔'' فوزیہ کی آواز میں اداسی شامل ہو گئی تھی۔ ''شاید یہ بہت دنوں سے ہنسی نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' جوکر نے کہا۔ ''اب یہ ہمیشہ ہنستی رہے گی۔''

فوزیہ ایک بار پھر پرانی یادوں میں گم ہونے لگی تھی۔

''حاتم طائی صاحب! اس کے پاپا اس کو خوب ہنسایا کرتے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اپنی ٹائی کی ناٹ غلط باندھتے اور گڑیا اس ناٹ کو ٹھیک کر دیا کرتی۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ میں باپ بیٹی کی ان حرکتوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں دعائیں کیا کرتی کہ خدایا ان خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے لیکن نظر لگ ہی گئی۔ ایک منحوس حادثے نے سعید کو مجھ سے اور گڑیا سے جدا کر دیا۔ معاف کرنا حاتم طائی میں بھی کہاں کی داستان لے کر بیٹھ گئی۔''

''نہیں ڈاکٹر بولتی رہا کریں۔'' حاتم طائی نے کہا۔ ''الفاظ سینے کی گھٹن دور کر دیتے ہیں اور بہتے ہوئے آنسو آہستہ آہستہ دکھوں کے داغ کو کم سے کم کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کتھارسس کا مرحلہ ہوتا ہے ڈاکٹر اگر الفاظ اور آنسو نہ ہوں تو انسان اندر سے اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ جائے کہ اس کی شناخت مشکل ہو جائے۔ اس لیے بولتی رہا کریں۔ مجھے گڑیا کی اور باتیں بتائیں اپنے مرحوم شوہر کے بارے میں بتائیں۔''

فوزیہ نے چونک کر اس جوکر کی طرف دیکھا۔ حاتم طائی نام کا یہ جوکر اس وقت کتنی سمجھ داری کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اس کے گہرے شعور کا اندازہ ہو رہا تھا۔

اتنے دنوں کے بعد کوئی ایسا آیا تھا جو اس کے زخموں پر اپنی باتوں کا مرہم رکھ رہا تھا۔ وہ جوکر ہی سہی لیکن ایک باشعور اور ہمدرد انسان بھی تو تھا۔

اس شام جوکر نے کچھ اور بھی تماشے دکھائے۔ دیکھنے والوں میں مریض بچوں کے ساتھ ساتھ گڑیا بھی تھی جو ہنس ہنس کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

وہ جوکر گڑیا کے ہونٹوں پر ہنسی لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆......☆

ماجد اپنے بھائی کے لیے ایک رشتہ لے کر آیا تھا۔

''کیا بتاؤں بھائی کیا لڑکی ہے اور اس کا باپ کیا زبردست آدمی ہے۔ ایم این اے رہ چکا ہے لیکن ابھی بھی اس کی کیا شان ہے۔''

''ایک بات بتاؤ۔ مجھے شادی اس لڑکی سے کرنی ہے یا اس کے باپ سے۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ارے بھائی جب تک کسی کا بیک گراؤنڈ نہ بتایا جائے اس کی تعریف مکمل نہیں ہوتی۔''

''چلو بیک گراؤنڈ تو ہو گیا۔ اب لڑکی کے بارے میں بھی بتا دو۔''

''بھائی جب وہ ایک شان سے اپنی گاڑی سے اترتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے شہزادی اتر رہی ہو۔''

''میرے پیارے بھائی ایسی لڑکیوں کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے۔ یہ آسمانوں میں چلتی ہیں۔ اس کو وہیں رہنے دو۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھائی۔'' ماجد نے پتا چلا لیا تھا۔

''آپ ہر بار ٹال کیوں جاتے ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم پولیس آفیسر ہو یا تم نے رشتے لگانے کا کام شروع کر دیا ہے۔'' ساجد نے کہا۔ ''تم اب تک میرے لیے چار پانچ رشتے لا چکے ہو۔''

ماجد ہنس پڑا۔ ''بات یہ ہے بھائی کہ ڈیوٹی کے دوران میں اگر کوئی رشتہ آپ کے لیے مناسب لگتا ہے تو ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی دیکھ لیتا ہوں۔''

''دیکھو بھائی میں نے ابھی تک ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔'' ساجد نے کہا۔ ''اور تم یقین کرو کہ جس دن میں نے ایسا کوئی فیصلہ کر لیا اس دن سب سے پہلے تمہیں معلوم ہو جائے گا۔''

''خدا کرے کہ وہ مبارک دن کسی طرح آ ہی جائے۔'' ماجد منہ بنا کر بولا۔ ''یہ گھر تو کسی کی نسوانی آواز کو سننے کے لیے ترس کر رہ گیا ہے۔ بس ہم ہی دونوں کوؤں کی طرح کائیں کائیں کرتے رہتے ہیں۔''

ساجد نے ہنستے ہوئے ماجد کو ایک چپت لگا دی تھی۔

☆......☆

اب گڑیا ہر دوسرے تیسرے دن فوزیہ کے ساتھ اسپتال آنے لگی تھی۔

اسکولوں میں چھٹیاں تھیں۔ اس لیے فوزیہ کو بھی اسے ساتھ لانے میں کوئی پرابلم نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس شام وہ فوزیہ کے ساتھ نہیں آسکی تھی۔

حاتم طائی نام کا وہ جوکر بھی اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ جوکر اور گڑیا بہت دیر تک نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہتے۔

فوزیہ، گڑیا کو زندگی کی طرف واپس آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتی۔ یہ جوکر ایک ایسا جادوگر تھا جس نے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر پھول کھلا دیے تھے۔

فوزیہ کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ جوکر بہت پڑھا لکھا انسان ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کر جاتا کہ فوزیہ اس کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔

اس شام جب وہ فوزیہ کے کمرے میں داخل ہوا تو فوزیہ اکیلی بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے ڈاکٹر آج ہماری گڑیا دکھائی نہیں دے رہی؟'' جوکر نے پوچھا۔

''اس کو آج نزلہ ہو رہا ہے۔'' فوزیہ نے بتایا۔ ''حالانکہ وہ یہاں آنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ لیکن میں نے لانا مناسب نہیں سمجھا وہ گھر پر آرام کر رہی ہے۔''

''ڈاکٹر اگر تم برا نہ مانو اور کوئی پرابلم نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ چلوں۔'' جوکر نے کہا۔

''میرے ساتھ!'' فوزیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں گڑیا کو دیکھنا اور اسے ہنسانا چاہتا ہوں۔ وہ اداس ہو رہی ہو گی۔''

''یہ بات تو ہے۔'' فوزیہ مسکرا دی۔ ''وہ واقعی اداس ہو رہی ہو گی۔''

''تو میں چل سکتا ہوں۔''

''بہت شوق سے۔'' فوزیہ نے کہا۔ ''یہ بہت اچھا ہو گا۔''

"میرے پاس اپنی گاڑی ہے۔" جوکر نے بتایا۔
"ڈاکٹر تم آگے آگے جانا میں تمہیں فالو کروں گا۔"
"لیکن!" فوزیہ کچھ جھجک رہی تھی۔
"میں سمجھ گیا۔" جوکر ہنس پڑا۔ "میرا یہ حلیہ تمہیں شرمندہ کردے گا کہ آج ڈاکٹر کسی جوکر کو اپنے ساتھ لے کر آگئی ہے۔ کیوں یہی بات ہے نا۔"
"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" فوزیہ ہنس پڑی۔
"فکر مت کرو۔ میں اسپتال تک ہی اسی طرح نہیں آتا ہوں کہ بچے جوکر جوکر پکارتے ہوئے کار کے پیچھے دوڑ لگا دیں۔ بلکہ میں ایک گاؤن پہن لیتا ہوں جس سے میرا جوکر والا لباس چھپ جاتا ہے۔ آنکھوں پر ڈارک گلاسز لگا لیتا ہوں یہ گلاسز ایسے ہیں کہ آدھے چہرے کو کور کرلیتے ہیں۔ بس اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلتا۔"
"اوکے چلیں۔ میں اپنے اسٹاف سے کہہ دیتی ہوں کہ میں جوکر صاحب کے ساتھ جا رہی ہوں۔"
گڑیا نے جب جوکر کو اپنے گھر میں دیکھا تو خوشی سے پاگل ہوگئی۔ "جوکر انکل! آپ کیا میرے لیے آئے ہیں؟"
"ہاں گڑیا صرف تمہارے لیے۔"
"آپ کتنے اچھے ہیں جوکر انکل۔"
"آپ دونوں باتیں کریں میں چائے لے کر آتی ہوں۔" فوزیہ نے کہا۔
فوزیہ چائے بنانے چلی گئی کچھ دیر بعد واپس آئی تو گڑیا ہنس رہی تھی۔ جوکر انکل نے اسے خوب ہنسایا تھا۔
"حاتم طائی صاحب اب یہ بتا دیں کہ آپ ہیں کون؟" فوزیہ نے چائے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"کیا یہ جاننا ضروری ہے۔"
"ہاں بہت ضروری ہے۔" فوزیہ نے کہا۔ "کیونکہ آپ ایسے تو نہیں لگتے کہ کسی سرکس وغیرہ میں کام کرتے ہوں۔ آپ کا بیک گراؤنڈ مجھے کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔"
"ہاں ڈاکٹر میرا بیک گراؤنڈ کچھ اور ہے۔" جوکر نے کہا۔ "میرا اصل نام ساجد ہے۔ میں نے انگلینڈ میں آرٹ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ اس لیے انگلینڈ اور امریکا کے اعلیٰ ترین تھیٹرز میں کام کرتا رہا ہوں۔"
"مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔"
"میں نے میک اپ اور گیٹ اپ کا فن تھیٹر ہی سے سیکھا ہے۔" ساجد نے بتایا۔
"لیکن جوکر ہی کیوں؟"
"اس لیے کہ یہ وہ کردار ہے جس کو بچے بہت پسند کرتے ہیں جس کو دیکھ کر ہنسنا چاہتے ہیں۔ میرے بچے بھی اس کردار کو بہت پسند کرتے تھے۔"
"آپ کے بچے! کہاں ہیں آپ کے بچے؟"
"میرے دو بچے تھے اور دونوں ہی تھیلیسیمیا کے شکار ہوگئے۔" ساجد کی آواز میں دکھ تھا۔ "مر گئے دونوں، بیوی بھی مر گئی۔ اس دن سے میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ ہنسی سے محروم بچوں کو ہنسانے کی کوشش کروں گا۔ اگر میں ان کے لبوں پر مسکراہٹیں لاسکا تو یہ میری نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔"
"آپ بہت بڑے آدمی ہیں ساجد صاحب۔" فوزیہ نے کہا۔
"اب مجھے اجازت دیں۔ بھائی انتظار کررہا ہوگا۔"
"کیا میری ایک خواہش پوری کردیں گے۔" فوزیہ نے پوچھا۔
"کیوں نہیں۔ آپ بتائیں۔"
"میں آپ کو اصل رنگ و روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" فوزیہ نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ اس قسم کے رنگ و روغن کے بغیر۔ کیوں گڑیا جوکر انکل کی اصل صورت دیکھو گی۔" فوزیہ نے پاس بیٹھی ہوئی گڑیا سے پوچھا۔
"یس ضرور دیکھوں گی۔ دکھائیں نا انکل۔"
"اچھا بابا۔" ساجد نے ایک گہری سانس لی۔ "میرا سوٹ گاڑی میں رکھا ہوا ہے میں وہ لے کر آتا ہوں۔ اس کے بعد واش روم جا کر یہ میک اپ صاف کروں گا پھر تم مجھے دیکھ لینا۔"
ساجد جب اپنا رنگ و روغن صاف کر کے اور سوٹ پہن کر واش روم سے باہر نکلا تو فوزیہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
وہ تو بہت معقول انسان تھا۔
اچھا خاصا خوب صورت اور ہینڈسم۔
"انکل۔" اچانک گڑیا نے اسے مخاطب کیا۔
"جی بیٹے۔"
"ادھر آئیں میرے پاس۔"
ساجد گڑیا کے پاس آگیا۔ "ہاں بیٹے۔"
"انکل آپ نے ٹائی کی ناٹ غلط کیوں باندھی ہے۔"
"صرف اس لیے کہ میری گڑیا اسے ٹھیک کرسکے۔" ساجد نے کہا۔
گڑیا کے ننھے ہاتھ ساجد کی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کررہے تھے اور فوزیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سب کچھ اچانک بہت خوب صورت اور بہت جانا پہچانا سا ہوگیا تھا۔

کر بھلا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
لوگ اِس فانی دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس فانی دنیا کا جو اصل مالک ہے اس کے میزان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس کا انصاف برحق ہے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کا حق غصب کرتے ہیں انہیں بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان کا حق بھی مٹی میں مل رہا ہے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہی ہمیں آفت و بلیات سے بچائے رکھتی ہیں۔ جیسا میرے ساتھ ہوا۔ آج میرا شمار بڑے بزنس مینوں میں ہوتا ہے کیوں کہ یہ میری ایک نیکی کا ثمر ہے۔ میری وہ کون سی نیکی تھی یہی میں آپ سب کو بتانا چاہ رہا ہوں۔

شاہد
(کراچی)

میں نے اپنے والد کو دیکھا وہ دوسروں کے لیے حد سے زیادہ کر جاتے تھے۔ اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ حالانکہ وہ مال و دولت کے لحاظ سے بڑے آدمی نہیں تھے۔ ایک کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے اور تنخواہ مناسب تھی۔ میں ان کی سب سے بڑی اولاد ہوں۔ میرے بعد دو بھائی اور ایک بہن ہے۔ گھر ہمارا اپنا ہے جو والد نے اچھے وقتوں میں بنا لیا تھا۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے صرف سولہ ہزار کا پلاٹ لیا تھا اور اس پر کل بیالیس ہزار خرچ کر کے چار کمروں کا مکان بنایا تھا۔ یہ پکا آر سی سی مکان تھا اور اتنا مضبوط تھا کہ بعد میں ہم اس پر مزید دو منزلیں بنوائیں۔ ابھی چند سال پہلے آخری منزل بنوائی تو اس پر ساڑھے چھ لاکھ روپے خرچ آیا تھا اور یہ بھی سستا سا کام تھا۔ اگر شو شا سے کام لیتے تو اس سے ڈبل بھی خرچ ہو سکتا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ میں نے والد صاحب کو بھی کسی کی مدد سے ہچکچاتے نہیں دیکھا۔ دوست احباب، رشتے دار اور دور کے جاننے والے بھی بلا جھجک مدد کے لیے ان کے پاس چلے آتے تھے اور وہ کسی کو مایوس نہیں لوٹاتے تھے۔ انتقال سے چند سال پہلے وہ ریٹائر ہوئے تو اس کے بعد بھی ان کا یہ معمول جاری رہا۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔

”ابو جی آپ کے پاس بہ ظاہر اتنا کچھ نہیں ہے لیکن آپ دوسروں کی اتنی مدد کر دیتے اور اس کے باوجود میں نے آپ کو کبھی تنگی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی پیسوں کے حوالے سے پریشان دیکھا ہے۔“

”اس کی دو وجہ ہیں۔“ والد نے کہا۔ ”ایک تو یہ کہ میرے نصیب میں جو رزق ہے وہ مجھے ملے گا اور دوسری وجہ کہ مجھے جو اللہ نے دیا ہے اگر میں اس میں دوسروں کو شریک کروں تو اللہ اسے کم نہیں کرے گا بلکہ بڑھا دے گا اور ایسا ہی ہوتا ہے۔“

سچی بات ہے میں آج کی دنیا کا مادہ پرست شخص ہوں اور والد کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ انسان کے پاس جو محدود ہے وہ اٹھا کر کسی کو دے دے تو اس میں اضافہ کیسے ہوگا اور وہ انسان کو واپس کیسے ملے گا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھے اللہ کی قدرت پر شک ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ میں اسے ہی رازق مانتا ہوں اور اس کی نعمتوں کا شکر بجا لانے کی کوشش بھی کرتا ہوں لیکن جو والد صاحب کرتے تھے وہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ چند ایک کی نہیں بلکہ درجنوں لوگوں کی مدد کرتے تھے۔ کتنے ہی لوگوں کی اہم ترین کاموں میں مدد کر چکے تھے۔ جن کا خرچ لاکھوں میں ہوتا ہے۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہوتی کسی کا کوئی عزیز شدید بیمار ہو کر اسپتال میں ہوتا تھا۔ کسی کا کاروبار تباہ ہو رہا ہوتا تھا۔ والد صاحب اس کی مدد کرتے تھے۔ مدد بھی یوں کرتے تھے کہ ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی تھی۔

انہوں نے کبھی ہمیں نہیں بتایا کہ انہوں نے کس کو کیا

دیا اور اس کا کیا ہوا۔ ان کو واپس ملا یا نہیں۔ انہوں نے کہاں سے کر کے دیا یہ بھی ہم نہیں جانتے تھے۔ اس کے باوجود ہم نے انہیں کبھی خالی ہاتھ نہیں دیکھا۔ گھر میں کوئی ضرورت ہو یا پھر ہم میں سے کسی کو کچھ چاہیے ہو اور وسائل نہ ہوں تو ہمیشہ والد صاحب کے پاس سے نکلتا تھا۔ گھر کا خرچ بھی مناسب انداز میں چلتا تھا۔ اپنی ذات کی حد تک ان کا خرچ بہت کم تھا۔ ان کے پاس ایک وقت میں بھی چھ سے زیادہ لباس نہیں رہے۔ ان میں سے دو گھر کے تھے اور چار وہ دفتر اور باہر جانے میں استعمال کرتے تھے۔ گھر میں پہننے کے لیے ایک چپل اور باہر کے لیے دو جوڑی جوتے ہوتے تھے۔ جب وہ اپنے لیے کچھ لیتے یا ان کو کوئی دوسرا لاکر دیتا تو ہمیشہ وہ اپنی کچھ پرانی ہو جانے والی چیز کسی ضرورت مند کو دے دیتے تھے۔ ان کے پاس میں نے بچپن سے بس اتنی ہی چیزیں دیکھی تھیں۔

لباس بھی وہ نارمل پہنتے تھے اسی طرح جوتے اور چپل بھی اچھی والی مگر بہت مہنگی نہیں ہوتی تھی۔ سگریٹ پیتے تھے مگر جب وہ کم کر دیتے تو ہم سمجھ جاتے کہ ان کے پاس رقم کم ہے۔ مگر یہ کمی صرف ان کی ذات کے لیے ہوتی تھی۔ ہمیں انہوں نے کبھی کوئی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ہمارا خیال تھا کہ ان کے پاس شاید زیادہ رقم نہ ہو مگر ان کے بینک اکاؤنٹ میں ساڑھے چار لاکھ کی رقم نکلی تھی اور انہوں نے ایک ڈائری میں حساب بھی لکھا ہوا تھا کہ انہوں نے کس کس کو کیا دیا ہے۔ اس میں تمام حوالے اور ثبوت بھی تھے اس لیے ہمیں ان کی دی ہوئی رقم وصول کرنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی۔ اکثر نے بہت خوشی سے اور آسانی سے دے دی۔ ایک دو نے ہچر مچر کی تو ہم نے دوسرے طریقے سے نکلوالی۔ گھر انہوں نے ہم تینوں بھائیوں کے نام کیا تھا اور نقد رقم میں سے امی اور بہن کو ان کا حصہ دینا تھا۔

ان کے بعد یہ مرحلہ بھی آسانی سے ہو گیا کیونکہ ہم بہن بھائیوں میں سے کسی کی نیت خراب نہیں تھی۔ اس لیے افہام و تفہیم سے سب کو اس کا حق دے دیا گیا اور اگر کسی نے چاہا تو دوسرے کے حق میں اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیا۔ امی میرے پاس رہ رہی تھیں۔ کیونکہ میری شادی خالہ کی بیٹی سے ہوئی تھی اور امی کی رفعت سے بنتی تھی اس لیے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے ساتھ رہنے کے لیے مجھے ترجیح دی۔ گراؤنڈ فلور میرے پاس تھا۔ مجھ سے چھوٹا بھائی پہلے فلور پر تھا اور سب سے چھوٹا سیکنڈ فلور پر تھا۔ تینوں فلورز کے

میٹرز الگ تھے۔حد یہ کہ پانی چڑھانے والی موٹریں اور اوپر سب کی پانی کی ٹنکیاں بھی الگ ہیں۔صرف پانی کھینچنے والی موٹر مشترک ہے۔گویا سب اپنے اپنے گھر میں آباد ہیں۔ہم تینوں بھائیوں اور بہن کی شادی والد کی زندگی میں ہوگئی تھی اور وہ ہمارے بچے بھی دیکھ کر گئے تھے۔ہم نے ان کی ہر ممکن خدمت کی تھی اور وہ ہم سے خوش ہو کر گئے تھے۔اس لحاظ سے بھی ہم خوش نصیب رہے تھے۔

جب میں کالج میں آیا تو میں نے ایف اے کا انتخاب کیا تھا اگرچہ والد کی خواہش تھی کہ میں انجینئرنگ لوں۔مگر میرا رجحان پڑھائی کی طرف کم تھا اور میٹرک کے بعد ہی میں نے جاب شروع کر دی تھی۔میں ایک گارمنٹس فیکٹری میں لگ گیا تھا۔شروع میں بہ طور ورکر کام کیا تھا مگر جلد میں سپروائزر بن گیا۔تنخواہ اس زمانے میں بھی اچھی ملتی تھی اس لیے جب اس کا چسکا لگا۔تو پڑھائی کی طرف دھیان اور کم ہو گیا اور میں نے بہت مشکل سے انٹر کیا اور اس کے بعد تعلیم ترک کر دی۔مختلف فیکٹریوں سے ہوتا ہوا میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک بڑی اور مشہور فیکٹری میں بہ طور کوالٹی کنٹرول سپروائزر ملازم ہوگیا۔اس وقت میری عمر مشکل سے اکیس برس تھی اور اسی برس میری شادی بھی ہوئی تھی۔کیونکہ میں کئی سال سے کما رہا تھا اور ساری تنخواہ والد کے حوالے کرتا تھا جو اسے جمع کرتے رہے تھے۔اسی سے انہوں نے میری شادی کی اور باقی رہ جانے والی رقم میرے حوالے کر دی۔

رفعت سے میری منگنی بچپن میں طے پا گئی تھی۔ادھر اس نے انٹر کیا اور ادھر خالہ نے امی کا پیچھا لیا۔امی بھی راضی تھیں اور والد کو بھی اعتراض نہیں تھا کیونکہ میں کما رہا تھا اور اپنے خاندان کا بوجھ اٹھا سکتا تھا۔اب تک میں جاب میں سیکھتا آیا تھا مگر شادی کے بعد میں نے سیکھنے کی بجائے جاب کو آگے بڑھانے پر توجہ دی۔اس سے پہلے میں کئی فیکٹریاں اور شعبے بدل چکا تھا۔مطلب یہ کہ کام تو ریڈی میڈ گارمنٹ کا ہی ہوتا تھا لیکن اس کے مختلف شعبوں میں طبع آزمائی کرتا رہا تھا۔رفتہ رفتہ مجھے پروڈکشن کے سارے اسرار و رموز آگئے تھے۔میرے پاس تعلیم اتنی نہیں تھی مگر کام کا تجربہ خوب آگیا تھا۔اس وقت مہنگائی اتنی نہیں تھی۔پھر اپنا گھر تھا کوئی فکر نہیں تھی۔شادی کے شروع دن تو بہت اچھے گزرے۔مگر جلد ہی پریشانیوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔

جلد شادی کی طرح بچے بھی جلد ہوئے اور جب بچے ہوئے تو ان کے ساتھ ان کے اخراجات بھی آئے۔مہنگائی میں اضافہ ہوا مگر تنخواہ میں اس حساب سے اضافہ نہیں ہوا۔میں نے کئی بار اضافے کے لیے درخواست دی مگر جواب میں انکار ملا۔اگر میرے ساتھ بیوی بچوں کی مجبوری نہ ہوتی تو میں جاب چھوڑ کر دوسری تلاش کرتا مگر اب میرے ہاتھ پاؤں بندھ گئے تھے اس لیے صبر شکر کر کے یہیں ملازمت کرتا رہا۔جب تک والد صاحب زندہ رہے وہ میری سپورٹ کرتے رہے لیکن جب وہ دنیا سے گزرے تو میری مشکلات میں اضافہ ہوگیا۔پورا گھر مجھ پر تھا۔اخراجات میں اضافہ ہوا تھا۔وراثت میں جو میرے حصے میں آرہا تھا اس کا بڑا حصہ میں نے بہن کو دے دیا کیونکہ اس کے پاس گھر نہیں تھا اور وہ اپنے گھر کے لیے کوشش کر رہی تھی۔کچھ اس کے شوہر نے کیا تھا اور انہوں نے اپنا گھر لے لیا۔

اس وقت مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اپنی ذات پر ایثار کر کے کسی کے لیے کچھ کیا تھا اور دیکھا جائے تو تربیت کے ساتھ یہ رقم بھی والد صاحب کا ترکہ تھی۔وقت گزرتا گیا۔شادی کے ابتدائی دس سالوں میں پانچ بچے ہو گئے۔اور اب میرے لیے اس ملازمت اور تنخواہ میں کام کرتے ہوئے گزارہ کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔تب میں نے پہلی بار اتنی ہمت سے کام لیا اور فیکٹری کے مالک سیٹھ ریاض کو وارننگ دے دی کہ اگر میری تنخواہ اور عہدے میں اضافہ نہیں کیا گیا تو میں ایک مہینے بعد ملازمت چھوڑ دوں گا۔یہ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے اور اس نے فوراً مجھے بلایا۔اس کے چہرے پر فکر تھی مگر ساتھ ہی اس نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ پوچھا۔''شاہد صاحب آپ کو کیا مسئلہ ہے آپ کیوں جاب چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے ہیں۔''

''سر وجہ میں اپنے نوٹس میں بتا چکا ہوں۔عملی طور پر میں فیکٹری میں تین شعبے دیکھ رہا ہوں۔جن کے لیے عام طور سے تین الگ الگ ملازم ہوتے ہیں۔''

''کون سے تین شعبے؟'' سیٹھ ریاض نے ایک بار پھر انجان بن کر پوچھا۔میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا تھا۔

''سر میں بیک وقت پروڈکشن، کوالٹی کنٹرول اور پرچیزنگ کے شعبے دیکھ رہا ہوں۔ہمارے ساتھ کام کرنے والی کرن گارمنٹس میں ان تینوں شعبوں کے لیے الگ الگ آدمی ملازم ہیں اور اتفاق سے تینوں کی الگ الگ سیلری مجھ سے زیادہ ہے۔''

"اچھا...... اچھا۔" سیٹھ ریاض نے یوں تعجب سے کہا جیسے اس کے علم میں یہ بات نہ ہو۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

میں شکریہ ادا کر کے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ یہ حقیقت تھی کہ پہلے میں پروڈکشن سپروائزر تھا پھر مجھے اس شعبے کا انچارج بنا دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد کوالٹی کنٹرول کے معاملات بھی میرے سپرد کر دیئے گئے اور جب ایک بار میں نے کچھ سامان جس کی فوری ضرورت تھی اجازت لے کر خود پرچیز کی اور پرچیز آفیسر اور میری خرید میں جو قیمت کا فرق آیا اس کے بعد سیٹھ ریاض نے پرچیزنگ بھی میری ذمے داری بنا دی۔ مزے کی بات یہ ہے ان ذمے داریوں کے اضافے سے میری تنخواہ میں ذرا برابر فرق نہیں پڑا۔ ہاں یہ ہوا کہ پہلے میں چھ سات بجے گھر چلا جاتا تھا تو اب چھٹی کر کے گھر جاتے جاتے نو دس بج جاتے تھے۔ دفتر میں بھی تینوں شعبوں میں سر کھپانا پڑتا تھا۔ جاب کے سات سال بعد میں یہ تینوں کام کر رہا تھا۔ اب بھی کر رہا ہوں لیکن سیٹھ ریاض کو وارننگ میں نے کوئی دس سال پہلے دی تھی۔ اس پر بھی اس نے فوری کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ مجھے ایک ہفتے بعد دوبارہ بلایا اور بولا۔

"شاہد صاحب آپ نے جو بتایا ہے میں نے اس پر کچھ کام کیا ہے۔ اول آپ نے جن تین افراد کا حوالہ دیا ہے وہ تینوں اپنے شعبوں میں کوالی فائڈ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔"

"سر آپ ان کی اعلیٰ تعلیم کی وضاحت کریں گے؟" میں نے ادب سے پوچھا تو اس نے بادل ناخواستہ جواب دیا۔

"تینوں گریجویٹ ہیں۔"

"ٹھیک سر۔"

"پھر وہ اپنے شعبے میں تجربے کار اور پرانے لوگ ہیں ان کو یہ کام کرتے ہوئے بیس سے پچیس برس ہو چکے ہیں۔"

"اس صورت میں بھی میں زیادہ داد کا مستحق ہوں کہ کم عمری اور کم تجربے کے ساتھ ان کے برابر کام کر رہا ہوں۔ ہاں آپ میرے کام سے نامطمئن ہوں تو دوسری بات ہے۔"

"ارے نہیں شاہد صاحب میں آپ سے بالکل مطمئن ہوں۔"

"تب میرے ساتھ انصاف کیجیے۔"

یہ انصاف بھی مجھے فوری نہیں ملا تھا مگر دو مہینے کی رد و کد کے بعد میری تنخواہ میں پچاس فیصد اضافہ کیا گیا تھا جب کہ میں سو فیصد اضافہ چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تینوں شعبے مستقل میرے ذمے کر دیئے گئے جو میں پہلے سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے باقاعدہ آفیسر کا درجہ دے دیا گیا اور اب شاہد صاحب اور فیکٹری مینیجر کے بعد میرا نمبر تیسرا تھا۔ ایک اچھا کام یہ ضرور کیا کہ مجھے گاڑی مہیا کر دی۔ اس سے پہلے میں بائیک پر دفتر آتا جاتا تھا۔ مجھے دی جانے والی کار چند سال پرانی کورے کار تھی مگر مجھے ری کنڈیشن کر کے دی گئی اور تقریباً نئی جیسی لگتی تھی۔ بائیک کی سواری سے مجھے کمر میں درد رہنے لگی تھی اب گاڑی ملی تو میں آسانی سے دفتر آنے جانے لگا اسی طرح گھر والوں کو کہیں لانا لے جانا بھی آسان ہو گیا ورنہ پانچ بچوں کے ساتھ بائیک پر کہیں جانا ممکن نہیں تھا۔

میں اس اضافے سے مطمئن نہیں تھا مگر اب پہلے کی طرح نامطمئن بھی نہیں رہا تھا۔ البتہ کبھی کبھی دیکھتا کہ میری جیسی صلاحیت رکھنے والا فرد دوسری کمپنیوں میں کیا لے رہا ہے اور کتنے فائدے میں ہے تو میرا خون اندر سے جلتا تھا۔ میں صرف پرچیز کی مد میں کمپنیوں کو سالانہ لاکھوں روپے بچا کر دے رہا تھا۔ فیکٹری میں ہر مہینے کروڑوں کی پرچیزنگ ہوتی تھی۔ سابق پرچیز آفیسر ہر چیز میں قیمت بڑھا چڑھا کر لیتا تھا۔ حد یہ کہ پینسل چھیلنے کا معمولی شاپنر بھی وہ دوگنی قیمت پر لاتا۔ جب پرچیزنگ میں نے سنبھالی اور چیزوں کے لیے خود جانے لگا تو رفتہ رفتہ مجھ پر کھلا کہ وہ اس معاملے میں کتنا کھل کر کھاتا تھا اور صرف وہی نہیں تقریباً تمام ہی پرچیز آفیسر اسی طرح کی ڈنڈیاں مارتے ہیں۔ جس پرچیز آرڈر کی وجہ سے مجھے یہ کام بھی سر مار دیا گیا اس میں فیکٹری کو ڈینم درکار تھی اور اس کی مقدار کوئی سترہ ہزار میٹرز تھی۔

وہ جو سیمپل لایا میں نے بہ حیثیت کوالٹی کنٹرولر اسے مسترد کر دیا اور پھر اس سے میرا جھگڑا ہوا اور میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ وہ کچرہ لایا ہے اور میں اس سے اچھی ڈینم اس سے اچھی قیمت پر لا سکتا ہوں۔ اس نے چیلنج کر دیا کہ میں نے لا کر دکھائی تو وہ نوکری چھوڑ کر چلا جائے گا۔ شاہد صاحب نے بھی مجھ سے کہا کہ جب میں نے دعویٰ کیا ہے تو اسے درست کر کے دکھاؤں۔ حالانکہ میں نے اسے صرف چڑانے کے لیے یہ دعویٰ کیا جو میرے گلے پڑ گیا۔ مرتا کیا نہ

کرتا میں نے چیلنج قبول کیا اور ڈینم کی تلاش شروع کیا۔ اتفاق سے میرے پاس جو چیز جس سپلائر سے آتی تھی میں اس کا پتا سمپل کے ساتھ ایک فائل میں محفوظ کرتا جاتا تھا۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ آیندہ جب اسی چیز کی ضرورت ہو تو اسی سپلائر سے کہا جائے۔ مزے کی بات ہے فیکٹری میں اس قسم کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ بھی میں اپنے طور پر کرتا تھا۔ کیونکہ اس سے میرا کام آسان ہو جاتا تھا۔

لیکن اس موقع پر یہ فائل میرے کام آئی اور میں نے دیکھا کہ ڈینم کی سپلائی کہاں کہاں سے آئی تھی اور ان میں سے کون سی ڈینم ہمارے آرڈر کے مطابق ہو سکتی ہے۔ ملتی جلتی ڈینم کے نمونے نکال کر میں نے ان کے سپلائرز سے رابطہ کیا اور ان سے کہا کہ اس قسم کی ڈینم سترہ ہزار میٹرز کی مقدار میں چاہیے۔ یہ خاصا بڑا آرڈر تھا اور اگلے ہی دن تین سپلائرز مجھ سے ملنے فیکٹری پہنچ گئے اور سب آرڈر لینے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے ان تینوں کو الگ الگ وقت بلایا تھا تاکہ کسی کا ایک دوسرے سے سامنا نہ ہو۔ ساتھ ہی میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے بہترین نمونے ساتھ لائیں۔ وہ تینوں سمپل بک لائے تھے۔ میں نے سمپل دیکھے اور اتفاق سے تینوں کے پاس اس معیار کی ڈینم موجود تھی جو ہمیں درکار تھی۔ مجھے پہلا دھچکا اس وقت لگا جب ان تینوں نے مجھے جو قیمت دی وہ پرچیزر کی لائی ڈینم کی قیمت سے کم سے کم بھی دس روپے فی میٹر کم تھی۔ جب کہ ابھی انہیں اس قیمت میں سے خاصا کم کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر میں نے ان سے کہا۔

''مجھے اس سے اچھی کوالٹی کی ڈینم چاہیے۔''

دو نے کہا کہ ان کے پاس اس سے اچھی ڈینم نہیں ہے ایک نے کہا کہ اس کے پاس ہے لیکن وہ دو دن بعد دکھا سکے گا۔ میں نے سب سے سمپل اور ان کے ہاتھ سے لکھی قیمت لے لی۔ مگر اسے فوری سیٹھ کے سامنے نہیں پیش کیا۔ دو دن بعد تیسرے سپلائر نے مجھے ڈینم کا نمونہ دیا تو یہ ہمارے مطلوبہ معیار سے بھی کہیں اچھی تھی۔ میں نے اس سے بھی قیمت لی اور مزے کی بات ہے وہ پھر بھی پرچیزر کی لائی ڈینم کی قیمت سے کم تھی۔ میں نے تمام سمپل اور قیمتیں سیٹھ ریاض کے سامنے رکھ دیں تو اس کی آنکھیں بھی کھلی رہ گئی تھیں۔ اس نے اسی وقت پرچیزر کو بلا لیا اور جب یہ چیزیں اس کے سامنے رکھیں تو اس کا منہ سفید ہو گیا۔ مگر وہ چالاک آدمی تھا اس سے پہلے سیٹھ اسے فارغ کرتا اس نے خود ہی کہہ دیا۔ ''ٹھیک ہے میں ہار گیا اور استعفا دے رہا ہوں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب اس قیمت پر چیز مل بھی جائے۔''

''مل جائے گی۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''میں نے خود جا کر نہیں دیکھا ہے ان لوگوں کو فیکٹری میں بلایا ہے۔''

''دیکھتے ہیں۔'' اس نے کہا اور چلا گیا۔

''آپ کیا کہتے ہیں سر ان میں سے کس کو آرڈر دیا جائے۔''

سیٹھ ریاض نے میری توقع کے عین مطابق تیسرے سپلائر کے اعلیٰ درجے کے سمپل کو مسترد کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ بھی اسے کم قیمت میں مل رہا تھا اس نے ہماری ضروریات پورا کرنے والے سمپل لیے اور مجھ سے کہا۔ ''دیکھو ان میں سے کون سب سے کم قیمت پر سپلائی کرتا ہے۔''

میرا خیال تھا کہ آگے ان سے بات چیت سیٹھ یا پرچیزر کرے گا مگر پرچیزر استعفا دے کر جا چکا تھا اور سیٹھ نے یہ ذمے داری بھی میرے سر ڈال دی تھی۔ مجبوراً مجھے یہ کام کرنا پڑا۔ اگلے دن میں نے پھر تینوں سے بات کی اور ان سے فائنل قیمت مانگی۔ میری توقع کے مطابق سب نے چار پانچ روپے فی میٹر مزید کم کر دیے۔ ان میں سے ایک سب سے کم قیمت ایک سو بتیس روپے میٹر پر آ گیا۔ مگر میں نے اسے ایک سو پچیس روپے میٹر کا کہا۔ پرچیزر کی قیمت ایک سو باون روپے میٹر تھی گویا بیس روپے کی بچت تو یہیں ہو رہی تھی۔ میں اسے مزید نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے ایک سو اٹھائیس کا ریٹ دیا۔ باقی دو کو اسٹینڈ بائی پر کر کے میں نے تیسرے سپلائر کی سیٹھ سے بات کرا دی۔ اس نے اسے مزید توڑا اور بالآخر ایک سو چھبیس روپے میٹر پر بات بن گئی اور چھبیس روپے فی میٹر کی بچت ہوئی جب کہ کل بچت چار لاکھ بیالیس ہزار روپے کی تھی۔

پرچیزر کمپنی کو اتنا چونا لگا رہا تھا جو میں نے بچا لیا۔

مجھے خیال آیا کہ شاید مجھے اس کا کوئی ریوارڈ ملے یا تنخواہ میں ہی اضافہ ہو جائے مگر توبہ کریں نہ تو تنخواہ میں اضافہ ہوا اور نہ ہی کوئی بونس وغیرہ ملا جیسے میں نے سیٹھ کو نہیں خود کو نقصان سے بچایا ہو۔ یوں سمجھ لیں کہ الٹا مزید کام گلے پڑ گیا اور اب وہ بھی کرنا پڑ رہا تھا پھر ایک بار عادت سے مجبور ہو کر کوالٹی کنٹرول کے معاملے میں ٹانگ اڑائی تو یہ شعبہ بھی میری ذمے داری بن گئی۔ اب ٹوٹل پروڈکشن، پرچیزنگ اور کوالٹی کنٹرول میرے شعبے تھے مجھے ان کا کوئی صلہ تو نہیں مل رہا تھا

مگر کوئی مسئلہ ہو جاتا تو جان میری عذاب میں آتی تھی۔ میں شروع سے اپنا کام اس طرح سے کرنے کا عادی تھا کہ جیسے مجھے سیٹھ کو نہیں خود کو مطمئن کرنا ہو اور میں اس وقت تک کام کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا جب تک خود مطمئن نہیں ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ شکایت کا موقع بہت کم آتا مگر اس کے لیے مجھے خود پر جو جبر کرنا پڑتا تھا وہ میں ہی جانتا تھا۔

جب تک والد صاحب زندہ رہے تمام تر مشکلات کے باوجود ایک حوصلہ ہوتا تھا کہ اگر میں کسی مشکل میں پڑوں گا تو میرے سر پر کوئی ہے جو سب دیکھ لے گا۔ مگر ان کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں بنا چھت کے کھلے آسمان تلے آ گیا ہوں۔ دھوپ، بارش اور زمانے کی آندھیوں سے اب کوئی بچاؤ نہیں تھا۔ تب میں جیسے ڈر گیا تھا۔ بہت دن والد صاحب کی کمی محسوس کرتا رہا۔ ان کی باتیں یاد کرتا تھا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ والد صاحب مشکل میں مبتلا لوگوں کی مدد کرتے تھے اور اللہ نے ہمیشہ انہیں اپنا محتاج رکھا کبھی کسی کے آگے ان کا سر نہیں جھکا تھا۔ میں نے بھی کسی کی اس طرح مدد نہیں کی تھی۔ جب والد صاحب کی یہ بات یاد آئی تو میں نے ہمت کی اور اس کے بعد اگر کوئی مشکل میں یا مصیبت زدہ نظر آتا تو میں اس کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کرتا۔

مالی مدد، عملی مدد یا حوصلہ افزائی سب کرتا تھا۔ اگر بات میرے بس سے باہر ہوتی تو دوسروں سے مدد لے لیا کرتا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ سچ مچ میرے سارے مسائل یوں حل ہونے لگے کہ میں حیران رہ جاتا۔ حالانکہ میری آمدنی اتنی ہی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ میں نے سیل پر چیز کا چھوٹا موٹا کام شروع کر دیا تھا۔ فیکٹری کے لیے پرچیز کرنے سے میرے تعلقات نہ صرف مارکیٹ میں بیٹھے بڑے سپلائرز سے ہو گئے تھے بلکہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کون سی چیز کس قیمت پر کہاں مل رہی ہے اور کس قیمت پر کہاں نکل جائے گی۔ میں دیکھتا کہ اگر کوئی لاٹ چانس کی مل رہی ہے تو اسے اٹھا لیتا اور تھوڑے نفع پر آگے فروخت کر دیتا تھا۔ اس سے کچھ رقم مل جاتی تھی۔ جیب میں نقد نہیں ہوتا تھا مگر مجھے مال ادھار پر مل جاتا اور جب فروخت کر دیتا تو ادھار اتار دیا کرتا تھا۔ مگر یہ بھی مہینے میں چند ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہر مشکل مرحلے سے یوں نکالا کہ میں خود بھی حیران رہ گیا۔

اتفاق کی بات ہے مجھ سے چھوٹے بھائی جو پڑھ لکھ

دلچسپ قوانین

☆ چین میں کالج میں جانے کے لیے ذہانت شرط ہے۔

☆ فرانس میں کسی جانور کا نام نپولین رکھنا جرم ہے۔

☆ کولاریڈو میں بارش کا پانی جمع کرنا منع ہے۔ اگر پولیس کو پتا چل جائے تو گرفتار کر سکتی ہے۔

☆ جارجیا میں مرغیوں کا روڈ کراس کرنا منع ہے۔ دوسری صورت میں ان کے مالک کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ ایریزونا میں اگر آپ نے کیکٹس کے پودے کو کاٹا ہے تو اس کی سزا پچیس سال تک ہو سکتی ہے۔

مرسلہ: فرحت جہاں۔ سرگودھا

گئے تھے اور اب اپنی تعلیم کے بل بوتے پر اچھی ملازمتوں پر تھے اور مجھ سے زیادہ کما رہے تھے۔ مجھ سے چھوٹا اکاؤنٹنٹ تھا اور ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہا تھا اور اس سے چھوٹے نے ایسوسی ایٹ انجینئرنگ کی ہوئی تھی اور چند سال پہلے دبئی چلا گیا تھا۔ اب اس نے اپنی فیملی کو بھی بلوا لیا تھا۔ مگر دونوں روتے رہتے تھے کہ یہ پورا نہیں ہوا اور یہاں کمی رہ گئی۔ میری شکوے شکایت کی عادت نہیں تھی اور جب رقم ہوتی تو کھل کر خرچ کرتا تھا اس لیے وہ سمجھتے کہ میں مالی لحاظ سے مضبوط ہوں۔ کبھی کبھی مجھ سے چھوٹا زاہد کہتا۔

''شاہد بھائی آپ ٹھیک ہو بس انٹر کیا اور کام پر لگ گئے ایک ہم ہیں پہلے گریجویشن کیا پھر کمپیوٹر کورس کیے۔ ملازمت کی تو اس میں بھی کورس کرتے رہو۔''

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیتا۔ ٹھیک ہے میں نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر دوسرے تجربات حاصل کرنے کے لیے جتنی جان ماری تھی اس سے آدھی محنت میں شاید ماسٹر یا ایم بی اے کر لیتا اور آج ان لوگوں کی طرح مزے کرتا۔ ایک کام کرتا، ڈبل تنخواہ لیتا اور شام چھ بجے تک گھر میں ہوتا۔ زاہد کے پاس مجھ سے اچھی اور ذاتی کار تھی۔ میرے پاس تو پھر بھی کمپنی کی کار تھی۔ اسے سال میں چھٹیاں اور بونس ملتا تھا اور میں چھٹی کرتا تو میری تنخواہ کٹ جاتی تھی۔ وہ آرام سے ساڑھے دس بجے گھر سے نکلتا تھا اور میں

صبح نو بج کر ایک منٹ پر جاتا تو میری ایک دن کی تنخواہ کٹ جاتی تھی۔ میں صبح وقت پر جانے کے باوجود رات گئے ہی گھر آتا تھا۔ مگر میں نے کبھی ان مشکلات کا شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ مجھ سے کام لے رہا تھا ورنہ میرے جیسے کتنے ہی بیکار اور بے روزگار مارے مارے پھرتے تھے۔

ہماری فیکٹری خاصی بڑی تھی اور اس میں شاید ہزار کے قریب ورکرز کام کرتے تھے۔ ان میں سے بے شمار میں نے ملازم رکھوائے تھے۔ جب بھی مجھ سے کوئی ملازمت کی درخواست کرتا تو میں کوشش کرتا کہ اسے فیکٹری میں کہیں نہ کہیں فٹ کرادوں۔ اتنی بڑی فیکٹری تھی اور زیادہ تر لوگ ڈیلی ویجز پر تھے۔ اس لیے ہر مہینے چالیس پچاس آسامیاں خالی اور بھرتی رہتی تھیں۔ فیکٹری میں ایک عورت صوفیہ بھی کام کرتی تھی۔ اس کا شوہر منشیات کا عادی تھا اور اس کے چھوٹے بچے تھے۔ ایک بار وہ آئی تو میں نے اسے یہاں رکھوا دیا۔ وہ پہلے صفائی کا کام کرتی تھی پھر اس نے سلائی کا شوق ظاہر کیا تو اسے اسٹچنگ ڈیپارٹمنٹ بھجوا دیا اب وہ یہاں سلائی کر رہی تھی اور زیادہ اچھی تنخواہ لے رہی تھی۔ ایک دن صوفیہ نے مجھ سے کہا۔

''شاہد بھائی میں نے بڑی مشکل سے اپنے شوہر سے نشہ چھڑایا ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ بیکار رہا تو پھر نشہ شروع کر دے گا۔ میں چاہتی ہوں اسے فیکٹری میں کام دلوا دیں۔''

میں نے کہا۔ ''کام تو دلوا دوں لیکن اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو میری بدنامی ہوگی کہ اسے شاہد نے رکھوایا تھا۔''

''شاہد بھائی میں قسم کھاتی ہوں اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو وہ تو رہے نہ رہے میں یہ نوکری چھوڑ دوں گی۔''

اس نے بات ایسی کی تھی کہ میں مجبور ہو گیا۔ ورنہ میری کوشش ہوتی تھی کہ بندہ میرٹ پر آئے۔ ''اسے کام کیا آتا ہے؟''

''کٹنگ ماسٹر ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ایسا ماسٹر ہے کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا مگر اس سے جلنے والوں نے اسے نشے پر لگا دیا۔ اللہ ان سے پوچھے۔''

''کوئی نشے پر نہیں لگتا جب تک وہ خود اندر سے کمزور نہ ہو۔'' میں نے کہا۔ ''جب میں کہوں اسے بھیج دینا۔ ایک دو مہینے میں شاید کام بن جائے۔''

''شکریہ شاہد بھائی اگر بختیار کام پر لگ گیا اور سدھر گیا تو میرے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔''

''مجھے تم لوگوں کی دعائیں ہی چاہییں۔'' میں نے کہا۔ فیکٹری میں نصف درجن کے قریب کٹنگ ماسٹر تھے اور فی الحال کسی کٹنگ ماسٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر مجھے صوفیہ کی بات کا خیال تھا کہ فارغ رہ کر بختیار پھر نشہ نہ کرنے لگ جائے۔ اس لیے میں نے اس کے لیے ایک عارضی آسامی نکالی اور صوفیہ سے کہا کہ اپنے شوہر کو بھیج دے۔ بختیار آیا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا مرجھائے چہرے والا دبلا آدمی تھا۔ نشے نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس کے مطلب کی جگہ ابھی خالی نہیں ہے لیکن اسے پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں سلے ہوئے ملبوسات کے اضافی حصے اور دھاگے وغیرہ کاٹنے کی جاب دے رہا ہوں۔ ''معاف کرنا کہ یہ تمہارے معیار سے کم جاب ہے مگر مجھے امید ہے جلد تمہارے مطلب کی جگہ نکل آئے گی۔''

''میرے لیے تو یہ بھی بہت ہے جی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو کوئی بھنگی رکھنے کو تیار نہیں ہے۔''

''اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔ میں بتا دوں کہ میں تمہیں ملازمت پر رکھ رہا ہوں لیکن اگر مجھے پتا چلا کہ تم پھر نشے کے پاس بھی گئے ہو تو میں ایک منٹ میں فارغ کر دوں گا۔''

''اب میں اس نامراد شے کے پاس بھی نہیں جاؤں گا۔'' اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''یہ بات مجھے نہیں خود سے کہو۔''

بختیار فیکٹری میں کام کرنے لگا۔ اتفاق کی بات تھی کہ ایک سال تک ہمیں کسی اضافی کٹنگ ماسٹر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک سال بعد ایک جگہ خالی ہوئی تو میں نے بختیار کو وہاں رکھوا دیا۔ ایک سال میں اس کا چال چلن ٹھیک رہا تھا اور جب اسے ملازمت ملی تو صوفیہ نے ملازمت چھوڑ دی کہ پوری توجہ گھر اور بچوں کو دے سکے۔ کٹنگ ماسٹر کی تنخواہ اچھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی بختیار ٹھیک چلتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ کبھی نرم اور کبھی گرم۔ ایک بار تنخواہ بڑھ جانے کے بعد سیٹھ ریاض پھر سکون سے بیٹھ گیا۔ جب مسلسل یاد دلاتا تو کئی سال بعد کچھ اضافہ کرتا اور اس کے بعد دوبارہ بیٹھ جاتا۔ چند سال پہلے میں نے محسوس کیا کہ گاڑی اس طرح نہیں چلے گی۔ اب مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ ریڈی میڈ گارمنٹ کی فیلڈ میں سب کچھ میں سیکھ چکا تھا اور میں نے

سوچا کہ اپنا کام کرتا ہوں۔

اتفاق سے میرا ایک دوست شبیر حسین جو خود بھی ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا اس کا بھی یہی خیال تھا اور ہم نے آپس میں پارٹنر شپ کرلی۔ اب مسئلہ فنانسر کا تھا۔ نہ میرے ہاتھ میں کچھ تھا اور نہ اس کے ہاتھ میں۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے فنانسر تلاش کرنا ہوگا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور ہم نے فنانسر کی تلاش شروع کردی۔ مگر ان ہی دنوں کاروباری حالات خراب ہونا شروع ہوئے تھے اور مارکیٹ سے بزنس اور بزنس مین غائب ہونے لگے تھے۔ بھتے، اغوابرائے تاوان اور سڑکوں پر لوٹ مار نے کاروباری حضرات کو مجبور کردیا کہ وہ شہر یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ جس کے پاس کچھ سرمایہ تھا تو وہ اسے لگانے کی بجائے کہیں دبا کر یا اس سے سونا یا ڈالرز خرید کر بیٹھ گیا تھا۔ ہمارے پاس ایک پروجیکٹ مکمل تیار حالت میں تھا اور ہمیں معلوم تھا کہ کہاں سے کپڑا اور دوسرا سامان لے کر کہاں سے گارمنٹ تیار کرانا ہے اور کہاں اسے فروخت کرنا ہے۔ مسئلہ یہیں آکر اٹک رہا تھا کہ ہمارے پاس کام کے لیے پیسے نہیں تھے۔

رفتہ رفتہ ہم مایوس ہونے لگے۔ جس سے بات کرتے وہ تسلیاں تو خوب دیتا اور پیسے دینے کی بات بھی کرتا مگر اس کے بعد دم سادھ کر بیٹھ جاتا اور اس سے پوچھتے تو آدمی کے پاس بہانے ہزار ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ہمارے ارادے بھی ڈھیلے پڑ رہے تھے اور ہمیں لگ رہا تھا کہ ہم نے اس حوالے سے جتنی بھاگ دوڑ اور کام کیا ہے وہ سب ضائع جائے گا۔ شبیر کے بچے ابھی چھوٹے تھے اور اس کی نوکری بھی مجھ سے بہتر تھی۔ اس لیے وہ اتنا ضرورت مند نہیں تھا۔ میرے بچے جوان ہورہے تھے۔ خاص طور سے بڑی بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ رہی تھی اور سولہ سترہ سال کی عمر میں اس نے خاصا قد کاٹھ نکال لیا تھا۔ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں اس کی جلد از جلد شادی کردینا چاہتا تھا۔ اس سے چھوٹے لڑکے تھے جو اب کالج میں جانے والے تھے۔ باقی دو بیٹیاں بھی اسکول میں پڑھ رہی تھیں اور اسکول کی تعلیم اب تقریباً پروفیشنل تعلیم جتنی مہنگی ہوگئی ہے۔ میں جس طرح اپنا گھر چلا رہا تھا میں ہی جانتا تھا۔

کچھ وقت اور گزرا ... تو تقریباً ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ کیونکہ یہاں ہر کچھ عرصے بعد چیزوں کی قیمت بدل جاتی ہے۔ جو کپڑا اور چیزیں پہلے دستیاب ہوں وہ کچھ عرصے بعد مارکیٹ میں نہیں ملتی ہیں ان کی جگہ دوسری چیزیں آجاتی ہیں۔ یوں ہم جو چیز اور جو ڈیزائن سوچا کرتے وہ بیکار ہوجاتا ہے اور نئے سرے سے تمام چیزوں پر کام کرنا پڑتا اور یہی ہماری مایوسی کی وجہ تھی۔ ہم پچھلے ایک سال سے کام کررہے تھے اور بہت محنت کی تھی۔ شبیر اگرچہ مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ ''کیا ہوا یار جو اس بار نہیں کرسکے، پھر کرسکتے ہیں۔''

''وہ تو ہم دس بار کرسکتے ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''لیکن پیسا نہ ہو تو یہ مشق بیکار ہے۔''

''ابھی مارکیٹ ٹھنڈی ہے۔ بڑے لوگ پیسا لگانے سے گریز کررہے ہیں اور اسی وجہ سے ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو موقع مل رہا ہے کہ ہم کام کرکے کچھ کماسکیں۔ ورنہ خود سوچو کہ اگر بڑی پارٹیاں مارکیٹ میں مال ڈال رہی ہوں تو ہم ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں؟''

میں نے سوچا اور شبیر کی بات کو درست پایا۔ ہم نے کوشش ہی اس لیے کی تھی کہ مارکیٹ میں بڑی کمپنیاں کام نہیں کررہی تھیں اور بہت سے چھوٹے گروپ مارکیٹ کی ضرورت پوری کررہے تھے۔ ہم نے بھی فائدہ اٹھانے کا سوچا مگر اسی لیے ناکام رہے تھے کہ ہمیں فنانسر نہیں مل رہا تھا اور ذاتی طور پر ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ ان دنوں فیکٹری میں کام خاصا آیا ہوا تھا۔ یہاں تیار ہونے والا سارا گارمنٹس بیرونِ ملک اور خاص طور سے یورپ جاتا تھا اس کے علاوہ کچھ گاہک جاپان اور جنوبی کوریا سے بھی آتے تھے۔ مگر نوے فیصد مال یورپ جاتا تھا۔ گرمیوں میں کام بڑھ جاتا تھا۔ اس لیے مارچ سے ہی فیکٹری میں کام کا لوڈ بڑھ گیا تھا اور اسی لحاظ سے مجھ پر دباؤ زیادہ آرہا تھا۔ میں صبح جاتا تو وقت پر تھا مگر میری واپسی کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔

صرف مجھ پر ہی نہیں پروڈکشن میں کام کرنے والے ہر فرد پر دباؤ تھا اور اس دباؤ کی وجہ سے غلطیاں بھی ہو رہی تھیں۔ میں اپنے دفتر میں تھا کہ بختیار مجھ سے ملنے آیا اور اس نے کہا۔

"سر جی آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

میرے ساتھ میرا نائب ہوتا تھا اور میں اس پر پورا اعتماد کرتا تھا میں نے بختیار سے کہا۔ "سمجھ لو تم مجھ سے اکیلے میں بات کر رہے ہو۔"

"سر جی مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔"

"کیسی غلطی؟"

"سر جی وہ پچاس میٹر کپڑا غلط کٹ گیا ہے۔"

میں چونکا۔ "غلط کیسے کٹا؟"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ پھر بولا۔ "آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے درمیان میں پھر چرس پینا شروع کر دی تھی۔ مگر صوفی کو پتا چلا تو اس نے میرا پیچھا لے کر چھڑوا دی مگر اب میرا دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہے۔ اسی وجہ سے غلطی ہوئی اور پچاس میٹر کپڑا غلط کٹ گیا۔ بالکل برباد ہو گیا اور ایسے کٹا ہے کہ اس میں سے کچھ ٹھیک کپڑا بھی نہیں نکل سکتا ہے۔"

"کپڑا کہاں ہے؟"

"میں ساتھ لایا ہوں۔" اس نے کہا اور باہر سے تھیلا اٹھا لایا جس میں کپڑا تھا۔ اس نے نکال کر میز پر پھیلایا اور میں نے دیکھا واقعی وہ بہت بری طرح سے برباد ہوا تھا۔ اس سے پینٹ کا کوئی چھوٹا پیس نکالنا بھی مشکل تھا۔ یہ سارا بڑا گارمنٹ تھا۔ اس میں پیس والا کام بھی نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم نے تو سارا برباد کر دیا ہے اور یہ کپڑا بھی مہنگا ہے چار سو ستر روپے میٹر پڑا ہے۔ یعنی تم نے تیئیس ہزار پانچ سو کا نقصان کیا ہے۔"

"اتنی تو میری تنخواہ ہے۔" اس نے گڑگڑا کر کہا۔ "خدا کے لیے مجھے اتنا کپڑا دلوا دیں ورنہ اس مہینے مجھے کچھ نہیں ملے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس غلطی پر نوکری سے نکال دیں۔"

نوکری سے تو نہیں نکالا جاتا مگر یہ ضرور ہوتا کہ اسے تنخواہ میں کٹوتی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اس نے لجاجت سے کہا۔ "شاہد صاحب میری بچی بیمار ہے اسے روز انجکشن لگ رہا ہے اگر مجھے کل تنخواہ نہ ملی تو اس کا انجکشن رک جائے گا۔"

"یار تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "اچھا تم جاؤ میں کچھ دیر بعد بتاتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ اگر وہ خود اسٹور والے کے پاس جاتا تو وہ مجھ سے پرچی لکھوا کر لانے کو کہتا اور اگر وہ اپنی غلطی کا بتاتا تو اسے کپڑا مل جاتا مگر پھر معاملہ مینیجر کے پاس چلا جاتا اور وہ اس کی تنخواہ کاٹ لیتا۔ ساتھ ہی اس کی غلطی بھی نوٹ کی جاتی۔ اس نے اپنی بچی کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے میرے دل میں آیا کہ مجھے اس کی مدد کرنی ہے۔ مگر ساتھ ہی اس نے جو نقصان کیا تھا وہ میں کیسے پورا کرتا یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نقصان بھی اچھا خاصا تھا۔ مگر کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے بختیار کو طلب کیا اور اسے پچاس میٹرز کپڑے کی پرچی بنا کر دی۔ "یہ جا کر لے لو اور ہاں کسی سے نقصان والے کپڑے کے بارے میں کچھ کہنا مت۔"

نقصان والا کپڑا میرے پاس تھا۔ وہ میں نے اپنی ذاتی الماری میں سنبھال کر رکھ لیا۔ اب یہ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کمی کیسے پوری کروں۔ ہر آرڈر پورا ہونے کے بعد میں پوری رپورٹ بنا کر سیٹھ ریاض کو دیتا تھا اور اس میں ایک ایک چیز کی وضاحت ہوتی تھی حتیٰ کہ یہ بھی کہ کتنا کپڑا آیا، کتنا استعمال اور کتنا بچا ہوا ہے۔ اسی طرح باقی چیزوں کی بھی مکمل وضاحت ہوتی تھی۔ اگرچہ سیٹھ نے شاید ہی کبھی ویئر ہاؤس میں جا کر جھانکا ہو کہ وہاں کیا کچھ موجود ہے۔ اس کے باوجود میری رپورٹ مکمل ہوتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس بار مجھے جھوٹی رپورٹ دینا ہوگی؟ میرا ضمیر اس پر آمادہ نہیں تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ نقصان اتنا بڑا تھا کہ میں اسے اپنی جیب سے بھی نہیں بھر سکتا تھا۔ میرے حالات تو ویسے ہی ٹائٹ چل رہے تھے۔

سوچ سوچ کر میرا دماغ دکھ گیا مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔ ان دنوں دو آرڈرز پر کام چل رہا تھا ایک شارٹس تھے اور دوسری ڈریس پینٹ تھیں اور دونوں آرڈر بڑے تھے۔ میں ان پر ورکنگ کر رہا تھا کہ کس پر کتنا کپڑا لگے گا اور اس کا کٹنگ پیٹرن کیا ہو سکتا ہے۔ عام طور سے کٹنگ پیٹرن دو تین ہی ہوتے ہیں۔ یہ کپڑے کے عرض کے لحاظ سے بنتے ہیں۔ ایک دن میں پیٹرن دیکھ رہا تھا کہ انہیں دیکھتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بختیار کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "تم میرے لیے ایک کام کر سکتے ہو؟"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ حکم کریں شاہد

صاحب آپ کے لیے جان بھی حاضر ہے۔"

"جان نہیں چاہیے یار۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ ایک شارٹ کے لیے کتنا کپڑا چاہیے ہوگا؟"

"سر جی معیار تو ایک اعشاریہ دو میٹر آرہا ہے۔"

"اگر اسے کسی طرح کم کرسکو بے شک معمولی سی کم کر دو۔"

"اس کے لیے تو پیٹرن دوبارہ دیکھنا پڑے گا۔"

"کب تک دیکھ لوگے؟"

"آج شام تک بتا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ اور پھر آ کر مجھے بتاؤ۔"

وہ چلا گیا شام کو چھٹی کرکے جانے سے پہلے میرے پاس آیا وہ اخبار پر نیا کٹنگ پیٹرن کاٹ کر لایا تھا۔ اس نے مجھے دکھایا۔ "سر جی میں نے کوشش کی اور اس میں ایک شارٹ پر کپڑا ایک اعشاریہ ایک میٹر لگ رہا ہے۔ ذرا مشکل ہے لیکن ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے تم اسی پیٹرن سے کاٹنا۔" میں نے کہا۔ "کتنے شارٹ کا کپڑا تمہارے پاس آرہا ہے۔"

"یہ تو نہیں پتا سر جی۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا کہ تمہارے پاس کم از کم دو سو شارٹ کا کپڑا آئے اور جو کپڑا بچے گا وہ تم نے مجھے دینا ہے اور خیال رہے کہ کپڑا کٹنگ میں نہ ہو تھان میں بچے۔"

"ایسا ہی ہوگا جناب۔" اس نے اعتماد سے کہا اور چلا گیا۔ چند دن بعد جب شارٹ کا کام شروع ہوا تو میں نے بختیار کو اس کا زیادہ کپڑا دلوایا۔ میری کوشش دو سو شارٹس کی تھی لیکن اسے ڈھائی سو شارٹس کا کپڑا مل گیا اور اس نے اس میں سے کوئی پچیس میٹرز کپڑا بچا کر مجھے پہنچا دیا۔ وہ میں نے رکھ لیا اور چند دن بعد جب پینٹس پر کام شروع ہوا تو میں نے اسے پھر بلایا۔ اس بار بھی میں نے اس سے وہی بات کی۔

"ایک پینٹ پر کتنا کپڑا لگ رہا ہے؟"

"ایک اعشاریہ سات میٹر جناب۔"

"اسے کس حد تک کم کر سکتے ہو۔"

"یہ آج شام تک بتادوں گا۔" اس نے کہا اور شام کو مجھے بتایا کہ اس نے نئے پیٹرن میں پینٹ کا کپڑا ایک اعشاریہ پانچ پانچ میٹر تک محدود کرلیا ہے۔ اسے شارٹ کاٹتے ہوئے بھی مشکل پیش آئی تھی کیونکہ اس نے معیاری طریقے سے ہٹ کر کٹنگ کی تھی جس میں کپڑا سہولت سے اور جلدی کٹ جاتا ہے مگر اس میں کپڑا زیادہ لگتا ہے۔ جب کہ کپڑا بچانے والا پیٹرن کٹنگ کے لحاظ سے آسان نہیں تھا۔ ممکن ہے کوئی اور اسے یہ کام کہتا تو وہ انکار کر دیتا مگر مجھے وہ انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس بار بھی وہ مشکل ہونے کے باوجود راضی ہوگیا۔ میں نے اسے دو سو پینٹس کا کپڑا کٹنگ کے لیے دلوایا اور اس نے بچ جانے والا تمیں میٹرز کپڑا مجھے لاکر دے دیا۔ میں نے اسی شام پچاس میٹرز کپڑا اوپیرہاؤس کیپر کے حوالے کیا اور اس سے اپنی پچاس میٹرز کپڑے والی پرچی واپس لے لی۔ یوں میرے سر سے وہ بوجھ اتر گیا جو پچاس میٹرز کپڑے کا لد گیا تھا۔ بختیار کو پتا بھی نہیں چلا کہ میں نے اسی کی مدد سے اسے دیا جانے والا اضافی کپڑا پورا کرلیا تھا بلکہ پانچ میٹرز اضافی کپڑا بچا لیا تھا جو بعد میں نہیں کام آتا۔ فیکٹری کا نقصان بھی نہیں ہوا تھا اور بختیار بھی بچ گیا تھا۔

جب اپنے کام کا فیصلہ کیا تو میں نے اور شبیر نے دس بارہ سال کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے فینسی جینز بنانے کا سوچا تھا۔ اس کا فینسی سامان تو اتنا مہنگا نہیں تھا مگر ڈینم خاصا مہنگا پڑ رہا تھا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ بختیار نے جو کپڑا خراب کیا تھا وہ بھی اعلیٰ درجے کا ڈینم تھا کیا وہ ہمارے کام آسکتا ہے۔ ایک شام کو جب سب چھٹی کرکے جاچکے تھے تو میں نے بختیار کو دفتر میں بلایا۔ میں نے اپنے پاس موجود نمونہ اسے دکھا کر اس سے خراب ہو جانے والے کپڑے کو دکھا کر پوچھا۔ "کیا اس میں سے اس کے لیے کپڑا نکل سکتا ہے؟"

اس نے اپنا فیتہ استعمال کیا اور بہت دیر تک کپڑے کو مختلف زاویوں سے ناپتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "سر جی یہ تو ایسا لگ رہا ہے کہ کپڑا اسی نمونے کے لحاظ سے کٹ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی بتاتا ہوں جناب۔" اس نے نمونہ ناپ کر دیکھا اور بولا۔ "اس میں پون میٹر کپڑا لگ رہا ہے اور میں کوشش کروں تو اعشاریہ ستر میٹر بھی لگ سکتا ہے تو اس کپڑے سے کوئی ستر پینٹ تیار ہو سکتی ہیں۔"

میں حیران ہوا اور خوش بھی ہوا تھا۔ "اگر تم آفس ٹائم کے علاوہ تیار کرسکو تو سمجھ لو کہ یہ میرا ذاتی کام کرو گے اور میں تمہیں اس کا معاوضہ بھی دوں گا۔"

”ایسا نہ کہیں جی۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔ ”آپ نہیں جانتے کہ مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ میری بچی ٹھیک ہو گئی ہے کیونکہ اسے روز انجکشن لگتا رہا ہے اب اسے ہنستا کھیلتا دیکھتا ہوں تو دل سے آپ کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔“

”نہیں جو تمہارا حق ہے وہ تمہیں ملے گا اور میں نے جو کیا وہ اللہ کے لیے کیا ہے اسی سے صلہ چاہتا ہوں۔“ میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”ایسا کرو تم کل سے کام شروع کر دو۔ روز جتنا ہو سکے کٹنگ کرتے جاؤ۔ مگر ایک بات بتا دوں معاوضہ میں جلد نہیں دے سکوں گا جب میرے پاس پیسے آئیں گے تب دوں گا۔“

”میں نے کہا آپ بے فکر ہو جائیں۔“ بختیار نے کہا اور اگلے دن سے کام شروع کر دیا۔ وہ چھٹی کے بعد میرے کمرے میں آ جاتا اور وہیں میز پر کٹنگ کرتا تھا۔ اس نے تین دن میں تمام کپڑا کاٹ دیا۔ پھر اس نے بچ جانے والی کترنوں سے پینٹ پر لگنے والی اضافی چیزیں بھی کاٹ کر دیں۔ میں نے شبیر سے بات کی اور اسے کپڑا دکھایا تو وہ حیران ہوا۔ ”یہ کہاں سے آیا؟“

میں نے اسے بتایا کہ یہ کہاں سے آیا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ ہم خود ہمت کریں کچھ ادھار پکڑتے ہیں اور مزید ایک سو تیس پینٹس کا کپڑا لیتے ہیں۔ باقی فینسی سامان اتنا مہنگا نہیں ہو گا۔“

”سلائی بھی تو دینا ہو گی۔“ اس نے یاد دلایا۔

”اسی کے لیے تو رقم چاہیے۔ باقی کپڑا اور سامان میں ادھار لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ سپلائر میرے جاننے پہچاننے تھے اور میرے لیے وہ سب کرنے کو تیار ہو جاتے۔ کیونکہ میں ان کے لیے سیٹھ سے لڑتا رہا تھا۔ ان کے واجبات دلوانے کے لیے ذاتی طور پر کوشش کرتا تھا اس لیے وہ بھی میری بات رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کپڑا ادھار مانگا تو مجھے بغیر وقت کی پابندی کے اور اس قیمت میں کپڑا مل گیا جس پر آج تک فیکٹری کو بھی مہیا نہیں کیا گیا تھا۔ جب کہ فیکٹری ہزاروں میٹرز لیتی تھی اور میں نے صرف سو میٹرز لیا تھا۔ اسی طرح متعلقہ سامان مہیا کرنے والوں نے مجھے خوشی سے ادھار سامان دیا۔ تقریباً سب نے یہی کہا کہ ادائیگی کی فکر نہ کروں جب پاس ہوں دے دینا۔ شبیر نے کوشش کر کے پچاس ہزار کا بندوبست کیا اور ہم نے اس فیکٹری کو ادائیگی کی جو ہمیں پینٹ سل کر دے رہی تھی۔

تین دن میں فیکٹری نے ہمیں مطلوبہ دو سو دس پینٹس سل کر دے دیں۔ اللہ کا کرم یہ ہوا کہ ایک پیس بھی خراب نہیں ہوا اور سو فیصد مال سو فیصد درستگی کے ساتھ سل کر اور پیک ہو کر آیا۔ مارکیٹ میں اس پینٹ کی قیمت تیرہ سو سے پندرہ سو تھی اور ہم نے اسے ایک پارٹی کو ہول سیل پر آٹھ سو روپے میں دی۔ کل ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار ملے اور تمام ادائیگیوں کے بعد بھی ہمیں کوئی پینتالیس ہزار بچ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا اور صرف ایک سال بعد میں اور شبیر اس پوزیشن میں آ گئے کہ ہم نے نوکریاں چھوڑ دیں اور پورا وقت اپنے کام کو دینے لگے۔ ہم جس اسٹیچنگ یونٹ سے کام کراتے ہیں اس کا مالک اسے فروخت کر رہا ہے اور وہ صرف فیکٹری کی عمارت کے دیئے گئے ایڈوانس اور باقی رہ جانے والے بلوں کی ادائیگی کے بدلے ہمیں فیکٹری دے رہا ہے جس میں دو درجن افراد کام کرتے ہیں۔

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے اللہ نے میری اس حقیر سی کوشش کے بدلے جو میں نے اس کے ایک بندے کے لیے کی تھی مجھے یوں صلہ دیا کہ اب میں اپنا کام کر رہا ہوں کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ اگرچہ ابھی میں اور شبیر بزنس سے بس گزارے لائق نکالتے ہیں مگر وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب ہم اپنی تنخواہ سے کہیں زیادہ آمدنی حاصل کر سکیں گے۔ بلکہ اتنا اب بھی کما رہے ہیں مگر فی الحال وہ سب بزنس میں لگا رہے ہیں۔ بختیار اب میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مگر اسے آج بھی نہیں معلوم کہ میں نے اس کے ساتھ جو کیا تھا اس کا مجھے کیا صلہ ملا ہے۔ جب میں نے سیٹھ ریاض کی فیکٹری کا خراب کپڑا استعمال کیا تب بھی میرے ذہن میں تھا کہ یہ میری چیز نہیں ہے مگر میں اسے کارآمد بنا رہا ہوں۔ جب میں نے سیٹھ ریاض کی ملازمت چھوڑی تو اسے اس کپڑے کے بارے میں بتا دیا کہ وہ اس طرح سے ضائع ہوا ہے صرف یہ نہیں بتایا کہ کپڑا میں نے استعمال کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اس کی قیمت میرے واجبات میں سے کاٹ لے۔ مگر اس نے رقم نہیں کاٹی۔ البتہ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا کہ میں ملازمت چھوڑ کر نہ جاؤں۔ اس بار وہ میری منہ مانگی تنخواہ پر آمادہ ہو گیا تھا مگر میں صرف فیصلہ ہی نہیں کر چکا تھا بلکہ .... اپنے ذاتی بزنس سیٹ اپ میں بہت آگے جا چکا تھا اس لیے میں نے معذرت کر لی اور ملازمت چھوڑ دی۔